مولانا رومؒ

جلد اوّل

تحقیق و ترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم اے علوم اسلامیہ

ایم اے تاریخ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدنا

حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انتساب

عشق اوّل کے نام جو سرّ دلبراں، جانِ جاناں، محبوب اکمل ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

نام کتاب	انوارِ مثنوی مولانا رومؒ
تاریخ اشاعت	اگست 2023ء بمطابق محرم الحرام 1445ھ
طباعت	محمد طاہر ہاشمی سروری قادری
ٹائیٹل	پروفیسر محمد حسان ہاشمی
تکنیکی خدمات	محمد انس الہاشمی
ہدیہ	رضائے الٰہی
تعداد	برقیؔ

ضروری وضاحت

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جا سکے۔ نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہو گا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

مولانا جلال الدین رومیؒ کے حالات زندگی

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا نام؛ محمد؛ اور لقب جلال الدین تھا۔ آپ نے مولانا رومؒ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد کا نام بھی ؛ محمد؛ اور لقب بہاؤالدین تھا۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ نابغۂ روزگار عالم دین تھے۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ کے حلقہ ارادت میں امام فخر الدین رازی اور محمد خوارزم شاہؒ بھی شامل تھے

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا سلسلہ نسب چند واسطوں کے ذریعے حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ آپؒ 604ھ میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی ملاقات حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے بھی ہوئی تھی۔ جس وقت حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی ملاقات حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ہوئی اس وقت مولانا رومؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے جن کی عمر اس وقت صرف چھ سال تھی۔ حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ نے مولانا رومؒ کو دیکھ کر حضرت محمد بہاؤالدینؒ کو تاکید کی کہ وہ اپنے صاحبزادے کی پرورش میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتیں اور اسے دینی علوم سے بہرہ ور فرمائیں۔

حضرت محمد بہاؤالدینؒ کی خصوصی توجہ سے مولانا رومؒ نے دینی علوم اور تمام مروجہ دینی کتب پر عبور حاصل کیا۔ مولانا رومؒ کی عمر مبارک ابھی صرف اٹھارہ برس ہی تھی کہ آپؒ کی شہرت ہر جگہ پھیلتی چلی گئی۔ اس دوران شاہ روم علاؤالدین کیقباد نے آپؒ کی شہرت سن کر آپؒ کو روم آنے کی دعوت دی۔ آپؒ علاؤالدین کیقباد کی دعوت پر روم کے شہر قونیہ تشریف لے گئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں جن کا قلب غم امت سے فیضیاب ہے اور وصال حق کے لئے بے تاب۔ آپؒ کا دور قتل وغارت گری کا دور تھا۔ آپؒ ابھی گیارہ برس کے ہی تھے تاتاریوں کا فتنہ شروع ہوا۔ آپؒ کے دور میں نوے لاکھ آدمیوں کو قتل کیا گیا اور مذہبی منافرت بہت زیادہ تھی۔ اس دور میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ حضرت شیخ محی الدین عربیؒ اور حضرت بو علی قلندرؒ جیسے نابغہ روزگار اولیااللہ پیدا ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی شادی اٹھارہ برس کی عمر میں گوہر خاتون سے ہوئی گوہر خاتون سمرقند کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھیں۔ ان سے آپ کے دو بیٹے تولد ہوئے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی خدمت میں بیشمار علماء دین اور طلبا حاضر ہوتے اور آپؒ سے علمی مسائل دریافت فرماتے تھے۔ آپؒ نے قونیہ میں ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی آپؒ کو روحانی تعلق حضرت سید برہان الدینؒ سے حاصل تھا آپؒ جب تقریر شروع کرتے تھے تو ہزروں لوگوں کا مجمع جمع ہو جاتا تھا۔ لوگ آپؒ کی تقاریر کو تحریر کرتے اور اس کی کتابت کرواتے آپؒ کی مسجد کی ایک خاصیت اس مسجد سے ملحق مکتب تھا جہاں بیشمار علمی کتابیں موجود تھیں۔ آپؒ کے مکتب میں روزانہ بیشمار کتب آتیں اور بیشمار کتب علمائے کرام لیکر بھی جاتے تھے۔

مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا بڑا علمی کارنامہ مثنوی مولانا روم کی تالیف ہے۔ آپؒ نے اپنی مثنوی کے اشعار مختلف اوقات میں کہے جنہیں آپؒ کے شاگرد لکھتے رہتے تھے اور جنہیں بعد ازاں یکجا کرکے مثنوی مولانا روم کے نام سے ترتیب دیا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک روز حضرت شاہ تبریزؒ بعد نماز عشاء قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے سو گئے تو خواب میں آپؒ نے ایک بزرگ کو دیکھا جن کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ وہ بزرگ آپؒ کے سرہانے کھڑے تھے اور فرما رہے تھے کہ بیٹے! تم اب ظاہری وباطنی وعلوم سے سرفراز ہو چکے اللہ تعالی تم سے ایک بڑا کام لینا چاہتا ہے جس کے لئے تمہیں روم جانا ہو گا اور وہاں پر ایک نامور عالم دین مولانا محمد جلال الدین رومیؒ ہیں جن کو تمہاری راہنمائی کی ضرورت ہے وہ بڑے عالم دین ہیں تم ان کی راہنمائی فرماؤ۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ جب نیند سے بیدار ہوئے تو آپؒ نے اپنے مرشد پاک حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کی خدمت میں حاضر ہو

کر اپنا خواب ان کے گوش گذار کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے خواب سننے کے بعد فرمایا کہ تم ابھی کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ چنانچہ آپؒ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی رات آپؒ کو پھر انہی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے پھر آپؒ کو روم جانے کا حکم دیا۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے اگلے روز پھر حضرت بابا کمال الدین جندیؒ سے اس خواب کا ذکر کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے فرمایا کہ اگر تم دوبارہ خواب دیکھو تو مجھے بتانا۔ آپؒ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کے کہنے پر ایک مرتبہ پھر رک گئے۔ تیسری شب مسلسل آپؒ کو خواب میں انہی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے آپؒ کو روم جانے کا حکم دیا۔ آپؒ نے اگلے روز حضرت بابا کمال الدین جندیؒ سے اپنے اس خواب کا ایک مرتبہ پھر ذکر کیا۔ حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے آپؒ کو روم جانے کی اجازت دے دی۔

حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد آپؒ نے فوراً سفر کی تیاریاں شروع کر دیں اور عازم روم ہوئے۔

قونیہ پہنچنے کے بعد آپؒ نے مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کی تلاش شروع کر دی۔

آپؒ کو معلوم ہوا کہ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ قونیہ کی ایک بڑی مسجد کے امام اور عالم دین ہیں۔ ان سے ملنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے اس لیئے ان سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ آپؒ نے فی الحال ان سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے لئے کسی رہائش کی تلاش شروع کر دی اور پھر بالآخر آپؒ کو ایک سرائے میں رہائش مل گئی۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے جس سرائے میں رہائش اختیار کی وہ سرائے برنج فروش کی تھی۔ آپؒ کی ملاقات اس سرائے میں قیام پذیر مزدوروں سے اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھی۔ ان مزدوروں نے ہمیشہ آپؒ کے ہاتھ میں ہمہ وقت قلم اور کتاب کو ہی دیکھا جس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ آپؒ تعلیم یافتہ انسان ہیں اسی لئے غور و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔

ان مزدوروں میں سے اگر کوئی آپؒ سے گفتگو کر لیتا تو آپؒ کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان لوگوں میں دو شخص محمد عمر اور محمد زبیر بھی شامل تھے جن سے آپؒ کی اچھی علیک سلیک ہو گئی۔ ان دونوں نے مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کے بارے میں بیشمار معلومات آپؒ کو دیں۔

ایک روز یہ دونوں شخص آپؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپؒ ہمیشہ اپنے حجرہ میں ہی مقیم رہتے ہیں شہر میں ایک بلند چبوترہ موجود ہے جو دریچہ امراء کے نام سے مشہور ہیں جہاں شہر کے نامور علماء اور عمائیدین جمع ہوتے ہیں اگر آپؒ ان سے ملنے کی خواہاں ہیں تو ہم آپؒ کو وہاں لئے چلتے ہیں اور لوگوں سے آپؒ کا تعارف کرواتے ہیں۔ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ بھی اکثر و بیشتر اس چبوترہ پر تشریف لاتے ہیں ہو سکتا ہے وہیں ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ نے ان کی بات سننے کے بعد ان کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ آپؒ نے عمدہ لباس زیب تن کیا اور قلم کتاب تھامے ان دونوں کے ساتھ دریچہ امراء روانہ ہوگئے۔

ایک دن درویش شمس تبریزؒ، جلال الدینؒ کے حلقہ درس میں پہنچ گئے اور جلال الدین سے پوچھا کہ تم کیا پڑھا رہے ہو....؟

جلال الدینؒ کو اپنی علمی مجلس میں ایک عام فقیر کا اس طرح سوال کرنا بہت بُرا لگا۔ انہوں نے فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا کہ یہ وہ علم ہے جسے تم نہیں جانتے۔

شمس تبریز صحن میں تالاب کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے عالم جلال الدینؒ کی قلمی کتابیں اٹھا کر پانی سے بھرے ہوئے حوض میں ڈال دیں۔ یہ منظر دیکھ کر جلال الدینؒ نے غصہ میں کہا:

"اے درویش! یہ کتابیں برسوں کی علمی ریاضت سے لکھی گئی تھیں، تونے میری ساری محنت ایک لمحہ میں برباد کر دی۔"

شمس تبریزؒ نے یہ سنا تو کہا کہ "فکر کیوں کرتے ہو"... اپنا ہاتھ حوض میں ڈالا اور تمام کتابیں صحیح سالم باہر نکال کر رکھ دیں۔ کتابوں کے سوکھے اوراق دیکھ کر ظاہری علم کے ماہر جلال الدینؒ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے شمس تبریزؒ سے پوچھا

"یہ کیا علم ہے....؟"

اللہ کے دوست شمس تبریزؒ نے جواب دیا:

"یہ وہ علم ہے جو تم نہیں جانتے۔"

روایات کے مطابق یہ واقعہ 642 ہجری کا ہے، اب جلال الدین حضرت شمسؒ کے مرید ہوگئے۔ شمس تبریزیؒ کی تربیت نے رومیؒ کے خیالات وافکار پر گہرا اثر ڈالا۔ حضرت شمس تبریزؒ کی چند روزہ صحبتوں نے مولانا رومؒ کو نیم مجذوب درویش بنا ڈالا تھا۔

مولانا خود فرماتے ہیں:

ہیچ چیزے خود بخود نشد

ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

مولوی ہر گزنہ شد مولائے روم

تا غلامِ شمس تبریزے نشد

چیزیں خود بخود وجود میں نہیں آتی، لوہا خود سے تلوار نہیں بن سکتا اسی طرح مولوی مولائے روم ہر گز نہ بن پاتا اگر شمس تبریز کا غلام نہ بنتا۔

اس کے بعد مولانا جلال الدین رومیؒ کی دنیا ہی بدل گئی، نہ شان و شوکت، نہ وعظ گوئی، نہ علمی مجلسیں و کتابیں۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ کتابوں اور وعظ کے سوا رومی کو کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا یا اب یہ حال ہوا کہ انہوں نے خاموشی اختیار کرلی، زیادہ وقت عالمِ وجد میں رہتے اور اگر کسی وقت بولتے تو منہ سے خوبصورت اشعار نکلتے جو ان کے مریدِ خاص حسام الدین چلپیؒ لکھتے جاتے۔ یہی اشعار آج ہمارے سامنے ان کے کلام کی صورت میں موجود ہیں۔

رومی کا روشن کلام اسرار و رموز کا ایک خزینہ اور معرفت و عرفان کا ایک گنجینہ ہے۔ آپؒ کی شاعری میں اللہ اور نبی کریم ﷺ سے محبت کا اظہار ہے، پند و نصائح کے موضوعات ہیں، ان میں فلسفیانہ عقائد جھلکتے ہیں، حکمت کا رنگ نمایاں ہے، سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مولانا رومیؒ کا کلام ایک طرف تو حکمت اور اعلیٰ خیالات کا گنجینہ ہے دوسری طرف شاعری کے محاسن سے پُر ہے۔ اُن کے کلام میں سادگی بھی ہے، سوز و گداز بھی ہے، عشق کی وارفتگی بھی اور وحدت کا اظہار بھی ہے۔ عشقِ نبوی ﷺ کا اظہار بھی، حیات و کائنات کے مسائل کا بیان بھی ہے۔

واقعہ نگاری ہو یا قصہ گوئی، وعظ و نصیحت ہو یا درسِ اخوت و مساوات، ہر فن میں طاق ہیں۔ اُن کے اشعار معنویت کا گہرا دریا ہیں اور تصوف کی نئی جہتوں کے عکاس ہیں۔ رومی نے تصوف کی لگی بندھی راہوں پر چلنے کی بجائے نئے خیالات کو رواج دیا۔

انسان کا اصل باطن ہے

صوفیاء کی تعلیمات بتاتی ہیں کہ ظاہری و باطنی تمام علم انسان کے اپنے باطن میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء انسان کو اپنے باطن کے کھوجنے پر زور دیتے ہیں۔ مولانا رومیؒ کے اشعار انسان کو اپنی اصل، یعنی اپنے باطن کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

ای نسخہ ی نامہ ی الہی کہ توئی

وی آینہ ی جمال شاہی کہ توئی

بیرون ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست

در خود بہ طلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

کیا تم نہیں جانتے، خدا کے پیغام کا اصل نسخہ تم ہی ہو، تم ہی وہ آئینہ ہو جس میں شاہ کا جمال اور صفات نظر آتی ہیں، اِس کائنات میں جو کچھ ہے، تمہارے اندر بھی موجود ہے۔ خود اپنے اندر جھانکو، تم جس کے متلاشی ہو وہ تمہیں مل جائے گا۔

مثنوی کے موضوعات میں شرف انسان، تکریم آدم اور علم الاسماء کا ذکر بھی جابجا موجودہ ہے۔

وجہ آدم آئینہ اسماء کند

عکس خود در صورتش پیدا کند

نقش آدم را رقم نوعي زند

کہ دو عالم را دراو پنہان کند

آدمؑ کو اللہ نے اپنے اسماء کا آئینہ یعنی اپنی صفات کا مظہر اور صورت پر تخلیق کیا ہے، آدمؑ کے نقش میں دو عالم پنہاں ہیں۔

رومی انسان کے وجود اور زندگی کی سچائیوں کو سمجھاتے ہیں

اوّل ہر آدمی خود صورت است

بعد ازاں جاں کو جمال سیرت ست

اوّل ہر میوہ جز صورت کے ست

بعد ازاں لذّت کہ معنی و لیست

یعنی انسان کی ابتدا خود صورت ہے اور اس کے بعد یعنی باطن کا جمال ہے، ہر میوے کا جز صورت ہے اس کے بعد لذّت ہے جو اس کے معنی ہیں

علم الاسماء

قرآن کریم کہتا ہے کہ آدمؑ کو جو علم عطا ہوا ہے اس کی بدولت آفاق آدمؑ کے لئے مسخر ہو سکتے ہیں۔

آدم خاکی ز حق آموخت علم

تا بہ ہفتم آسمان، افروخت علم

آدمِ خاکی نے حق تعالیٰ سے جو علم سیکھا ہے، اس علم کی بدولت ساتوں آسمان اس کے سامنے روشن کر دیئے گئے ہیں۔

بو البشر کو علم الاسماء بگست

صدہزاران علمش اندر ہر رگست

اسم ہر چیزی چنان کان چیز ہست

تابہ پایان جان اورا داد دست

اسم ہر چیزی تو از دانا شنو

سر رمز علم الاسماء شنو

اسم ہر چیزی بر ما ظاہرش

اسم ہر چیزی بر خالق سرش

ابوالبشر آدمؑ کو علم اسماء جو علم کا سردار ہے عطا کیا، جس کی ہر رگ میں لاکھوں علم ہیں۔ جس چیز کا اسم جس طرح وہ ہے، آخر تک ان کی روح کو معلوم ہو گیا۔ تو ہر چیز کا نام اے عقلمند سُن، علم الاسماء کا راز سُن، ہمارے نزدیک ہر چیز کا نام اس کا ظاہر ہے، مگر رب کے نزدیک ہر چیز کا نام اس کے باطن پر ہے۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آدم (انسان) اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ وہ خود کو نہیں جانتا۔ اگر وہ خود کو جان لے، دیکھ لے تو اللہ تعالیٰ کی صفت ربانیت کو پہچاننا بالکل آسان ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق صفت ربانیت کا مظہر ہے۔

رومیؒ فرماتے ہیں:

جملہ عالم ہست حاجت مند تو

توگدایانہ چہ گردی کوبکو

تمام عالم کو انسان کی حاجتمندی کے لیے بنایا گیاہے. پس اے انسان! توخود کو یوں محتاج سمجھ کر بھٹکتانہ پھر

گر کفِ خاکے شود چالاک اُو

پیشِ خاکش سر نہد افلاکِ اُو

خاکِ آدم چونکہ شد چالاکِ حق

پیشِ خاکش سر نہد املاکِ حق

اگر ایک مٹھی مٹی (یعنی انسان) اپنی زیرکی دکھائے تواس کے سامنے آسمان جھک جائیں، خاکِ آدم کی مثال ایسی ہی ہے کہ اس کے آگے اللہ کی مملوک نے سر رکھ دیا

کاملے گر خاک گیرد زر شود

ناقص ار زَر بُرد خاکستر شود

کامل انسان خاک پکڑے تو سونا بن جائے۔ ناقص اگر سونا لے لے تو خاک ہو جائے۔

روح، قلب و نگاہ

تصوف اور روحانیت میں روح، قلب اور نگاہ کی بہت اہمیت ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

قالب بے جان کم از خاک استدوست

روح چوں مغزاست و قالب ہمچو پوست

قالب بے جان نمی آید بے کار

سعی کُن جانِ بدست آر اے غیار

قالبت پید او آں جان بس نہاں

راست شد زیں ہر دو اسباب جہاں

اے دوست! جسم بے روح، خاک سے بھی کمتر ہے، روح اگر مغز ہے تو جسم پوست، بے روح قالب کسی کام کا نہیں، تو کوشش کر اور اس روح کو بھی پالے۔ روح باطن ہے اور جسم ظاہر، دونوں کو پا کر دنیا کے سب کام درست ہو جائیں گے۔

جسم کی اندر خور پایۂ دل است

مرد خفتہ روح او چون آفتاب

در فلک تابان و تن در جامہ خواب

جان نہان اندر خلا ہم چون سجاف

تن تقلب می کند زیر لحاف

روح چون من امر ربی مختفی است

ہر مثالی کہ بگویم منتفی است

جسم تو قلب کا سایہ ہے، جسم قلب کے رتبہ کے کب لائق ہے، سوئے ہوئے انسان کی روح سورج کی طرح ہے، جو آسمان میں چمکتی ہے اور جسم بستر میں محو خواب ہے۔ روح خلا میں کشیدہ کاری کر رہی ہے اور جسم زیر لحاف کروٹیں لے رہا ہے، روح کی حقیقت تو امر ربی میں پوشیدہ ہے۔ میں جو کچھ مثال دوں وہ جداگانہ ہے۔

چہ تعلق آن معانی را بہ جسم

چہ تعلق فہم اشیاء را بہ اسم

لفظ چون وکرست و معنی طائر است

جسم جوئے و روح آب سائر است

صفات کا جسم سے کیا تعلق؟....، اشیاء کے فہم کا اسم سے کیا تعلق؟....، لفظ گھونسلے کی طرح ہے اور معنی پرندے کی طرح، جسم ٹھہرا پانی ہے اور روح بہتے پانی کی طرح ہے۔

مولانارومؒ نے قلب کو آئینے سے تشبیہ دی ہے اور فرمایاہے کہ انسان اپنے دل کے آئینے کو اتناصاف شفّاف بناسکتاہے کہ اس میں زندگی کی تمام سچائیاں، تمام اشیاءوعناصر اور تمام صورتیں نظر آسکتی ہیں:

آہن ارچہ تیرۂ وبے نور بود

صیقلی آں تیر گی ازوے زُدود

صیقلی دید آہن وخوش کر درُو

تاکہ صور تہاتواں دید اندرُو

گر تن خاکی غلیظ و تیرہ است

صیقلش کن زانک صیقل گیرہ است

تادرو اشکال غیبی رودہد

عکس حوری وملک دروی جہد

صیقل عقلت بدان دادست حق

کہ بدو روشن شود دل راورق

لوہااگرچہ کالااوربے نورہوتاہے، مگر صیقل ہوکراس کی کالک صاف ہوجاتی ہے، مزید صیقل ہوکرلوہاخوبصورت بن جاتاہے کہ اس میں آئینے کی طرح صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں، اگر تیراخاکی جسم بھی آلودہ ہوچکاہے تواسے صیقل کر، وہ صیقل قبول کرنے والاہے،

تا کہ اس میں غیبی صورتیں نظر آئیں، حور و ملائک کا عکس جھلکے، تجھے اللہ نے عقل کا صیقل اسی لیے دیا ہے کہ تو اس کے ذریعے دل کا ورق روشن کرے

نورِ نورِ چشم خود نورِ دلست

نورِ چشم از نورِ دلہا حاصلست

باز نورِ نورِ دل نورِ خدا است

کوز نورِ عقل و حس پاک و جدا است

نگاہ کا نور، دل کا نور ہے۔ دل کے نور سے نگاہ کا نور حاصل ہوتا ہے، پھر دل کی بصیرت کا نور خدا کا نور ہے، جو عقل و حواس کے نور سے پاک اور جُدا ہے۔

تو نہ ای ایں جسم تو آں دیدہ ای

وارہی از جسم گر جاں دیدہ ای

آدمی دیدہ ست باقی گوشت و پوست

ہر چہ چشمش دیدہ است آں چیز اوست

تو یہ جسم نہیں بلکہ آنکھ ہے، اگر تو جان یعنی اپنے اصل باطن کو دیکھ لے تو جسم سے نجات پاجائے، آدمی کی نگاہ اصل چیز ہے اسکے علاوہ گوشت پوست ہے ۔ جو نگاہ نے دیکھا اصل چیز وہی ہے۔

آدمی دید است باقی پوست است

دید آں است آنکہ دید دوست است

آدمی کی اصل نگاہ ہے، باقی تو کھال ہے اور نگاہ بھی وہ ہے جو دوست کو پہچان سکے

شیخ سعدی نے اسی طرح بھی کہا ہے کہ

آدمی را عقل باید در بدن

ورنہ جان در کالبد دارد حمار

آدمی کی اصل ماہیت عقل و شعور و ادراک ہے ورنہ رہا جسم تو وہ گدھے کے پاس بھی ہے۔

ہین بہ بین کز تو نظر آید بہ کار

باقیت شحمی و لحمی پُود و تار

شحم تو در شمع ہا نفزود تاب

لحم تو مخمور را نامد کباب

در گداز این جملہ تن را در بصر

در نظر رو در نظر رو در نظر

یک نظر دو گز ہمی بیند ز راہ

یک نظر دو کون دید وروی شاہ

در میان این دو فرقی بی شمار

سرمہ جو واللہ اعلم بالسرار

خبردار نگاہ پر توجہ دے، تری نظر کام آئے گی، باقی تو چربی و تانا بانا ہے، تری چربی سے شمع کی روشنی بڑھائی نہیں جاسکتی، تیرا گوشت کباب بنانے کے کام نہیں آتا، تیری نظر ہی ہے اس نظر سے جسم کو پگھلادے، نظر میں جا، نظر میں جا، نظر میں جا، ایک نگاہ تو وہ ہے جو دو گز راستہ ہی دیکھ پاتی ہے، اور ایک نگاہ وہ ہے جو دونوں جہاں اور شاہ کو دیکھ لیتی ہے۔ ان دونوں نگاہ میں بڑا فرق ہے۔ اس سرمہ کو تلاش کر، اور اللہ ہی اسرار کا جاننے والا ہے۔

آنکہ یک دیدن کند ادراک آں

سالہا نتواں نمودن از زباں

آنکہ یک دم بیندش ادراک ہوش

سالہا نتواں شنودن آں بگوش

لمحہ بھر میں نگاہ جو ادراک کر لیتی ہے، زبان سے اسے سالوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، جس کو علم و ہوش یکدم دیکھ لیتا ہے، اس کو کانوں کے ذریعے سالوں سنایا نہیں جاسکتا ہے۔

عشق و عرفان

رومی اور صوفیاء کرام کے نزدیک عشق اللہ تعالیٰ کا قرب بخشنے والا جوہر ہے۔ عشق ہی عرفان و تصوف کا حقیقی سرمایہ ہے اور عشق ہی کی بدولت حضرت آدمؑ نے شرف اور بزرگی کا غیر معمولی درجہ پایا ہے۔

وجودِ آدمی از عشق می رَسَد بہ کمال

گر ایں کمال نَداری، کمال نقصان است

آدمی کا وجود عشق سے ہی کمال تک پہنچتا ہے، اور اگر تو یہ کمال نہیں رکھتا تو پھر کمال نقصان ہے۔

عشق جوشد بحر را مانند دیگ

عشق ساید کوہ را مانند ریگ

عشق بشکافد فلک را صد شکاف

عشق لرزاند زمین را از گزاف

عشق سمندر کو دیگ جیسا کھولا دیتا ہے، پہاڑ کو ریت جیسا پیس دیتا ہے، عشق آسمان میں سو شگاف ڈال دیتا ہے اور زمین کو بآسانی لرزا دیتا ہے۔

مردہ بُدم زندہ شُدم، گریہ بدم خندہ شدم

دولتِ عشق آمد و من دولتِ پایندہ شدم

میں مُردہ تھا زندہ ہو گیا، گریہ کناں تھا مسکرا اٹھا.... دولتِ عشق کیا ملی کہ میں خود ایک لازوال دولت ہو گیا۔

عشق بر د بحث را ای جان وبس

کوز گفت و گو شود فریاد رس

اے جان! عشق بحث کو کاٹ دیتا ہے اور بس، کیونکہ وہ گفتگو کے معاملے میں فریاد رس بن جاتا ہے، یعنی جب روح میں عشق بس جائے تو بحث و مناظرہ ختم ہو جاتا ہے ور نطق اس کے بیان میں عاجز ہو جاتا ہے۔

عاشقی کز عشق یزدان خورد قوت

صد بدن پیشش نیر زد ترہ توت

وہ عاشق جس نے خدا کے عشق کی روزی کھالی، اس کے آگے سینکڑوں بدن بھی شہتوت کے پتے، گھاس پھوس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

ہر چہ جز عشقست شد ماکول عشق

دو جہان یک دانہ پیش نول عشق

جو عشق کے سوا ہے وہ عشق کی غذا ہے، عشق کے لیے تو دو جہاں ایک دانہ کے برابر ہیں۔

عقل در شرحش چو خر در گِل بخُفت

شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

عشق کی تشریح میں عقل ناکام رہتی ہے اور عشق و عاشقی کی شرح بھی خود عشق کرتا ہے۔

من کی آواز

رومی نے انسان کے باطن یعنی من سے آنے والی آواز پر متوجہ کیا ہے، اور اس کو ستار کی تمثیل میں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

خشک سیمی، خشک چوبی، خشک پوست

از کجامی آید ایں آوازِ دوست

یعنی ستار میں دیکھو تار بھی خشک ہے، لکڑی بھی خشک ہے اور کھال بھی خشک ہے پھر یہ محبوب کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔

جان چہ باشد باخبر از خیر و شر

شاد بااحسان و گریان از ضرر

چون سر و ماہیت جان مخبر ست

ہر کہ او آگاہ تر باجان ترست

روح راتاثیر آگاہی بود

ہر کہ رااین بیش اللہی بود

انسانی جان کی تعریف یہ ہے کہ وہ خیر و شر سے باخبر ہو اور نیکی سے خوش ہو اور برائی سے غمگین ہو۔ جان کا راز و ماہیت اس کا باخبر ہونا ہے، جو زیادہ آگاہ ہے وہ اتنا محتاط ہے۔ روح کی تاثیر باخبری ہے، یہ تاثر جس کو زیادہ حاصل ہے وہ اللہ والا ہے۔

لمحہ موجود اور مائنڈ فلنیس

رومی نے اپنی ایک نظم میں انسان کو لمحہ بہ لمحہ آنے والے خوشی و غم کے خیالات اور اندیشوں کی ایک تمثیل کچھ اس طرح پیش کی ہے۔

ہست مہمان خانہ این تن ای جواں

ہر صباحی ضیف نو آید دواں

نے غلط گفتم کہ آید دم بدم

ضیف تازہ فکرتِ شادی و غم

میز بانِ تازہ روشواے خلیل

در مبند و منتظر شو در سبیل

ہر چہ آید از جہان غیب وش

در دلت ضیفست اورا دار خوش

ہیں مگو کیں مانند اندر گردنم

کہ ہم اکنون باز پرّد در عدم

اے جوان! یہ جسم ایک مہمان خانہ ہے، ہر صبح ایک نیا مہمان دوڑا آتا ہے، بلکہ غلط کہا کیوں کہ لمحہ بہ لمحہ آتا ہے، خوشی ورنج وفکر کا نیا مہمان، اے دوست خندہ پیشانی والا میزبان بن، دروازہ بند نہ کر اور راہ میں منتظر رہ، غیب جیسے جہاں سے جو آئے وہی تیرے دل کا مہمان ہے، اسے بخوشی رکھ، خبر دار یہ نہ کہو کہ وہ گلے کا ہار بن گیا، بلکہ ابھی وہ عدم کی جانب پرواز کر جائے گا۔

مولانا رومیؒ کی یہ نظم آج کل مغرب میں مراقبہ اور مائنڈ فلنیس کے ماہرین میں بہت مقبول ہو رہی ہے، "Guest House" کے عنوان اس کا انگریزی ترجمہ مائنڈ فلنیس کے ماہر جان کباٹ زن، ایلیشا گولڈ اسٹین، مارک ولیم اور ڈینی پینن مائنڈ فلنیس ٹریننگ پروگرام میں بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔

اس نظم میں مائنڈ فلنیس کا بنیادی اصول پیش کیا گیا ہے، مائنڈ فلنیس میں لمحہ موجود کی بہت اہمیت ہے، مائنڈ فلنیس کے مطابق انسان کو ہر لمحہ ہر دم آنے والے مہمان یعنی خیالات اور حالات کا خوش دلی سے سامنا کرنا چاہیے۔

انسانی نگاہ کے سامنے جتنے مناظر ہیں وہ شعور کی بنائی ہوئی مختلف تصویریں ہیں۔ دیکھنے کی یہ طرز مفروضہ ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کے لئے خوشی اور دوسرے کے لئے غم کا باعث ہوتی ہے۔ ایک چیز کے بارے میں مختلف لوگوں کی سینکڑوں مختلف آرا ہوتی ہیں حالانکہ حقیقت ایک اور صرف ایک ہو سکتی ہے۔

عبادت

آدمی راہست در ہر کار دست

لیک ازو مقصود این خدمت بدست

ماخلقت الجن والانس این بخوان

جز عبادت نیست مقصود از جہان

انسان ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے، لیکن اس کا اصل مقصود خدمت خلق ہے۔اور یہ آیت پڑھ لے ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ط کہ انسان وجنات کو اس جہاں میں صرف عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

نوم عالم از عبادت بہ بود

آنچنان علمی کہ مستنبہ بود

آن سکون سابح اندر آشنا

بہ زجہد اعجمی بادست وپا

اعجمی زد دست وپاو غرق شد

می رود سباح ساکن چون عمد

عالم کی خاموشی بھی ظاہری عبادت سے بہتر اور علم بھی وہ جو آگاہی دینے والا ہو، بالکل جیسے تیراکی میں تیراک کا سکون اناڑی کے ہاتھ پاؤں مارنے سے بہتر ہے، اناڑی نے ہاتھ پاؤں مارے اور ڈوب گیا، اور تیراک شہتیر کی طرح ساکن محو سفر رہا۔

فکر آن باشد کہ بکشاید راہے

راہ آن باشد کہ پیش آید شاہے

فکر وہ بہتر ہے جو راستہ دکھائے اور راستہ وہ مفید ہے جو شاہِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ تک پہنچا دے.

صحبتِ اولیاء

رومی نے صالح لوگوں ،بزرگ و اولیاء کی صحبت پر بھی کافی اشعار کہے ہیں۔

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالح ترا طالح کند

نیک لوگوں کی صحبت نیک بنا دیتی ہے اور بُرے لوگوں کی صحبت بُرا بنا دیتی ہے

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اللہ کے ولی کی صحبت کے چند لمحے سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہیں

همنشینی مُقبلاں چوں کمیاست

چوں نظر شاں کیمائے خود کجاست

بارگاہ حق کے مقبول بندوں کی ہم نشینی تو سونا ہے، بلکہ ان لوگوں کے نظر کے مقابلے میں سونا خود کچھ نہیں۔

اولیاء راہست قدرت اَز اِلٰہ

تیر جستہ باز آرندش راہ

اللہ کے ولیوں کو رب کی طرف سے طاقت ملتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس کر دیتے ہیں یعنی ان کی نظر تقدیر بدل دیتی ہے

مولانا رومیؒ اخلاقیات پر بہت زور دیتے ہیں

خُلق نیکو وصف انسانی بُود

آدمی با خُلق بد حیوان شُود

اچھے اخلاق انسانیت کے اوصاف ہے اور بد اخلاق آدمی جانور جیسا ہوتا ہے۔

ہر کہ دراو در جہاں خلق نکو

مخزنِ اسرارِ حق شد جان او

جس شخص کے اندر اخلاق حسنہ دیکھو تو سمجھ جاؤ کہ اس کی روح اسرارِ الٰہیہ کی حامل ہے۔

خیر کن با خَلق بہرِ ایزدت

یا برائے راحت جاں خودت

خدا کی رضا کے لیے مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کر کے دیکھ، تو اپنی روح میں راحت محسوس کرے گا۔

رحمتِ مادر اگرچہ از خدا است

خدمتِ او ہم فریضہ است و سزا است

ترک شکرش ترک شکرِ حق بود

حق اُو لاشک بحق ملحق بود

ماں کی رحمت اللہ کی عطا کردہ ہے۔ ماں کی خدمت کرنا بھی فرض ہے۔ماں کا شکر ادا نہ کرنا حق کا ناشکرا ہونے کے مترادف ہے، کیونکہ ماں کا حق، اللہ نے اپنے حق کے ساتھ ملحق کیا ہے۔

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو

از توکل در سبب کاہل مشو

اشارہ سمجھو کہ حلال روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے، توکل کے نام پر کاہل نہ بن جانا۔

گفت پیغمبرؐ با آواز بلند

بر توکل زانوئے اُشتر بہ بند

نبی پاک ﷺ نے واضح انداز میں بتادیا کہ اللہ پر توکل رکھو ساتھ ہی اُونٹ کے گھٹنے بھی باندھو۔

جلال الدین رومیؒ کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے۔ جن کا کلام سالوں کی گرد اُڑنے کے بعد بھی دھندلا نہیں ہوا بلکہ اُن کے اشعار کو پڑھ کے دلوں کے آئینے شفاف تر ہو جاتے ہیں اور روحوں کی کثافتیں دور ہو جاتی ہیں۔ آپ کا ہر شعر سوز و گداز میں گندھا ہوا اور پڑھنے والے کے دل میں اترتا جاتا ہے۔ سات سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ کلام، عالمی ادب میں بے نظیر ہے۔ آپ کو یہ جان کر بھی شاید حیرت ہو گی کہ رومی کی شاعری امریکہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والے کلام میں سے ہے۔ آج بھی انٹرنیٹ پر مولانا رومی کے اشعار جابجا شئیر کیے جاتے ہیں۔

سالہا سال تک بنجر دِلوں کو آباد کرنے والا یہ عظیم انسان 5 جمادی الثانی 672ھ بمطابق 17 دسمبر 1273ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ قونیہ میں ان کا مزار آج بھی اہلِ دل کے لیے حرم ہے۔ مولانا رومؒ کے مزار کے داخلی درازے کے اوپر لکھا گیا ہے کہ

کعبۃُ العُشّاق باشد ایں مقام

ہر کہ ناقص آید ایں جا شد تمام

یہ مقام عاشقوں کا کعبہ ہے جو بھی ناقص یہاں آتا ہے وہ مکمل ہو جاتا ہے ۔

مثنوی مولانا رومؒ کی اہمیت و ضرورت

مثنوی شریف کا آغاز کرنے سے پہلے کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں

جمالیاتی ذوق ایک شرف ہے جو کسی انسان کو دیگر انسانوں سے ممتاز کرتا ہے، فطرت کے حسن سے عشق کرنے والا انسان، انسان دوست اور جہاں دوست ہوتا ہے، ایسا بندہ انسانیت کا حقیقی ترجمان بھی ہوتا ہے۔

رات کے کسی پہر رواں پانی میں اترتا ہوا چاند کا عکس، پھول کی پتیوں پر بارش کے قطرے، قوس قزح کا منظر، گھاس پر شبنم کی تہہ، صبح کاذب کا سَحر، انگڑائی لیکر بیدار ہوتی زندگی، پرندوں کی چہک میں گم جنگل، حسرت، آسودگی، درد والم کے درمیان جیتی بستیاں اور شام کا غروب ہوتا سورج ایک جمالیاتی ذوق کا مشتاق رہتا ہے جو ان چیزوں کو پہچانے، محسوس کرے اور بیان کرے

کائنات میں پھیلی قدرت کی فیاضیوں پر دادِ نظارہ دینا انسان پر عین فرض ہے، مگر کم لوگ ہیں جو غور کرتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں، ان گنے چنے لوگوں میں بھی جان کیٹس، شیلے اور موزارٹ کی طرح زیادہ تر قدرت کے حسن کو مرکز نگاہ رکھتے ہیں اور بہت تھوڑے ایسے ہیں جو حافظ، سعدی، اور جامی کی طرح صاحب قدرت کو مرکز نگاہ رکھتے ہیں ایسے لوگ بلاشبہ صاحبِ نظر اور صاحبِ دل کہلانے کے حقدار ہیں

ہست قرآن در زبان پہلوی

صاحبِ قدرت کو مرکزِ نگاہ رکھنے والا رومی جیسا صاحب قلب و نظر جب دین کی طرف دیکھتا ہے تو اسے کائنات کا حسن بھی کلامِ دین کے آگے ہیچ نظر آنے لگتا ہے، کلام الہی کی رعنائی اور چاشنی کو جب صاحبِ دل بیان کرتا ہے تو معنویت کے عجب چشمے رواں ہونے لگتے ہیں۔

مثنوی شریف ایک ایسا ہی وجد آفرین کلام ہے، یہ علم و حکمت کا ایک منفرد سمندر ہے، ندرتِ خیال کی ایک سحر خیز وادی ہے، تخلیقی ادب کا کوہ گراں ہے، اشارات، تشبیہات اور استعاروں کا وسیع و عریض جہاں ہے، آفاقی حقائق کا موجزن چشمہ، باطنی علوم کی آبشار اور لطافت کی سلسبیل ہے۔

مثنوی شریف دین نہیں بلکہ دین کی ایسی تشریح ہے جو ایک صاحبِ قلب و نظر نے کی ہے، یہ فارسی زبان میں دینی عشق و معرفت کی سحر انگیز تشریح ہے اسی لئے اس کلام کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہا جاتا ہے، جو قبل کی ندرتِ عارفانہ کا کمل ہے۔ کیونکہ مثنوی کے بارے یہ انہی کا بیان ہے۔ یہ تشریح ایک ایسی شمع فروزاں ہے جس کی لَو پر اہل دل پتنگوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، بیش بہا لوگوں نے اپنے گریباں چاک کئے، قیمتی اور منقش قبائیں اتار کے پھینک دیں، سونے کے نوالے اپنے اوپر حرام کر دیئے اور مولانا روم کے گرد رقص کناں ہو رہے، ایک زندہ اور آفاقی کلام کی یہی خاصیت ہے کہ وہ ہر دور میں زندہ رہتا ہے، وجد کا یہ سلسلہ آج بھی رکا نہیں، مثنوی کا وجد آج بھی ویسا ہی طاری ہوتا ہے جیسا ان کے سامنے ہوتا تھا۔

وجد اور تواجد

وجد ایک ایسی قبا ہے جو انسان کو اپنے اوپر سے اپنا اختیار چھین لیتی ہے، یہ قبا لاکھ کوشش کے باوجود انسان خود نہیں اوڑھ سکتا، یہ بیٹھے بٹھائے انسان کو ایک اڑتی ہوئی چادر کی طرح آکے نہیں ڈھانپتا بلکہ یہ من کے چشمے میں کوئی کنکر گرنے سے وِرل۔ پول (بھنور)(whirlpool) کی طرح اندر سے اٹھتا ہے، اس کی مقدار متوازن ہو تو بندہ جھوم کے رہ جاتا ہے اور اگر یہ من کے اوپر حاوی ہو جائے تو بندہ محو رقص ہو جاتا ہے۔

جیسے صحرا میں خراماں خراماں چلتی ہوا پہلے سرسرانے لگتی ہے پھر اس میں ایک ادائے بے نیازی داخل ہوتی ہے پھر اس کا وجود خود اس کے اپنے بس سے نکل کر ایک مرغولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ سیدھی سادھی سرسراتی ہوا دیکھتے ہی دیکھتے ایک بگولے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دھول مٹی اڑاتی ہوئی ہر خس و خاشاک کو اپنے ہونے کا ثبوت دیتی چلی جاتی ہے۔

ایسا دریا میں بھی ہوتا ہے، خراماں خراماں چلتا ہوا پانی کسی سحر انگیز منظر کے زیر اثر تو کبھی سمندر سے ملاپ کی خوشی میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے، لیکن اپنے آپ کو کناروں کے وجود میں محصور دیکھ کر گرداب بننے لگتا ہے اور پھر وارفتگی میں گھومتا گھومتا بلاآخر جوار بھاٹے میں ڈھل جاتا ہے۔

ایسا انسان کے اندر بھی ہوتا ہے، آپ کسی بچے کو مسلسل بلا کے نام سے ڈراتے رہیں، اس کے ذہن میں بلا کی ایک شکل اور اس کا خوف تشکیل کرتے چلے جائیں حتٰی کہ ڈر اور خوف اس کی فطرت میں رچ بس جائے تو پھر اسے تنہا بیٹھا دیکھ کر کسی ڈراؤنی شکل کا ماسک لگا کے اسے ڈرائیں تو وہ اس کا ایسا بھیانک اثر لے گا کہ اٹھ کر بھاگ کھڑا ہو گا۔

اگر اسی واردات کو آپ اچھے پیرائے میں انجام دے لیں تو یہی صورتحال انسان میں وجد پیدا کر دیتی ہے، کسی چیز کا خوشنما حلیہ انسان کے سامنے بیان کریں، پھر اس حلیئے سے اسے مانوس کرتے چلے جائیں، جب وہ ہم آہنگ ہو جائے تو اس کے حصول کو ممکن بتاتے چلے جائیں، اس کا شوق بڑھاتے چلے جائیں اور جب وہ اس چیز کے شوق میں وارفتگی کے عالم تک پہنچ جائے تو اس کے مقصود کی اس کے سامنے تجسیم کر دیں، اپنے مقصود کو اچانک اپنے قریب پا کر انسان کا مَن جھومنے لگتا ہے۔ ہوائے دہر کی طرح کوئی مرغولہ یا دریا کی طرح کوئی گرداب اس کے من سے اٹھتا ہے اور حصول قرب کے ان لحات میں اسے جھومنے پر مجبور کر دیتا ہے، جب یہ کیفیت انسان کے اندر سما نہ سکے تو وجد بن کر اس کے وجود پر چھا جاتی ہے۔

مثنوی شریف انسان کے ساتھ مؤخر الذکر صورت پیدا کرتی ہے، اسے شریعت کی طرف راغب کرتی ہے اور خدا سے مانوس کرتی چلی جاتی ہے، بندے کے مزاج کو شریعت سے ہم آہنگ کرتی چلی جاتی ہے، عمل کی طرف مائل کرتی ہے، انسان کے من سے مٹی جھاڑ جھاڑ کر وہ حصہ دریافت کر لیتی ہے جہاں کنکر پھینکنے سے گرداب بنتا ہے، پھر کسی نہ کسی موقع پہ بندہ آہستہ آہستہ جھومنا شروع کرتا ہے، ہوائے دہر کی طرح کوئی مرغولہ یا آبِ جو کی طرح کوئی گرداب اس کے من سے اٹھتا ہے اور وجد بن کر بندے کے وجود پر چھا جاتا ہے۔ سبحان اللہ!!

دنیا میں ہر چیز کی ایک نقل بھی ہوتی ہے، وجد کی نقل "تواجد" ہے، صاحب وجد "واجد" کہلاتا ہے تو صاحب تواجد "متواجد" کہلاتا ہے۔

واجد کسی من پسند حقیقت کے آشکار ہونے پر بلا اختیار روح کی سر شاری کا مظہر بن کر محورقص ہوتا ہے، لیکن متواجد محض ذاتی نمود کے لئے پکھنڈ کرتا ہے، اپنے مفادات کی غرض سے وجد کی طرز کا ڈھونگ رچا کر بیٹھتا ہے، بظاہر دونوں کے فعل میں مماثلت ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ان کے درمیان "کہاں رام رام اور کہاں ٹیں ٹیں" کے مصداق زمین و آسمان جیسا بُعد پایا جاتا ہے۔

دین و دنیا کے معاملے میں واجد اور متواجد ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں، لیکن کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور، واجد حضرات مظاہرِ قدرت سے متاثر ہو کر صاحبِ قدرت کے شیدائی ہوتے ہیں اور متواجد حضرات مظاہرِ قدرت کو لے کر صرف اپنے مفادات کے گرد گھومتے ہیں، وجد جتنا اچھا فعل ہے تواجد اتنا ہی از کارِ رفتہ (بے کار) فعل ہے۔

مثنوی شریف کا اعجاز

مولانا رومیؒ نے پچیس سال کے عرصے میں 70،000 اشعار کہے ہیں جن میں سے 26،666 اشعار مثنوی شریف میں ہیں اور باقی سب دیوان شمس تبریز میں ہیں، مثنوی میں چھ دفاتر ہیں جو تین جلدوں میں تقریباً ساڑھے تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

رومیؒ اس کلام میں مختلف اسباق کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ جن میں فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ میں محبت کو ایسی روحانی تازگی اور دِلی تڑپ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ منافقت، کھوکھلے پن اور بناوٹ کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

انہوں نے مذہب سے خوف کے رنگ کو، نہ صرف اڑا کے رکھ دیا ہے بلکہ خوف کے ہاتھوں لگے زخموں کو محبت کے تریاق سے مندمل بھی کیا ہے، انسان کی دینی، دنیاوی اور اخروی الجھنوں کو دور کر کے انسانی ذہن کی نشوونما کو بڑے احسن اور ٹیکٹ فل انداز سے ہینڈل کیا ہے، رومیؒ انسان کو گردن سے نہیں بلکہ دل سے پکڑتے ہیں اور یہ کام صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی بلکہ یہ لطف و کرم وہ ہر انسان کے ساتھ کرتے ہیں۔

رومیؒ کو بلا تخصیص رنگ و نسل اور مذہب ہر کوئی اپنی سوچوں کا ترجمان، دور رس مفکر اور اپنا شاعر سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ رومیؒ صرف تصوف کے آستانوں پر ہی نہیں بلکہ یورپ کے چرچوں، صنم خانوں اور ادبی حلقوں میں بھی برابر سنے جاتے ہیں، پچھلے پندرہ

سالوں میں مولانا رومؒ امریکہ کے موسٹ فیورٹ شاعر کے طور پر جانے گئے ہیں، مولانا کے کلام کو ترجمہ کر کے نہ صرف گایا گیا ہے بلکہ اس کلام کے عکس میں پینٹنگز، شاعری، ادب حتیٰ کہ رقص کو بھی ری شیپ کیا گیا ہے۔

شاہ رام شیوا کے مطابق رومیؒ میں بارہ خوبیاں ہیں، عام آدمی سے ہمکلام ہوتے ہیں، ملٹی لیول یعنی تہہ دار گفتگو کرتے ہیں، سب کے لئے یگانگت کی بات کرتے ہیں، دوستانہ گفتگو کرتے ہیں، شخصیت بلڈنگ یا پرسنل پروسس کو مہمیز دیتے ہیں، ان کے کلام کا ہر بار ایک نیا معنی کھلتا ہے، محبت کا عنصر بہت نمایاں ہے، ایک محبوب شخصیت کے طور پر ملتے ہیں، تہذیبوں کے درمیاں پل کا کام کرتے ہیں، شاعری کو ناپسند کرنے والے لوگ بھی رومی کو نظر انداز نہیں کر پاتے، انسان اپنی کایا پلٹتی ہوئی محسوس کرتا ہے، رومیؒ بہت اعلیٰ روحانی رہنما ہیں۔

درس مثنوی کے اغراض و مقاصد

مسلم دنیا میں ماضی کی بہت اعلیٰ ہستیوں نے مثنوی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جن میں مولانا نذیر عرشی صاحب اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قابل ذکر ہیں جنہوں نے مفتاح العلوم 17 جلدوں میں اور 24 جلدوں پر کلید مثنوی کے نام سے مثنوی کی نہایت ضخیم شرحیں لکھی ہیں، ان تشریحات میں فارسی کے الفاظ، تراکیب، معانی اور دیگر عوامل کو نہایت جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان کے بعد کئی اور لوگوں نے بھی چیدہ چیدہ کام کیا لیکن ان دو کے بعد کوئی قابل ذکر نام ہے تو وہ مولانا قاضی سجاد صاحب کا ہے جنہوں نے مثنوی کا منظوم ترجمہ کیا۔

متذکرہ بالا تینوں کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں لیکن ان سے اکتساب فیض جرعہ جرعہ کشید کرنا پڑتا ہے کیونکہ فارسی کلام کا لفظی ترجمہ پھر مشکل ترکیبوں، استعاروں، تشبیہات اور اشارات کی تشریح پڑھنے سے کہانی کے مرکزی خیال تک پہنچنے میں وہ تسلسل قائم نہیں رہتا جو ایک نثری مضمون میں قائم رہتا ہے، وقت کی کمی اور فارسی سے دوری کی بنا پر آج کے دور میں اتنی باریک بینی سے مطالعہ کرنے والے لوگ نظر نہیں آتے اور فی زمانہ ایسی کوئی منفرد نثری تحریر بھی موجود نہیں جو پڑھنے والوں کو ایک تسلسل کے ساتھ مطالعہ کرنے کی سہولت دے۔

یہ درس مثنوی دین نہیں اور دین اسلام پر اسے کوئی فوقیت بھی حاصل نہیں البتہ یہ کتاب بندے کو خدائے تعالٰی اور شریعت مطہرہ کی طرف بلانے والی بہترین آواز ہے اسی لئے اس کتاب کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہا جاتا ہے یعنی "فارسی زبان میں دعوت دین کا خلاصہ"، جس کا مقصد بُھولے بھٹکے لوگوں کو ربِ کریم سے جوڑنا ہے، دینی معاملات کی جو تشریحات و تعبیرات مولانا رومی علیہ رحمۃ نے فقیرانہ حکمت سے پیش کی ہیں انہیں عوام میں افادہءعام کے لئے پیش کرنا اور دعوت عمل دینا میرا اولین مقصد ہے۔

مثنوی شریف کو پیش کرنے کا دوسرا مقصد ادبی ہے جو علمی و ادبی رجحانات رکھنے والوں کے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہو گا، اب تک مولانا رومؒ کے حوالے سے لوگ اکا دکا شعر یا منتخب اقوال کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، حالانکہ علمی دنیا کے اندر مستعمل اشارات، تشبیحات، استعارات، فلسفہ، حکایات اور کہانیوں کا ایک بہت بڑا حصہ مثنوی سے ماخوذ و مشتق ہے، جن لوگوں کو نہیں پتا کہ اس مثنوی میں کیا ہے ان کے لئے یہ مرحلہ ایک سربستہ راز کھولنے کے مترادف ہو گا۔

مثنوی شریف کو پیش کرنے کا تیسرا مقصد اس کلام کی نثر نگاری کرنا مقصود ہے تاکہ اسے ایک نثری کتاب کی طرح کوئی تسلسل کے ساتھ پڑھنا چاہے تو الفاظ و معانی اور تشریحات کے جھنجھٹ میں الجھے بغیر باآسانی پڑھ سکے۔

مندرجہ بالا تین مقاصد کے علاوہ اس پیشکش کا اور کوئی مطمع نظر نہیں، یہ پروجیکٹ تصوف سمیت کسی بھی نظریئے یا طبقے کی پروجیکشن کے لئے نہیں ہے نہ اس پر کسی کی انویسٹمنٹ ہے، یہ میرا ذاتی شوق ہے اور اپنی مدد آپ کے تحت متذکرہ بالا تین مقاصد کے پیش نظر اختیار کیا گیا ہے۔

درس مثنوی شریف کے اس نثری بیان میں ہر مضمون کے اندر موجود تعلیمات و خیالات، حقائق، فلسفہ، تطبیق، اشارات، تشبیحات، استعارے، محاورات، مقالات، اقوال اور ارشادات سب مولانا رومی علیہ رحمۃ کے سمجھے جائیں، میں نے اپنی طرف سے اس میں نہ کچھ ڈالا ہے اور نہ کچھ نکالا ہے بلکہ مثنوی شریف کے مضامین کو اپنے انداز بیاں اور نثر میں ڈھالتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ نثری مفہوم اصل مضمون کے بالکل قریب رہے اور میرے خیالات اس میں شامل نہ ہوں تاہم جہاں کہیں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں اپنے خیالات کو میں نے بریکٹس، حاشیے یا فٹ نوٹ میں پیش کیا ہے۔

مثنوی شریف کے اشکالات

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے حوالے سے قاضی سجاد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ مثنوی میں بعض جگہ پر ایسی احادیث بیان ہوئی ہیں جو احادیث کی کتب میں موجود نہیں اور صحابہ اکرام علیہم الرضوان کے متعلق بعض ایسے واقعات بھی ہیں جو سیرت صحابہؓ میں کہیں نہیں ملتے، ایسی باتیں صوفیا کے خواب یا الہام کی بنا پر ہوتی ہیں اور وہ انہیں سچ سمجھتے ہیں تاہم عوام الناس کو ان پر عمل کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ وہ عام آدمی کے لئے شرعی حجت کی حیثیت نہیں رکھتے۔

آج کے معاشرے میں مذہبی تعصبات اور شدت پسندی کی وجہ سے لوگ دین سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں اور الحاد بڑھتا جارہا ہے، ان حالات میں اگر کوئی راہ الی اللہ میں وعظ و تلقین پیش کرتا ہے تو اسے حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے تاکہ نیکی کی آوز بلند رہے۔

لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ متعصب رویوں کے باعث موجودہ دور میں نیکی کا کام کرنے والوں کو بعض اوقات ایسی مشکلات پیش آتی ہیں کہ وہ بیچارے نیکی برباد اور گناہ لازم کی کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں، انسان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے، الفاظ کی کم و بیش ادائیگی یا تعبیر کی غلطی سے نادانستہ کسی جگہ کوئی بات خلاف ادب یا خلاف دین بھی نظر آسکتی ہے جو قابل اصلاح تو ہونی چاہیئے قابل مواخذہ نہیں، ایسے سہو پر کفر کے فتوے کی بجائے اصلاحی توجہ ہونی چاہیئے۔

ان حالات کے پیش نظر میں واضح طور پر بیان کرتا ہوں کہ میں غیر متعصب مسلمان ہوں، اپنے دین کے ساتھ ساتھ اصحاب و رفقاء رسول ﷺ، اہلبیت اطہار، معتبر اسلامی شخصیات، مقتدر علماء وفقہاء اور اولیاء اکرام کا مؤدب و عقید تمند ہوں اور اپنے دین و ایمان کو ہر چیز پر مقدم جانتا ہوں لہذا ان مقالات میں کوئی املا کی غلطی، کوئی مفہوم کی غلطی، یا کسی بھی اور طرح کی غلطی جو کسی دینی قدر یا کسی مقتدر ہستی کے ادب و لحاظ سے متصادم نظر آئے تو اسے ہر گز ہر گز میری طرف سے شعوری کوشش نہ سمجھا جائے، بلکہ ایسی بات سو فیصد سہو کے زمرے میں سمجھی جائے، اہل علم کی طرف سے ایسی کسی بھی غلطی کی نشاندہی موصول ہونے پر فوراً درست کر دی جائے گی کہ علمی دیانت اور علمی اصلاح کا یہی طریقہ کار معتبر ہے۔

وجد، تواجد اور تصوف

مولانا رومی علیہ رحمۃ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلام شمس تبریزی نہ شد

مولوی کبھی بھی مولانا روم نہ بنتا اگر شمس تبریز کی غلامی میں نہ آتا، یہ ان کی نگاہ کا کمال تھا کہ مجھے اس مقام تک پہنچا دیا

بے شک مولانا رومؒ نے ایسا کہا ہے بلکہ مثنوی میں وہ جابجا یہ کہتے ہیں کہ شمس تبریز سے پوچھو، کسی صاحب نظر سے ملو، اہل اللہ سے پوچھو، کسی ولی اللہ کے ہاتھ میں اپنا آپ دو، اس طرح کے بے شمار مضامین مثنوی میں موجود ہیں۔

مولانا رومیؒ کی ان باتوں کو لے کر ہمارے طبقات میں ایسا پرچار بھی ہوتا ہے کہ فٹافٹ کہیں کسی سلسلے میں فٹ ہو جاؤ ورنہ سب کچھ بیکار ہے، دین پر چلنا کچھ معنی نہیں رکھتا جب تک کسی اللہ والے کا ساتھ نہ ہو لیکن شمس تبریز جیسے ولی اللہ اب کہاں ملتے ہیں، کہنے کو تو سبھی کہتے ہیں کہ وہ شریعت کے پاسدار ہیں لیکن اندر خانے کیا کچھ بھرا ہوتا ہے وہ سادہ سمجھ سے پتا نہیں چلتا جب تک کہ شریعت کے آئینے میں نہ دیکھیں اور جب انہیں شریعت کے آئینے میں دیکھیں تو مروجہ تصوف کے قرطاس پر ایسا بہت کچھ براجمان ہے جو شریعت مطہرہ سے نہ صرف متصادم ہے بلکہ ۱۸۰ ڈگری الٹ ہے، اس ہنگام سے بچنے کی شدید احتیاج ہے۔

کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ مثنوی کے سحر بیان اور وجد آفرین مضامین سے متاثر ہو کر انسان اگر حق کی طرف چل پڑے تو عین مقصودِ وجد یہی منزل ہے لیکن وجد اگر خام ہو تو انسان کسی غیر معتبر منزل کی طرف بھی نکل سکتا ہے، خام وجد خام خیالی سے پیدا ہوتا ہے اور خام خیالی، کم علمی اور مروجہ غیر ضروری خیالات سے جنم لیتا ہے۔

اس خام وجد یا تواجد سے بچنے کے لئے انسان کا ایمان کے بنیادی تقاضوں پر اعتقاد غیر متزلزل اور مضبوط ہونا چاہئے ورنہ انسان کا ایمان محض کسی ایک شعبدے کی مار ہے، کسی ایک کرامت کے قدموں پر ڈھیر ہو کر ساری ساری عمر لوگ خدا کو بھول کر تصوف کے اسٹیک ہولڈرز کی دہلیزیں چومتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

ایسے خام اذہان کو مثنوی سنانا سونے کی دیگ میں شلجم پکانے کے مترادف ہے۔

بندے کو کنٹرول کرنے کے لئے آج کے متصوفین ایسے ایسے تواجد پسند ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ بندہ ان کے حصار سے پھر نکل نہیں سکتا، اس کے لئے حکایات کا سہارا لیا جاتا ہے، حاجت روائی کر کے دکھائی جاتی ہے، بزرگوں کے اقوال کو مس-یوز کر کے لوگوں کو ٹریپ کیا جاتا ہے اور غلام بنا کے رکھا جاتا ہے۔

مولانا رومؒ اس صورتحال سے خود بھی آگاہ ہیں اسی لئے انہوں نے مثنوی کے ابتدائی چیپٹرز میں خود بھی اس بات کو موضوع بنایا اور اپنے پڑھنے سننے والوں کو کھرے کھوٹے کی تمیز کرنے کا سبق بہت واضع الفاظ میں دیا ہے۔

جعلی تصوف پر مولانا رومیؒ کی تنقید

تواجد پسند متصوفین پر تنقید کرتے ہوئے خود مولانا رومیؒ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں:۔

"چونکہ بہت سے شیطان انسانی چہرے جیسے ہیں، اس لئے ہر ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ پکڑانا چاہئے، شکاری پرندے جیسی آواز اس لئے نکالتا ہے تاکہ وہ پرندے کو دھوکہ دے سکے، وہ پرندہ اپنے ہم جنس کی آواز سمجھ کر فضا سے زمین پر اترتا ہے تو جال اور ڈنک پاتا ہے، اسی طرح کمینہ آدمی فقراء کے کلمات چرا لیتا ہے تاکہ وہ کسی بھولے بھالے پر منتر پڑھے، مردوں کا کام روشنی اور گرمی پہنچانا ہے جبکہ کمینوں کا کام دھوکہ دینا اور بے شرمی ہے، یہ لوگ اپنی گداگری، یعنی مال اور نام کمانے کے لئے، اون کا شیر بناتے ہیں، ایسے لوگوں کی مثال ایسی ہے جو مسیلمہ کذاب کو مسیحا کا لقب دیں جبکہ مسیلمہ کا لقب کذاب رہا ہے اور سیدنا محمد ﷺ کا لقب "صاحب عقل" رہا ہے، شراب حق کی مہر خالص مشک کی ہوتی ہے اور دنیاوی شراب کی مہر گندگی اور عذاب ہے"

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"کھوٹا سونا اور کھرا سونا، کسوٹی پر پرکھے بنا ہر گز قابل اعتبار نہیں، خدا جس کے دل میں کسوٹی رکھ دیتا ہے بلاشبہ وہ یقین کو شک سے جدا کر لیتا ہے، وہ جو سیدنا مصطفیٰ کریم (صل اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "اپنے دل سے فتویٰ پوچھ" اس بات کو وہی سمجھتا ہے جو وفاداری سے پُر ہے، زندہ کے منہ میں اگر تنکا گر جائے تو اس کو چین اسی وقت آتا ہے جب اس کو باہر نکال دے، ہزاروں لقموں میں جب ایک چھوٹا سا تنکا آیا تو زندہ کی حس نے اس کا پتا لگا لیا"

یہاں زندہ سے مراد وہ ہے جو شریعت کو جانتا ہے، جب اس کے سامنے غیر شرعی فعل ہو گا وہ فوراً تنکے کو پہچان جائے گا لیکن جو شریعت سے بے بہرہ ہوں گے وہ مردے کی مانند ہیں انہیں اس تنکے یعنی غیر شرعی فعل کی خبر نہیں ہو گی وہ بزرگ کی کشف و کرامت سے ایک بار مرعوب ہو کر ہر نوالہ مقدس سمجھ کر نگلتے رہیں گے۔

پیر رومیؒ کی وصیت

میں تم سب کو پوشیدہ اور کھلے عام ہر حال میں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، نیز کم کھانے اور کم سونے اور کم بولنے کی تاکید کرتا ہوں، نیز معاصی اور گناہوں سے اجتناب اور روزے پر مواظبت اور قیام شب پر مداومت اور ہمیشہ شہوات کے ترک اور ہر شخص کی جفا و زیادتی پر تحمل کی نصیحت کرتا ہوں، نیز عوام اور بیوقوفوں کے ساتھ بیٹھنے سے اجتناب اور صالحین اور شریفوں کے ساتھ بیٹھنے کی وصیت کرتا ہوں۔

یقیناً بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہو اور عمدہ ترین کلام وہ ہے جو لفظ کے اعتبار سے تو کم ہو مگر معنیٰ کے اعتبار سے زیادہ ہو، حمد کا مستحق تو بس اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

بانسری کا بیان

مثنوی شریف بانسری کے باطنی مفہوم سے شروع ہوتی ہے۔ اور اسی کی تشریح میں مولانا رومؒ ایک سے ایک نئی گرہ کھولتے چلے جاتے ہیں، وہ ایک بات کی تشریح میں دوسری بات شروع کرتے ہیں اور پھر اس بات کی تشریح میں اگلی بات، آدھی کتاب پڑھنے کے بعد وہ پھر پہلی والی بات پہ آجاتے ہیں اور بندہ حیران رہ جاتا ہے کہ میں کتنا جہان گھوم آیا ہوں اور اسرار و معنی کے اتنے گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد پھر مجھے وہیں لا کھڑا کیا جہاں سے چلا تھا، شائید بصیرت افروزی کی اس سے عمدہ حالت کوئی نہ ہو کہ بندہ زمین و آسمان کی سیر کر چکنے کے بعد دیکھے کہ میں اپنی جگہ سے ہلے بغیر اپنے اندرونی انسان میں ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہا ہوں جو بندے سے اللہ کی طرف رغبت کا ایک ایسا تقاضا کرتی ہے جس میں ایک خاص اپنائیت کا عنصر ہے۔

مثنوی کا پہلا مضمون ہی بندے کو اٹھا کر فکری آسمان پر لے جاتا ہے اور اس کے آگے کے کلام میں یہ خاصیت بدرجہ ءاتم موجود ہے کہ وہ پھر بندے کو واپس زمین پر نہیں آنے دیتا۔

اے میرے عزیز!

ذرا بانسری سے سن کیا فریاد کرتی ہے، اور وہ جدائیوں کی کیا شکائیت کرتی ہے

کہ جب سے مجھے بنسلی سے کاٹا ہے، میرے نالہ سے سب مرد و عورت روتے ہیں، میں اپنی بات سمجھانے کے لئے ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو، تاکہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں۔

جب کوئی اپنے اصل سے دور ہو جاتا ہے تب وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر سے تلاش کرتا ہے، میں بھی ہر مجمع میں روئی ہوں، خوش اطوار اور بد احوال لوگوں کے ساتھ رہی ہوں لیکن ہر شخص اپنے خیال کے مطابق میرا دوست بنا اور میرے اندر سے میرے رازوں کی جستجو کسی نے نہ کی۔

میرا راز میرے نالہ ءجدائی سے دور نہیں لیکن آنکھ اور کان کے لئے وہ نور نہیں کہ اسے کوئی سمجھ سکے، بدن روح سے اور روح بدن سے چھپی ہوئی نہیں ہے لیکن یہاں کسی کے لئے روح کو دیکھنے کا رواج و دستور ہی نہیں؟

بانسری کی یہ آواز اک آگ ہے، ہوا نہیں، جس میں یہ آگ نہ ہو وہ نیست و نابود ہو، عشق کی اک آگ ہے جو بانسری میں لگی ہوئی ہے، عشق کا جوش ہے جو شراب میں آیا ہوا ہے۔

بانسری اس کی ساتھی ہے جو اپنے دوست سے جدا ہو گیا ہو، اس بانسری کے راگوں نے ہمارے دل کے پردے پھاڑ دیئے ہیں کیونکہ ہم جدائی کے مارے لوگ اس کا درد سمجھتے ہیں۔

بانسری جیسا زہر اور تریاق کس نے دیکھا ہے، بانسری جیسا ساتھی اور عاشق کیا کسی نے دیکھا ہے؟، یہ بانسری خطرناک راستہ کی بات کرتی ہے، مجنوں کے عشق کے قصے بیان کرتی ہے۔

بانسری کی طرح گویا ہم بھی دو منہ رکھتے ہیں، ایک منہ اس پھونک مارنے والے کے لبوں میں چھپا ہے اور ایک منہ روتا ہوا تمہاری طرف ہے، آسمان میں شور و غل مچائے ہوئے ہے، لیکن جسے آنکھ میسر ہے وہ جانتا ہے کہ اس سرے کی آہ و فریاد اس پھونک مارنے والے ہی کی جانب سے ہے جیسے ہمارا ہر کام مشیت الٰہی کی وجہ سے ہے، اس بانسری کی آواز اسی پھونکوں کی وجہ سے ہے جیسے ہماری روح کا شور و غل اس کی تسبیحات سے ہے۔

اس ہوش کا راز داں بیہوش کے علاوہ کوئی نہیں ہے، (میٹھی) زبان کا خریدار (سننے کے مشتاق) کان جیسا کوئی نہیں ہے، بانسری کی فریاد کا اگر کوئی نتیجہ (سننے والا) نہ ہوتا تو بانسری دنیا کو عشق کے شکر (چاشنی) سے نہ بھرتی۔

ہمارے غم میں بہت سے دن ضائع ہوئے، بہت سے دن سوزشوں کے ساتھ ختم ہوئے

دن اگر گزریں تو کہہ دو گزریں، پرواہ نہیں، اے وہ کہ تجھ جیسا کوئی پاک نہیں ہے، تو ہمیشہ رہے گا۔

جو مچھلی (عاشق) کے علاوہ ہے اس کے پانی سے سیر ہوا، جو بے روزی ہے اس کا وقت ضائع ہوا، کوئی ناقص کسی کامل کا حال معلوم نہیں کر سکتا، پس بات مختصر یہی ہے:

شراب جوش میں ہمارے جوش کی محتاج ہے، آسمان گردش میں ہمارے ہوش کا قیدی ہے، (شراب کا جوش دیکھنا ہو تو اسے اپنے اندر انڈیلنا پڑتا ہے اسی طرح آسمان کے اسرار ہماری توجہ کے متقاضی ہیں)۔

شراب ہم سے مست ہوئی نہ کہ ہم اس سے، جسم ہماری وجہ سے پیدا ہوا نہ کہ ہم جسم کی وجہ سے (جس طرح شراب نے اپنا رنگ ہمارے اندر جا کر دکھایا اسی طرح روح نے بھی اس جسم میں جا کر اپنا رنگ دکھایا، یہ جسم ہمارے لئے پیدا کیا گیا نہ کہ ہم اس جسم کے لئے تاکہ ہم شراب کی طرح اس جسم میں وارد ہو کر اپنا رنگ دکھائیں)

جس طرح انجیر ہر پرندے کی خوراک نہیں اسی طرح سچی بات سننے پر ہر شخص قادر نہیں،

اے بیٹا قید کو توڑ آزاد ہو جا، سونے چاندی کا قیدی کب تک رہے گا۔ اگر تو دریا کو ایک پیالے میں ڈالے تو کتنا آئے گا محض ایک دن کا حصہ

حریصوں کی آنکھ کا پیالہ نہ بھرا، جب تک سیپ نے قناعت نہ کی موتی نہ بھرا (اگر سیپ حرص کرے اور بہت سارا پانی پی لے تو موتی نہیں بنتا، موتی بنانے کے لئے اسے محض ایک قطرہ بارش کا پانی چاہیے ہوتا ہے) جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہوا، وہ حرص اور عیب سے بلکل پاک ہوا (جو جان لے کہ اصل کام یہاں خدا سے تعلق استوار کرنا ہے تو وہ پھر ضرورت کے علاوہ دیگر دنیاوی چیزیں اکٹھی کرنے کی حرص سے پاک ہو جاتا ہے)۔

خوش رہ ہمارے اچھے جنوں والے عشق، اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب

اے ہمارے تکبر اور عزت طلبی کی دوا، اے کہ تو ہمارا افلاطون اور جالینوس ہے

خاکی جسم عشق کی وجہ سے آسمانوں پر پہنچا، پہاڑ ناچنے لگا اور ہوشیار ہو گیا

اے عاشق، عشق طور کی جان بنا، طور مست بنا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے، اس زیر و بم میں اک راز چھپا ہوا ہے، صاف صاف کہہ دوں تو دنیا کو درہم برہم کر دوں (جس طرح ایک بڑی تجلی طور کی قوت برداشت سے باہر ہے اسی طرح سب کچھ ایک ساتھ کھل کر کہہ دینے سے بہت بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے)

ان دونوں معاملوں میں بانسری جو کچھ کہتی ہے، اگر میں بیان کر دوں تو دنیا تباہ ہو جائے گی، اگر میں اپنے یار کے ہونٹ سے ملا ہوا ہوتا تو بانسری کی طرح کہنے کی باتیں کہتا، جو شخص دوست سے جدا ہوا وہ بے سہارا ہوا، خواہ سو سہارے رکھے (اگر بانسری میں کوئی پھونک مارنے والا نہ ہو خواہ دنیا بھر کا سامان اس کے ارد گرد رکھا ہوا ہو تو بیکار ہے، بانسری کی آواز اس پھونک مارنے والے کی محتاج ہے)

جب پھول ختم ہوا اور باغ جاتا رہا، اس کے بعد تو بلبل کی سرگزشت نہ سنے گا۔

جب پھول ختم ہوا اور باغ ویران ہو گیا، پھول کی خوشبو کس میں تلاش کروں؟ عرق گلاب میں (جب انسان عالم ارواح سے رخصت ہوا تو خدا سے جدا ہو گیا اب اس کی خوشبو کس میں تلاش کریں، اب بوئے یار ہی تسلی کا موجب ہے)

تمام کائنات معشوق ہے اور عاشق پردہ ہے، معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ ہے

جب عشق کو اس کی پرواہ نہ ہو، وہ بے پر کے پرندے کی طرح ہے، اس پر افسوس ہے، ہمارے بال و پر اس کے عشق کی کمند ہیں، اس عشق کے بال و پر کھینچتے ہوئے مجھے اس دوست کے کوچہ تک لے جاتے ہیں

میں کیا کہوں کہ میں آگے پیچھے کا ہوش رکھتا ہوں جبکہ میرے دوست کا نور ساتھی نہ ہو لیکن اس کا نور دائیں بائیں، نیچے اوپر ہے، تاج اور طوق کی طرح میرے سر اور گردن میں ہے۔

عشق چاہتا ہے کہ یہ بات ظاہر ہو، تیرا آئینہ غماز نہ ہو تو کیونکر ہو؟ تو جانتا ہے تیرا آئینہ غماز کیوں نہیں ہے، اس لئے کہ زنگ اس کے چہرے سے علیحدہ نہیں ہے، وہ آئینہ جو زنگ اور میل سے دور ہے، وہ نورِ خدا کے آفتاب کی شعاؤں سے بھرا ہے۔

جا بیٹا! اس کے رخ سے زنگ کو صاف کر، اس کے بعد اس نور کو حاصل کر

اس حقیقت کو دل کے کان سے سن لے، تاکہ تو پانی اور مٹی سے بالکل نکل آئے

اگر سمجھ رکھتے ہو تو روح کو راستہ دو، اس کے بعد شوق سے راستہ پر چلو

بانسری کا درد بیان کر کے پیرِ رومیؒ نے دراصل انسان کا ذوق خدا پرستی جگانے کی کوشش کی اور پھر اس کے راستے میں حائل دنیاوی رعب کو جھاڑنے کے لئے اسے دنیا کی سیر پر لے گئے جس میں طرح طرح کے واقعات سنا کر اسے دنیا کے عیب اور رہزنی سے آشنا کرواتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ صحیح راستے کی بھی پہچان کرواتے جاتے ہیں۔

مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کا ہم ذوق کیفیات کا حامل ہونا

علامہ محمد اقبالؒ مولانا رومیؒ کو اپنا روحانی پیر مانتے تھے۔ کشف اور وجدان کے ذریعے ادراک حقیقت کے بعد صوفی صحیح معنوں میں عاشق ہو جاتا ہے کہ بہ رغبت تمام محبوب حقیقی کے تمام احکام کی پیروی کرتا ہے۔ رومیؒ نے جوہر عشق کی تعریف اور اس کی ماہیت کی طرف معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ صوفی کی ذہنی تکمیل کا مقام کیا ہے؟ اس کے متعلق دو شعر نہایت دل نشیں ہیں:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو در نظر رو در نظر

علامہ اقبالؒ نے اس کی یوں تشریح کی ہے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مثنوی

مثنوی کا لفظ، عربی کے لفظ ''مثنیٰ'' سے بنا ہے اور مثنیٰ کے معنی دو کے ہیں۔ اصطلاح میں ہئیت کے لحاظ سے ایسی صنفِ سخن اور مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے، لیکن ساری مثنوی ایک ہی بحر میں ہو۔ مثنوی میں عموماً لمبے لمبے قصے بیان کیے جاتے ہیں نثر میں جو کام ایک ناول سے لیا جاتا ہے، شاعری میں وہی کام مثنوی سے لیا جاتا ہے، یعنی دونوں ہی میں کہانی بیان کرتے ہیں۔ مثنوی ایک وسیع صنفِ سخن ہے اور تاریخی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر کئی ایک خوبصورت مثنویاں کہی گئی ہیں۔ مثنوی مولانا رُومؒ" جو "مثنوی مولوی معنوی سے بھی معروف ہے یہ کتاب ہے جس نے مولاناؒ کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصانیف کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد، جیسا کہ کشف الظنون میں ہے 26666 ہے۔ مشہور یہ ہے کہ مولاناؒ نے چھٹا دفتر ناتمام چھوڑا تھا اور فرمایا تھا کہ

باقی ایں گفتہ آید بی گماں
در دل ہر کس کہ باشد نور جاں

اس پیشن گوئی کے مصداق بننے کے لیے نے بہت لوگوں نے کوششیں کیں اور مولاناؒ سے جو حصہ رہ گیا تھا اسے پورا کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ نے بیماری سے نجات پا کر خود اس حصے کو پورا کیا تھا اور ساتواں دفتر لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے

اے ضیاء الحق حسام الدیں سعید
دولتت پائندہ عمرت برمزید

مثنوی مولانا رومؒ کو جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی۔ آپ کے کلام میں تصوف، اخلاقیات، فلسفیانہ خیالات اور قرآنی تفسیر و تشریح جابجا دکھائی دیتی ہے۔ عشق کی وارفتگی کا بیان جس خوبصورتی سے ان کے کلام میں نظر آتا ہے کہیں اور کہاں مل پائے گا۔ فرماتے ہیں:

چوں قلم اندر نوشتن می شتافت
چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت
چوں سخن در وصف ایں حالت رسید
ہم قلم بشکست و ہم کاغذ درید

یعنی عشق کا جذبہ اس قدر طاقتور ہے کہ جب قلم نے لکھنے کا قصد کیا اور جب لفظ "عشق" لکھنے لگا تو اس میں شگاف پڑ گیا اور جب عشق کے رستے پر چلنے سے پیش آنے والے حالات کا ذکر آیا تو قلم ٹوٹ گیا اور کاغذ پھٹ گیا۔
اُن کے نزدیک اصل عشق، عشقِ حقیقی ہے۔ وہ عشق جو پائیدار ہے اُس میں نجات ہے۔ ظاہری حسن سے عشق میں ذلت و رسوائی ہے۔ انھوں نے یہ نصیحت اُس لونڈی کے عشق کی حکایت میں کی، جو کہ سنار کے ظاہری حسن پر فریفتہ تھی اور جب اُس کا حسن باقی نہ رہا تو عشق کا جذبہ سرد پڑ گیا۔ مولاناؒ اس موقع پر فرماتے ہیں:

عشق ہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

مولانا رومیؒ کے نزدیک عشق کی تشریح میں عقل ناکام رہتی ہے اور عشق و عاشقی کی شرح بھی خود عشق کرتا ہے۔
گویا اس مقام پر مولاناؒ عقل کو عشق کے مقابلے میں محدود اور کم توقیر قرار دیتے ہیں۔

مولانا رومیؒ، علامہ اقبالؒ کے روحانی پیر و مرشد تھے۔ اقبالؒ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ انھیں اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں اور انھوں نے بارہا اپنے کلام میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں اپنے کلام میں پیرِ رومی، پیرِ یزدانی، پیرِ حقیقت سرشت اور پیرِ عجم کے نام سے یاد کیا اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا جیسے :

راز معنی مرشد رومی کشود
فکر من آستانش در سجود

اقبالؒ کے یہاں اکثر و بیشتر مقامات پر مولانا رومیؒ کے موضوعات پر کلام دکھائی دیتا ہے جیسے عشق و عقل میں عشق کو ترجیح دینا، جبر و قدر کے موضوع میں عمل اور جہد مسلسل کو بہتر جاننا یا اخلاقی موضوعات کا بیان۔ اقبال بڑی حد تک ایسے موضوعات میں مولانا رومیؒ سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی نظم پیر و مرید میں مولانا رومیؒ کے اشعار میں اپنی الجھنوں کا حل تلاش کیا ہے۔ جیسے ایک مقام پر فرماتے ہیں :

اقبالؒ :

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے
اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے ؟

پیر رومیؒ :

ہر ہلاکِ اُمت پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند عود

اقبالؒ، رومیؒ کی مثنوی کے عظیم خیالات سے بے حد متاثر ہیں۔
رنگ آہن محو رنگ آتش است آتشی می لافد و آہن وش است

رومیؒ نے اکثر جگہ عشق کو آگ سے تشبیہ دی ہے۔ عشق ایسا شعلہ ہے جو چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور عاشق ایسا فولاد ہیں جو آگ میں داخل ہوتا ہے۔ آگ کی تب و تاب و سوز سے گرم ہو جاتا ہے اور گویا اس کے مثل ہو جاتا ہے۔ یہی خیال عاشق کا ہے، وہ آتش عشق یعنی محبوب حقیقی میں اپنے آپ کو اس قدر مدغم کر دیتا ہے کہ محبوب کی تمام صفات یعنی گرمی و روشنی سے متصف ہو جاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں اس میں اوصاف خداوندی پیدا ہو جاتے ہیں۔

من آن روز بودم کہ اسما نبود نشان از وجود مسما نبود

نما شد مسما و اسماء پدید در آن روز کانجا من وما نبود

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان روح تھا اور ارواح میں خدا کے قریب تھا، پھر انسان کو جسم عطا ہوا اور وہ مادی زندگی سے آلودہ ہو کر اس دنیا میں آگیا۔ اپنے مرکز سے جدا ہو گیا۔ دنیا کی دلچسپیاں اسے خدا سے غافل کر دیتی ہیں اور وہ ان میں الجھ کر اپنی اصلیت سے دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی حقیقت سے باخبر روح اپنے اصل کی طرف جانے کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس جسد عنصری سے آزاد ہو کر پھر اپنے مقدس عالمِ ارواح میں جانا چاہتی ہے مولانا جلال الدینؒ نے اپنی مثنوی کا آغاز تمثیلاً اس بے قرار روح کی فریاد سے کیا ہے۔

جملہ معشوق است و عاشق پردہ ای

وحدت شہود کے متعلق آہن اور آہن کی مثال مثنوی میں موجود ہے۔۔۔

رنگ آہن محو رنگ آتش است

ز آتشی می لافد وہ آہن وش است

لوہے کا رنگ آگ کے رنگ سے مٹ جاتا ہے۔ جس طرح آگ جلتی ہے اور اس کا لوہا بھی جلتا ہے۔

رومیؒ نے اکثر جگہ عشق کو آگ سے تشبیہ دی ہے۔ عشق ایسا شعلہ ہے جو چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور عاشق ایسا فولاد ہیں جو آگ میں داخل ہوتا ہے۔آگ کی تب وتاب وسوز سے گرم ہو جاتا ہے اور گویا اس کے مثل ہو جاتا ہے۔ یہی خیال عاشق کا ہے، وہ آتشِ عشق یعنی محبوب حقیقی میں اپنے آپ کو اس قدر مدغم کر دیتا ہے کہ محبوب کی تمام صفات یعنی گرمی وروشنی سے متصف ہو جاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں اس میں اوصاف خداوندی پیدا ہو جاتا ہے۔

عشق میں ایک منزل یہ بھی آتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر محبوب کی ہستی میں کھو جاتا ہے۔ وہ آپ خود نہیں رہتا ہے ہمہ تن وہی ہو جاتا ہے۔ جب ہر وقت غالب ہی غالب رہے اور مغلوب اس حد تک مغلوب ہو کہ اس کا ذکر تک باقی نہ بچے تو کلام بھی غالب کے ذکر کا ہی نکلے گا۔ یعنی محبوب کو یوں یاد کر کہ نہ دنیا یاد رہے اور نہ تو اپنے آپ کو یاد رہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے یوں یاد کر کہ پہلے تو خود کو دنیا سے الگ کر دے اور پھر خود کو خود سے بھی الگ کر لے۔

ذاکر جب خود کو دنیا سے الگ کر دے تو ذاکر "ذکر" ہو جاتا ہے اور جب خود کو خود سے الگ کر دے تو "مذکور" ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے ذاکر ہمہ ذکر و ذکر مذکور شود (ذاکر سراپا ذکر ہو جائے تو ذکر مذکور ہو جاتا ہے) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان "اُس" سے مکمل محبت کرتا ہے اور ہر ماسوا کو بھول جاتا ہے۔

حسین بن منصورؒ کی بھی یہی کیفیت تھی کہ وہ ہستی خداوندی میں اس قدر جذب ہو گئے تھے کہ وہ اپنی انا فنا کر کے بقاء حاصل کر چکے تھے۔اس لیے جب انہوں نے انا الحق کہا تو وہ خود نہیں بول رہے تھے بلکہ قدرت خدا بول رہی تھی۔اس نقطہ کو ظاہر پرست نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مولانا جلال الدینؒ اس حقیقت کو جانتے تھے اور کہتے تھے۔ عشق۔ عشق آرزو ہے، کسی کو حاصل کرنے کا شدت عمل ہے۔اگر مقصود عالی ہو تو عاشق قربانی دینے کیلئے آمادہ ہوتا ہے۔ وہ تمام قوتوں کو اس کے حصول کیے لیے مرکوز کرتا ہے۔اس میں ایسی قوت آجاتی ہے کہ بقول رومیؒ۔۔۔

عشق جوشد بحر را مانند دیگ

عشق سائدہ کوہ راہ مانند ریگ

عشق ایک ایسا عزم بالجزم اور کام کرنے کی بے پناہ تڑپ ہے کہ وہ زندگی کو گوناگوں اعمال میں ایک حرکت و تعبیر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔

از محبت تلخ ہا شیرین شود

از محبت مس ہا زرین شود

از محبت درد ہا صافی شود

وز محبت درد ہا شافی شود

اگر عشق کا مطمع نظر باری تعالیٰ ہو، انسان تمام علایق سے کٹ کر اس کی طرف لگ جاتا ہے۔ تمام رکاوٹوں کو دور کرتا ہے یعنی تمام نفسیاتی خواہشات اور اخلاقی ضمیمہ ہوس، حسد، کینہ کٹ جاتے ہیں۔ یہ گویا عشق کی برکت اور اس کا ثمر ہے۔ اس لیے مولانا جلال الدینؒ عشق کو کہتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خود سودای ما

اے طبیب جملہ علت ہای ما

اے دوای نخوت و ناموس ما

ای تو افلاطون و جالینوس ما

چون بہ سرخی گشت ہمچو زر کان پس انا النار است لافش بیگمان

وحدت الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی اور الہٰ نہیں ہے۔ اللہ کا کوئی اور شریک نہیں۔ اہل تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمہ اوست، کائنات میں صرف اللہ ہی کی ذات ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے سب اللہ ہی اللہ ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء جو جسم اختیار کیے ہوئے محدود صورت میں ہمیں نظر آتی ہیں، یہ سب خداوندی کی مظاہر ہیں۔ صوفیا کا یہ عقیدہ ہمہ اوست کہلاتا ہے۔ اسے نظریہ وحدت الوجود بھی کہتے ہیں۔ وحدت وجود میں شخصیت فنا ہو جاتی ہے۔ وحدت شہود میں شخصیت قائم رہتی ہے۔ مثلاً چراغ، آفتاب کی روشنی میں کم ہو جاتا ہے لیکن اپنی روشنی قائم رکھتا ہے اور لوہا آگ میں

آگ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے لیکن وہ آگ نہیں بن جاتا۔ جب یہ صفات نہیں رہتی تو لوہا اپنی ہستی الگ قائم رکھتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں قسم کے خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ مولانا ہدایت اور تعلیم کو سخن پردازوں اور شاعری کی نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے پیش نظر عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی اور عالی بھی۔ ان کا روئے سخن سب کی طرف ہے۔ اس لیئے زبان بھی ایسی استعمال کی ہے جو سب کی سمجھ میں آسکے۔

صاحب مجمع الفصحا نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں، کوئی نہیں ہوئی۔

شاہ نامہ

گلستان

مثنوی روم

دیوان حافظ

ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہوگی۔ مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علماء و فضلا نے مثنوی کو جس قدر اہمیت دی اور کسی کتاب کو نہیں دی۔ کشف الظنون ایک مشہور شرح ہے جس کے بعد بھی کئی شرحیں لکھی گئی مثلاً شرح محمد افضل الہ آبادی، وولی محمد، و عبد العلی بحر العلوم و محمد رضا وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان سے شاہ بو علی قلندر پانی پتیؒ بھی مولانا کی صحبت میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ قلندریہ بھی ایک درجہ میں مولانا رومیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

گزشتہ آٹھ صدیوں سے سے مثنوی مولانا رُومؒ مسلمانانِ عالم میں عقیدت واحترام سے پڑھی جارہی ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی شخصیت اور ان کا کلام دونوں ہی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مثنوی مولوی معنوی، تصوف اور عشق الٰہی کے جملے، موضوعات کو انتہائی سادگی روحانی اور عام فہم انداز مین بیان کرتی ہے۔ عشق الٰہی اور معرفت کے انتہائی مشکل و پیچیدہ نکات سلجھانے کے لیے مولاناؒ نے سبق آموز حکایات و قصے کہانیوں سے مدد لی ہے، جو بھی لکھا ہے قرآن و حدیث نبوی ﷺ سے اس کی سند بھی بیان کی جاتی ہے اس لیے آج آٹھ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ان کے کلام کی اہمیت وافادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ ان کے فرقے کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ مولانا کا لقب جلال الدینؒ تھا اس لیے ان کے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہوگا۔ لیکن آج کل ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقے کو لوگ مولویہ کہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل بلقان، افریقہ اور ایشیا میں مولوی طریقت کے پیروکاروں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتی، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں۔ خرقہ یا کرتا

کی بجائے ایک چنٹ دار پاجامہ ہوتا ہے۔ ذکر و شغل کا یہ طریقہ ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینے پر اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کرتا ہے۔ رقص میں آگے پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور دوسرے ساز بھی بجاتے ہیں۔ ان کے 800 ویں جشن پیدائش پر ترکی کی درخواست پر اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، ثقافت و سائنس یونیسکو نے 2007ء کو بین الاقوامی سالِ رومی قرار دیا۔ اس موقع پر یونیسکو تمغا بھی جاری کیا۔

حوالہ جات!

(کلیدِ مثنوی، جلد اوّل، دفتر اوّل، از مولانا محمد اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان مفتاح العلوم، مثنوی مولانا روم، دفتر اوّل، مترجم: مولوی مرزا محمد نذیر، لاہور، قریشی بک ایجنسی، سوانح مولانا روم از شبلی نعمانی، اللہ کے سفیر، و دیگر کتابوں سے ماخوذ)

علم بدیع کا بیان

(اردو شاعری کی صنعتیں)

علم بدیع اردو ادب کی ایک اہم قسم ہے۔ اس کے لفظی معنی کلام میں "ندرت پیدا کرنا، کوئی اچھوتی بات کرنا یا زاویہ پیدا کرنا" کے ہیں۔ علم بدیع میں الفاظ کے معنوی، حوری حسن اور ان طریقہ ہائے کے استعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے کلام کے معنوی یا ظاہری خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس علم میں مختلف قسم کی صنعتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے دو اہم حصے ہیں۔ صنائع لفظی اور صنائع معنوی.

1۔ صنائع لفظی:

صنعت کے معنی بناوٹ کے ہیں۔ بنانے والا صانع اور بننے والا مصنوع کہلاتا ہے۔ جیسے یہ کائنات اللہ پاک نے بنائی ہے اور ہم سب اللہ پاک کی مصنوعات ہیں۔ شاعر بھی صناع ہوتا ہے۔ شاعر لفظوں کا پارکھ ہوتا ہے، وہ لفظوں کا نباض ہوتا ہے۔ ہر شاعر معنوی اعتبار سے لفظوں کی نوع بھر نوع شکلیں بناتا ہے۔ لفظ و معنی کا رشتہ نازک و پیچیدہ ہوتا ہے۔ بعض نے اس کو جسم و روح کا رشتہ قرار دیا ہے۔ شاعر لفظی شعبدہ باز ہوتے ہیں اور اپنی شاعری میں مختلف صنعتیں استعمال کرتے ہیں۔ صنائع لفظی کے تحت آنے والی صنعتوں کے نام درج ذیل ہیں۔

صنعت قلب، صنعت سیاۃ الاعداد، صنعت ترصیع، صنعت ایہام، صنعت منقوطہ، صنعت غیر منقوطہ، اور صنعت القوافی وغیرہ۔

2۔ صنائع معنوی:

کلام میں استعمال ہونے والی زائد خوبیاں اگر ہمارے ذہن کو کلام کے معنوی حسن کی طرف لے جائیں تو انہیں صنائع معنوی کہتے ہیں۔ اس صنعت میں صنائع لفظی کے برعکس گہری سطحوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس میں معنوی حسن کو اہمیت دی جاتی ہے۔ صنائع معنوی کے تحت آنے والی صنعتوں کے نام درج ذیل ہیں جنہیں ہم آگے ایک ایک کر کے تفصیل سے پڑھیں گے۔

صنعت حسن تعلیل، صنعت لف و نشر، صنعت تضاد، صنعت سوال و جواب، صنعت تجنیس، صنعت جمع، صنعت تفریق، صنعت اشتقاق، صنعت تکرار، صنعت مراعات النظیر، صنعت تلمیح، صنعت مبالغہ، تجاہل عارفانہ، صنعت تنسیق الصفات، صنعت تعلی، صنعت مکر شاعرانہ، صنعت ادماج، صنعت عاطلہ اور صنعت ردالعجز وغیرہ۔

-1 صنائع لفظی کی اقسام:

(تفصیلی وضاحت)

ا صنعت قلب:

انسان کو انسان اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جلد مانوس ہو جاتا ہے اور قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ قلب کے لغوی معنی بدلنا کے ہیں۔ 'انقلاب' لفظ اسی سے مشتق ہے۔

اگر کسی لفظ کو الٹنے سے وہی لفظ دوبارہ بن جائے تو اسے صنعت قلب کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی لفظ کے حروف ادل بدل کر سارے کے سارے دوسرے میں آ جائیں تو یہ سب تقلیب کی صورتیں ہیں۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔ جن میں قلب کل، قلب بعض اور قلب مستوی شامل ہیں۔ صنعت قلب کی ایک مثال دیکھتے ہیں۔

دنیا میں ہے خزانہ لڑائی کا گھر صدا

از رو غور گنج کو الٹو تو جنگ ہے

اس شعر میں لفظ "گنج" کو الٹنے پر لفظ جنگ بنتا ہے۔ لہذا اس شعر میں صنعت قلب کا استعمال ہوا ہے۔

۲۔ صنعت سیاۃ الاعداد:

یہ ایسی صنعت ہے جس میں شاعری میں اعداد کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ کبھی ایک مصرعے میں کچھ اعداد کا ذکر ہوتا ہے جب کہ دوسرے مصرعے میں ان اعداد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی متواتر اعداد ہوتے ہیں ان کی کوئی معین صورت نہیں ہے۔ اس کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

اب تو شش جہت تنگ ہے ہم پر

اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش

ایک دو تین چار پانچ چھ سات

آٹھ نو دس بس بس انشاء بس

۳۔ صنعت ترصیع:

یہ ایسی صنعت ہے جس میں شعر کے دونوں مصروں کے تمام ارکان باہم ہم وزن و ہم سجع ہوں عموماً سجع کو نثر کی صنعت میں شمار کیا جاتا ہے یا ایسے الفاظ جن کی آخری آوازیں ایک جیسی ہوں جیسے یار، غار، انکار، افکار وغیرہ۔

اس صنعت کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

باصر ہیں یہ بصیر ہیں اہلِ وفا ہیں یہ

قادر ہیں یہ قدیر ہیں اہلِ سخا ہیں یہ

صاحب تحقیق را جلوت عزیز

صاحب تخلیق را خلوت عزیز

۴۔ صنعت ایہام:

اس کے معنی ہیں وہم میں ڈالنا۔ شاعر عموماً ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس میں اس کا مقصد معنی بعید کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی ایک اور تعریف یوں ہو سکتی ہیں۔

کلام میں ایسا لفظ لایا جائے جو ذو معنی ہو۔ ایک قریب مفہوم ہو جس کی طرف فوری ذہن منتقل ہو اور دوسرا مفہوم بعید ہو جو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آئے لیکن شاعر کا مقصد مفہوم بعید سے ہوتا ہے۔ صنعت ایہام کی ایک خوبصورت مثال ملاحظہ فرمایئے۔

شعلے جو اٹھے آتشِ رخسارِ یار کے

بالے کی مچھلیوں کو سمندر بنا دیا

۵۔ صنعت منقوطہ:

ایسا شعر یا ایسا کلام جس میں تمام الفاظ نقطہ دار استعمال ہوئے ہوں کہا جائے گا کہ اس میں صنعت منقوطہ استعمال ہوئی ہے جیسے:

نے تیغ نے شقی بچے نے تیغ زن بچے

بنی بچی نے چین جبین نے ذقن بچے

۶۔ صنعت غیر منقوطہ:

ایسا شعر یا ایسا کلام جس میں کوئی بھی لفظ نقطے والا نہ استعمال ہوا ہو تو کہا جائے گا کہ اس شعر میں صنعت غیر منقوطہ استعمال ہوئی ہے۔ جیسے:

اور کسی کا آسرا ہو سر گروہ اس راہ کا

آسرا اللہ اور آل رسول اللہ کا

۷۔ صنعت ذوالقوافی:

ایسا شعر یا ایسا کلام جس میں دو قافیے استعمال ہوئے ہوں تو صنعت ذوالقوافی والا شعر کہلایا جائے گا جیسے:

صبا اڑا کے نہ لے جا میرا اغبار کہیں

کہ مجھ سے چھوٹنے کی آستان یار نہیں

صنائع معنوی کی اقسام

تفصیلی وضاحت

ا۔ صنعت حسن تعلیل:

یہ صنائع معنوی کی ایک اہم قسم ہے۔ تعلیل کے لغوی معنی "وجہ متعین کرنا یا وجہ بیان کرنا" کے ہیں۔ اصطلاح میں حسن تعلیل سے مراد ہے کہ کسی چیز یا امر کی حقیقی علت یا وجہ سے توجہ ہٹا کر اس کی کوئی اور وجہ بیان کی جائے۔ مگر اس میں کوئی شاعرانہ جدت و نزاکت ہو اور وہ پر لطف ہو۔ مثلاً:

کونسی ہے وہ مصیبت مجھ پہ جو ٹوٹی نہیں

رات دن گردش میں ہیں ہفت اسمان میرے لیے

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

سجدہ شکر میں ہے شاخ ثمر دار ہر اک

دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عز و جل

اس شعر میں شاخوں کا جھکنا تو فطری بات ہے مگر شاعر نے شعر میں اپنی علت بیان کی ہے۔

۲۔ صنعت لف و نشر:

کسی ایک شعر میں کچھ الفاظ کو لپیٹ کر بیان کرنا، پھر دوسرے شعر میں ان الفاظ کو کھولنا۔ یہ ایک مصرعے میں بھی ہو سکتا ہے اور دو مصروں میں بھی۔ لف کا مطلب "لپیٹنا" اور نشر کا مطلب "کھولنا" ہوتا ہے۔

اس کی تین اہم صورتیں ہیں جن میں مرتب، غیر مرتب اور معلوس الترتیب شامل ہیں۔

اگر دونوں مصروں میں ترتیب ایک نہ ہو تو اسے لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں۔

لف و نشر کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار

گل جدا سرو جدا نرگس بیمار جدا

۳۔ صنعت تضاد:

تضاد کہتے ہیں شعر میں ایسے الفاظ کو ایک ساتھ لایا جائے جن میں بہ اعتبار معنی تضاد یعنی ضد پائی جائے۔ یہ شاعری میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی صنعت ہے۔ اس کو تکافو، طباق بھی کہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

اسے فکر کیا سزا و جزا کی

تیری آرزو جس نے صبح و مسا کی

اس شعر میں 'صبح' و 'مسا' (شام) میں معنوی تضاد ہے۔

ایک اور مثال دیکھیے۔

امیر شہر کو اس سے غرض کیا

فقیر شہر کب سے دربدر ہے

۴۔ صنعت سوال وجواب:

یہ علم بدیع کی ایک ایسی صنعت ہے جس میں شعر کے اندر ہی سوال کیا جاتا ہے اور پھر شعر میں ہی جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

کہا جاپان کو جائیں؟

کہا جاپان کو جاؤ

کہا اونٹ پر بیٹھیں؟

کہا اونٹ پر بیٹھو

کہا کوہان کا ڈر ہے؟

کہا کوہان تو ہو گا

۵۔ صنعتِ جمع:

کلام میں جب کچھ چیزیں ایک حکم میں جمع ہو جائیں اور پھر ہر ایک کو خصوصیت کے ساتھ منسوب کریں تو اس کو جمع تقسیم کہتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو۔

رنج، راحت، غم، خوشی کچھ بھی نہیں

جز فریب آگہی کچھ بھی نہیں

اس شعر میں پہلے مصرعے میں رنج، راحت، غم اور خوشی کو تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر ہر ایک کو ایک خصوصیت "فریب آگہی" کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

۶۔ صنعت تفرق:

علمِ بدیع کی اصطلاح میں صنعتِ تفریق سے مراد ایک نوع کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کرنا، جیسے زکی آکا یہ شعر ملاحظہ ہو:

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانے کے ساتھ

وصل میں یہ جان دے، وہ ہجر میں جیتی رہے

بلبل اور پروانہ دونوں کا عشق مشہور ہے لیکن یہاں شاعر نے مصرعۂ ثانی میں ان کے درمیان فرق کر دکھایا ہے۔

یہ صنعت، صنعت جمع کہ الٹ کام کرتی ہے... اس میں فرق بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے:

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۷۔ صنعت تجنیس:

اس کے معنی ہیں ایک ہی جنس یا ایک ہی نوع کا ہونا۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

1۔ تجنیس تام

جب شعر میں دو ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کا تلفظ ایک ہو لیکن معنی مختلف ہو تو اس شعر میں تجنیس تام کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

سب سہیں گے ہم اگر لاکھ برائی ہو گی

پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہو گی

2۔ تجنیس محرف

کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جن کے حروف یکساں ہوں لیکن حرکات و سکنات میں فرق ہو۔ مثلاً:

یہ بھی نہ پوچھا کسی صیاد نے

کون رہا کون رہا ہو گیا

3۔ تجنیس مضارع

جب دو لفظوں کے بعض حروف مختلف ہوں اور ان میں ایک حرف سے زیادہ قریب المخرج ہوں یعنی ان کو ادا کرنے میں حلق کا ایک ہی حصہ یا اس کے قریب کا حصہ کام میں لایا جائے۔ مثلاً:

زندگی بھی ہم سے ہے بیزار سے

زندگی سے بھی ہیں ہم بیزار سے

۸۔ صنعت اشتقاق:

جب کلام میں ایک اصل کے چند لفظ لائے جائیں اور ان لفظوں میں اصل لفظ کے حروف کی ترتیب بھی قائم رہے اور اصل میں جو معنی ہیں اس سے بھی موافقت ہو تو اسے صنعت اشتقاق کہتے ہیں۔ مثلاً:

تو مرے حال سے غافل ہے پرائے غفلت کیش

ترے انداز تغافل نہیں غفلت والے

۹۔ صنعت تکرار یا تکریر:

تکرار یا تکریر ایسی صنعت کو کہتے ہیں جس میں دو لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہوں اور شعر یا مصرعوں میں برابر جمع کئے جائیں۔ بالفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لفظوں میں جب کسی شعر یا مصرعے میں ایک لفظ کی تکرار کی جائے یعنی بار بار آئے۔ مثلاً:

پتھر کو گوہر کہہ کہہ کر

بدتر کو بہتر کہہ کہہ کر

ہم نے ماحول بگاڑا ہے

رہزن کو رہبر کہہ کہہ کر

۱۰۔ صنعت ترصیع:

شعر کے دونوں مصرعوں میں ترتیب کے ساتھ ایسے الفاظ لائے جائیں جو ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں۔ مثلاً:

تیرا حسن ہے عالم عالم

میرا عشق ہے تنہا تنہا

۱۱۔ مراعات النظیر:

کلام میں ایسے الفاظ جمع کئے جائیں جن کے معنی میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک نسبت واقع ہو لیکن یہ نسبت تضاد و تقابل کی نہ ہو مراعات النظیر کہلاتا ہے۔ مثلاً:

کہاں ہے ساقیئ محفل؟ کہاں ہیں جام و سبو؟

ہوئے عطر فشاں نغمہ بار ہے یارو!

اس شعر میں لفظ "ساقی، جام اور سبو" میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک نسبت واقع ہے جو تضاد و تقابل کی نہیں ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے، کاکل بڑھے

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

۱۲۔ صنعتِ تلمیح:

تلمیح سے مراد شعر یا کلام میں کسی مشہور قصے، واقعے، کردار، شخصیت یا مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے پیچھے پورا قصہ یا پوری تاریخ چھپی ہوتی ہے۔ مثلاً:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ بندہ نواز

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

۱۳۔ صنعت مبالغہ:

کسی شخص یا چیز کی تعریف یا مذمت اس حد تک کرنا کہ سننے والے کو یہ گمان ہو کہ اس وصف یا ذم کا کوئی اور مرتبہ باقی نہیں رہا۔ اس کی ایک قسم "غلو" ہے۔

غلو کہتے ہیں، جس بات کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ عادت اور عقل دونوں کے لحاظ سے قرین قیاس نہ ہو۔ جیسے:

آج پھر یاد آ گئے کچھ بیتے دن

آج پھر آنکھوں سے دریا بہہ گیا

عادتاً اور عقلاً دونوں لحاظ سے آنکھوں سے دریا کا بہنا قرین قیاس نہیں ہے لیکن شاعر نے "دریا" بول کر 'کثرت اشک' مراد لیا ہے۔

۱۴۔ تجاہل عارفانہ:

اس کے لغوی معنی ہیں 'جان بوجھ کر انجان بننا'۔ اصطلاح میں کسی چیز کو جاننے کے باوجود اس سے اپنی ناواقفیت ظاہر کرنا تجاہل عارفانہ کہلاتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھتے ہیں۔

بھری محفل میں اظہارِ محبت

یہ لغزش اور پھر میری نظر سے؟

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے

کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

۱۵۔ صنعت تنسیق الصفات:

جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کسی شخص یا کسی چیز کا ذکر اس کی صفات کے ساتھ کیا جائے، خواہ یہ صفات خوبی کی ہوں یا برائی کی۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

بوسہ لیتا ہے جو منھ چڑھ کے برابر گیسو

کتنا گستاخ ہے، بے ہودہ ہے خود سر گیسو

۱۶۔ صنعت تعلی:

تعلی کہتے ہیں کہ شاعر اپنے کسی شعر میں اپنی شاعری کی برائی کی طرف اشارہ کرے یا بیان کرے۔ جیسے:

ہم مزاج غزل سے ہیں خوب آشنا

ہم سے قائم ہے حسنِ غزل دوستو!

۱۷۔ صنعت مکر شاعرانہ:

کوئی ایسی بات کہی جائے جس کا اصل مقصد کچھ ہو اور ظاہر کچھ ہوتا ہو۔ جیسے:

محفل میں تم اغیار کو زر دیدہ نظر سے

منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

۱۸۔ صنعت ادماج:

شعر میں ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرنا جن سے مجموعی طور پر دو معنی یا دو مفہوم پیدا ہوتے ہوں، دونوں ہی اپنی جگہ درست، صاف اور واضح ہوں، قاری کو اختیار ہے کہ وہ کسی ایک معنی و مفہوم کو قبول کرے اور دوسرے کو رد کر دے اس فیصلے کی صحت قاری کے فہم و ادراک پر ہے۔ اسے ادماج کہتے ہیں۔ جیسے:

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۱۹۔ صنعت عاطلہ:

ایسا کلام خواہ نظم ہو یا نثر جس میں کوئی حرف نقطہ دار نہ ہو صنعت عاطلہ کہلاتا ہے۔ جیسے:

اور کسی کا آسرا ہو سر گروہ اس راہ کا

آسرا اللہ اور آل رسول اللہ کا

۲۰۔ صنعت ردالعجز:

دوسرے مصرعے کے دوسرے ٹکڑے کے تکرار کو ردّالعجز کہتے ہیں

پیر و مرشد کا پیدا ہوا

خوش ہر ایک طفل و جوان و پیر ہے

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ؕ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ

شرح مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

بشنو از نَے چون حکایت میکند

از جدائے ہا شکایت میکند

ایرانی نسخہ میں یوں لکھا ہے۔

بِشُنو این نِی چون شِکایَت می کُند از جُدایِی ہا حِکایَت می کُند

بشنو: سنو۔۔۔نَے: بانسری: روح، سرکنڈا۔۔۔از: سے۔۔۔حکایت: کہانی۔۔۔وز: حقیقت میں، دراصل۔۔۔جدائے ہا: علیحد گی

ترجمہ: بانسری سے سنو کیا حال سناتی ہے اور ہجر و فراق کی کیا شکایت کرتی ہے۔

بانسری سے سن! کیا بیان کرتی ہے درد و جدائی کی (کیا) شکایت کرتی ہے

نَے استعارہ بالتصریع (استعارہ بالتصریح جس میں فقط مشبہ بہ کا ذکر کریں۔ مثلاً چاند کہیں اور معشوق مراد لیں۔) ہے، انسانی روح کے ساتھ۔

تشریح:

حضرت مولانا رومیؒ بیان کرتے ہیں۔ کہ بانسری سے سن! کیا کہتی ہے اور وہ جدائیوں کی کیا شکایت کرتی ہے؟ کہ جب سے مجھے بنسلی سے کاٹا ہے میرے نالے سے مرد و عورت سب روتے ہیں-میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو، تاکہ میں اسے عشق کے درد کی تفصیل سناؤں-جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے-میں ہر مجمع میں روئی خوش حال اور بد احوال لوگوں کے ساتھ رہی-ہر شخص اپنے خیال کے مطابق میرا یار بنا مگر میرے اندر سے اس نے میرے رازوں کی جستجو نہ کی-میرا راز میرے نالے سے دور نہیں ہے لیکن آنکھ اور کان کے لئے نور نہیں ہے-(یعنی سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے)

"نَے" سے مراد انسانی روح کا وجود ہے جو ارواح کی دنیا میں (ملکوت) عشق اور حق کی معرفت میں مصروف تھی، لیکن جسموں کی دنیا (ناسوت) جو جسمانی صفات (شہوت اور غصہ) پر منحصر ہے۔ میں داخل ہو گئی ہے۔

محبت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا یا کسی کامل انسان کی گفتگو اور اہل محبت سے ملاقات بلاشبہ حقیقت کی دریافت اور اس کی اصلی حالت کی یاد دلانے کا باعث بنتی ہے اور جب یہ کیفیتیں ختم ہو جاتی ہیں تو انسان کو افسوس ہوتا ہے اور افسوس کا اظہار ہوتا ہے یہاں اس ندامت اور پشیمانی کو تنکے سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ روح کی بہت سی مطلوبہ صفات ہیں اور جب انسان ان میں سے ہر ایک سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کے وجود میں تھوڑی سی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ شروع میں ایک خاص سوال کیا جا سکتا ہے کہ مولاناؒ کی مثنوی رب کی حمد سے کیوں شروع نہیں ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نصوص کی تحریر میں رب کی حمد و ثناء سے شروع کرنا ضروری نہیں ہے، اور زبانی حمد بھی کافی ہے، جس طرح کھانے پینے سے پہلے اللہ کی حمد لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اسی حد تک، زبانی تعریف ہی کافی ہے۔

نَے

یہ ایک پودا ہے، اور آپ تالاب یا ندی یا جھیل وغیرہ کے کنارے جاتے ہیں تو وہاں اگا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے نڑا، نرکل کہتے ہیں جو درمیان سے کھوکھلا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے بانس اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔

بعض مقامات، اور علاقوں میں، ایک خاص دن، مغرب کی اذان کے بعد، وہ سرکنڈوں کے جھاڑیوں میں آگ چھوڑ دیتے ہیں، اور یہ جلن صبح تک جاری رہتی ہے۔

آدھی رات میں، جب سرکنڈے جلتے ہیں، عجیب اور پراسرار آوازیں سنائی دیتی ہیں، اور صبح تک ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ صبح سویرے اور طلوع آفتاب سے پہلے وہ جلے ہوئے سرکنڈوں پر جاتے ہیں۔ کچھ سرکنڈے جلے نہیں ہوتے اور پھلیاں کے ساتھ تلے یا پکائے جاتے ہیں۔

ان میں سے تلی ہوئی سرکنڈوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے، کچھ سرکنڈے جن کی سات پٹیاں ہوتی ہیں اور ایک میٹر سے بھی کم ہوتی ہیں، اصلی سرکنڈوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، کچھ کو بانسری، لبک سرکنڈے، ڈبل سرکنڈے، قشمہ وغیرہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ جو سرکنڈے بنائے جاتے ہیں، انہیں اس وقت تک جلنے کا راز بتانا ضروری ہے جب تک کہ وہ کھل نہ جائیں۔

جناب رومیؒ کے عرفان کے تین مراحل ہیں: جاننا، دیکھنا اور بننا.........بننا بہت ضروری ہے۔

یہاں سنو، سننا احساس نہیں ہے، یہ مقدس و محترم عمل ہے، جس کا مطلب ہے: سیکھ جاؤ! لیکن تمہیں یہ کام نی سے سننا پڑے گا.....

یہاں، بھوسا، سرکنڈا، نرکل ایک روحانی انسان کی مثال ہے جو خواہشات سے پاک ہے....

نی سے سننے کا مطلب ہے خدا کے ولی سے سننا، وہ جو خواہشات سے پاک ہے اور اس پر نفخ الٰہی کا اثر ہوتا ہے۔

لیکن ایسے شخص کے پاس کہانیاں ہیں... اس کی سب سے اہم کہانی جدائی کی کہانی ہے!۔۔۔۔

انسان کو بھوسے سے کیوں تشبیہ دی جاتی ہے؟

اس شعر میں انسان کو سرکنڈے سے تشبیہ دی گئی ہے، انسان اور سرکنڈے کی مماثلت کو اس شعر میں بہت خوبصورت اور حیرت انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شعر میں جناب مولانا جلال الدین رومیؒ کا روحانی جوش پوری مثنوی میں ان کی ذہنی کیفیت کو ایک نہایت ہی پرکشش تمہید کی طرح ظاہر کرتا ہے اور اس کتاب کے تمام موضوعات کو ایک بہترین فہرست کی طرح سمیٹتا ہے۔

نیز اس شعر میں جناب رومیؒ کی محبت کی جلن اس قدر عظیم ہے کہ اس میں جدائی کی آگ میں جلتے ہوئے انسان کا چہرہ سرکنڈہ نظر آتا ہے۔

پہلی تمثیل جس کا اظہار وہ انسان اور تنکے کے درمیان کرتے ہیں وہ ہے اصل سے جدائی کا نوحہ۔

جیسے کوئی سرکنڈہ آپ کے لیے اصل (نستان) سے ہٹ کر چیختا ہے۔ بعینیہ، انسان اپنے اصل سے الگ ہونے کی شکایت کرتا ہے، جو فطرت اور الہی قرب کے دائرے سے باہر ہے. انسان اپنے غیر موجود (اپنی اصل حیثیت) میں اپنے ساتھیوں (افراد) کے ساتھ ہیں اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے کلچر کی وجہ سے وہ پاکیزگی، روحانیت اور اتحاد سے بھری ہوئی دنیا میں رہتے ہیں، اس لیے اس دنیا میں فطرت، تمام خیالات اور کوششیں اور اس کی دعائیں وہ چیخیں ہیں جو اس پہلی جگہ کی تلاش میں گونجتی ہیں۔

۞ کوئی ان چیخوں کا صحیح مفہوم سمجھ سکتا ہے اگر وہ اپنے آپ سے آگاہ ہو تو یہ آگہی اس میں سچی محبت پیدا کرے گی اور اس اصول کی طرف لوٹنے کی خواہش اس کے دل میں شعلے بھڑکا دے گی۔

فلسفیوں، صاحب عرفان بزرگوں اور شاعروں کی ایک بڑی جماعت نے انسان کا سرکنڈے سے موازنہ کیا ہے، ان میں حکیم صفا کہتے ہیں:

بر شهیدان کوی عشق بسرخ روئی علم نگردد

هر آن نالد بناله ءنی چونی بهر جا کمر نبندد

کوئی عشق کے شہیدوں کا پتہ نہ چلا سکے

جو اپنی کمر کو سرکنڈے کی طرح کہیں نہ باندھے ہوئے ہیں۔

۞ ماہرین بشریات کے ایک اور گروہ نے انسان کو سرکنڈے سے تشبیہ نہیں دی ہے بلکہ سرکنڈے کو سچائیوں اور حقیقتوں کے اظہار کے وسیلہ کے طور پر متعارف کرایا ہے اور انسان کے ماورائے فطرت سے ہجرت کی کڑواہٹ اور جلن سے بڑھ کر کون سی کڑواہٹ اور جلن ہے جو اس کا اصل مقام تھا؟

جبران خلیل جبران اس گروہ میں سے ایک ہیں جو انسانی مصائب کی نشاندہی کرنے کے لیے سرکنڈوں کا استعمال کرتے ہیں۔

اگر تم چاہتے ہو کہ ان اسرار کی خوبصورتی تم پر آشکار ہو تو عبادت کی عرفی عادت چھوڑ دو جو، تخیل کی بت پرستی ہے۔ مطلب کہ دل و جان سے اللہ کی عبادت کرو اور الست وبربکم۔۔۔ قالوا بلیٰ، والی کیفیت میں ڈوب جاؤ۔

مخلوقات نے جو کچھ سنا ہے اسے بھول جاؤ اور جو کچھ تم نے سنا ہے اسے نظر انداز کر دو اور جو مصیبت تمھیں پہنچے سوائے دل کی زبان سے نہ مانگو تا کہ تم پر حقیقت آشکار ہو جائے۔

جس جنت کا وعدہ انہوں نے عوام سے کیا ہے وہ مراعات یافتہ طبقے کی جیل ہو، عوام سے مانگنے کی جنت ہو، اس قبیلے کو نور و فضل کی زنجیروں سے جکڑ کر جنت کی طرف گھسیٹنا غلطی ہے، نہ جانا اور نہ ماننا۔

بڑی کوشش فرعون کی بیوی آسیہ کی طرح ہونی چاہیے جو دعا کرتی ہے: وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا امۡرَاَتَ فِرۡعَوۡنَ ۘ اِذۡ قَالَتۡ رَبِّ ابۡنِ لِیۡ عِنۡدَکَ بَیۡتًا فِی الۡجَنَّۃِ وَ نَجِّنِیۡ مِنۡ فِرۡعَوۡنَ وَ عَمَلِہٖ وَ نَجِّنِیۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾

اور اللہ مسلمانوں کی مثال بیان فرماتا ہے فرعون کی بی بی جب اس نے عرض کی اے میرے رب میرے لیے اپنے پاس جنّت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے کام سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات بخش۔

{وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ: اور اللہ نے مسلمانوں کیلئے فرعون کی بیوی کو مثال بنادیا۔} اس آیت میں مسلمانوں کے لئے مثال بیان فرمائی جا رہی ہے کہ انہیں دوسرے کا گناہ نقصان نہیں دے گا۔ اس کا پسِ مَنظر اور خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے جادوگروں کو مغلوب کیا تو فرعون کی بیوی آسیہ آپؑ پر ایمان لے آئیں، فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے انہیں سخت سزا دی اور چار میخوں سے آپؑ کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے، سینے پر بھاری چکی رکھ دی اور اسی حال میں انہیں سخت دھوپ میں ڈال دیا۔ جب فرعون کی سختیاں بڑھ گئیں تو حضرت آسیہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی: اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں گھر بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا جنتی مکان ان پر ظاہر فرمایا اور اس کی خوشی میں ان پر فرعون کی سختیوں کی شدّت آسان ہو گئی۔ پھر عرض کی: مجھے فرعون، اس کے کفر و شرک اور ظلم سے نجات دے اور مجھے فرعون کے دین والے ظالم لوگوں سے نجات عطا فرما، چنانچہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی روح قبض فرمالی۔ (تو جس طرح فرعون کے کفر نے حضرت آسیہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا کو

کوئی نقصان نہ پہنچایااور اس کی وجہ سے آپ کو کوئی عذاب نہیں ہوا اسی طرح مسلمانوں کو ان کے رشتہ داروں کا کفر نقصان نہیں پہنچائے گا اور ان کے کفر کی وجہ سے مسلمانوں کو عذاب نہ ہو گا۔)(خازن، التحریم، تحت الآیۃ: ۱۱، ۴ / ۲۸۸، جلالین، التحریم، تحت الآیۃ: ۱۱، ص۴۶۶، ملتقطاً)

آیت " اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ " سے حاصل ہونے والی معلومات:

اس آیت سے 3 باتیں معلوم ہوئیں

(1)... جنت میں وہ گھر زیادہ درجے والا ہے جس میں بندے کو اللّٰہ تعالیٰ کا قرب زیادہ ہو۔

(2)... اللّٰہ کی محبت میں اس سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا اور دعا کرنا جائز ہے۔

(3)...اللّٰہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرنا، اس کی بارگاہ میں التجائیں کرنا، مشکلات اور مَصائب میں اس سے خلاصی کا سوال کرنا نیک بندوں کی سیرت ہے۔

بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ اس تنکے کا مطلب خود جناب رومیؒ کا وجود ہے۔

شمس تبریزیؒ ظاہری طور پر امی تھے لیکن ان کا سینہ محبت اور علم الٰہی سے معمور تھا۔ شمسؒ کی محبت، عشق کے پودے کی طرح، جناب رومیؒ جیسے عاشق کے وجود کے درخت کے گرد لپٹی اور اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ لیا، یہاں تک کہ اسے اپنے وجود میں غرق کر دیا، جو حق کے نمائندہ کا وجود تھا۔

جناب رومیؒ نے جناب شمس تبریزیؒ کے گھر کی مٹی کو اپنے خون جگر سے معمور کر دیا تھا جس کی روشن مثال اسیدنا یعقوب علیہ السلام کی سی تھی جو سیدنا یوسف علیہ السلام سے جدائی کے وقت سے ہمیشہ گریہ میں رہتے تھے، اسی طرح وہ جناب شمسؒ سے جدائی کی وجہ سے ہمیشہ روتے رہتے۔

جس کے پاس عشق کی ہوا ہے اور جس کے پاس خالص تعلق ہے اور اس کے آقا و قائد پر انحصار ہے، عاشق کی یہ ہوا روح کی ہوا ملنے سے فنا اور ختم ہو جاتی ہے۔ جب وہ مفکر جو حسن کا مالک ہے اور مردہ وجود کو زندہ کرتا ہے، سالک کی طرف توجہ کرتا ہے تو یہ وجود کے کیمیا کی طرح ہوتا ہے۔ جس سے عام دھات بھی خاص میں بدل جاتی ہے اور جو ناخالص کو خالص بنا دیتی ہے۔

نَے کون ہے؟

'نی' جناب مولاناؒ خود ہیں۔

'نے' ایک ایسے انسان کی تمثیل ہے جو دنیا سے بچھڑ کر سات بندھنوں پر مشتمل ہے اور نوحہ و گریہ وزاری میں مصروف ہے۔ اور وہ آہوں کے ساتھ بولتا ہے اور ہجرت اور جدائی کو بیان کرتا ہے۔ 'نی' خود مولانا کا نام ہے اور مولاناؒ کی کتاب کا پہلا شعر پوری کتاب کو بیان کرتا ہے!

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ میں ایک تنکا ہوں جو جدائیوں سے رو رہا ہوں اور میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ میری آہیں سنو!

ایک صوفیانہ اور جلے ہوئے سینے والا وہ شخص ہے جو ہجران یار کے بخار میں رہتا ہے اور ہجران کا یہ بخار اس کا وزن کم کر دیتا ہے اور اس کے اندر آگ جلا کر اسے آگ سے بھر دیتی ہے۔ عام طور پر جب وہ سرکنڈے یا بانس کو کاٹ کر اسے آلے میں تبدیل کرنا چاہتے تھے تو اس پر سوراخ کر دیتے تھے تا کہ ہوا وہاں سے باہر نکل جائے اور اسے اندر سے جلا دیتے تا کہ وِلی غائب ہو جائے اور صاف آواز نکلے۔ ایک اور استعارہ یہ ہے کہ جب نے یعنی بانسری میں ہوا پھونکی جاتی ہے تو ہوا کا ایک ورل پول (whirl pool) (بھنور) بن جاتا ہے۔ اب اس بھنور میں جو ڈوب جائے یا تو تہہ پا لیتا ہے یا پھر چکروں میں لگ جاتا ہے اور تنکے کی طرح گردش میں ڈوبا ہوتا ہے۔ تو گویا وہ تنکۂ محبت میں آدمی ہے!

محبت کرنے والے لوگ عام طور پر کم کھاتے ہیں اور وزن کم کرتے ہیں۔ محبت سات انسانی چکروں کو کھولتی ہے۔ اور جناب رومیؒ نے محبت میں مرد کے لیے تنکے کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ کیونکہ سرکنڈوں کی سات شاخیں ہوتی ہیں اور انسانوں کے سات چکر یا سات روشنی کے دروازے ہوتے ہیں۔

اور جناب رومیؒ یہاں خود کو سات فعال چکروں کے ساتھ ایک انسان کے طور پر بیان کرتے ہیں!

نَے سے مرادِ خاص

نے سے مراد روح انسانی ہے۔اور یہ ایک ایسی جگہ کے بارے میں بتاتے ہیں جہاں اصل مسئلہ کا تعلق ہے!

اصل مسئلہ کہاں ہے؟

تصوف کہتا ہے کہ ہم اپنی اصل سے بہت دور ہیں (اس لیے نہیں کہ ہمیں جنت سے نکالا گیا تھا، کیونکہ جنت میں ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی جس سے ہم دور جانے کی فکر کرنا چاہتے ہیں)، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ روحِ الٰہی سے دور ہو جانا... ہم میں سے ہر انسان دنیا میں الٰہی روح کے قطرے ہیں۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ اچھے انسان ہیں یا برے، ہر حال میں آپ روح الٰہی کا ایک ذرہ ہیں، جو روح الٰہی کے سمندر میں، ذرہ جیسا ہے...

اس کا مطلب ہے کہ تم وہ قطرہ ہو جو سمندر میں ہے۔اور قطرے سمندر میں واپس جانا پسند کرتے ہیں۔

ھر کسی کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روز گار وصل خویش

ہر وہ شخص جو اپنی اصل سے دور رہا۔

اپنی پچھلی زندگی کا دوبارہ جائزہ لیں۔

ہم اپنے اصل سے دور رہے ہم وہ قطرے ہیں جو سمندر سے جدا ہوئے ہیں اور ہم ہمیشہ لوٹنا چاہتے ہیں۔

آپ کے دل میں ہمیشہ ایک عجیب احساس محرومی رہتا ہے کہ اگر آپ خوشی اور محبت کے بہترین حالات میں ہوں تب بھی آپ کو کمی محسوس ہوتی ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ کچھ کمی ہے۔ یعنی اگر انسان کو بہترین سہولتیں میسر ہوں تب بھی کمی کا احساس ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہی کمی روح کو محسوس ہوتی ہے۔

ہماری روح، روحِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے پنکھ کھینچتی ہے، یعنی قطرہ سمندر میں شامل ہونا پسند کرتا ہے۔

ہم مکمل سلامتی اور امن تک پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن مکمل امن کبھی بنی نوع انسان کو نہیں ملتا۔ جب تک کہ اس کی روح، روح الٰہی کے ماخذ سے متصل نہ ہو۔

یہاں تک کہ تفریح و نشاط کے عروج پر، جب ہم اکیلے اور خاموش ہوتے ہیں، ہمیں لگتا ہے کہ ہم کچھ اور چاہتے ہیں؛ اور یہ کہ ایک چیز کا عام طور پر دوسرا امکان نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم اندر ہی اندر کھوئے ہوئے ہیں!

تعارف کے آغاز میں جناب رومیؒ کہتے ہیں: ہمیں ایک قطعی تعلق تک پہنچنا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے دیکھنا!

انسان جب غمگین ہو جاتے ہیں، جب ان کا دل اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے تو اُن کے دل کانپتے اور ڈرتے ہیں۔

کیونکہ وہ محبوب سے دور ہوتے ہیں اور جب محبوب کے پاس پہنچتے ہیں تو راحت پاتے ہیں۔ 'محبوب ہمارے جسم سے باہر نہیں ہے'۔

ہمارے وجود میں محبوب!

جب ہم کائنات کے رازوں اور تصوف کے رازوں کے ساتھ اپنی باطنی محبت کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں، تب ہم آسانی اور سکون کے ساتھ پہنچ جائیں گے اور ہمارے تمام دکھ اور جدوجہد ختم ہو جائیں گی۔

جناب رومیؒ فرماتے ہیں کہ میں جدائی کی شکایت کر رہا ہوں!

بشنو این نی چون حکایت می کند

از جدایی ہا شکایت می کند

سنو کہ وہ کس طرح جدائی کی بات کرتے ہیں اور جدائیوں اور ایام ہجران کی تسبیح کرتے ہیں۔

اس کو خود سے جدا کیا میں نے

بس یہی جرم کیا اور کیا کیا میں نے

نہیں، یہ ایک کامل انسان کی تمثیل ہے۔ جناب رومیؒ سے پہلے صوفیاء کے لیے سرکنڈے کو انسانی وجود کی علامت سمجھنا عام تھا، مثلاً شیخ احمد غزالی نے رسالہ براق میں ایک جگہ سرکنڈے (= قصب) کا ذکر کیا ہے اور اسے انسانی فطرت کا راز قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ حدیقہ صنعاء اور سیرت آباد صنعاء پر ذل اوحد الدین رازی میں بھوسے کے درد اور جلنے اور انسانی حالت سے اس کے تعلق کے حوالے موجود ہیں۔

مثنوی کے شارحین نے نےَ کے معنی کو مکمل انسان سمجھا ہے۔ ان میں عبدالرحمٰن جامی، یعقوب چرخی، اسماعیل انقروی۔ پچھلے شارحین سے متاثر ہو کر نکلسن کہتے ہیں: اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ نی، سرپرست یا کامل انسان کی روح کی نمائندگی کرتا ہے، جو "نستان" (سرکنڈوں کا علاقہ) سے علیحدگی کی وجہ سے ماتم کر رہا ہے، یعنی روحانی دنیا جس کا وطن وہاں تھا۔ مادی وجود سے پہلے اور دوسروں میں بھی اپنے حقیقی وطن کے لیے وہی آرزو زندہ کرتی ہے۔ نیز، خاص طور پر یہاں کا تنکا یا تو حسام الدین کی طرف اشارہ ہے (جس کے ساتھ شاعر صوفیانہ طور پر ایک ہے) یا یہ خود شاعر کی علامت ہے کہ اس کا وجود الٰہی نفحات سے بھرا ہوا ہے اور وہ اسے اس کی شکل میں بہا دیتا ہے۔ استعارہ دیوان شمس اور روحانی مثنوی دونوں میں ملتا ہے۔

یہاں مناسب ہے کہ "کامل انسان" کی اصطلاح کے بارے میں مختصر وضاحت کی جائے: کامل انسان کی بحث ایک وسیع ترین صوفیانہ موضوعات میں سے ایک ہے، جس کا تعلق ابن عربی کے تصوف سے ہے۔ اور اس کے بعد تصوف کے درمیان یہ تعبیر یہاں تک پھیل گئی کہ اس موضوع پر متعدد مقالے لکھے گئے۔ ابن عربی نے فصوص الحکم، فص آدمی میں اس میدان میں وسیع بحث کی ہے۔ وہ انسان کو ایک جامع کائنات سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عرفان کی اصطلاح میں کائنات وجود کی دنیا ہے۔ انسان وجود کا اجداد ہے اور انسان دراصل دنیا کی روح ہے اور دنیا اس کا جسم ہے۔ یعنی دنیا انسانوں پر غور کیے بغیر ایک مردہ اور ٹھوس جسم ہے۔ اس وجہ سے ابن عربی کہتے ہیں: اگر یہ موجود نہ ہوتا تو یہ ایک مردہ جسم کی طرح ہوتا جس میں روح نہ ہو۔

اس طرح کامل انسان کو پوری کائنات کا نقل سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ عزیز الدین نسفی کہتے ہیں:

جان لو کہ ہر چیز بڑی دنیا میں ثابت ہوتی ہے، اس قول کے سچ ہونے کے لیے اس کا خاکہ چھوٹی دنیا میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا کی نقل اور خاکہ ہے۔ اور ہر وہ چیز جو بڑی دنیا میں ہے چھوٹی دنیا میں اس کا خاکہ ہے۔ شیخ محمود شبستری کامل انسان کی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ آپ کی جگہ سے ایک قدم بہتر ہے۔

دنیا چھوڑ کر اپنے آپ میں دنیا بن جا اور واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں

پتے ٹوٹ گئے ڈالی سے یہ کیسی رت آئی

مالا کے منکے بکھرے ہیں دے گئے یار جدائی

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ. فصلت:53

ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں اور خود اُن کی ذاتوں میں دِکھا دیں گے۔"

شیخ فرماتے ہیں: عالم اصغر ایتنا فی انفسھم کے عنوان کے تحت ہے اور عالم اکبر آیتنا فی الآفاق کے عنوان کے تحت ہے۔ عالم اصغر سے مراد انسان کی ذات اور اس کے مختلف اعضاء، سر، دماغ، آنکھیں، ناک، کان، بطن، پھیپھڑے، گردے اور دل وغیرہ ہیں۔

جبکہ عالم اکبر میں وہ ساری کائنات ہے جو اللہ رب العزت نے تخلیق فرمائی ہے جس میں سورج، چاند، سیارے، ستارے، کہکشائیں، الغرض قدرت کے تمام مناظر عالم اکبر کا حصہ ہیں۔

شیخ محمد لاہیجی (9 ویں صدی کے ایک صوفی سے) مذکورہ آیت کی تشریح میں کہتے ہیں: جان لو کہ انسان تمام روحانی اور جسمانی دنیا کا برگزیدہ اور نقل ہے۔ پھر ابن عربیؒ کہتے ہیں: اور وہ آنکھ کہ آدمی کی حقیقت ہے، آنکھ کی آنکھ سے۔ "رب العالمین کا تناسب آنکھ کی

پتلی اور آنکھ کا تناسب ہے۔اور دیکھنا ایسا ہی ہو گا۔"لیکن ایک کامل انسان کی نشانیاں اور خصوصیات اس طرح بیان کی گئی ہیں: کامل انسان وہ ہے جو چار چیزوں میں کامل ہو: اچھا قول، اچھا عمل، اچھا اخلاق اور علم۔ ایک کامل انسان کا سرکنڈے سے موازنہ یہ ہے کہ وہ دنیاوی رشتوں اور جسمانی ہواؤں سے خالی ہے۔ جس طرح ایک مکمل سرکنڈہ سرکنڈے کی عکاسی نہیں کرتا، اسی طرح ایک شخص جو جسمانی خواہشات اور دنیاوی لگاؤ سے بھرا ہوا ہے وہ الہی سرکنڈے کی عکاسی نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں جناب رومیؒ نے ایک تمثیلی اور ولولہ انگیز بیان کے ساتھ انسان کے اس کی اصل سے جدا ہونے کو بیان کیا ہے۔

مکمل بغور پڑھنے کی اپیل ہے؛ تاکہ آئندہ کی تشریحات میں آپکو مثنوی کی حقیقت سمجھ آسکے اسلیئے وضاحت زیادہ کی گئی ہے

مولانا جلال الدین روم علیہ الرحمہ نے "مثنوی" بانسری کے بیان سے شروع کی ہے اور بانسری کا ذریعہ اسرار و معارف کے جو مضامین بیان کئے ہیں، وہ کسی اور ساز سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ (بانسری کا تعلق روحانیت والوہیت سے بطور تمثیل پیش کیا گیا ہے) مولانا نے بانسری کی تشبیہ سے رُوح کہ ماہیت اور اسکے جزیات کو دلنشین اور دلسوز طریقہ پر پیش فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جس طرح بانسری کے دِلسوز نغمے اس بناء پر ہیں کہ وہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے اور اس کے نغموں کا سوز و گداز نیستاں سے جدا ہو جانے کی بنیاد پر ہے۔ اس طرح رُوح انسانی چونکہ روح الارواح، ہستی مطلق (یعنی خدا) سے جدا ہو کر اس عالم شہود (گوشت پوست کی مادی دنیا) میں آئی ہے۔ لہٰذا اِسکا اضطراب اور بے چینی بھی اسی بنیاد پر ہے۔ اور جب تک (رُوح) اپنی اصل (خدا) کی طرف واپس نہ ہو جائے گی اُسکو سکون حاصل نہ ہو گا۔

جیسا کہ قرآن پاک میں مزکور ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ (سورۃ الفجر)

ترجمہ:

"اے اطمینان والی جان۔ اپنے ربّ جَلَّ جَلَالُہٗ کی طرف اِس حال میں واپس آ کہ تُو اُس سے راضی ہو وہ تُجھ سے راضی ہو"۔

رُوح اُسکی مُنتظر ہے؛ جب تک اُسکو یہ پیغام نہ مل جائے گا اُسکو سکون اور چین، نصیب نہ ہو گا۔ اور وہ بانسری کی طرح اپنے درد و فراق کا اِظہار کرتی رہے گی۔

یہی مضمون جو مولانا نے شروع کیا ہے، مولانا کی پوری مثنوی میں پھیلا ہوا ہے.

اب ہم بانسری کی تمثیل سے مولاناؒ کی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ (علیہ الرحمہ) کِس قدر جزبۂ عشق الٰہی جَلَّ جَلَالُہٗ میں سرشار تھے۔ اور آپ کے اندر کس قدر عشق و گداز موجزن تھا۔ اور وصالِ محبوب جَلَّ جَلَالُہٗ کیلیئے کس قدر بے تاب رہتے تھے۔ اِس میں کوئی

شک نہیں، کہ اُنکو وصالِ یار میسر آچکا تھا۔ لیکن یہ عشق کی داستان ہی عجیب ہے کہ اس میں وِصال ہو یا فِراق، کیفیت اضطرابی رہتی ہے۔

اور یہ اضطرابی کیفیت عاشق کیلیئےایسی ہوتی ہے کہ بظاہر اضطراب ہو تا ہے لیکن باطن میں راحت و سکون محسوس ہو تا ہے۔ اسلئے جُوں جُوں عاشق، طالبِ حق کے عقدے (حِجابات) کُھلتے جاتے ہیں تسلیم و رضا کے اِسرار و رموز واضح ہوتے چلے جاتے ہیں، گویا "سُکھ ہوں یا غم" عاشق "تسلیم و رضا" کا پیکر بن جاتا ہے۔

اب آتے ہیں حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ کی مثنوی کے پہلے شعر کی طرف کہ جس میں بے انتہا رمزیں پوشیدہ ہیں۔

بشنوز از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

ترجمہ :

سُن بانسری سے سُن کہ وہ کیا بیان کر رہی ہے

یہ اپنی جدائی کی شکایت کر رہی ہے

مراد یہ ہے کہ:

بانس کے درخت کا حصہ تھی اسکو وہاں سے کاٹا (جُدا کیا) گیا۔ اور پھر اسکو آگے بانسری کی شکل دی گئی۔ یعنی اسکی شکل تو بدل گئی مگر اسکا اصل نہ بدلا، اب جب بھی اسکو کسی انسان نے بجایا تو اس نے اپنی اصل کی آواز نکالی کہ میں اصل میں ایک بانس کا حصہ تھی۔ اور جب بانس سے کٹی تو میرا یہ رنگ روپ جدا ہو گیا اور میں کسی اور کے استعمال میں آگئی۔ لیکن اصل, چونکہ جو اسکا تھا، وہ اصل ہی تھا, جب اسکو بجایا گیا تو اسکے اندر کی جو آواز قدرت نے رکھی تھی وہ باہر نکلی۔ اور اس نے بتایا اے لوگو! تم تو میری آواز سے محظوظ ہو رہے ہو، خوش ہو رہے ہو۔ لیکن اصل میں میرا آہ و فغاں ہے جو اپنی جدائی کے غم کو بیان کر رہا ہے، اور اپنے فراق کو سب پر عیاں کر رہا ہے۔ لوگوں نے تو بس ایک ساز تلاش کر لیا، چونکہ اس کی ایک مسحور کن آواز ہوتی ہے تو لوگ اس سے محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی جدائی کا نالہ رو رہی ہوتی ہے۔

* خُلاصہ کلام *:

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنے اصل کی یاد میں جب کوئی محو ہو جاتا ہے تو اپنے اصل کے غم میں صحیح معنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ جو

بھی آواز نکالے پُر تاثیر بن جاتی ہے کیونکہ اُس آواز کے اندر رنگِ حقیقت ہوتا ہے۔ اصل کی طرف لوٹنا چونکہ حقیقت ہے تو فراق کی آواز دراصل حقیقت کی طرف جانے کا ذریعہ ہے۔

مولاناؒ نے بانسری کی یہ مثال دے کر حقیقتِ انسان کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ شعر معرفت سے لبریز ہے۔ ایک بہت بڑا خزانہ ہے اور حقیقت کا درس دیتا ہے۔

ایک بزرگ کا قول مجھے یاد آرہا ہے کہ:

"* مثنوی مولانا روم؛ اہلِ علم سے نہیں، اہلِ باطن سے پڑھنی چاہیے"۔*

کیونکہ اہلِ علم اِسکے ظاہر پر جائیں گے۔ اور اہلِ باطن اصل معنی تک پہنچ کر طالب کو علمِ حقیقت سکھادیں گے۔ آگے طالب جتنی توجّہ کرے گا اُتنا (علمِ معرفت) نصیب ہوتا جائے گا۔ تو اِس طرح مولانا کی اِس مثنوی کے ہر، ایک شعر میں رنگِ حقیقت دکھائی دیتا ہے۔

مولاناؒ نے بانسری کی مثال اسلیئے دی ہے کہ: درخت سے کٹ کر اپنی جُدائی کے صدمے کو بیان کرتی ہے۔ اور لوگ اِسکی آواز سے محظوظ ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ (انسانی روح کی شکل میں بانسری) رَو رہی ہے۔ وہ دعوت دے رہی ہے کہ اے انسان! میں اپنی اصل سے کٹ کر اُسکا ذِکر کر رہی ہوں۔ اُسکو یاد کر رہی ہوں، تو تُو کیوں بے خبر ہے؟ تُجھے بھی چاہیۓ دھیان کر اور اُسکو یاد کر! گویا انسان اور بانسری کی اصل تو ایک ہے مگر، شکل بگڑ گئی، بانسری اپنی جدائی کا غم رو رہی ہے جسکو انسان ایک اچھا ساز سمجھ رہے ہیں، لیکن انسان اپنی اصل کو بھول بیٹھا ہے اور یہاں مختلف کاموں میں لگ گیا ہے۔ بانسری یہ کہ رہی ہے کہ اپنی اصل پر توجہ کرنی چاہیۓ اور یہی درسِ حقیقت ہے کہ جہاں سے ہم آئے تھے، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ بانسری کی اصل سے (مراد) بانس ہے۔ اور انسان کی اصل (مراد) قُربِ الٰہی جَلَّ جَلَالَہٗ ہے، انسان دنیا کے کاموں میں لگ گیا اور اپنے اصلی کام کو بھول گیا، ہر ہر قدم پر اصل یاد رہنی چاہیۓ یعنی کہ اپنی اصل کا ذکر کرتے رہنا چاہیۓ۔ اسلئے کہ جب انسان اپنے اصل کام (ذکرِ الٰہی جَلَّ جَلَالَہٗ) میں لگا رہے گا۔ تو اُس (انسان) کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادت بن جائے گا۔

بعض قدیم نسخوں میں یہ اس طرح بھی لکھا گیا ہے۔ اس کو نکلسن نے اپنے مسودہ میں بیان کیا ہے۔

بشنو این نی چون شکایت می کند

از جدایی ها حکایت می کند

مولوی جلال الدین مولانا رومؒ کیوں بنے؟!

اور حضرت رومی کی حد تک ترقی اور فضیلت حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ رومی کی زندگی میں شمس کے داخل ہونے سے وہ رومی بنے۔ لیکن میری ایک اور رائے ہے۔ مولانا عطارؒ نے انہیں رومی بننے کا پہلا آغاز دیا۔

جب رومی کہتے ہیں:

هفت شهر عشق را عطار گشت

ما هنوز اندر خم یک کوچه ایم

کہ عطار عشق کے سات شہروں کو سر کر چکے اور ہم ابھی اگلی گلی کے موڑ پر ہیں۔

(یہ سات شہر، طلب و جستجو، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت اور فنا کے نام سے موسوم ہیں۔)

ہم اب بھی ایک گلی کے موڑ میں ہیں؛ اس کا مطلب ہے کہ وہ جناب عطارؒ کے روحانی مقام کا جائزہ لے رہے ہیں اور وہ شیخ عطارؒ کو اتنا بڑا مقام دے رہے ہیں۔ جناب رومیؒ کے والد نے ان پر جو سب سے بڑا احسان کیا وہ یہ تھا کہ وہ انہیں بچپن میں شیخ عطارؒ جیسے بزرگ کی خدمت میں لے گئے۔

شیخ عطارؒ اعلیٰ درجہ کا شعور رکھتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ مشورہ دیتے کہ اگر آپ کے پاس اعلیٰ علم نہیں ہے تو عطارؒ کے پاس مت جاؤ۔ کیونکہ عطارؒ شعور کا ایک بہت بڑا سمندر ہے کہ اگر ہم اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اس میں غرق ہو جائیں گے۔

جب کوئی شیخ عطارؒ جیسی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی خدمت پر پہنچ جاتا ہے تو یقیناً اس کے ذہن کا سانچہ بن جاتا ہے۔

اگر آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ روبرو اور قریب سے ان لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں جنہوں نے بیداری کے لحاظ سے بہت ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ مشکل ہے، سفر کی تیاری کریں اور بزرگوں سے ملاقات کریں؛ اگر آپ کے پاس کوئی بزرگ نہیں ہیں تو ان کی قبروں پر جائیں۔ اگر کوئی قبر نہیں ہے تو ان کی کتابوں کے پاس جاؤ۔ اور اگر آپ ان کی کتابوں کو نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔

اپنے دل کو ان کے دل سے جوڑیں اور ان کا روحانی احساس حاصل کریں!

رومیؒ اپنے بچپن سے شیخ عطارؒ کے پاس جاتے ہیں اور اپنے ذہن کو بہتر بنانے کا طریقہ سیکھتے ہیں اور حضرت عطارؒ جیسا ایک بہت ہی موزوں رول ماڈل ڈھونڈا ہے اور رومی کی طرح خوشحالی کی طرف جانا ہے۔

دلا نزد کسی بنشین کہ او از دل خبر دارد

بہ زیر آن درختی رو کہ او گلہائی تر دارد

کسی ایسے شخص کے ساتھ بیٹھو جو تمہارے دل کا حال جانتا ہو۔ اس درخت کے نیچے جہاں اس کے تازہ پھول ہیں۔ براہ کرم کسی ایسے شخص کے پاس بیٹھیں جو اچھی ذہنی حالت میں ہو۔

آپ کسی ایسے شخص کا انتخاب کر سکتے ہیں جو نفسیاتی بحران کا شکار ہو اور ڈپریشن، غصے اور خودکشی کی خواہش سے بھرا ہو۔ یا آپ کسی ایسے شخص کے پاس جاسکتے ہیں جس کی روحانی حالت اچھی ہو اور وہ آپ کو ترقی دے سکے۔

اگر آپ ابھی پڑھے لکھے لوگوں سے مل سکتے ہیں اور ان سے رابطہ کر سکتے ہیں، تو آپ کا ذہن یہ سیکھے گا کہ آپ کی زندگی کا نمونہ کیا یا کون ہونا چاہیے! کیونکہ ایک شخص اپنے رول ماڈلز کے ساتھ مضبوطی سے آگے بڑھتا ہے اور اگر اس کے پاس اچھے رول ماڈل ہوں گے تو یقیناً اس کی قسمت اچھی ہو گی۔

رومی یہاں اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بہت سے علاج دماغ میں ہوتے ہیں، جسم سے نہیں!

آج کے ڈاکٹر اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ اگر کسی کی ذہنی حالت اور باطن ٹھیک ہو جائے تو اس کی بہت سی بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں اور اسے دوا کی ضرورت نہیں ہوتی اور نفسیاتی علاج سے بہت سے دکھوں اور تکالیف کو دور کیا جا سکتا ہے۔

سالک، جو اپنی زبان سے محبت کرتا ہے، بولنے سے قاصر ہے۔ وہ درد دیکھتا ہے۔ وہ علاج جانتا ہے۔ لیکن کتنی دھیمی زبان سے نئے سے سر نکالتا ہے۔ اللہ! اللہ! وہی روح کا نقارہ ہے۔ جو بانسری سے بازگشت کرتی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جڑی ہے۔

لیکن اس کی خواہش ہے کہ واپس لوٹ جائے اسی عالم میں جو الست میں تھی۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ-قَالُوْا بَلٰىۛ-شَهِدْنَاۛ-

اور اے محبوب! یاد کرو جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا (اور فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں، ہم نے گواہی دی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے طرف روح جانا چاہتی ہے۔ وہ پاکیزگی وطہارت، لذت وانبساط، قرب ووصل اور لقا کی طرف لوٹنا چاہتی ہے۔

ایرانی طرز

کَز نِیِستان تا مرا بُبرِیدہ اَند

در نَفِیرَم مرد وزَن نَالِیدہ اَند

پاکستانی طرز

کَز نِیُستان تا مرا بُبرِیدہ اَند

از نَفِیرَم مرد وزَن نَالِیدہ اَند

حل لغت: نستان: سرکنڈا کی زمین، یہاں اس سے مراد انسان کی ذات اور فطرت ہے۔ نیفیر: زور کی آواز، رونا، فریاد

اس میں استعارہ مرشحہ استعمال میں آیا ہے۔ کیونکہ نے کے لئے نیستاں اور نفیر کا اثبات مائمات سے ہے۔

(استعارہ مرشحہ۔ جس استعارہ میں مستعار منہ کے مناسبات کا ذکر ہو۔

مثلاً

دکھلائے لے جاکے تجھے مصر کا بازار

پرواں نہیں خواہاں کوئے اس جنس گراں کا

اس میں استعارہ ہے جنس گراں اور بازار مناسبت ہے)۔

جب سے مجھے نستان سے کاٹ کر لے گئے ہیں۔ میرے نالہ وفغاں سے مرد وزن روتے ہیں۔ جس دن سے انہوں نے مجھے میری اصلیت اور اصل وطن (نستان) سے جدا کیا ہے، مرد وزن میرے نوحے میں روتے ہیں۔
چونکہ انسان کی روح لطیف عالم بالا سے اس مادی دنیا میں اترتی ہے اس لیے وہ بہت غمگین ہوتی ہے اور اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی خواہش رکھتی ہے۔

رومی کے تصوف کے تین مراحل ہیں

جاننا، دیکھنا اور بننا.........بننا بہت ضروری ہے۔ یہاں، سرکنڈا ایک الہی انسان کی مثال ہے جو خواہشات سے پاک اور منزہ ہے....
یہاں سننا ایسا عمل ہے جو بانسری کی لے کی روح میں ہے۔ اگر اسے سنیں گے تو غم واندوہ کی کیفیت سے ہمکنار ہو اجائے گا اور سننے سے اس کے ہجراں کی کیفیت محسوس ہو گی۔ تو بانسری کہتی ہے
جس دن سے انہوں نے مجھے میرے اصل (نستان) سے جدا کیا ہے، مرد وزن مجھ سے جدائی کے درد پر نوحہ کناں ہیں۔
سہیل عظیم کے بقول

ہر وقت کی آہ وزاری سے دم بھر تو ذرا ملتی فرصت

رونا ہی مقدر تھا میرا تو کس لیے میں شبنم نہ ہوا

چونکہ میں خالص فطرت اور خالص سچائی سے ہٹ کر کثرت، تقسیم اور ہوس کی دنیا میں پڑ گیا ہوں، اس لیے میری آہیں اس قدر بلند اور غمگین ہیں کہ وجود کے شروع سے آخر تک دل رکھنے والے تمام لوگوں کی آہوں کو۔ میری آہوں میں سنا جا سکتا ہے۔
روح کو تنکے سے تشبیہ دے کر، ارواح کی دنیا کو عدم سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے ارواح کی دنیا سے جدا کر دیا ہے اور میں پاتال میں ایسی تکلیف میں ہوں کہ اگر کوئی میری کراہ سنے گا تو اس کے جگر سے خون نکل جائے گا۔
امیر خسروؒ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

ہر شب منم فتادہ بہ گرد سرائے تو

تاروز آہ ونالہ کنم از برائے تو

میں ہر رات آپ کے گھر کے پاس آتا ہوں۔ اُس دن تک جب تک کہ میں تیری خاطر آہیں بھرتا رہوں گا۔

نستان کا مطلب ہے سرکنڈوں کا میدان........سرکنڈوں کی اصل
جس طرح سرکنڈے سرکنڈوں سے الگ ہوتے ہیں، اسی طرح ہم انسان بھی اپنی اصل سے الگ ہوتے ہیں۔
نفیر کا مطلب ہے کراہنا، رونا اور چیخنا۔ دنیا میں کون ہے جس کی نفی نہ ہو، شکایت نہ ہو، غم نہ ہو۔ دنیا کے تمام انسانوں کے وجود میں تمام غموں کا ہونا ایک چیز کا ثبوت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مقام ہے جہاں خوشی ہے۔
دیکھو پیاس تو نشانی ہے پانی کی پانی نہ ہوتا تو پیاس نہ لگتی۔
انسان کسی چیز سے مطمئن نہیں ہو گا۔ پیسے سے نہیں، جائیداد سے نہیں، کرسی اور میز سے بھی نہیں۔
کچھ دنوں کے بعد وہ ہر چیز سے اکتا جاتا ہے۔ اطمینان کی یہ کمی اس بات کی علامت ہے کہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان مطمئن ہے، اور ایک جگہ ہے جسے ہم اصل کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے اللہ یعنی جب تک ہم خدا سے دور ہوتے ہیں، ہم تنکے کی طرح رہتے ہیں جو بے نیازی سے الگ ہو جاتا ہے،

ایرانی طرز

سینہ خواہم شَرحہ شَرحہ از فِراق

تا بِگویَم شَرحِ دَردِ اِشُتیاق

پاکستانی طرز

سینہ خواہم شَرحہ شَرحہ از فِراق

تا بِگویَم شَرحِ دَردِ اِشُتیاق

سینہ خواہم: سینہ چاہتی ہوں۔۔۔ شرحہ شرحہ: پارہ پارہ۔ ٹکڑے ٹکڑے۔۔۔ فراق: جدائی۔۔۔ تا: تاکہ۔۔۔ بگویم: بیان کر سکوں اشتیاق: شوق۔۔۔ شرح: کھول کے بیان کرنا

اس شعر میں تجنیس مطرف ہے جو کہ شرحہ اور شرح سے ظاہر ہے

متجانس (دو لفظوں کا تلفظ میں مشابہ اور معنی میں مختلف ہونا۔) متجانس الفاظ میں سے کسی لفظ کے آخری حرف کا مختلف ہونا، جیسے: آفات، آفاق وغیرہ ۔ تجنیس مطرف کہلاتا ہے۔

ترجمہ: نَے کہتی ہے میں سننے والے کا ایسا سینہ چاہتی ہوں جو پہلے فراق کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہو۔ تاکہ میں اس کو اپنا درد شوق کھول کھول کر سنا سکوں۔

بے درد دل کے سامنے دکھڑا بیان کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ بانسری کی لے کہتی ہے: میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی و ہجر سے پارہ پارہ ہو اس لئے کہ میں درد شوق کھول کر بیان کر سکوں

بانسری ایک ایسا آلہ ہے جو ماتم کی تقریبات اور خوشی کی تقریبات دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور جب اسے بجایا جاتا ہے تو ہر کوئی اس کے ساتھ صف بندی کرتا ہے۔ بانسری کی طرح یہ انسانی دل کا گیت ہے۔

لیکن میرے خیال میں چونکہ جناب رومیؒ راوی ہیں اس لیے فرماتے ہیں:

تم سننے والوں میں مجھے کوئی ایسا شخص چاہیے جس کے سینوں میں جدائی کا درد ہو اور اس کے اندر آرزو کی آگ بھڑک اٹھی ہو، تاکہ میں اس کو آرزو کا درد بیان کر سکوں!

جب بھی آپ رومیؒ کی کتاب اٹھاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ سے بات کر رہے ہیں، تو تعبیریں بدل جاتی ہیں!

مولاناؒ کہتے ہیں کہ جب بھی تمہارا دل اشتیاق سے بھر جائے تو آؤ میں تمہیں سکھاؤں گا!

انشاءاللہ آپ کا دل اشتیاق و محبت سے لبریز ہو جائے گا اور جب بھی آپ کتاب ہاتھ میں پکڑ کر اپنے سینے سے لگائیں گے۔ درد و شوق کی کیفیات سے دلی طور پر معمور ہو جائیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ جناب رومیؒ اپنے شعور کی شعاعیں آپ کی طرف بھیج رہے ہیں۔

حضور سلطان باہوؒ کے مطابق

اے تن میرا پُرزے پُرزے جیوں درزی دیاں لیراں ھُو

میرا جسم اور دل و جان بھی درد داغ اور فراق زار میں کسی درزی کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کے مصداق پرزے پرزے ہے

تو رومی کو پھر پڑھیں

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق

تا بگویم شرح درد اشتیاق

"فراق سے میرا سینہ اس قدر چھلنی ہو گیا ہے کہ میں اس دردِ اشتیاق کو بیان کر رہا ہوں۔"

بعض لوگوں نے اس شعر کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اے خدا، مجھے ایک پھٹا ہوا سینہ چاہیے جو ٹوٹ جائے اور میں اسے بیان کر سکوں۔

تم سننے والوں میں مجھے کوئی ایسا شخص چاہیے جس کے سینوں میں وہ دل جو ٹوٹا ہو، وہ دل جو پھٹا ہو.......... جدائی سے!

اس کا مطلب ہے کہ اس نے جدائی کو محسوس کیا ہے، اسے چھوا ہو، اسے چکھا ہو اور اسے کھینچا ہو!

جدائی اور درد کی حدت ہو اور اس کے اندر آرزو کی آگ بھڑک اٹھی ہو، تاکہ میں اس کو آرزو کا درد بیان کر سکوں!

وہ دل واحد دل ہے جو میرے دل کے درد کو محسوس کر سکتا ہے اور اسے سن کر میرے دل کو ہلکا کر سکتا ہے، کیونکہ ایسی جگہیں ہیں جہاں میرے جذبات کے اظہار اور سمجھنے کے لیے الفاظ کافی نہیں ہوتے۔

کیونکہ الفاظ اور گفتار گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں کی مانند ہیں، آپ ان پر سواری کر سکتے ہیں خشکی پر، صحرا میں، لیکن جب آپ سمندر پر پہنچتے ہیں تو ان کا مجموعہ اچھا نہیں ہوتا۔

اس لیے میں صرف اس کے ساتھ دل کا درد رکھ سکتا ہوں جو جادۂ درد کا مسافر ہو۔

اگرچہ اکثر لوگ کسی شخص کی تکلیف دہ حالت سے متاثر ہوتے ہیں لیکن بعض لوگ اپنی سخت دلی کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اسے دکھاوا ہی سمجھتے ہیں۔

"نی" ایسے لوگوں کو جواب دیتا ہے کہ تمہارا انکار اس لیے ہے کہ تم جدائی کے درد اور دوری اور ہجرت کے ادراک سے بے خبر ہو۔ البتہ میری آہوں اور کراہوں کی سمجھ کے لیے ایک سینہ چاہیے جو کسی کی ہجر سے پھٹا ہو۔ یقیناً ایسے لوگوں میں یہ اہلیت ہے کہ انہیں میرے جذبے کا درد کا احساس ہو اور وہ بتا سکیں۔

درحقیقت یہ ایک اصول ہے کہ عاشق محبت کے درد سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس لذت کو کھونا نہیں چاہتا۔ تو جب ایسے ہجر اس سے گذر ہوتا ہے تو ادھر سے پھر وہ لذت آشنائی میسر آتی ہے۔ دل کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ پھر آواز آتی ہے۔

جیسے اللہ کریم نے اپنے محبوب کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا:

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ

کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کشادہ نہ کر دیا؟

مفتی نعیم الدین مراد آبادی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں "یعنی اے حبیب! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، ہم نے آپ ﷺ کی خاطر آپ ﷺ کے سینۂ اقدس کو ہدایت، معرفت، نصیحت، نبوت اور علم و حکمت کے لئے کشادہ اور وسیع کر دیا یہاں تک کہ عالَمِ غیب اور عالَمِ شہادت اس کی وسعت میں سماگئے اور جسمانی تعلقات روحانی اَنوار کے لئے مانع نہ ہوسکے اور علومِ لدُنّیہ، حکمِ الٰہیہ، معارفِ ربّانیہ اور حقائقِ رحمانیہ آپ کے سینۂ پاک میں جلوہ نُما ہوئے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے" : فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ)" (انعام:۱۲۵)

اور جسے اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ، بہت ہی تنگ کر دیتا ہے گویا کہ وہ زبردستی آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں ”تاجدارِ رسالت مآب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے عرض کی: اس کھولنے سے کیا مراد ہے؟ ارشاد فرمایا: ”اس سے مراد وہ نور ہے جو مومن کے دل میں ڈالا جاتا ہے جس سے اس کا دل کھل جاتا ہے۔ عرض کی گئی: کیا اس کی کوئی نشانی ہے جس سے اس کی پہچان ہو سکے؟ ارشاد فرمایا: ”ہاں، اس کی تین علامتیں ہیں (1) (آخرت کی طرف رغبت (2) دنیا سے نفرت، اور (3) موت سے پہلے آخرت کی تیاری۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الزہد، ماذکر عن نبیّنا صلی اللہ علیہ وسلم فی الزہد، ۸ / ۱۲۶، الحدیث: ۱۴)

تو وہ جو سینہ درد اصلی سے پارہ پارہ ہوا تھا اس کی جزا تبھی میسر آئی جب دل کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

ایرانی

ھر کسی کو دور مانْد از اصلِ خویش

باز جویَد روز گارِ وَصلِ خویش

پاکستانی

ہر کسے کو دور مانْد از اصلِ خویش

باز جویَد روز گارِ وَصلِ خویش

ہر وہ شخص جو اپنی اصل سے دور ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے وصل (ملاپ) کے وقت کو دوبارہ تلاش کرتا ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی؛

-خویش؛ خود ۔۔۔ خویش: ردیف اصل،۔۔۔۔وصل: متصل۔۔۔۔۔ قافیہ۔ متضاد دور رہنا

-اصل خویش؛ ۔۔۔ نفس کا اصول۔۔۔ در اینجا: یہاں:.

-تلمیح بہ آیہ انّااللہّ وانّاالیہ راجعون -آیت کی طرف اشارہ "انا اللہ ونا الیہ راجعون

اس قول کی طرف اشارہ کرنے والی آیت مشہور ہے: (إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)) قرآن میں سورۃ البقرہ کی آیت 156 کے ایک حصے سے لیا گیا ہے۔، مطلب ہے "ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔یعنی تمام چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

شعر کا مفہوم: جو شخص معنویت کی دنیا اور خدائی دربار (اپنی اصل) سے دور رہا وہ اپنے اصل اور وقت کی طرف لوٹنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے۔اس بات کا مندرجہ بالا آیہ کی طرف اشارہ ہے۔

چیزیں اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہیں۔پہلے بند میں شاعر کہتا ہے (ہر وہ شخص جو اپنی اصل سے دور ہو جائے) کا مطلب ہے وہ جو اپنی اصل سے دور رہا اور دوسرے بند میں کہتا ہے (دوبارہ وصل کی طرف راجح ہوتا ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اپنی اصل سے دور ہے وہ اس وقت کی تلاش میں ہے جب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ جائے۔ عربی کا معروف محاورہ ہے:

كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ إِلَى أَصْلِهِ۔

ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

چنانچہ ہر شے ابتدا میں اپنے سفر کا آغاز وحدت سے کرتی ہے تو وہ درجہ بہ درجہ اجتماعیت کے سانچوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔جب یہ اجتماعیت کے رنگ و بو اور انواع و اقسام میں پرورش پا کر اپنے منتہائے کمال پر پہنچتی ہے تو پھر وہاں سے وحدت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انسان کی ابتدا، جس وحدت سے ہوئی ہے اس کی انتہا بھی اسی وحدت سے منسلک ہے۔

شعر میں عام طور پر اصل کی طرف لوٹنے کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر کوئی اپنے اصل سے دور رہتا ہے تو وہ اپنے اصل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

ماز دریاییم و دریامی-رویم ماز بالاییم و بالامی-رویم

ماز فلک بودہ-ایم، یار ملک بودہ-ایم باز ہمان جارویم جملہ، کہ آن شہر ماست

بہ اصل خویش راجع گشت اشیا ہمہ یک چیز شد پنھان وپیدا

خلق چو مرغابیان، زادہ ز دریای جان کی کند این-جا مُقام، مرغ کز ان بحر خاست

چو مرغابیاں کی تخلیق، سمندرِ زندگی سے پیدا ہوا وہ یہاں کب رکا، سمندر کا مرغا ہوا

ایران کے ایک محقق استاد مقدم نے بہت شاندار گفتگو کی اس سے اقتباس بیان کیا جارہا ہے جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

'ہم کئی جگہوں سے بہت دور ہیں۔ سب سے پہلے، ہم روح الٰہیہ سے بہت دور ہیں، جس کی وجہ سے ہم محفوظ اور پر امن محسوس نہیں کرتے۔

ہمارے پاس ایک اور دور افتادہ راستہ دستیاب ہے اور ہم اسے آج سے ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس تصوف اور روحانیت کا ایک مکمل ذخیرہ ہے جس میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر، ہم مولانا رومیؒ کے اشعار میں ایک اور حکمت کا اضافہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ کامل ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس کہ ہم اس بھرپور حکمت و دانش سے دور ہو گئے ہیں کیونکہ اب ہم اس بھرپور اور صوفیانہ مجموعہ سے دور ہو گئے ہیں، نئے سکولوں اور ذہنی کھیلوں کے سلسلے میں مصروف ہو گئے ہیں! مگر ہماری اصلیت تصوف کا بھرپور مجموعہ ہے...

ہمارے افکار ان کتابوں کے ساتھ گھل مل گئے ہیں جو ہمیں ایک سازش کے تحت فراہم کی گئیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے اصل کی طرف لوٹ جائیں۔

بند "جو اپنی اصل سے دور رہے" کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے:

میں وہ ہوں جو اپنی صوفیانہ ثقافت سے بھٹک گیا ہوں اور آج میں اس کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں!

ہمیں جناب رومیؒ کے پاس واپس جانا ہے!

اہم بات جو میں آپ کو بتانا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ جب آپ جوان ہوں تو شاعری کو یاد کرنا شروع کر دیں۔ یہ شروع میں تھوڑا مشکل ہے لیکن میں آپ کو سکھاؤں گا کہ اسے کیسے کرنا ہے۔

کیونکہ جب آپ کوئی نظم یاد کرتے ہیں تو آپ کے الفاظ کا راگ اسی نظم جیسا ہو جاتا ہے، یعنی ایک تال اور تھاپ ہے جو کہنے میں سادہ نہیں ہے اور صرف شاعری یا نظم میں موجود ہے۔ فارسی شاعری ترتیب کے لحاظ سے بہت مضبوط ہے اور اس کی مختلف ترتیبیں ہیں۔

جب آپ شاعری کو یاد کرتے ہیں اور باقاعدگی سے شعر پڑھتے ہیں تو جب آپ بولتے ہیں تو آپ کی تقریر سریلی ہو جاتی ہے اور آپ کی تقریر میں وسعت ورعنائی ہوتی ہے۔ الفاظ میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور یہ شعر حفظ کرنے سے ممکن ہے۔ آپ کو شروع سے آخر تک پوری نظم کو حفظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ مشکل اور بے اثر ہے۔ آپ وہ سنگل یا چند اشعار لکھیں جو کہیں خوبصورت ہوں اور انہیں محفوظ کریں اور اپنی گفتگو میں استعمال کریں۔

نظم کو حفظ کرنے کے لیے بہتر ہے کہ اس کی تصویر کو حفظ کر لیا جائے، یعنی اسے مسلسل دہرایا جائے اور اس کی تصویر بنائی جائے۔

اسی طرح جس کتاب میں آپ نظم کو یاد کرتے ہیں اس کا فونٹ بھی اہم ہے، یا آپ اپنی نوٹ بک میں جس ہینڈ رائٹنگ سے نظمیں لکھتے ہیں، اس کا فونٹ بھی اہم ہے، اور کوشش کریں کہ اس ہینڈ رائٹنگ کو اسی نوٹ بک میں رکھیں اور اسے تبدیل نہ کریں!

یا اگر آپ ٹائپ کرتے ہیں تو ایک فونٹ کے ساتھ ٹائپ کریں اور اس طرح آپ کے ذہن میں اس نظم کی تصویر بنی رہتی ہے۔

اور جب بھی آپ نظم پڑھنا چاہیں گے تو آپ کو اپنے لاشعور میں نظم کے فونٹ کی تصویر نظر آئے گی اور آپ اسے آسانی سے یاد اور ظاہر کر سکتے ہیں۔ نظم کو اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ نظم ذہن پر نقش ہو جائے۔ اس کی تصویر ذہن میں رہتی ہے۔

سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ایک خوبصورت نوٹ بک ہو اور اس میں ایک خوبصورت قلم سے نظمیں لکھیں اور پھر وہیں سے نظمیں حفظ کریں۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ آپ اپنی عام گفتگو میں ان اشعار کو استعمال کریں جو آپ نے حفظ کیے ہیں۔

مثال کے طور پر، اسے ہیلو! اور الوداع! کہنے اور اپنے روز مرہ کے کام میں دیگر چیزوں کے لیے استعمال کریں۔

اگر کوئی آپ سے اس کے لیے کچھ کرنے کو کہے تو کہو (مجھے کرنے کا حکم دو، میں ابلیس کو رلادوں گا، جو تم کہو گے میں وہی کروں گا) یعنی (فرمان بده تا آن کنم ابلیس را گریان کنم هرچه تو گویي آن کنم)

اور شرمندہ نہ ہوں۔ کیونکہ جب لوگ طرز زندگی اپناتے ہیں تو ان کے سامنے شرم آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کا مذاق اڑایا جائے گا۔ اور یہاں آپ کو شرم کو ایک طرف رکھنا ہو گا اور اپنے روزمرہ کے الفاظ میں نظموں کو بھی استعمال کرنا ہو گا۔

مثال کے طور پر، آپ اپنے خاندان کو یاد کرتے ہیں اور یہ نظم پڑھتے ہیں

هر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روز گار وصل خویش

ہر وہ شخص جو اپنی اصل سے دور رہا۔

اپنی پچھلی زندگی کا دوبارہ جائزہ لیں۔

اگلا نکتہ یہ ہے کہ جناب رومیؒ کی کتاب کا ایک صفحہ پڑھیں اور اسی صفحے سے جو اشعار آپ کو خوبصورت لگیں اسے حفظ کریں۔

اگلا کام یہ ہے کہ آپ نے جو نظمیں حفظ کی ہیں انہیں اپنی آواز سے ریکارڈ کریں اور انہیں باقاعدگی سے سنیں۔

شروع شروع میں ہو سکتا ہے آپ کو اپنی آواز پسند نہ آئے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان کی آواز اچھی نہیں ہے لیکن وہ آواز ہمارے ذوق یا ہمارے مزاج کی ہو سکتی ہے اور ہر آواز کی اپنی خوبصورتی ہوتی ہے۔۔۔

کچھ دیر بعد نظم خود آپ کے حفظ کرنے کے لیے آجائے گی۔

ذہن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مدھر الفاظ کو بہت زیادہ دہراتا ہے اور تال والے جملوں کو راستہ دیتا ہے، جیسے گانے جو پڑھے اور ذہن میں دہرائے جاتے ہیں۔ ذہن کی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ کے سامنے حکم ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور آپ حکم سے دوسروں کو نصیحت بھی کر سکتے ہیں۔

جو شخص غیر اخلاقی گانا سنتا ہے اور اسی گانے کے غیر اخلاقی الفاظ کو اپنے ذہن میں دہراتا رہتا ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا!

بہتر ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اعلیٰ نظمیں گائیں جو آپ کا مقدر اچھا بنائے۔ کتنے لوگ ہیں جو غیر اخلاقی باتیں سن کر ڈپریشن کا شکار ہو گئے، انہوں نے خود کو کاٹ لیا اور خود کشی کرنا چاہا... لیکن اس کی بجائے مثنوی آپ میں زندگی کی ترنگ پیدا کر دے گی۔

آپ کے پاس جناب رومیؒ جیسا منبع ہے جو خوشگوار اشعار سے بھرا ہوا ہے کہ ان ابیات کو ذہن میں دہرایا جا سکتا ہے۔

پہلے تو شاعری کو یاد کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد یہ آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔

ایرانی

من به هر جَمعیَّتی نالان شُدم

جُفتِ بد حالان و خوش ُحالان شُدم

پاکستانی

من بہ ہر جَمعیَّتے نالاں شُدم

جُفتِ بَد حالاں و خوش ُحالاں شُدم

من: میں۔۔۔ بہ ہر جمعیتے: ہر جماعت و ہجوم میں۔۔۔ نالاں شدم: میں روئی ہوں۔۔۔ جفت: دو بمعنی ہمراہی۔۔۔ بد حالاں: اداس۔۔۔ خوش حالاں: خوش حال

ترجمہ: میں ہر ہجوم میں روئی۔ میں اداس اور خوش احوال لوگوں کے ساتھ رہی

اگر آپ جناب رومیؒ کی روح کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں، چاہے آپ کو الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں، آپ اس نظم کا مطلب سمجھ جائیں گے۔

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ میں جہاں بھی جاتا تھا روتا تھا اور لوگوں کو خوش کرتا تھا اور غمگین ہوتا تھا تو غمگین کرتا تھا۔

مفہوم: مولانا سب کے لیے سچائی کی محبت کا نالہ ناپتے تھے۔

شعر کا مفہوم: 'نے' کہتی ہے جو ایک راہبر کی طرف استعارہ ہے وہ کہتا ہے؛ میں اپنے نالوں کے ساتھ لوگوں کے ہر ہجوم میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر کے لیے میں کبھی غریبوں کا ساتھی اور کبھی صالحین کا ساتھی بن گیا۔(مولانا سب سے بات کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر دل سے سچائی کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔) ہر طرح کے لوگوں سے ملا۔ ایسے بھی ملے جن پر میرے نالہ سے کوئی اثر نہ ہوا اور بڑے ایسے بھی ملے اور انکی رفاقت ملی جن پر میرے آہ و فغاں سے لرزگی ورقت طاری ہوگئی۔ تو گویا اہل مجلس میں محرم راز بھی ہوتے ہیں اور نابلد و ناآشنا بھی۔

کیا کہوں اس سے کہ جو بات سمجھتا ہی نہیں

وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

ہم نے دیکھا ہے فقط خواب کھلی آنکھوں سے

خواب تھی وصل کی وہ رات سمجھتا ہی نہیں

میں نے پہنچایا اسے جیت کے ہر خانے میں

میری بازی تھی مری بات سمجھتا ہی نہیں

رات پروائی نے اس کو بھی جگایا ہو گا

رات کیوں کٹ نہ سکی رات سمجھتا ہی نہیں

اس میں راز یہ ہے اب یہ رومیؒ جس کا وجود غربت و افلاس کی سطح پر پہنچ کر بھوسے اور گنے یعنی نے کی سطح پر پہنچ چکا ہے، ہمارے پاس پیغام دینے آیا ہے۔ وہ وہاں سے ہمارے لیے پیغام لایا ہے جو اصل کی طرف وصل کا ہے جو کچھ یوں پکارتا ہے۔ کہ میں واپس آیا ہوں اس دوست کی طرف سے، مجھے بات کرتے ہوئے ہزاروں سال ہو گئے ہیں۔

میں اس دوست کی طرف سے آیا ہوں اور اس مطلق وجود سے، میں شکر گزار ہوں، میں وہاں گیا، میں واپس آیا، اور اب میرے پاس آپ کے لیے ایک پیغام ہے، جو کہ ایک مثنوی ہے۔ سر دلبراں کہ ہر کوئی اپنے اپنے شک کی بنا پر اور اپنی سمجھ کے مطابق میرا دوست بن گیا لیکن میرے راز میرے اندر چھپے ہوئے تھے۔

وہ لوگ جو فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جس کا مطلب ہے سرکنڈہ ہونا، اور پھر بقائے الٰہی کے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں، جس کا مطلب ہے شکر کا 'نے' ہونا، اور پھر واپس آکر ہمارے لیے پیغام رکھتے ہیں، یہ لوگ اپنی حتمی صلاحیت کے عادی نہیں ہیں۔

لوگ اس کی بات کو پوری طرح نہیں سمجھتے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ میرے راز میرے اندر ہی اندر ہیں

میرا اسرمیری آہوں سے دور نہیں ہے۔

تاکہ وہ نور آنکھوں اور کانوں پر چمکے۔

آخر میں، قرآن کے باطنی معانی، جو قرآن کے ان خارجی الفاظ سے زیادہ دور نہیں ہیں، ایک ہی متن سے نکلتے ہیں۔ لیکن مثال کے طور پر میں لا الہ الا اللہ کو ایک طرح سے سمجھتا ہوں اور عظیم صوفی ابن عربی اسی لفظ سے کچھ اور سمجھتے ہیں۔ انسان کو اندر سے خوش ہونا چاہیے۔

یزکیھم اور یعلم الکتاب

ایرانی

هر کسی از ظَنِّ خود شد یارِ من

از دَرونِ من نَجُست اسرارِ من

پاکستانی

هر کَسے از ظَنِّ خود شُد یارِ مَن

وز دَرونِ من نہ جُست اَسرارِ مَن

ہر کسے: ہر شخص۔۔۔ ظن: خیال و تصور۔۔۔۔ یار من: میرا دوست، یار۔۔۔اسرار: بھید

ترجمہ: ہر شخص اپنے خیال میں میرا دوست و یار بنا حالانکہ اس نے میرے دل کے بھید کو جانا ہی نہیں۔

ہر شخص اپنے خیال کہ مطابق میرا دوست بنا

اور میرے اندر سے میرے رازوں کو نہ پہنچ سکا

لیکن جو مثنوی ایران سے چھپی اس میں شعر اس طرح لکھا گیا ہے؛

ھر کسی از ظن خود شد یار من

از درون من نجست اسرار من

اس کا ترجمہ ذرا مختلف ہو گا

شک سے سب میرے دوست بن گئے۔ میرے راز میرے اندر سے ناپاک ہیں یعنی جو فکر ہے وہ ہر آدمی کے خیال کے مطابق ہے چونکہ میں اپنے خیالات کا خود مالک ہوں لہذا خیالات ناپختہ اور خام ہیں۔ جو حقیقت سے آشنا نہیں اور گویا ان میں ناپاکی ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے نقطہ نظر سے جناب رومیؒ کے پاس گیا اور کسی نے رومیؒ کے وجود کی اصل تلاش نہیں کی۔ یہاں یہ بات بھی اظہر من الشمس کر لینی چاہئیے کہ کسی ادنیٰ چیز کی مثال دینا کوئی برا فعل نہیں کیونکہ ہم محدود ہیں اور ہماری سوچ بھی محدود ہے۔ اس لئے عام سی چیز سے بات اخذ کرنا جس سے بات سمجھ میں آجائے بہت عمدہ طریقہ ہے۔ چنانچہ

قرآن کریم میں ایک آیت ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ- فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ- وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ- يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ- وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ- وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲۶) (بقرۃ)

ترجمہ: بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کے لئے کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔ بہر حال ایمان والے تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور رہے کافر تو وہ کہتے ہیں، اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اللہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا فرماتا ہے اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔

{ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖ: بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا۔} جب اللہ تعالیٰ نے ’’سورۂ بقرہ‘‘(کے دوسرے رکوع) میں منافقوں کی دو مثالیں بیان فرمائیں تو منافقوں نے یہ اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند تر ہے کہ ایسی مثالیں بیان فرمائے اور بعض علماء نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے معبودوں کی کمزوری کو مکڑی کے جالوں وغیرہ کی مثالوں سے بیان فرمایا تو کافروں نے اس پر اعتراض کیا۔ اس کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔(تفسیر کبیر، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۶، ۱/۳۶۱، طبری، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۶، ۱/ ۲۱۳-۲۱۴، ملتقطاً)

چونکہ مثالوں کا بیان حکمت کے مطابق اور مضمون کو دل نشین کرنے والا ہوتا ہے اور ماہرینِ کلام کا یہ طریقہ ہے، اس لیے مثال بیان کرنے پر اعتراض غلط ہے۔

{ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا: اللہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے گمراہ کرتا ہے۔} ان الفاظ سے کافروں کو جواب دیا گیا کہ مثالیں بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے؟ نیز مومنوں اور کافروں کے مقولے اس کی دلیل ہیں کہ قرآنی مثالوں کے ذریعے بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں جن کی عقلوں پر جہالت کا غلبہ ہوتا ہے اور جن کی عادت صرف ضد، مقابلہ بازی، انکار اور مخالفت ہوتی ہے اور کلام کے بالکل معقول، مناسب اور موقع محل کے مطابق ہونے کے باوجود وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور انہی مثالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ جل شانہ بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو غور و تحقیق کے عادی ہوتے ہیں اور انصاف کے خلاف بات نہیں کہتے، جو جانتے ہیں کہ حکمت یہی ہے کہ عظیم المرتبہ چیز کی مثال کسی قدر و قیمت والی چیز سے اور حقیر چیز کی مثال کسی ادنیٰ شے سے دی جاتی ہے جیسا کہ اوپر آیت نمبر 17 میں حق کی مثال نور سے اور باطل کی مثال تاریکی سے دی گئی ہے۔ نزولِ قرآن کا اصل مقصد تو ہدایت ہے لیکن چونکہ بہت سے لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے قرآن کو سن کر گمراہ بھی ہوتے ہیں لہٰذا اس اعتبار سے فرمایا کہ قرآن کے ذریعے بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔

{ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ: اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔} شریعت میں ’’فاسق‘‘ اس نافرمان کو کہتے ہیں جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو۔ فسق کے تین درجے ہیں **ایک تَغَابِی** وہ یہ کہ آدمی اتفاقیہ کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو جائے اور اس کو برا ہی جانتا رہا۔ **دوسرا اِنْہِمَاک** کہ کبیرہ گناہوں کا عادی ہو گیا اور اس سے بچنے کی پروا نہیں کرتا۔ **تیسرا جُحُود** کہ حرام کو اچھا جان کر ارتکاب کرے اس درجہ والا ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ پہلے دو درجوں میں جب تک سب سے بڑے کبیرہ گناہ یعنی کفر و

شرک کا ارتکاب نہ کرے وہ مومن و مسلمان ہے۔ مذکورہ آیت میں فاسقین سے وہی نافرمان مراد ہیں جو ایمان سے خارج ہو گئے۔ (روح البیان، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۶، ۱/۸۸)

یہ قرآن بعض کو گمراہ کرتا ہے اور بعض کو ہدایت دیتا ہے۔

کچھ مسلمان ایسے ہیں جو قتل اور ہولناک کاموں سے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو خدا کی رحمت سے بھرے ہوئے ہیں اور دونوں قرآن کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ آپ قرآن کے مندرجات کو سمجھنا چاہتے ہیں یا آپ اسے اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں!

مثال کے طور پر، ایک خودکش بمبار قرآن سے چند آیات لیتا ہے اور جنگ اور تشدد کے لیے انہی ذرائع کا استعمال کرتا ہے۔

اگر یہ شخص بدھ مت کا پیروکار ہوتا تو ایسا ہی کرتا کیونکہ اس کی سوچ جنگ اور قتل کی سوچ ہے۔ کیونکہ اس شخص کی اصل بنیاد تشدد ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ قرآن کی آیات کو استعمال کرے گا تو اپنے لیے جنت بنا لے گا!

'رومی' سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہاں کچھ سیکھنے نہیں آئے تھے بلکہ کتابوں میں اپنے عقیدہ کی وجہ تلاش کرنے آئے تھے اور وہ اس بات کو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی نے مجھ سے کوئی راز نہیں دیکھا اور مجھ سے سوال کرنے نہیں آئے۔

اور ہر کوئی اپنے اپنے شکوک و شبہات سے میرے پاس آیا اور اس طرح ایک شخص رومیؒ پڑھتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے دماغی مسودات کے ساتھ کتاب کے پاس گیا تھا۔

اسی لیے میں نے کہا کہ آپ کو رومیؒ پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ آپ جناب رومیؒ کی عظیم روح سے اجازت نہ لیں کہ اس کتاب کے اندر کیا ہے وہ ہمیں بتا دیں۔

پہلے تزکیہ اور پھر کتابی علم پڑھنا، پڑھانا ہی سود مند ہو گا۔

تو جناب رومیؒ فرماتے ہیں؛

"یہ وہ آگ ہے جو میرے دل سے نکلتی ہے، یہ 'ہوا' (خواہش نفس) کی ہوا نہیں ہے۔"

وہ ادراک جو مثنوی کی شعلہ بیانی کو سمجھنا چاہیے، وہ ادراک ہم میں بند ہے۔ ایسے ہی کہ

اگر آپ کسی جانور کو قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں تو کیا اس کا اثر ہوتا ہے؟! ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہے!

یہ ایک اچھا امتحان ہے۔ قرآن پڑھیں اور آپ کی ہر آیت سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو وہ ادراک نہیں ہے، آپ کا دل بند ہے۔۔ عذاب کی آیات، انعام کی آیات، خدا کی محبت کی آیات، ان میں سے کوئی بھی آپ میں فرق نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں سامنا ہے۔ اس کے برعکس اگر دل کھلا ہو تو قرآن کا آدھا صفحہ نہیں پڑھ سکتا۔

سابقہ فقیہ سب رازوں سے پردہ اٹھاتے تھے یعنی وہ ایک ایسا کلام کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے جس میں درجنوں راز پوشیدہ ہوتے تھے اور وہ کلام سب کے سامنے پیش کر دیتے تھے اور جو شخص اس راز کو جانتا تھا وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس لفظ کے اندر کیا ہے۔.

ہم جناب رومیؒ کے کلام کے راز اور حکمت کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم ان سے دل سے یہ نہ کہیں کہ وہ ہمیں ان کی باتوں کو سمجھنے دیں۔

ایک دفعہ شعر کو پھر پڑھیں

هر کسے از ظن خود شد یار من

از درون من نہ جست اسرار من

ہر شخص اپنے خیال کہ مطابق میرا دوست بنا

اور میرے اندر سے میرے رازوں کو نہ پہنچ سکا

ایرانی

سرّ من از نالہ من دور نیست

لیک چشم و گوش را آن نور نیست

سِرِّ مَن اِز نالہ ُمَن دُور نِیست
لِیکْ چَشم و گُوش را آن نُور نیست

سر من: میرا راز۔۔۔نالہ ُمن: میرا رونا، آہ کرنا۔۔۔دور نیست: دور نہیں۔۔۔لیک: لیکن کا مخفف۔۔۔ چشم و گوش: آنکھ و کان۔۔۔نور نیست

ترجمہ: میرا بھید میری آہ وزاری سے جدا نہیں ہے۔ لیکن (لوگوں کی) آنکھ اور کان کو وہ (ذوقی بصارت و سماعت کا) نور حاصل نہیں ہے۔(جس سے عاشق کی حالت کو دیکھ کر اور اس کے نالہ وفغاں کو سن کر حقیقت کو سمجھ سکیں)۔

سر "راز کو کہتے ہیں جو ایک بھید ہے۔اس کے لئے ایک لفظ کتمان آیا ہے کہ بھید کو چھپا کر رکھنا چاہئیے۔

کتمانِ سر (راز کی حفاظت) کا تعلق عملی اخلاقیات کے مسائل سے ہے

، نیز یہ کامیابی و کامرانی کے مضبوط ترین اسباب میں سے ہے۔ سر اس چیز کا نام ہے جسے انسان چھپاتا ہے، اس کی ضد اعلان ہے۔ راز کی دو قسمیں ہیں: اول: وہ بات جو انسان کسی اور کو خفیہ طور پر بتاتا ہے، پھر وہ اسے اس پر امین بناتا ہے؛ چاہے ایسا وضاحت کے ساتھ کرے جیسے کہ اس سے کہے: "جو میں تجھے بتا رہا ہوں اسے خفیہ رکھنا"۔ یا پھر صورت حال سے اس کا پتہ چلے مثلاً وہ اپنی گفتگو کو باقی لوگوں سے مخفی رکھے، یا اکیلے میں اس سے گفتگو کرے اور اس دوران اِدھر اُدھر دیکھے، یا اس کے ساتھ اپنی آواز کو پست کر لے۔ دوم: وہ حدیثِ نفس (دل میں گزرنے والا خیال) ہو جسے ظاہر کرنے سے انسان شرماتا ہے، یا کوئی عیب ہو جسے وہ چھپانا چاہتا ہے یا اس طرح کی کوئی اور بات ہو۔ دونوں قسموں میں کتمان (رازداری) قابلِ تعریف ہے۔ پہلی قسم میں وہ ایک طرح کی وفاداری اور وقار کی علامت ہے، اور دوسری قسم میں وہ حزم واحتیاط اور پردہ داری کے زمرے میں آتا ہے۔ البتہ راز فاش کرنا انسان کے بے صبرا اور تنگ دل ہونے کی دلیل ہے، اور یہ کمزور آدمیوں، بچوں اور عورتوں کا وصف ہے۔

متصوفانہ شاعری میں عقل سے مراد ہے منطقی استدلال. جس کے ذریعہ سے ظنی مظاہر کا ایک دھندلا سا تصور قائم ہوتا ہے، اور عشق سے مراد ہے جذبہ ٔ باطن جس کی بدولت طالب تعینات کے پردوں کو ہٹا کر حقیقت کی بلاواسطہ معرفت حاصل کرنا ہے۔ عقل کی کوششوں کا ماحصل علم یا "خبر" ہے، یعنی ذہنی ادراک، اور عشق کی منزل معرفت یا "نظر" یعنی وجدانی مشاہدہ، اگر ہم عقل و ادراک سے حقیقت کے عقدے کو حل کرنا چاہیں تو تصورات کا ایک لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے۔ ہر تصور کی تشریح کے لئے ایک نئے تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ نیا تصور پھر ایک نئی تشریح کا محتاج ہوتا ہے۔ غرض یہ عقدہ کبھی حل نہیں ہوتا، بلکہ اور نئی نئی گتھیاں پڑتی چلی جاتی ہیں۔

فلسفی راز حقیقت نتوانست کشود

گشت راز دگر آں راز کہ افشامی کرد

اس عقدے کو حل کرنے کے یعنی وجود حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم ذوق شوق سے ریاضت جسمانی اور مجاہدۂ نفس کے مرحلے طے کر کے وہ نظر پیدا کریں جو ہمیں شاہد حقیقت کا جلوہ دکھاتی ہے۔

آدمی دید است باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

جملہ تن را در گداز اندر بصر

در نظر رو در نظر رو در نظر

ہر کسی کو یہ گماں تھا کہ وہ میرا یار ہے

دل میرے کی جستجو لیکن کوئی کر نہ سکا

جناب رومیؒ نے اپنا تعارف ایک تنکے کے طور پر کرایا اور چوں کہ تنکے کی آواز کراہنے کی آواز کی طرح ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اس آہ وزاری میں ایک راز ہے کہ ان رازوں کو سمجھنے کے لیے آنکھوں اور کانوں میں روشنی ہونی چاہیے۔ آئیں علامہ اقبالؒ کو بھی یہاں دیکھ لیتے ہیں۔

علامہ نے کچھ یوں فرمایا؛

سِرّ عیشِ جاوداں خواہی بیا

ہم زمیں، ہم آسماں خواہی بیا

ترجمہ و تشریح: تو ہمیشہ کی زندگی کا بھید جاننا چاہتا ہے تو میرے پاس آ، اگر زمین و آسمان کا بھی تو طالب ہے تو آ۔(یہ سب نعمتیں تجھے مل جائیں گی)۔

تفہیم: مراد یہ کہ ان (علامہ) کے افکار کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونے سے زندگی جاوید میسر آسکتی ہے اور زمین و آسمان کو تسخیر کیا جاسکتا ہے۔

حوالہ: کلام: علامہ محمد اقبالؒ، کتاب: اسرارِ خودی

ہدایت کی روشنی جناب رومیؒ سے ضرور آنی چاہیے تاکہ آپ ان رازوں کو سمجھ سکیں۔

اور یہ مکمل طور پر ایک جسمانی ادراک اور روشنی ہے۔ جو مکمل طور پر قابل پیمائش ہے اور رومی کے الفاظ کو سمجھنے کے لیے اپنی آنکھیں اور کان کھولنے کے لیے جناب رومیؒ کی طرف جذب سے جانا چاہئیے۔

اجنبی ہوں میں شناساؤں میں بھی رہتے ہوئے

جانتا کوئی نہیں پہچانتا کوئی نہیں

(میں اس استاد کی تعریف کرتا ہوں جس نے مجھے سوچنا سکھایا، خیالات کو منتقل کرنا نہیں)

تشریح: اگرچہ میرے درد کی حقیقت آہوں اور کراہوں سے سمجھی جاسکتی ہے لیکن چونکہ یہ کیفیت ذوق کا معاملہ ہے اس لیے ظاہری حواس اور عقل اس کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

عشق عربی زبان کا لفظ ہے محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے اور یہی محبت کسی درجے پر جاکر جنوں کہلاتی ہے۔ اس پر اقبال سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے عشق کا محرک مجازی یا حقیقی ہوسکتا ہے۔ یہ عشق ناممکن کو ممکن بناڈالتا ہے۔ کہیں فرہاد سے نہر کھدواتا ہے تو

کہیں سوہنی کو کچے گھڑے پر تیرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت کوئی سیدنا صدیق اکبرؓ کہلاتا ہے تو کوئی سیدنا بلالؓ بنتا ہے۔ غرض ہر عشق کے مدارج مختلف ہیں۔ کوئی عشق مجازی میں ہی گھر کر رہ جاتا ہے۔ تو کوئی عشقِ مجازی سے حقیقی تک رسائی حاصل کر کے حقیقی اعزاز و شرف حاصل کرتا ہے۔

اقبال کے یہاں عشق اور ان کے مترادفات ولوازمات یعنی وجدان، خود آگہی، باطنی شعور، جذب، جنون، دل، محبت، شوق، آرزو مندی، درد، سوز، جستجو، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، تواتر، انہماک سے ملتا ہے۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے تصورات میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔ انسانوں میں پیغمبروں کا مرتبہ دوسروں سے اس لیے بلند تر ہے کہ ان کا سینہ محبت کی روشنی سے یکسر معمور اور ان کا دل بادہ عشق سے یکسر سرشار ہے۔ محبت جسے بعض نے فطرتِ انسانی کے لطیف ترین حسی پہلو کا نام دیا ہے۔ اور بعض نے روحِ انسانی پر الہام و وجدان کی بارش یا نورِ معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے متعلق اقبالؒ کیا کہتے ہیں اقبالؒ ہی کی زبان سے سنتے چلیے، یہ ان کی نظم "محبت" سے ماخوذ ہے۔

کائنات کی پیہم خلاقانہ آشکارائی عشق کی بدولت ہے

اقبال کے لیے کائنات کی پیہم خلاقانہ آشکارائی عشق کی بدولت ہے۔ یہ ایک ایسا داعیہ روح ہے جس کی بدولت کائنات ہر لحظہ ارتقا پذیر ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسی قوت محرکہ (Driving force) کی حیثیت رکھتا ہے جو انسان کو منزل کے حصول کے لیے گامزن کرتا ہے اور اسے مقاصد آفرینی پر اکساتا ہے۔ یہ قوت محرکہ کاروان وجود کو ہر لحظہ نئی آن وشان سے ترقی کرنے کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔ عشق انسان میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ اس عالم زمان و مکاں سے ماورا بھی کئی جہاں ہیں۔ اقبال نے عشق کو عین وجود قرار دیا ہے۔ اقبال کے خیال میں عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو تمام کائنات میں کار فرما ہے۔ ان کے خیال میں محبت ہی کی بدولت کائنات میں زندگی کا ظہور عمل میں آیا

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود

عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی

حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی

ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیر ِ شبنم سے

پھر ان اجزاء کو گھولا چشمہ حیوان کے پانی میں

مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

یہ ہے وہ محبت کا جذبہ عشق جو اقبال کے دائرہ فکر و فن کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہی تخلیق کائنات سے لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت کا آشنا اور کارزارِ حیات میں انسان کا رہنما و کارکُشا ہے۔ بقول اقبال کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ ورنہ اس سے پہلے، اس کی فضا بے جان اور بے کیف تھی۔

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد!

ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

یہ سبق اقبال نے رومی سے لیا۔ جو ایک روشنی کی شکل میں ان میں گھر کر گیا۔

روشنی سے مراد ادراک کی صلاحیت ہے، اور ذائقے کے تمام معاملات میں ایک ہی کیفیت ہوتی ہے، بھوک اس شخص کو سمجھ آتی ہے جو کم از کم ایک بار بھوکا ہوا ہو، ورنہ وہ دنیا کا عقلمند ترین شخص ہو تو بھی اس سے عاجز ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے.

آنکھ اور کان: کان کے لیے روشنی کے پورے وجود کا تناسب اور اجازت: اس میں حس ہے

فَلَوۡلَا رَجَاءُ الوَصلِ مَا عِشتُ سَاعَةً

وَلَوۡلَا خَيَالُ الطَّيفِ لَم أتَهَجَّعِ

(عطاء بن یعقوب)

اگر [تمہارے] وصل کی امید نہ ہوتی، میں ایک لمحہ بھی نہیں جیتا؛ اور اگر [تمہاری] رُویا کا خیال نہ ہوتا، میں ہر گز نہیں سوتا۔

شعر کا مفہوم ہے: میرے آہوں میں میرا راز پوشیدہ ہے لیکن ظاہری آنکھ اور کان اس آہ وزاری کے راز اور حقیقت کو نہیں جان سکتے (اس کو صرف آنکھ اور کان ہی سمجھ سکتے ہیں)

یعنی جسم اور روح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ڈھکے ہوئے نہیں ہیں، لیکن کسی کو روح (روح) کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے اور ہمیں اس کے ادراک کے لیے ظاہری حس کے علاوہ کسی اور احساس کی ضرورت ہے۔

تیرے افکار میں وہ درد کی لذت نہ رہی

تیرے نغمات پہ اب روح مچلتی ہی نہیں

اے ایازؔ اب ترے افکار سے ندرت روٹھی

اب تری فکر۔ غزل پارے۔ اگلتی ہی نہیں

تن ز جاں و جان ز تن مستور نیست

لیک کس را دید جاں دستور نیست

تن: بدن۔۔۔ مستور: پوشیدہ، مخفی۔۔۔ کس را دید: کس نے دیکھا۔۔۔ دستور: قاعدہ، آئین

اس میں صنعت عکس ہے۔

ترجمہ: (مثلاً) بدن جان سے اور جان بدن سے پوشیدہ نہیں۔ مگر یہ دستور نہیں ہے کہ کوئی جان کو دیکھ سکے۔ (یہی حال اس آہ و زاری کے بھید کا ہے)

جسم اور روح جسم اک دوسرے سے مستور (پوشیدہ) نہیں

لیکن روح کا دیکھ لیا جانا بھی دستور میں شامل نہیں یہ اللہ کا قانون ہے کہ روح کا معاملہ پوشیدہ ہے

جسم اور روح ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن انہوں نے کسی کو روح کو دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔

یہ بیت پچھلے شعر کی مثال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح جسم اور روح ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہیں اسی طرح سر کنڈے کا 'سرّ' سر کنڈ کے کراہنے سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن روح کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ انسانی آنکھ کو اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ وہ صرف ایک حد تک اشیاء اور رنگوں کو دیکھ سکتی ہے، لیکن انسان روح یا روح کے وجود کو اپنے پاس موجود طریقے سے تلاش کر سکتا ہے۔ روح جسم کے کام کا انتظام کرتی ہے..

یہاں رومی اس معاملے کی وضاحت کے لیے کہتے ہیں کہ بانسری کا نالہ جسم کی طرح ہے اور بانسری کا سر (نالے کے اندر پوشیدہ رمز) انسان کے لیے روح کی طرح ہے۔ جس طرح روح کو دیکھنا کسی کے لیے ممکن نہیں وہ میرے راز کو اتنا ہی سمجھیں گے جتنا وہ حسن و جمال کی کیفیات کا مشاہدہ کریں گے۔

اکبر آبادی کہتے ہیں کہ سر کنڈے کا نوحہ جسم کی طرح ہے اور نوحہ کا سر روح جیسا ہے۔ جیسا کہ زندگی حواس کو ثبوت کے طور پر نظر نہیں آتی۔ کراہنا خارجی حواس کے لیے قابل توجہ نہیں ہے۔ اس تمثیل سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ شعر میں تمام حواسِ ظاہر سے سر کے ادراک کی نفی مراد ہے۔ یہاں جدید نظریہ کا ٹچ بھی ہو جائے

جسم اور روح کے بارے میں سائنس کا نقطہ نظر

جسم اور روح کے باہمی ارتباط کی توجیہہ جدید سائنسی نقطہ نظر سے کی جائے تو ہم سائنس کی اصطلاح میں جسم کو مادہ (Matter) اور روح کو توانائی (Energy) کا نام دے سکتے ہیں۔ مادہ اپنی تین حالتوں یعنی ٹھوس 'مائع اور گیس پر مشتمل ہوتا ہے اور کثیف ہونے کے باوجود جب وہ ٹھوس سے مائع اور مائع سے گیس میں بدلتا ہے تو اس کی کثافت (Density) بتدریج گھٹنے لگتی ہے اور اس کی ماہیت میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ مادے کی ایک بنیادی خاصیت یہ ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے' اس کی مثال یوں ہے کہ برتن میں پانی مادے کی مائع حالت میں موجود ہے۔ برتن میں موجود پانی کو گرم کریں تو وہ حرارت سے بھاپ میں تبدیل ہو کر گیس کی شکل اختیار کرے گا اور پورے کمرے کی فضا میں پھیل جائے گا، جبکہ برتن میں وہ ایک محدود جگہ میں مقید تھا۔ پانی جب گرم ہو کر بھاپ یا گیس کی ہیت اختیار کر گیا تو وہ اپنی کثیف حالت سے لطیف حالت میں منتقل ہو گیا اور وہ اپنی اس حالت میں خالی جگہ میں پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس عام اصول کے مطابق جب کوئی شے مائع سے ٹھوس حالت میں منتقل ہوتی ہے۔ تو اس کی کثافت میں نسبتاً اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ گھیرنے کی استعداد نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ یہ عام سائنسی مشاہدہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ مادہ جس قدر کثیف ہو گا، وہ اتنا ہی محدود جگہ میں محصور ہو گا اور وہ جوں جوں لطیف ہوتا جائے گا، توں توں اس کا پھیلاؤ اور حصار بڑھتا

چلا جائے گا۔ مادے کی ان تینوں مختلف حالتوں کے فرق سے اس کی کثافت و لطافت کے فرق کا اندازہ ہو گیا۔ مادے اور توانائی کے فرق کو ایک مثال کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں۔

فرض کریں کہ آپ کے منہ میں پانی موجود ہے، جسے آپ کلی کی صورت میں باہر نکالیں گے تو اس کا فاصلہ اور پھیلاؤ محدود ہو گا' کیونکہ پانی مادہ ہونے کی بنا پر نسبتاً محدود جگہ میں محصور رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے منہ سے نکلنے والی آواز جو کہ توانائی کی ایک شکل ہے' دور تک جا رہی ہے اور اگر آپ لائوڈ سپیکر استعمال کر رہے ہوں تو اس آلے کی مدد سے اس کے دائرہ اثر (Range) میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ جسم اور روح کا تعلق اس سے گہری مماثلت رکھتا ہے' جسم مادی اور کثیف ہے' جبکہ روح غیر مادی لطیف وجود سے متشکل ہے اور وہ توانائی کی ناقابلِ بیان لطیف صورت ہے۔ اس پر مستزاد توانائی کی مختلف صورتیں' مثال کے طور پر آواز کے مقابلے میں روشنی بہت زیادہ طاقتور اور تیز رفتار ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کر لیتی ہے، جبکہ آواز کی رفتار مختلف اور محدود ہے، وہ صرف گیارہ سو پچاس فٹ فی سیکنڈ کی رفتار رکھتی ہے۔ رات کی تاریکی میں بجلی کا ایک قمقمہ روشن ہوتے ہی آن واحد میں پورے کمرے کو روشن کر دیتا ہے۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی لامتناہی مسافتیں طے کر کے مختصر وقت میں کرۂ ارض کے وسیع و بسیط خطے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اس کے تقابل میں آواز باوجود محیر العقول سائنسی ایجادات و اکتشافات کے ایک حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ ان مظاہر سے بدرجہا بڑھ کر روح توانائی کی وہ مافوق الادراک مابعد الطبیعاتی صورت ہے، جس کے لئے قُرب و بُعد اور زمان و مکان کی حدود و قیود کی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

جسم اور روح کی بحث کا ماحاصل

اس ساری گفتگو کا ماحاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مادی جسم اپنی خلقت کے اعتبار سے پابند اور محدود ہے' جبکہ روح ایک فوق الادراک ما بعد الطبیعاتی حقیقت ہے، جس تک عقل رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ انسانی شخصیت کی تعمیر میں روح کا کردار فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے' جب تک جسم پر بشریت کے اوصاف غالب رہیں' روح کمزور' مضمحل اور دبی دبی رہتی ہے اور نتیجتاً انسانی شخصیت میں بہیمیت اور حیوانیت کا عنصر غالب رہتا ہے، جس کے باعث وہ اعلیٰ اقدار کے جوہر سے محروم رہتی ہے' لیکن جیسے ہی جسم پر بشریت کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے' روح تقویت پا کر غالب اور مستحکم ہونے لگتی ہے اور انجام کار اس کی ملکوتی صفات جسمِ انسانی پر حاوی ہو جاتی ہیں، جس کے زیر اثر ایسے اوصاف کی حامل شخصیت سے وہ افعال صادر ہونے لگتے ہیں' جو روح کے تصرفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے؛ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ.

(بنی اسرائیل، 85:17)

اور یہ (کفار) آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے۔

خدا تعالیٰ نے روح کو امر ربی کہہ کر انسان کو متنبہ کر دیا کہ وہ اس معاملے کو زیادہ نہ کریدے کہ اس سے زیادہ اس کے حیطہ ءِ ادراک و فہم میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا اس کی شایانِ شان یہی ہے کہ روح کی ماورائی حقیقت کو فقط اپنے رب کا امر (حکم) سمجھنے پر اکتفا کرے، ورنہ وہ اپنی ناقص اور محدود عقل کے بل بوتے پر ایسی بھول بھلیوں میں پڑ جائے گا، جس سے نکلنا اس کے لئے ممکن نہ ہو گا۔

روح کا لفظ رب کے حکم سے ہے اور اسی لیے آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ روح کی حقیقت کیا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے اور اسی وجہ سے سب نے روح کے بارے میں جو کچھ کہا ہے کہہ دیا ہے۔، اور اس کی نوعیت کے بارے میں مختلف الفاظ بیان کیے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ آخری دو اشعار سے رومی کا مطلب یہ ہے کہ جسم روح سے مخفی نہیں ہے اور روح جسم سے مخفی نہیں ہے۔ اس نے یہ تمثیل اس نکتے کی وضاحت کے لیے پیش کی کہ سر آہ وزاری سے الگ نہیں ہوتا اور کراہنا بانسری کے سر سے الگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم وہی ہے جو روح ایک خاص مظہر کے ساتھ ہے اور روح ایک خاص اثر کے ساتھ جسم کی طرح ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسانی آنکھ کو اس طرح بنایا کہ وہ روح اور روح کو دیکھ سکے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یہ دونوں ایک ہیں، دو چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ظاہری مظہر ہے اور دوسری اندرونی مظہر ہے۔ اخروٹ کا مغز اور اس کا تیل دراصل ایک ہی چیز ہے۔ اخروٹ کی گٹھلی کے ہر ذرے میں تیل موجود ہے، لیکن دونوں کے دو اثرات ہیں۔ جیسا کہ طبیعیات دان مادے اور توانائی کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔ یعنی دونوں ایک جیسے ہیں، لیکن مادہ گاڑھا ہوا اور کمپریسڈ انرجی ہے، اور مادے کی توانائی رقیق ہے، اور ہمارے لیے دونوں میں فرق یہ ہے کہ ہم مادے کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن توانائی کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن ہم اسے ایک آلے سے سمجھ سکتے ہیں۔

رومی کہتے ہیں کہ تم اس زندگی سے الگ نہیں ہو، یعنی تم غیب میں ہو یا زندگی کے ساتھ گھل مل گئے ہو، لیکن تمہیں اسے دیکھنے کی اجازت نہیں، یہ اس مچھلی کی طرح ہے جو پانی میں ڈوبی ہوئی ہے، لیکن اسے خبر نہیں ہے۔ پانی، جب بھی پانی (مچھلی کا وجود بھی پانی سے ہے کیوں کہ اسکا 80-90 فی صد پانی ہے) سے نکلتا ہے اور اپنے سانچے کو خالی کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ پانی ہی اس کی زندگی کا ذریعہ تھا۔

ہم الٰہی روح میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور الٰہی روح اس قدر وسیع ہے کہ ہم اسے دیکھنے سے قاصر ہیں اور روح سے ناواقف ہیں!

اور ہمارے لیے ماوراء اور زندگی کو سمجھنے کے لیے، اس کا حکم ہونا چاہیے۔

اور میں امید کرتا ہوں کہ ہماری درخواست رب کے پاس جائے گی، کہ اس کا حکم ہم پر الٰہی روح سے جاری ہو گا۔

آتش است این بانگِ نائے و نیست باد

ہر کہ این آتش ندارد نیست باد

آتش: آگ۔۔۔، بانگِ نائے: نے نواز۔۔۔ پہلے مصرعہ میں نیست بمعنی نہیں اور باد بمعنی ہوا اور دوسرے مصرعہ میں نیست کے معنی برباد و فنا ہونا۔ باد مخفف ہے۔ بواد کا جو دعائیہ کلمہ ہے بود سے اور بود صیغہ واحد غائب فعل مضارع سے بودن کا۔

ترجمہ: یہ بانسری کی آواز ایک آتشِ سوزاں ہے اور صرف ہوا نہیں ہے۔ جو شخص اس آگ سے بہرہ ور نہیں وہ خدا کرے نیست و نابود ہو جائے۔

یہ بانسری کی آواز در اصل آگ ہے۔ جس میں یہ کیفیت آگ نہ ہو وہ ختم ہو یعنی نیست و نابود ہو جائے۔
گرم اور آتشی الفاظ خدا کے اولیاء ہیں اور ہواؤں اور جسمانی ہواؤں سے متاثر نہیں ہوتے۔
اور جو اس آگ سے فائدہ نہ اٹھائے، اس کا نہ ہونا وجود کی وجہ سے ہے۔!

اب تک ہم سمجھ چکے ہیں کہ سرکنڈے کی آواز رومی کے کلام کے پیچھے ذہانت ہے، یعنی رومی کی کتاب میں ایک روح رواں ہے اور وہ روح آگ کی طرح ہے۔ آپ سو سال تک رومی کی کتاب پڑھ لیں لیکن آگ آپ کی زندگی پر نہیں پڑے گی کیونکہ آپ کو رومی کی روح نہیں ملی۔

اور آپ رومی سے ایک لمحے کے لیے قلبی تعلق قائم کر لیں اور اس کی آگ آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور جب یہ آگ آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک اور آواز ہے اور یہ وہ آگ ہے جو آپ کو زندگی میں لے آئی ہے۔

مولانا جلال الدین روم کو خدا تعالي سے بے حد محبت تھي اور ان کا عشق الٰہي ایک شعلہ فشاں ولولہ تھا جو اللہ تعالي کي معرفت کے حصول کے لیۓ دن رات کوشاں رہتا تھا-رومي عشق الٰہي کے اس روحاني جذبے کو اپني خلوت نشیني اور اپنے زہد اور تقوي کو معاشرتي زندگي میں بروۓ کار لاتے تھے -

انہوں نے خدا سے وصل کے لیۓ تنہائي اور خلوت اختیار کي تا کہ اللہ تعالي کا قرب ممکن ہو-اس کام میں وہ بے حد مستقل مزاج رہے-انہوں نے کبھي بھي بے صبري کا مظاہرہ نہ کیا-رومي کے مطابق جو لوگ اللہ تعالي سے حقیقي عشق کرنے کي تعلیم دیتے ہیں وہ ہمیشہ اپنا یہ عہد یاد رکھیں کہ وہ شعلہ فشان جذبات کے ساتھ اللہ سے محبت کرتے ہیں -یہ وہ گراں قیمت ہے جو ہر باوفا عاشق اللہ کے عشق میں فنا حاصل کرنے کے لیے ضرور ادا کرتا ہے-مزید انہیں ایسے بلند پایہ اخلاق اور روحاني رویوں میں سر مست رہنا چاہیے کہ وہ کم خور و کم خواب ہوں اور اپني گفتگو میں ہمیشہ رب تعالي کي طرف مکمل طور پر متوجہ رہیں-اور جب ایسا مرد کامل خدا کے عشق میں فنا ہو کر لازوال نعمت عشق حاصل کرتا ہے تو وہ لازمي طور پر حیران کن روحاني تجربات سے گزرتا ہے-

رومي کي نظر میں ایک عاشق کو غفلت کي نیند نہیں سونا چاہیں کیونکہ اس کي یہ نیند محبوب کو ناگوار گزر سکتي ہے اس لیۓ محبوب سے ملاقات کے وقت عاشق کو ہمہ وقت بیدار رہنا چاہیۓ-جیسا کہ خدا تعالي نے حضرت داود کو ہدایت فرمائي-

"اے داود جو لوگ میرے دائمي ذکر سے غافل ہو کر سوتے ہیں اور پھر مجھ سے محبت کا دعوي کرتے ہیں،وہ جھوٹے ہیں"-

رومی کے کلام سے عشق و مستی، محبت شدید اور عقیدہ وحدت الوجود کی توانائی معصوم و منتظر آہیں اور سسکیاں، تمنائے دیدار محبوب اور ملاقات رب ودود کے سچے جذبات ظاہر ہوتے دکھائی دیتے ہیں-

رومی کو اپنے جذبہ عشق پر یقین کامل تھا اور انہوں نے تمام عمر عشق و مستی کا اظہار کیا-انہیں یقین تھا کہ وہ خدا کو محبوب ہیں-ان کی قربت میں بہت سی پاک ہستیاں بھی موجود ہوا کرتی تھیں-وہ یقین رکھتے تھے کہ وفا کی حساسیت کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ جام محبت جو ان کو رب کی جانب سے انہیں پیش کیا جاتا تھا-وہ جام محبت اپنے تمام حلقہ احباب کو پیش کریں-

انسانی فطرت ہے کہ وہ اس دُنیا میں جس بھی شے سے محبت کرتا ہے اس کے قرب و دیدار کی طلب اور حصول کی جستجو کرتا ہے۔

محبت بہت سے رشتوں اور اشیا سے ہو سکتی ہے لیکن جس محبت میں شدت اور جنون پیدا ہو جائے اور جو دیگر تمام محبتوں پر غالب

آجائے اسے عشق کہتے ہیں۔ عشق مستی و جنون ہے، عشق وفاو قربانی ہے۔ عشق جاں نثاری ہے، عشق مقامِ فنا ہے یعنی اپنی ہستی کو مٹا کر معشوق کی ہستی میں اس طرح فنا ہو جانا جہاں میں اور تُو کا فرق بھی مٹ جائے۔ عشق کا خمیر انسان کی روح میں ازل سے شامل ہے۔ کائنات کی ابتدا عشق ہے اور انسان کی تخلیق عشق کے لیے ہوئی۔ اللہ کی ذات مخفی و پوشیدہ تھی۔ پھر اس ذات میں پہچانے جانے کا جذبہ پیدا ہوا تو اس نے کائنات اور مخلوقات کو تخلیق کیا۔ حدیثِ قدسی ہے "میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو تخلیق کیا۔" قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن (الذاریات۔56)

ترجمہ: اور ہم نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

اللہ نے اللہ پاک سے عشق کو مومنین کی صفت قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔(البقرہ۔165)

ترجمہ: اور جو ایمان لائے اللہ کے لیے ان کی محبت بہت شدید ہے۔

کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی صفات کی مظہر ہے لیکن انسان اشرف المخلوقات اس لیے کہلایا کہ ربّ کائنات کی لا محدود ذات اپنی تمام تر تجلیات کے ساتھ انسان کے اندر موجود ہے۔ اللہ پاک نے وحدت سے نکل کر کثرت میں ظہور کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنی ذات سے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ظاہر فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نورِ مبارک سے تمام ارواح کو پیدا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت سے عشقِ الٰہی کا جوہرِ خاص انسانی ارواح کے حصے میں آیا۔

شاعر نے عشق کی اعلیٰ کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ لعنت ہو اس پر جس کو حالتِ عشق نصیب نہ ہو اور موت اس کے لیے زندگی سے بہتر ہے اور دوسری تشریح میں اس کے لیے دعا کی ہے کہ اگر وہ تکلیف میں نہ ہو۔ محبت کی کیفیت سے، وہ اس میں مبتلا ہو گا اور وہ متاثر ہو گا اور اسے بے نیازی اور فنا نصیب ہو گی۔

آتشِ عشق است کاندر نےَ فتاد

جوششِ عشق است کاندر مےَ فتاد

مشکل الفاظ کے معانی

کاندر: اندر کا ،کاف بیانیہ، آتش: آگ، نَے سے مراد عاشق اور مےَ سے مراد معشوق

ترجمہ: عشق کی آگ جو بانسری میں لگی ہے۔ اور جو شراب میں جوش ہے وہ بھی عشق کی بدولت ہے۔ اور بعض کے ہاں یوں ہے

یہ آگ عشق کی ہی ہے جو نے میں لگ رہی ہے۔ یہ جوش عشق ہی کا ہے جو شراب میں برپا ہے۔

مطلب:

اگر سرکنڈ جلتی اور سلگتی آرزو میں گرتا ہے تو یہ محبت کی آگ کی وجہ سے ہے جو اس میں گر گئی اور اس کی اداس آواز کا سبب بنی۔

اور اگر ہوا ابلتی ہے تو یہ محبت کے ابلنے کی وجہ سے ہے۔

مذکورہ بالا شعر افلاطونی روشن خیالی کے اصول پر مبنی ہے کہ تمام کائناتوں میں محبت رواں دواں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وجود اپنی بلندی کی آرزو رکھتا ہے اور بنیادی طور پر مخلوقات کی حرکت و کوشش کی وجہ کمال کی خواہش ہے۔

محبت حبت سے ماخوذ ہے (= چپکی اور لگاؤ)۔

اسی وجہ سے کانٹے کے پودے کو محبت بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ درخت کے تنے کو لپیٹ کر چپک جاتا ہے اور اوپر چڑھ جاتا ہے۔

افلاطون کا خیال ہے کہ محبت انسانوں اور دیوتاؤں کے درمیان ثالث ہے اور ان کے درمیان خلا کو پر کرتی ہے۔

پچاس سال تک عقل کتنی ہی جمع کر لے، محبت اس جملے کو ایک ہی سانس میں جلا کر عاشق کو پاک وصاف کر دے گی، اور سالک اس نمک کی مقدار کو پورا نہیں کر سکے گا جو عاشق ایک طرف کر سکتا ہے۔

لیکن رومی کا خیال ہے کہ محبت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

کوئی بھی جو طالب ہے نے ہو سکتا ہے! محبت کے بارے تھوڑی سے بات کر لیں:

لفظ محبت اپنے معانی اور مفہوم کے اعتبار سے اپنے دامن میں بڑی وسعت، جامعیت اور معنویت رکھتا ہے اس کے لغوی معنی الفت و پیار، چاہت و لگن اور انس و عشق کے ہیں۔ اصطلاح عام میں محبت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ وہ لطیف جذبہ جو دل کو کسی جانب مائل کر دے یا ایسا طبعی میلان جو دائی اور مستقل ہو محبت کہلائے گا۔

ہر حال میں محبوب کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، اس کو محبت کہتے ہیں راحت و سرور ہو یا رنج و غم، نفع ہو یا نقصان، ہر صورت میں اپنی خواہش ختم کر کے محبوب کی خواہش کا غلام ہو جانا، اسی کا نام محبت ہے ۔اس کی کئی اقسام ہیں۔

رومیؒ کہتے ہیں عشق کی آگ بھوسے میں پڑی ہے !

اس کا مطلب ہے کہ رومی میں شمس کی آگ یا روح پھونکی گئی ہے! آگ تپش کا نام ہے۔ یہ اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ اس نعمت ہے۔ کسی ٹھٹھرے سے اس کی قیمت پوچھیئے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ کا واقعہ بیان کرتے ارشاد فرمایا؛

اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (١٠) ترجمہ: جب اُس نے ایک آگ دیکھی تو اپنی بی بی سے کہا ٹھہرو مجھے ایک آگ نظر پڑی ہے شاید میں تمہارے لیے اس میں سے کوئی چنگاری لاؤں یا آگ پر راستہ پاؤں۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰى ؕ (١١) اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡكَ ۚ اِنَّكَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى ؕ (١٢) ترجمہ: کنزالایمان پھر جب آگ کے پاس آیا ندا فرمائی گئی کہ اے موسیٰ بے شک میں تیرا رب ہوں تو تو اپنے جوتے اتار ڈال بے شک تو پاک جنگل طویٰ میں ہے۔ جب محبت کی تپش کی حرارت قلب موسوی پر پڑی تو منظر بدل گیا اور پھر

جب حضرت موسیٰ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اس آگ کے پاس تشریف لائے تو وہاں آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے ایک سرسبز و شاداب درخت دیکھا جو اوپر سے نیچے تک انتہائی روشن تھا اور آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام جتنا اس کے قریب جاتے اتنا وہ دور ہو جاتا اور جب آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ٹھہر جاتے ہیں تو وہ قریب ہو جاتا، اس وقت آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو ندا فرمائی گئی کہ اے موسیٰ !بیشک میں تیرا رب ہوں تو تو اپنے جوتے اتار دے کہ اس میں عاجزی کا اظہار، مقدس جگہ کا احترام اور پاک وادی کی

خاک سے برکت حاصل کرنے کا موقع ہے، بیشک تو اس وقت پاک وادی طُویٰ میں ہے۔)مدارک، طہ، تحت الآیۃ :۱۱-۱۲، ص ۶۸۷

وہ انوار و تجلیات کی ہویدگی ہوئی کہ سامنے جلوہ و تجلیٰ تھا اور موسیٰؑ تھے اور اسکا جلوہ۔ اللہ اللہ !

ایرانی صوفیانہ ادب میں روح کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جب وہ بیدار ہوتی ہے تو بہت زیادہ روشنی پیدا کرتی ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ تم ایک پتلا سرکنڈہ ہو اور میرے الفاظ سے تم میں آگ بھڑک اٹھتی ہے اور بیدار ہوتی ہے، جو کہ سب سے اہم ہے۔ جو محبت ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر کی یہ آگ محبت میں بدل جائے گی اور پھر ابل پڑے گی۔

جب وہ شراب ڈالتے ہیں تو ایک مرحلہ آتا ہے جہاں انہیں اسے باقاعدگی سے ہلانا پڑتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کریں تو شراب بلبلا اٹھے گی، جھاگ اور خراب ہو جائے گی، اور رومی کا مطلب یہ ہے کہ جو پھوڑا آپ کے جسم میں پیدا ہوتا ہے۔ آگ کا نتیجہ کہ میں نے تیرے اندر ہلایا اور پیدا کیا...

شعر میں "نے" کا معنی "طالب" ہے، اور "نے" اور "طالب" کی تشبیہ آہیں ہیں، اور "مئے" ایسی حالت ہے جو طالبان بناتی ہے۔ خود کو کھو دیتے ہیں. لہٰذا اس شعر میں عشق و محبت کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ کہ عشق و محبت دونوں محبوب اور محبت ہیں۔ حالانکہ ان دونوں صفتوں میں بہت فرق ہے۔ "پاکیزہ دنیا میں گندگی کا تناسب کیا ہے" لیکن برائے نام شرکت کو کوئی چھوٹی نعمت نہیں سمجھا جاتا۔ جیسا کہ: سعدیؒ فرماتے ہیں

برگِ درختانِ سبز، در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست ز معرفت کردگار (سعدیؒ)

ہوشیار کی رائے میں سبز درختوں کے پتے

ہر صفحہ، علم اللہ کی معرفت کی کتاب ہے۔

اے خدا! میں اس بے سوز و گداز زندگی سے عاجز آگیا ہوں یا تو مجھے وہ آنکھ عطا کر جو تجھے دیکھ سکے یا پھر اس "جانِ بے دیدار" کو مجھ سے واپس لے لے۔ تو نے مجھے عقل دی ہے، تو عشق (جنون) کی دولت بھی عطا فرما تا کہ میں مقصدِ حیات میں کامیاب ہو سکوں۔

اقبالؒ، علم اور عشق کا مختصر موازنہ کرتے ہیں

کہتے ہیں کہ علم کا مقام ذہن یا سوچ بچار ہے لیکن عشق کا مقام قلب ہے، جو ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

"قلب لا نیام" وہ قلب جو کبھی نہ سوئے اس لئے اقبالؒ دل کی بیداری کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ جب عاشق "**واذکروالله کثیراً**" پر عمل کرتا ہے تو ذکرِ الٰہی کی برکت بلکہ تاثیر سے اس کا دل جاری ہو جاتا ہے یعنی خواہ وہ کسی حال میں ہو، اس کا دل ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ اس کو صوفیاء اپنی اصطلاح میں "دل کا جاری ہو جانا" کہتے ہیں اور اقبالؒ اس کو دل کے زندہ ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اسی دلِ زندہ کو قلبِ لا نیام بھی کہتے ہیں یعنی عاشق کا دل ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے، سوتے میں بھی، جاگتے میں بھی۔ ذکر سے مراد یاد بھی ہے اور توجہ بھی، لگن، رابطہ اور دھیان بھی۔ ادنیٰ درجہ میں اس کا تجربہ عشقِ مجازی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ شخص خواہ میز کرسی لگائے پڑھ رہا ہو یا لکھ رہا ہو یا دفتر میں فائلوں میں سر کھپا رہا ہو یا دکان پر سودا بیچ رہا ہو یا سڑک پر کنکر کوٹ رہا ہو یا کلاس میں لیکچر دے رہا ہو، غرضیکہ کسی حال میں بھی کیوں نہ ہو، دھیان اس کا اپنے محبوب کی طرف ہوتا ہے۔ بظاہر وہ کسی کام میں مشغول نظر آتا ہے مگر اس کا دل اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بس اسی کو ذکر کہتے ہیں۔

حضور ﷺ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ آپؐ کے غلاموں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ ہر حال میں "دل بیار و دست بکار" کے اصول پر عامل رہتے تھے اور اسی لئے وہ اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال تھے۔

جب تک علم (عقل) عشق سے روشنی اور ہدایت حاصل نہ کرے اس وقت تک اس کی حیثیت "تماشہ خانۂ افکار" سے زائد نہیں ہوتی۔ جب تک علم (عقل) عشق کے تابع نہ ہو اس وقت تک اس میں انسان کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور یہ تماشہ خانہ گویا 'سحر سامری' ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، محض فریب نظر ہوتا ہے، جس سے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب تک علم (عقل) کو روح القدس (عشقِ الٰہی) کی تائید نہ ہو، اس کی حیثیت افسوں گری سے زیادہ نہیں ہے۔

اقبالؒ نے (عقل) کو ہمیشہ 'تماشہ خانۂ افکار' یا 'بتکدۂ تصورات' سے تعبیر کیا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بتکدۂ تصورات

تماشہ خانۂ افکار یا بتکدۂ تصورات سے اقبالؒ کا دراصل مطلب یہ ہے کہ محض عقل، انسان کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کی حالت یہ ہے کہ مثلاً آج وہ ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایک دلیل قائم کرتی ہے تو کل خود ہی اس کے ابطال پر دلیل قائم کر دے گی۔ یعنی جو دلیل آج ہم علم (عقل) کے دربار میں مقبول ہے، کل وہی دلیل مردود ہو جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ عقل، افکار و تصوراتِ مختلفہ، متضادہ اور متعارضہ کا ایک تماشہ خانہ ہے جس میں ہر روز نئے نئے تصورات جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے جھلک دکھا کر اسی طرح خارج ہو جاتے ہیں جس طرح ایکٹر تماشہ دکھا کر اسٹیج سے غائب ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں عقل انسانی جو تصورات قائم کرتی ہے ان کی صحت پر اسے کبھی بھی یقین نہیں ہوتا (کیونکہ ہو نہیں سکتا) اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا دارومدار ان معلومات پر ہے جو بذریعہ حواسِ خمسہ حاصل ہوتی ہیں اور حواس کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہتے ہیں۔ یعنی جو علم، حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ یقینی نہیں ہوتا اس لیے تصوراتِ ذہنی اور افکار عقلی بھی لائقِ اعتبار نہیں ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب تک۔" تجلّی" یعنی عشق رہنمائی نہ کرے، کوئی عقلمند آدمی محض اپنی عقل کے بل بوتے پر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ وہ اپنے خیالاتِ متضادہ کی کشمکش ہی میں مبتلا رہتا ہے اور انجام کار حیرانی اور پریشانی کے صحرا میں ساری عمر بھٹکتا رہتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا

دل کو بھایا نہ کوئی رنگِ محبت کے سوا

کہتے ہیں کہ تجلّی کے بغیر یعنی عشقِ صادق کے بغیر انسانی زندگی مستقل عذاب یا مصائب و آلام کا منبع بن جاتی ہے اور انسان بلاشبہ اطمینان، تسکین اور راحتِ قلبی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "رنجوری" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ رنجوری کے معنٰی ہیں مرض یا بیماری۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہر وہ شخص جو عاشق نہیں ہے، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے مریض (رنجور) ہوتا ہے۔ صرف عشق ہی میں یہ طاقت ہے کہ وہ روح کے تمام امراض کا ازالہ کر سکے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما (رومیؒ)

تجلی کے بغیر زندگی تو سراسر دکھ ہے اور عقل مہجوری ہے یعنی منزلِ مقصود سے دوری ہے۔ یا حریم ناز (درِ جاناں) سے جدائی ہے۔ دیکھا جائے تو ہر عقلمند آدمی مسلکِ جبر کی طرف مائل ہوتا ہے کیونکہ عقل اسے دلیلوں سے قائل کرتی ہے کہ انسان مجبور ہے اور چونکہ مجبور ہے اس لیے اس سے بازپرس نہیں ہوگی۔ عاشق، بر عکس ایں، اختیار کی طرف راغب ہوتا ہے یعنی وہ مسلک اختیار پر عامل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ کا نائب ہوں اس لیے اگر مجھ میں اختیار نہ ہو تو نیابت کیسے کروں۔ عشق کا تقاضا ہے کہ وہ عاشق کو معشوق کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کو جذب و انجذاب کہتے ہیں یعنی عاشق، معشوق کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں اس کے خواص پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح لوہا اگر کچھ عرصہ آگ میں پڑا رہے (یعنی وہ اپنے کو آگ میں فنا کر دے) تو لوہے میں آگ کی صفات جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ دنیا جو کوہ و دشت و بحر و بر کا مرکب ہے، ہم اپنی غلطی کی بناء پر اس سے 'نظر' کے طالب ہیں لیکن یہ ماڈی دنیا ہمیں صرف 'خبر' دے سکتی ہے۔ نظر تو کسی صاحبِ نظر کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل نہ خود حقیقت کو دیکھ سکتی ہے نہ ہمیں دکھا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ 'نظر' سے محروم ہے۔ اس کا دارومدار تو خبر پر ہے، یعنی ان اطلاعات پر جو اس کو حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خبر کی بدولت انسان جان سکتا ہے، دیکھ نہیں سکتا۔ اسی لئے سلطان ابو سعید ابوالخیرؒ نے ابن سینا کی گفتگو سن کر اپنے خدّام سے یہ فرمایا تھا "انچہ او مہ داند ما می بینم"

بات صرف اتنی ہے کہ خبر میں ہمیشہ کذب (جھوٹ) کا احتمال رہتا ہے۔ نظر، یقین پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا کہ

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

کہیں 'عشق' سجدے میں گر گیا
کہیں 'عشق' سجدے سے پھر گیا
کہیں عشق درسِ وفا بنا
کہیں 'عشق' حُسنِ ادا بنا

کہیں ’عشق‘ نے سانپ سے ڈسوا دیا

کہیں ’عشق‘ نے نماز کو قضا کیا

کہیں ’عشق‘ سیفِ خُدا بنا

کہیں ’عشق‘ شیرِ خُدا بنا

کہیں ’عشق‘ طور پر دیدار ہے

کہیں ’عشق‘ ذبح کو تیار ہے

کہیں ’عشق‘ نے بہکا دیا

کہیں ’عشق‘ نے شاہِ مصر بنا دیا

کہیں ’عشق‘ آنکھوں کا نور ہے

کہیں ’عشق‘ کوہِ طور ہے

کہیں ’عشق‘ تُو ہی تُو ہے

کہیں ’عشق‘ اللہ ھُو ہے

’عشق‘ کی پہلی منزل ’لا‘ ‘ ‘

نے حَریف ہر کہ از یارے برید

پردہایش پردہ ہائے ما درید

حریف: ہم پیشہ دشمن کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔

برید: کاٹ دیا

بانسری اس کی ساتھی ہے جو یار سے کٹ گیا ہو۔ اور اس کے نالوں اور سر نے ہمارے دلوں کے پردے پھاڑ دئے ہوں۔

ایک کامل انسان، جو بانسری کی طرح الٰہی گیت گاتا ہے، اس کا دوست اور ساتھی ہوتا ہے جو اپنے تمام دنیاوی وابستگیوں اور لگاؤوں سے کٹا ہوا ہوتا ہے، اس کے وہ کلمات اس درد اور فراق کی لذت سے ادا ہوتے ہیں کہ سننے والوں کی دل گویا ٹوٹ جائیں گے۔

آواز ایک حقیقت ہے یہ ایک توانائی کی قسم ہے۔ بلا شک وشبہ اس کی اثر انگیزی ہے۔ اور نے جو کہ روح ہے اس پر آواز کا وہ اثر ہے جو روح کو تابندگی عطا کر دیتی ہے۔

لحن داؤدی

داؤد علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ جب آپ تلاوت فرماتے تو اس لحن کے باعث پرندے وجانور تک وجد میں آجاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ترتیل کا حکم عطا کیا تھا، جس کے باعث پہاڑ اور پرندے ان کی خوش الحان قرأت میں آواز سے آواز ملا کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے۔ آپ کی آواز میں وہ نغمگی، مٹھاس اور ایسا زیر و بم تھا کہ شجر و حجر سبھی کو متاثر کرتا تھا۔ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندے رُک جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہاڑ بھی صبح وشام ان کے ساتھ تسبیح کرنے پر مامور تھے۔ کائنات کا ہر ذرہ حمد وثنا کرتا ہے بے شک ہم نہ سمجھ سکیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ایک رات صحابیِ رسول ابو موسیٰ اشعری تلاوت کلام پاک کر رہے تھے۔ رسول کریم ﷺ دیر تک سنتے رہے پھر خوش ہو کر فرمایا کہ آج مجھے لحن داؤد علیہ السلام کا کچھ حصہ مل گیاہے۔ روایات میں یہاں تک آیا ہے؛ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں "إِنِّي لَأَعْرِفُ أَصْوَاتَ رُفْقَةِ الأَشْعَرِيِّينَ بِالْقُرْآنِ، حِينَ يَدْخُلُونَ بِاللَّيْلِ، وَأَعْرِفُ مَنَازِلَهُمْ مِنْ أَصْوَاتِهِمْ بِالْقُرْآنِ بِاللَّيْلِ، وَإِنْ كُنْتُ لَمْ أَرَ مَنَازِلَهُمْ حِينَ نَزَلُوا بِالنَّهَارِ "(3) قبیلہ اشعر کے لوگ جب رات کو اپنے گھروں میں تلاوت قرآن کرتے ہیں تو میں ان کی آواز پہچان لیتا ہوں اور اسی آواز سے ان کے مکانات کو بھی جان جاتا ہوں خواہ میں نے ان کو دن میں ان کے گھروں میں آتے جاتے نہیں دیکھا ہو اس قبیلہ کی تلاوت اور قرات قرآن کی تعریف میں آپ نے فرمایا "اشعرون في الناس كصرة فيها مسك "(4) یعنی قبیلہ اشعر کے لوگوں کی مثال ایک مشق بھری ہوئی تھیلی کی ہے خاص طور پر حضرت ابو موسی کی تلاوت و قرات قرآن کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا "لَقَدْ أُوتِيَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ" اللہ نے انکو حضرت داؤد علیہ السلام کے خاندان کے لوگوں کی طرح حسن صورت اور خوش الحانی عطا فرمائی ہے۔

امام ابن عساکر متوفی 571ھ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ حضرت دائود (علیہ السلام) کو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ حسین آواز دی گئی تھی۔ (تاریخ دمشق الکبیر ج 19 ص 72، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1421ھ) پس جب حضرت دائود (علیہ السلام) کی آواز پہاڑوں تک پہنچتی تو وہ ان کی آواز کی لذت سے جھومنے لگتے اور جب پرندے ان کی آواز سنتے تو وہ بھی ان کے ساتھ سُر ملانے لگتے۔ بعض عارفین نے کہا ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت دائود (علیہ السلام) کی تسبیح کے ساتھ اس لئے تسبیح کرتے تھے تاکہ ان کی تسبیحات کا اجر و ثواب بھی حضرت دائود (علیہ السلام) کو مل جائے، حضرت دائود (علیہ السلام) جب حمد اور تسبیح کے معنی میں بہت غور کرتے تھے تو وہ حمد اور تسبیح آپ کے اعضاء میں سرایت کر جاتی تھی، کیونکہ یہ اعضاء آپ کی روح کے مظاہر تھے، پھر آپ کے اعضاء سے حمد اور تسبیح کی صورت پہاڑوں اور پرندوں میں سرایت کر جاتی تھی، کیونکہیہ اعضاء آپ کی روح کے مظاہر تھے، پھر آپ کے اعضاء سے حمد اور تسبیح کی صورت پہاڑوں اور پرندوں میں سرایت کر جاتی تھی، اس وجہ سے پہاڑ اور پرندے بھی آپ کی تسبیح کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، اس وجہ سے ان کی تسبیح کا فائدہ بھی آپ کی طرف لوٹتا تھا، شام کے وقت اور دن چڑھنے کے وقت اس تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے انوارز اور اس کی برکت کے آثار بہت عظیم ہوتے ہیں کیونکہ جو مقربین اللہ تعالیٰ کی تجلیات میں مستغرق اور مخمور ہوتے ہیں وہ اس وقت اپنے استغراق اور خمار سے باہر آجاتے ہیں اور شام کے وقت میں نماز پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجات پیش کرتے ہیں اور اس سے مناجات کرتے ہیں۔ (تبیان القرآن ص:21۔۔۔19)

رومی کہتے ہیں: ہم جو جدائی میں مبتلا ہیں، ان غم زدہ آہوں سے متاثر ہوئے اور ہمارے دلوں سے غفلت اور سستی کے پردے ہٹ گئے اور ہم محظوظ ہو گئے (سرکنڈوں کے سوراخ جن سے آواز نکلتی ہے اسے پردہ کہتے ہیں، اور لفظ پردہ کی تکرار نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے)۔

ایسے پردے ہیں جو دل کو ڈھانپتے ہیں اور ہمیں اس جدائی کی طرف توجہ نہیں کرنے دیتے۔

صرف علومِ قلب، یعنی وہ علوم جو اللہ تعالیٰ نے انسانی دل میں نازل کیے ہیں، انسان کو حرکت دے سکتے ہیں۔ اس لیے رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اور خدا کے درمیان سے وہ پردے ہٹ جائیں گے۔ اس کے لئے جو اس خالی پن کو سمجھتا ہے، جو سمجھتا ہے کہ میں پہلے وہاں تھا، اب حاضر ہوں، ایسے شخص کے لیے مثنوی سے پردہ کھل جاتا ہے اور وہ اسے حرکت فراہم کرتی ہے۔

قرآت قرآن کی دل سوزی

اللہ کی آخری کتاب 'قرآنِ کریم' میں لفظی و معنوی حسن بھی بلادرجے کا ہے۔ جب ایک قاریٔ قرآن دل کی گہرائی سے سوز وانداز سے تلاوتِ قرآن کرتا ہے تو پاکباز روح اس سے مسرور ہو جاتی ہے۔ خوبصورت آواز میں کی گئی تلاوت دل میں اُترتی جاتی ہے، قرآن کی زبانی ﴿وَإِذا سَمِعوا ما أُنزِلَ إِلَى الرَّسولِ تَرىٰ أَعيُنَهُم تَفيضُ مِنَ الدَّمعِ مِمّا عَرَفوا مِنَ الحَقِّ...٨٣﴾ ... سورۃ المائدۃ "خلوصِ دل سے اس تلاوت کو سننے والوں کی آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آواز سے متاثر ہونے کے فطری تقاضے کو 'مارنے' کی بجائے تلاوتِ قرآنِ مجید میں مسلمانوں کا دل لگایا جائے۔ اگر وہ اس تلاوت کے ساتھ ان الفاظ کا مفہوم بھی بلاواسطہ سمجھ سکیں تو پھر یہ اثر آفرینی دوچند ہو جائے۔

قرآنِ کریم کو خوش الحانی اور خوبصورت آواز سے پڑھنا سید القراء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سنت ہے۔ درج ذیل احادیث اس پر واضح دلیل ہیں:

صحیحین میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

»ما أَذِنَ اللهُ لشيء ما أَذِنَ لنبي حسن الصوت يتغنى بالقرآن يجهر به«

"اللہ تعالیٰ اتنا متوجہ ہو کر کسی چیز کو نہیں سنتا، جتنا قرآن کو متوجہ ہو کر سنتا ہے، جب پیغمبر ﷺ اس کو اونچی آواز سے خوش آوازی اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔) "بخاری ٧٥٤٤، مسلم ١٨٤٤(

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ جب قرآنِ کریم کو ترنم اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس قدر توجہ سے سنتے ہیں کہ کسی اور کی آواز کو اس قدر توجہ سے نہیں سنتے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کی تلاوت کو اس لئے بھی زیادہ توجہ سے سنتا ہے کیونکہ پیغمبروں کی شخصیت ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہے اور ان کی قراءت خشیتِ الٰہی، سوز اور خوبصورت آواز کا ایک حسین مرقع ہوتی ہے اور تلاوتِ قرآن کا مقصدِ حقیقی بھی یہی ہے اور اسی میں انسان کی سعادت ہے کہ اللہ اس کی آواز کو توجہ سے سن لے۔ یوں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نیک وبد اپنے سب بندوں کی آواز کو سنتا ہے جیسا کہ امّ المومنین عائشہ صدیقہ نے فرمایا:

»تبارك الذي أوعى سمعه كل شيء " «برکت والی ہے وہ ذات کہ کوئی چیز بھی اس کے دائرۂ سماعت سے باہر نہیں ہے(تفسیر ابن کثیر: ٨/ ٦٠)

لیکن اپنے مؤمن بندوں کی آواز کو وہ زیادہ توجہ سے سنتا ہے۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَما تَکونُ فی شَأنٍ وَما تَتلوا مِنہُ مِن قُرءانٍ وَلا تَعمَلونَ مِن عَمَلٍ إِلّا کُنّا عَلَیکُم شُهودًا إِذ تُفیضونَ فیهِ...٦١﴾ ...سورۃ یونس

"(اے نبی!) تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور (اے لوگو!) جو کام بھی تم کر رہے ہوتے ہو، ہم ہر وقت تمہارے سامنے موجود ہوتے ہیں، جبکہ تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔" قرآن پاک کی تفسیر پر ہمارا ایک اور فورم ہے آپ قرآن فہمی کے لئے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

همچو نے زهرے و تریاقے که دید

همچو نے دمساز و مشتاقے که دید

مشکل الفاظ کے معانی:

ہمچو: مانند، مثل، اسی طرح، دید: نظر، دیکھا

دمساز: ہمدم، ہمراز، ہمدرد، ساتھ دینے والا، ساز کے ذریعے یا اس کے ساتھ آواز نکالنے والا

مشتاق: خواہش رکھنے والا، چاہنے والا، خواہش مند، خواہاں، طالب

ترجمہ: بانسری جیسا زہر اور تریاق کسی نے دیکھا ہے؟ کیا بانسری جیسا ساتھی اور عاشق کسی نے دیکھا ہے؟

مطلب؛ نے سے اگر انسان کامل مراد لیں تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ وہ خود ہی زہر ہے اور خود ہی تریاق بھی ہے کہ بالآخر بقاء باللہ حاصل کرتا ہے۔

اور اگر ظاہری معنی یعنی بانسری لیا جائے تو مطلب یہ کہ اس کی تاثیر غم ناکی سے لذت ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ طلبِ کمال پیدا کرتی ہے جو روح کے لئے تریاق کا کام دیتی ہے۔

ماضی میں، زہر اور زہریلی جڑی بوٹیوں کو علاج کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور اگر وہ الٹا اثر کرتیں تو انکا اثر ختم کرنے کے لئے بھی زہر ہی استعمال کیا جاتا اس وقت اسے تریاق کا نام دیا جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔

رومی کہتے ہیں کہ میں زہر اور تریاق دونوں ہوں، یعنی میں جڑا ہوا ہوں اور جلاوطن بھی، میں درد اور علاج دونوں ہوں۔

بانسری کے نوحہ کے نتیجے میں دل سے غفلت دور ہو جاتی ہے اور ایک خوشگوار گرمجوشی ابھرتی ہے۔ غفلت کو دور کرنا اور شہوتوں کو کم کرنا ضروری ہے جس کے نتیجے میں روح کے لیے ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو جائے اس کے بدلے میں روح کے لیے کھانا تیار ہو گا۔ لہٰذا، جب نے کا جلتا ہوا جذبہ سامعین کے لیے اس قدر جوش و خروش اور اثر لاتا ہے، تو ذاتی طور پر نےَ کے لیے اس کا کیا شاندار اثر ہو گا؟! چونکہ نےَ دراصل روح کے معنی میں ہے۔ اس لئے ان اصولوں کے مطابق تعلق کا متلاشی زیادہ پیار سے خدا تک پہنچنے کے راستے پر چلتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے: سرکنڈوں (جڑی بوٹیوں) کی طرح، یہ نہ تو زہریلا (روح سے متعلق) ہے اور نہ ہی تریاق (روح سے متعلق)۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قربت اور تعلق کو "دمسازی" سے تعبیر کیا ہے جس کا مطلب ہے متفق ہونا اور بہت کچھ حاصل کرنا "مشتاق" ہے جس کا مطلب ہے کہ عاشق تعلق میں بھی صبر اور سکون نہیں رکھتا۔

سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

دلارام در بر، دلارام جوی

لب از تشنگی خشک بر طرف جوی

نگویم کہ بر آب قادر نی اند

کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

دروازے پر اگر ندی ہو تو ہونٹوں ہر تشنگی ہو ندی پر کھڑا ہو

فضا کی طرف خشک پیاس سے ہونٹ

یہ مت کہو کہ وہ پانی کے قابل نہیں ہیں۔

جو دریائے نیل کے کنارے آباد ہو۔

کیف صدیقی کے بقول:

اک سانپ مجھ کو چوم کے تریاق دے گیا

لیکن وہ اپنے ساتھ مرا زہر لے گیا

اکثر بدن کی قید سے آزاد ہو کے بھی

اپنا ہی عکس دور سے میں دیکھنے گیا

حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوا:

کلمہ حق کہنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَحُبُّ الْجِهَادِ إِلَى اللهِ كَلِمَةُ حَقٍّ تُقَالُ لِإِمَامٍ جَائِرٍ۔

صحیح الجامع، رقم:١٦٦۔

"اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پسندیدہ جہاد ظالم بادشاہ کو حق بات کہنا ہے۔"

ایک اور روایت میں یہ مضمون یوں آیا ہے

افضل الجهاد كلمة عدل (وفی رواية: حق) عند سلطان جائر"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :سب سے زیادہ فضلیت والا جہاد، ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ عدل) یا کلمہ حق) کہنا ہے

عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رضی الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی الله عليه وآله وسلم: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ أَوْ أَمِيرٍ جَائِرٍ.

رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَة.

أخرجه أحمد بن حنبل فی المسند، 315/4، الرقم/18850، وأبو داود فی السنن، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهی، 123/4، الرقم/4344، والترمذی فی السنن، كتاب الفتن، باب ما جاء أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر، 471/4، الرقم/2174، والنسائی فی السنن، كتاب البيعة، باب فضل من تكلم بالحق عند إمام جائر، 161/7، الرقم/4209، وابن ماجة فی السنن، كتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنكر، 1329/2، الرقم/4011.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ظالم بادشاہ یا ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی بات کہنا افضل ترین جہاد ہے۔

کلمہ حق سے مراد ظالم بادشاہ کو کسی نیکی کا حکم یا کسی برائی سے روکنا ہے یہ کام خواہ الفاظ سے کرے یا لکھ کر یا اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے کرے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے پسندیدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں جہاد کرنے والا خوف بھی رکھتا ہے اور امید بھی۔ اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غالب آئے گا یا مغلوب ہو گا مگر ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو یقینی ہلاکت میں داخل کر لیا ہے۔ لہٰذا جہاد کی اس قسم میں خوف کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس کو افضل قرار دیا گیا۔

آئیں ایک دفعہ پھر مولانا کی طرف

ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید

ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید

نے حدیثِ راہِ پرخُون می کند

قصہ ہائے عِشقِ مجنُوں می کند

مشکل الفاظ کے معانی:

حدیث: بات، بیان

پرخون: خطرناک، ایسا کام جس میں جان جانے کا خطرہ ہو

مجنوں: دیوانہ

بانسری خطرناک راستہ کی بات کرتی ہے۔ اور مجنوں کے عشق کے قصے بیان کرتی ہے۔

مطلب: عشق کا راستہ خطرناک ہے اس میں جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور راہ بڑی مصیبتوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہاں نَے ان عاشقوں کا حال سناتی ہے جن کے دل ماسوا اللہ ہر چیز کو فنا کر چکے ہوتے ہیں۔

جو لوگ پاکیزہ روح رکھتے ہیں اسے قبول کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے روشنی ہے۔ ناپاک زندگی والے لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے نقصان ہے۔ بھوسہ (آپ سوچتے ہوں گے کہ لفظ ایک ہی ہے نےَ لیکن کبھی اسے سرکنڈا لکھا جاتا ہے اور کبھی تنکا کبھی بھوسا۔ بھئی یہ ایک ہی لفظ کے معانی ہیں جب اس کی ہئیت کا ذکر ہو گا تو سرکنڈا بولا جائے گا اور جب اس کی کم مائیگی کا ذکر ہو گا تو بھوسہ اور جب اس کی شان کا ذکر ہو گا تو بانسری) ایک ہی ہے، یہ کسی کے لیے زہر اور دوسروں کے لیے تریاق ہے۔

(فارسی میں نےَ کو نیَ لکھا جاتا ہے جبکہ برصغیر میں اسے 'ے' کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ یعنی نےَ۔)

البتہ نی کا معنی خود رومی ہے وہ شخص جس نے ایک روحانی سفر کیا ہو اور اپنے وجود کی گہرائیوں میں سفر کیا ہو اور اس مقام پر پہنچ گیا ہو جہاں انسان خدا سے ملتا ہے اور کچھ باتیں سنتا تھا، وہاں اسے کچھ باتیں سکھائی جاتی تھیں اور اب وہ واپس آ گیا ہے۔

اب یہ خبر جو وہ واپس آ کر لوگوں کے سامنے لاتا ہے، ہر کوئی قبول نہیں کرتا۔ ہر کوئی ان حقائق کو قبول نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ اس سے انکار کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خوش نصیب ہیں اس لیے ان الہی لوگوں کا پیغام ان کے لیے تریاق ہے۔ یہ زہر کا تریاق ہے، یہ ان کے وجود کو ختم کرتا ہے اور انہیں صحت بخشتا ہے۔ وہ اندھیرے کو دور کرتا ہے اور انہیں روشنی دیتا ہے۔ لیکن جن کے اندر ناپاک روحیں ہیں ان کے لیے یہ زہر ہے۔

نبی کے زمانے میں قرآن آیا اور کچھ لوگ اس پر ایمان لے آئے اور مسلمان ہو گئے جبکہ کچھ اپنے ہی کفر پر قائم رہے، انبیاء علیہم السلام کا کام الگ الگ ہونا ہے۔ انبیاء علیہم السلام برائی کو ٹھیک کرنے نہیں آئے، وہ برائی کو اچھائی سے الگ کرنے آئے تھے۔

پس بہ ہر دوری ولیی قائم است آزمایش تا قیامت دائم است

پس کوئی بھی دور، ولی کھڑا کیوں نہ ہو، آزمائش قیامت تک دائمی ہے۔

اولیاء کیا کرتے ہیں قرآن کا نچوڑ نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ قرآن لاتے ہیں اور بزرگ قرآن کے رمز سکھاتے ہیں۔ والدین وہ ہیں جو روح کے سفر کے ساتھ اپنے اندر اس قرآنی علاقے تک پہنچتے ہیں۔ وہ ان قرآنی سچائیوں کو اپنے اندر سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور یہیں سے بہت سے لوگ قبول نہیں کرتے اور قبول نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے کو قبول بھی کرتے ہیں اور الگ بھی ہوتے ہیں اور باطن کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

پیامبر بر توحید رب دین خودش را استوار کرد و اولیای خدا بر توحید وجود دین خودشان را استوار می کنند.

پیغمبر نے دین کی بنیاد خدا کی توحید پر رکھی اور خدا کے اولیاء نے اپنے مذہب کی بنیاد خدا کی توحید پر رکھی۔

اور یہ وہ چیز ہے جسے ہر کوئی قبول نہیں کرتا!

مختصر یہ کہ قرآن بعض لوگوں کے لیے زہر اور بعض کے لیے تریاق ہے

یضل بہ کثیرا ویہدی بہ کثیرا۔(2:27) اور یہی حال اس مثنوی کا ہے۔ لہٰذا جو لڑائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان تھی وہ اب بھی جاری ہے۔ اس وقت بھی شریعت کے اندر سے خبریں لانے والوں اور شریعت کی سطح پر رہنے والوں کے درمیان ایک ہی لڑائی ہے۔

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند؟! پنہان خورید بادہ کہ تکفیر می کنند!

گویند حرف عشق مگویید و مشنوید مشکل حکایتی ست کہ تقریر می کنند

کیا آپ جانتے ہیں کہ بربط اور سُندر کیا گاتے ہیں؟

وہ کہتے ہیں کہ محبت کے بارے میں بات نہ کرو، اور سننا ان کی کہانی کی شکل ہے۔ چھپ کر کھاؤ، یعنی اس خالص الٰہی سچائی کو چھپ کر پیو اور اسے عوام کے سامنے نہ پیش کرو!

سلوک کا راستہ آسان راستہ نہیں، یہ خون سے بھرا راستہ ہے۔ الطیر کی منطق میں ہمارے پاس یہ ہے کہ جب کوئی شخص سڑک پر قدم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بڑے ناموں سے ظاہر کرتا ہے تاکہ جو کوئی محرم نہ ہو وہ بھاگ کر چلا جائے۔

عشق از اول سرکش و خونین بود تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

محبت شروع سے ہی باغی اور خونخوار تھی یہاں تک کہ وہ بھاگ گئی، جو بھی بیرونی تھا۔

العشق نار یحرق کل شی ما سوا المعشوق

عشق اک آگ ہے جو سوائے معشوق کے ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باھو قدس سرہ العزیز

العشق نار فی القلوب یحرق ما سوی المحوب

ترجمہ:

"عشق دلوں میں ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر غیر کو جلا دیتی ہے۔"

اللہ جل شانہ کی تمام صفاتی شانیں بندے کے سامنے آ جاتی ہیں اُسے اللہ کے سوا دوسری کوئی شئے نظر ہی نہیں آتی، ہر شئے اور ہر طرف اللہ ہی اللہ نظر آتا، عشق کا یہ جذبہ سارے منفی جذبوں کو ختم کر دیتا ہے، قلب سلیم میں کسی دوسرے خیال کا گزر ہی ممکن نہیں رہتا، ظہوری نے اس مقام کی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار

برائے کینہ اغیار در دلم جانیست

صوفیائے باصفا کٹھن ریاضتوں اور مجاہدات کے ذریعے عشق کی اسی آتش افروزی کے عمل سے اپنے باطن کا تزکیہ و تصفیہ کرتے اور مخلوق خدا کے خلاف پیدا ہونے والے منفی جذبوں کو جلاتے ہیں۔

اقبال بھی دیگر صوفیاء کی طرح نفس کی معرفت اور خودی کے استحکام کے لئے عشق اور محبت کو لازم قرار دیتے ہیں۔

از محبت می شود پائندہ تر

زندہ تر سوزندہ تر پائندہ تر

وہ مومن کے ایمان وایقان کی تکمیل اور تہذیب حیات انسانی کے لئے عشق کو بنیاد سمجھتے ہیں۔

استاد تو عشق است چوں آنجا برسی

او خود بزبان خود بگوید راز

معرفت کا کمال یہی ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اللہ کو پہچان لیا، یعنی جو اپنی حقیقت) روح، قلب، نفس اور جسم (سے واقف ہوا، اس نے ہر جزو کو اللہ کے حکم کے مطابق، اس کی رضا کے حصول کے لئے تیار کیا، اور جب اجزائے انسانی پر اس کو دوام نصیب ہوا، تو وہ حق تعالی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے قابل ہوا، جب انسان کے نفس کو اللہ تعالی جل شانہ کی

حاکمیت اعلیٰ اور ہر شئے کے مالک ہونے کا یقین کامل ہو جاتا ہے۔ فطرۃ بالفعل اور شعور کے تقاضے، فطرۃ بالقوہ اور لاشعور کے تقاضوں کے تحت منضبط ہو جاتے ہیں تو انسان عقل کے پورے کمال کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالی سے واصل ہو جاتا ہے، عقل عشق کے راز کو پالیتی ہے اور اسے اپنا استاد تسلیم کر لیتی ہے۔

استاد تو عشق است چوں آنجا برسی

او خود بزبان خود بگوید راز

عشق آں شعلہ ست کہ چوں برفروخت

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

ترجمہ:

عشق ایک ایسا شعلہ ہے کہ جب یہ روشن ہو جائے، تو معشوق کے سوا باقی تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر بنا دیتا ہے، جب تک معشوق کی ذات کے اندر فنائیت نہ ہو، معشوق کے اندر عشاق کے لئے کشش کا جذبہ نہیں ابھرتا اور عشق کی ہر کوشش منزل تک رسائی میں ناکام رہتی ہے۔

اگر از جانب معشوق نباشد کششے

کوشش عاشق بے چارہ بجائے نرسد

انسان جب عشق کے ذریعے درجہ احسان

(اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (تک پہنچ جاتا ہے،

تو اللہ سبحانہ وتعالی اس کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہے۔

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہ

عشق کی کیفیات میں اضطراب واضطرار، بے قراری، بے چارگی، والہانہ پن اور بے خودی کی وجہ سے صوفیاء نے اس کا اطلاق اپنے اوپر کیا، کہ اس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ بندہ اللہ سبحانہ سے عشق کرے کیونکہ یہ عقل نہیں جذبہ ہے، محبت میں ذات وصفات کا

عرفان یعنی عقل شامل ہے تو اللہ بندوں سے محبت کرتا ہے، فنا فی اللہ بندے اللہ سبحانہ سے عشق کرتے ہیں۔ جب انسان خود شناسی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالی جل شانہ اس پر اسرار شہنشاہی کے رموز کا دریچہ وا کر دیتا ہے اور وہ نیابت الٰہی کے فریضے کی ادائیگی میں مصروف کار ہو جاتا ہے۔

مجنوں؟

مجنوں کا اصل نام قیس بن الملوح تھا۔ یہ 24 ہجری بمطابق 645 عیسوی کو پیدا ہوا۔ اپنے عصر کا معروف شاعر تھا۔ اس نے ایک مسلمان کے طور پر زندگی گزاری اور حالتِ ایمان میں ہی فوت ہوا۔

مؤرخین، محدثین اور اہلِ علم نے مجنوں کے احوال بیان کیے ہیں۔ بعض مؤرخین نے اس کے حج پر جانے اور حرمین میں اس کے قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ چند کتب کے حوالے درج ذیل ہیں:

ابنِ قتیبہ، عبد اللہ بن مسلم، تاویل مختلف الحدیث، 319:1، دار الجیل، بیروت

ابن جوزی، عبد الرحمٰن بن علی، بن محمد، المنتظم، 105:6، دار صادر، بیروت

ابنِ منصور، ابو سعید عبد الکریم بن محمد، الانساب، 204:5، دار الفکر، بیروت

الذھبي، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان، تاریخ اسلام، 217:5، دار الکتاب االعربي، لبنان

مذکورہ کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قیس (مجنوں) کا دور اولین صدی ہجری ہے جو کہ صحابہ کا زمانہ ہے۔ قیس چونکہ مسلمان تھا اور حالتِ ایمان میں ہی فوت ہوا ہے، اگر اس کی کسی صحابی سے ملاقات ہوئی ہے تو وہ طبقہ تابعین میں شمار ہو گا۔ ہماری تحقیق کے مطابق قیس (مجنوں) کا تابعی ہونا قرینِ قیاس ہے۔

سیر و تراجم کا اس بات پر اجماع ہے کہ قیس لیلی کا چچازاد تھا۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا دونوں اپنے گھر والوں کے مویشی اکٹھے چراتے تھے اور اکٹھے کھیلتے تھے۔ قیس اپنے شعر میں کہتا ہے:

ولم یبد للأتراب من ثدیھا حجم　　　　تعلَقت لیلی وھي ذات تمائم

إلى اليوم لم نكبر، ولم تكبر البهم		صغيرين نرعى البهم ياليت أننا

چنانچہ سید فالح الحجية اپنی کتاب (الغزل في الشعر العربي) میں بیان کرتے ہیں: لیلی کو اپنے چچازاد سے محبت تھی۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے، اکٹھے اپنے والدین کے مویشی چراتے تھے بچپن کا یہ ساتھ ان کی محبت کا سبب بنا۔ حتی کہ دونوں محبت میں وارفتگی کی انتہا کو پہنچ گئے۔ عرب صحرانشینوں کی روایت کے مطابق لیلی جب بڑی ہوئی تو اسے پردہ اختیار کرنا پڑا۔ قیس اپنے ایام گذشتہ کو یاد کرتا اور حسرت کرتا کہ کاش یہ ایام لوٹ آئیں۔ محبت و وارفتگی میں اس کی زباں پر پر تاثیر اشعارِ غزلیہ جاری رہتے۔ پھر قیس اپنے چچا کے پاس لیلی کا ہاتھ مانگنے گیا، اس وقت تک اس نے مہر کی خطیر رقم جمع کر لی تھی اور اس کا 50 سرخ اونٹوں پر مشتمل تھا۔ مجنوں نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا کیوں کہ عرب، اس محبوبہ۔ جس کی محبت مشہور ہو چکی ہو، اس سے شادی کرنا باعث عار سمجھتے تھے۔

بعض روایات کے مطابق مجنوں کی گھر چھوڑنے کی وجہ مجنوں اور لیلی کے والدین کے درمیان اختلاف تھا جو میراث کی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ آخر کار لیلی کی شادی طائف کے ایک شخص سے کر کے اسے طائف بھیج دیا گیا۔

لیلی کے ہجر نے قیس کی محبت کی آگ کو تیز تر کر دیا اور اسی عالم وارفتگی میں وہ فوت ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ قیس کا والد اسے اپنے ساتھ حج پر لے گیا تا کہ لیلی کی محبت کی وجہ سے اس پر جو مصائب آئے ہیں، اللہ تعالی اسے ان مصائب سے نجات دے۔ اس کے والد نے اسے کہا کہ کعبہ کے غلاف کو پکڑ کر دعا مانگو کہ خدا لیلی کی محبت سے نجات دے۔ قیس نے کعبہ کے غلاف سے لپٹ کر دعا مانگی:

"اے اللہ میری لیلی سے محبت کو زیادہ کر دے اور مجھے کبھی اس کی یاد سے غافل نہ کر" !

اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ قیس، لیلی کے شوہر ورد کے پاس گیا۔ یہ شدید سردیوں کے دن تھے، ورد اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ، آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ قیس نے وہاں یہ اشعار فی البدیہہ کہے:

بربّک هل ضممت إليك ليلى		قبيل الصبح أو قبلت فاها

وهل رفّت عليك قرون ليلى		رفيف الأقحوانة في نداها

كأن قرنفلاً وسحيقَ مِسك		وصوب الغانيات قد شملن فاها

(یعنی تجھے رب کا واسطہ کیا تو نے صبح ہونے سے پہلے لیلی کو آغوش میں لیا؟ یا اس کا منہ چوما؟۔۔۔ یا اس کی شبنمی زلفیں تجھ پر نازک پھولوں کی طرح لہرائیں؟۔۔۔ جیسے کہ خوشبوئیں اور مشک اس کے منہ میں در آئی ہوں؟) ورد نے کہا، جب تم نے مجھے قسم دی ہے تو جواب ہاں میں ہے۔ تو مجنوں نے اپنے ہاتھوں سے آگ کو پکڑ لیا اور اسے نہ چھوڑا یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

آئیں ذرا ذوق سے رومی کو پڑھیں ترنم سے

نے حَدیثِ راہِ پر خُون می کند

قِصہ ہائے عِشقِ مجنُوں می کند

رومی فرماتے ہیں کہ نَے جو پر خون راستوں کی بات سناتی ہوئی مجھے مجنوں کے عشق تک لے آئی ہے۔ اور س کے درد بھرے واقعات سناتی ہے۔

آشوب جدائی کیا کہیئے انہونی باتیں ہوتی ہیں

آنکھوں میں اندھیرا چھاتا ہے جب اجیالی راتیں ہوتی ہیں

ذبح کرتی ہے جدائی مجھ کو اس کی صبح وصل

خواب سے چونک اے موذن وقت ہے تکبیر کا

دو دہاں داریم گویا ہم چوں نے

یک دہاں پنہان ست در لبہائے وے

بانسری کی طرح گویا ہم دو منہ رکھتے ہیں

ایک منہ اس کے لبوں میں چھپا ہوا ہے

یہ شعر برصغیر میں چھپی ہوئی مثنوی میں ہے لیکن ایران میں چھپی مثنوی میں نہیں۔ واللہ اعلم!

دہاں: منہ

داریم: چھوٹے اقدم اٹھانا

پنہاں: پوشیدہ، چھپاپوا، خفیہ

لب: ہونٹ

ترجمہ: گویانے کی طرح ہم (بھی) دو منہ رکھتے ہیں (جن میں سے) ایک اس (حقیقی نے نوا) کے لبوں میں چھپا ہوا ہے۔
اللہ اکبر کیا خوبصورت انداز میں روح اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حقیقت کو بیان فرمایا اور کیا خوبصورت مثال سے بیان فرمایا بانسری کے دو منہ کی طرح روح کے بھی دو منہ ہیں۔ ایک اس جہاں میں ہے تو دوسرا ذات حق کی طرف۔ جب وہاں سے کچھ القا کیا جاتا ہے تو اس کے سر اس دنیا میں لوگوں کو سنائی دیتے ہیں۔

مدح سرائی سرکار

یہ جو ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ سرکارِ دوعالم احمد مجتبیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی مدح سرائی کرتے ہیں ہم سمجھتے ہیں یہ ہم مداح سرائی کررہے حالانکہ یہ مدح سرائی کا ساز پہلے وہاں سے بجایا جاتا ہے تو پھر آواز یہاں پر سنی جاتی ہے۔

إذا أَحَبَّ اللهُ تعالى العَبْدَ، نَادَى جِبْرِيلَ: إنَّ اللهَ تعالى يُحِبُّ فلاناً، فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، فَيُنَادِي في أَهْلِ السَّمَاءِ: إنَّ اللهَ يحِبُّ فلاناً، فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ القَبُولُ في الأرضِ.» وفي رواية: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «إنّ اللهَ تعالى إذا أَحبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ، فقال: إني أُحِبُّ فلاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثم ينادي في السَّمَاءِ، فيقول: إنَّ اللهَ يُحِبُّ فلاناً فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ له القَبُولُ في الأرضِ، وإذا أَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ، فيقول: إني أُبْغِضُ فلاناً فَأَبْغِضْهُ. فَيُبْغِضُهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ

ينادي في أَهْلِ السَّمَاءِ: إنَّ اللهَ يُبْغِضُ فلاناً فأَبْغِضُوهُ. ثُمَّ تُوضَعُ له البَغْضَاءُ في الأرضِ.»

(متفق عليه. الرواية الأولى لفظ البخاري، والثانية لفظ مسلم)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالی کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرائیل علیہ السلام کو پکار کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالی فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں اس لیے تو بھی اس سے محبت رکھ۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اہلِ آسمان میں اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے اس لیے تم سب بھی اس سے محبت کرو چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور زمین میں اس کے لیے قبولیت لکھ دی جاتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور آسمان میں اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ فُلاں سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو چنانچہ اس سے آسمان والے بھی محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت لکھ دی جاتی ہے اور جب رب تعالیٰ کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر کہتا ہے کہ میں فُلاں سے نفرت کرتا ہوں تم بھی اس سے نفرت کرو۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام بھی اس سے نفرت کرتے ہیں، پھر آسمان والوں میں اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ فلاں سے نفرت کرتا ہے اس لیے تم لوگ بھی اس سے نفرت کرو۔ پھر زمین میں اس کے لیے نفرت لکھ دی جاتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت ویاد اور سرکارِ دوعالم احمد مجتبیٰ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کی یاد ایک طرفہ نہیں ہے ہمیشہ پہلے آپ کو وہاں یاد کیا جاتا ہے تو آپ ان کی مدح سرائی کرتے ہیں یہاں اس عالم ناسوت میں لہذا اگر آپ کو مدح سرائی کی توفیق عنایت ہے تو پھر آپ سمجھ لیں کہ آپ کا کنکشن جڑ چکا اور آپ ٹھیک راہ پر گامزن سفر ہے

مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ مزید معرفت الٰہی کے سمندروں میں موجزن ہو کر قیمتی موتی نکال کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں اور یہ کیفیت سیدی سلطان باہوؒ کے لفظوں میں یوں ہے:۔

جاگ بنا دودھ جمدے ناہیں

پاوئیں لال ہوون کڑھ کڑھ ھو

یہ کامل روح ہی ہوتی ہے جو آپ کی روح میں سے بیماریوں کو زائل کر کے اور عشق حقیقی کا بیج رکھ دیتی ہے اور اس بیج کی اگر آپ صحیح طرح سے نگہداشت کرتے ہو تو آپ کی روح بھی بالیدہ ہو کر دوسری ارواح کی بیماریوں کو دور کرنے والی بن جاتی ہے

مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ مزید معرفت الٰہی کے سمندروں سے موتیوں کا تحفہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں

گر من نہ عرقِ آتش و آبم ز عشق تو

ایں سینہ پُر آتش و چشمِ پُر آب چیست

آپ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر میری روح آپ ﷺ کے عشق کے آگ و پانی میں ڈوبی ہوئی نہیں ہے تو یہ میرا سینہ آپ ﷺ کے عشق میں کیوں جل رہاہے اور یہ آنکھ میں پانی کیوں ہے ؟

آپ رحمتہ اللہ علیہ عاشقوں کی پہچان سے پردہ اٹھارہے ہیں کہ ہمہ وقت ان کا سینہ عشق میں جلتا رہتا ہے وہ عشق حقیقی میں آہیں بھرتے رہتے ہیں اور ان کی آنکھیں بھی تر رہتی ہیں جہاں ان کی معشوق حق کا تذکرہ زوق سے ہو گا وہاں عشاق کی آنکھوں کو آپ تر پاؤ گے

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں خوب فرمایا

آہ کو نسبت ہے بڑھی عشاق سے

آہ نکلی اور پہچانی گئی

یہ کرشمہ سازیاں اس دوسری جانب سے در صل پھونکی گئی ہیں۔ جب ادھر سے وہ جلوہ گری ہوتی ہے تو پھر ادھر کہرام مچ جاتا ہے۔

اللہ اللہ !

جن لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہیں خوب پتاہے۔ ایسا ہی ہے۔

ایک دفعہ رومی کو دوبارہ پڑھیں

دو دہاں داریم گویا ہم چوں نے

یک دہاں پنہان ست در لبہائے وے

اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو پڑھا لکھا اس کو سمجھنے کی توفیق عنایت فرمائیں اور کسی صاحب دل اور کامل روح کی صحبت نصیب فرمائیں تا کہ ہماری ارواح کو بھی گزرا وقت یاد آجائے اور ہم بھی معرفتِ الٰہی کے جاموں سے سر فراز ہو سکیں

آمین ثم آمین یارب العالمین

یَک دَہاں نالاں شُدہ سُوئے شُمَا

ہائے وہوئے دَر فِگَندَہ دَر سَماء

ایک منہ روتا ہوا تمہاری جانب ہے

آسمان میں شور وغل مچائے ہوئے ہے

مشکل الفاظ:

یک: ایک دہاں: منہ۔۔۔ نالاں: روتا ہوا، نالیدن مصدر سے۔۔۔ ہائے وہوئے: شور وغوغا۔۔۔ سماء: آسمان

در: دروازہ، اندر، میں،۔۔۔ فگندہ: ، گرایا ہوا، چھوڑا ہوا، لٹکایا ہوا

ترجمہ:

ایک منہ روتا ہوا تمہاری جانب ہے اور آسمان میں شور وغُل مچائے ہوئے ہے

تشریح:

حضرات ہر آنے والے وقت میں شدتِ محبت کی حدّت، سفر کی شدّت، محبت کی گرمی اور محبت کی شدت لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی جا رہی ہے تو مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما

ہائے وھُوئے در فگندہ در سَما

کل اس بارے میں کچھ کچھ بیان ہوا تھا لیکن جس جس نے درس پڑھا اس کو تو پتہ ہو گا جس نے نہیں بڑھا وہ پچھلا درس پڑھ لیں تب ہی سمجھ آئے گی تو فرماتے ہیں کے یہ ان اللہ کے مقبول محب اور عاشقوں اور اللہ کے ولی، ان کی ایک زبان جو ظاہر میں تمہیں درد کی تفصیل سنا رہی ہے اور ایک دوسری زبان جو مالکِ حقیقی کی طرف پھیر لی ہے۔ اس نے پہلے آسمان دوسرے آسمان تیسرے آسمان ، چوتھے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، سدرہ المنتہی، جنت عرشِ اولا تک جتنی کائنات ہے سب کے اندر ایک رقص طاری کر دیا ہے۔ انھوں نے، صرف رقص جس پر طاری نہیں ہے، وہ فرشتے ہیں کیونکہ وہ اس کیفیت کے دائرے سے باہر ہیں اُن کے ساتھ بس ایک ہی کیفیت ہے جو سجدے میں ہے وہ سجدے میں ہی ہیں جو رکوع میں ہیں وہ رکوع میں ہی ہے ہیں۔ جو قیام میں ہیں وہ قیام میں ہیں۔ اور انسان وہ خدا کے نزدیک بھی ہے، وہ عالمِ ناسوت میں بھی ہے، وہ عالمِ لاہوت میں بھی ہے دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں

بھی ہے لیکن یہاں جو پریشانی کا عالم طے کر رہا ہے ناں قدم بہ قدم فنا سے گزر رہا ہے اور جب فنا سے گزر جائے تو وادیٔ بقا میں آجاتا ہے تو ایک لمحہ بھی وہ اپنے محبوب سے جدا نہیں ہوتا تو جس جہاں سے وہ علیحدہ ہوتا ہے وہ محبوب کے قریب رہ کر بھی سارے جہاں کا نظارہ کرتا ہے

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں

غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں

(بالِ جبریئل حضرت علامہ اقبالؒ)

میر تقی میر

پھر کیا ہے یہ فتور کہ ہے شور ہر طرف

پھر کیا یہ حشر ہے کہ جہاں میں ہے دھوم دھام

پھر کیا ہے یہ خیال سر دور چرخ میں

جس سے نہیں زمین کے مرکز کا اک مقام

پھر کیسا واقعہ ہے کہ یہ زلزلہ ہے یاں

برہم ہوا سا دیکھتے ہیں دہر کا نظام

حالانکہ روح کی کہانی اس کی حیثیت سے ظاہر ہے۔ لیکن پھر بھی یہ قصہ عشق ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جو حقیقی عقل اور علم رکھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ کی معرفت حاصل ہوئی ہے۔ اس کا ادراک ان لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا جو اللہ کے سوا غافل ہیں کیونکہ جاننے والے اور جاننے والے کے درمیان گہرے تعلق کی شرط ہے۔ دیکھو منہ سے نکلنے والی تقریر کو کان کیسے سمجھ رہے ہیں گویا یہ ان تقریروں کے خریدار ہیں جیسے کانوں کا رشتہ ہے جبکہ دوسرے حسی اعضاء کا آواز۔ آواز سے ایسا تعلق نہیں ہے اس لیے وہ اس کے فہم سے محروم ہیں۔ سبحان اللہ!

روح جو کہ اسرار ربی ہے۔ یہ اسی قادر مطلق کی طرف سے جاری ہوتی ہے۔ اس تمثیل سے رومیؒ نے جس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا کہ اس سے معانی کی وہ ہویدگی ہوئی کہ قلب و نظر واہو گئے۔

روح چونکہ سرِّ الٰہی ہے اور اس کا منبع قرآن حکیم ہے۔ تو اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍۙ(۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ۠(۵۳)

اور یونہی ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی بھیجی۔ اس سے پہلے نہ تم کتاب کو جانتے تھے نہ شریعت کے احکام کی تفصیل کو۔ لیکن ہم نے قرآن کو نور کیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بیشک تم ضرور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔ اس اللہ کے راستے کی طرف (کہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں سب اسی کا ہے۔ سن لو! سب کام اللہ ہی کی طرف پھرتے ہیں *۔ (سورۃ الشوری آیت نمبر 52 / 53)*

{وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا: اور یونہی ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی بھیجی۔}

انبیاءِ کرام عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی طرف وحی کی صورتیں بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں اللہ تعالٰی نے اپنے حبیب صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ سے ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ، جس طرح ہم نے اپنے تمام رسولوں عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی طرف وحی فرمائی یونہی ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف قرآنِ پاک کی وحی بھیجی جو کہ دلوں میں زندگی پیدا کرتا ہے ورنہ ہمارے بتانے سے پہلے نہ تم کتاب کو جانتے تھے اور نہ شریعت کے احکام کی تفصیل کو جانتے تھے، لیکن ہم نے قرآن کو نور کیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بیشک تم ضرور سیدھے راستے یعنی دینِ اسلام کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔ *(تفسیر کبیر، الشوری، تحت الآیۃ: ۵۲، ۹ / ۶۱۵-۶۱۴، خازن، الشوری، تحت الآیۃ: ۵۲، ۴ / ۱۰۱، ملتقطاً)*

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن ایمان کی جان ہے کہ اس کی تلاوت اور فہم سے ایمان میں جان پڑ جاتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن سے سب ہدایت نہیں پاتے بلکہ وہ ہی ہدایت پاتا ہے جسے اللہ تعالٰی ہدایت دے اور اللہ تعالٰی کے اِذن سے حضور پُر نور صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ ہدایت دیتے ہیں۔

{صِرَاطِ اللّٰهِ: اللہ کے راستے۔} یعنی اے حبیب! صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ، آپ اس اللہ تعالٰی کے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمائے ہوئے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں موجود تمام چیزوں کا مالک ہے، سن لو! آخرت میں مخلوق

کے سب کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پھریں گے تو وہ نیک انسان کو ثواب اور گناہگار کو سزا دے گا۔ *(خازن، الشوریٰ، تحت الآیۃ:۵۳، ۴/۱۰۱)

آئیں ذوق سے رومی کو لَے کے ساتھ گنگنائیں:

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما

ہائے وہوئے در فگندہ در سما

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

لیک داند ہر کہ اورا منظر ست

کائیں فغان ایں سرے ہم زاں سر ست

لیکن جسے آنکھ میسر ہے وہ جانتا ہے

کہ اس سرے کی آہ وفریاد اس ہی جانب کی ہے

مشکل الفاظ کے معانی: منظر یہاں بمعنی آنکھ ستعمال ہوا ہے۔۔۔۔کائیں یعنی کہ ایں، کہ اس جانب

فغاں: آہ وفریاد۔۔۔ داند: جانتا ہے۔۔۔۔ لیک: لیکن۔۔۔ ہم زاں: اسی سے

ترجمہ: لیکن ہر ایک بصیرت رکھنے والا جانتا ہے کہ اس سرے پر نوحہ (جاری) اسی سرے سے (الہام) ہے۔

اگرچہ نَے کی کہانی اس کے نوحہ سے معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ محبت کی کہانی دراصل حقیقی ذہانت اور عقل کی کہانی ہے، جس کی مدد سے علم الٰہی حاصل ہوتا ہے، اور اس تصور کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کا کسی اور چیز سے تعلق نہ ہو۔ تشریح میں شاعر "مدہوش" ہے اور یہ عاشق کی ایک خاص کیفیت ہے۔ جس طرح زبان سے نکلنے والی بات کو صرف کان ہی سمجھتا ہے، گویا گاہک کا کان ہی زبان کا خریدار ہوتا ہے، کیونکہ زبان اور کان کا رشتہ ہوتا ہے اور انسان کے دوسرے حواس یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ زبان کیا ہے۔ کہتے ہیں ان کا آواز سے کوئی تعلق نہیں ہے؟؟؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ عوام کی نظر صرف ظاہر کے آثار پر ہوتی ہے۔ ان کا مشاہدہ محدود ہوتا ہے۔ انکی رسائی مؤثر حقیقی تک نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا ادراک و شعور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل سلوک و تصوف کے اقوال کو سطحی نظر کے طور پر دیکھ کر انہیں صرف ان اولیاؒ سے ہی منسوب کرتے ہیں۔ انہیں یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ دراصل یہ تو وہ الہام ہیں جو اس قادر مطلق کی طرف سے ان پر کیے جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے کوئی بانسری کو سن کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اواز تو بانسری سے ہی نک رہی ہے۔ حالانکہ یہ تو نَے نواز کی ہی آواز تھی، بانسری تو ایک ویسل ہے۔

مگر چشم بصیرت رکھنے والے اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی شان بھی شان پیغمبری کا ایک پرتو اور جلوہ نمائی ہوتی ہے۔ یہ ان سورج کی کرنوں جیسی فیض یابی ہوتی ہے جیسے سورج کی کرنوں سے ہر چیز روشن منور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب فیض نبوت سے اولیاء سیراب ہوتے ہیں تو ان پر مختلف حقائق آشکار ہو جاتے ہیں۔ اور شان رسالت مآب ﷺ کے بارے ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝(۳) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝(۴)

ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو اُنہیں کی جاتی ہے

{ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: **اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کہتے۔**} اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کہتے تھے: قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں بلکہ محمد (صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ) نے اسے اپنی طرف سے بنا لیا ہے، اس کا رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے حبیب صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ جو کلام تمہارے پاس لے کر آئے ہیں اس کی کوئی بات وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ اس قرآن کی ہر بات وہ وحی ہی ہوتی ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

حضرت جبریل عَلَیْہِ السَّلَام کے ذریعے کی جاتی ہے۔(خازن، النجم، تحت الآیۃ: ۴-۳، ۴ / ۱۹۱، جلالین، النجم، تحت الآیۃ: ۳-۴، ص۴۳۷، ملتقطاً)

سمجھنے والوں کے لیے ہی قرآن میں سب باتیں ہیں۔

نَے تبھی تشکیل پاتی ہے۔جب سرکنڈے کی طرح وجود کو تمام بندشوں، گندگیوں اور درمیانی علتوں سے صاف کر دیا جائے تو بانسری بننے کے قابل ہوتی ہے ورنہ وہ سرکنڈا ہی رہتا ہے۔اسی طرح جب ممکنہ ہر طرح کی آلائش دور ہو جائے تو وہ روح، نَے کی شکل بنتی ہے جو ہم میں پھونک پھونک کر روتی ہے اور جدائی کی کیفیت کو دہراتی ہے اور ہمیں دوبارہ جڑنے کی دعوت دیتی ہے۔یہ عظیم صوفیاء کا پیغام ہے۔یہی بات ابن عربی، بایزید اور حلاج نے بھی مختلف تاویلات کے ساتھ کہی ہے۔عام طور پر، "ضمیر کی پاکیزگی" جس پر صوفیاء بھروسہ کرتے ہیں وہ عقل کی نفی اور دماغ کا کنٹرول جو تمام خطرات، خیالات، اندرونی خواہشات کو کنٹرول کرتا ہے۔اس کی روح کی گہرائیوں میں چل رہا ہے، ارتکاز اور ارادے کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ منسلکات کی نفی بھی ہے۔

جب یہ میسر آجائے تو روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

دَمدَما ایں نائے از دمہائے اوسط

ہائے وہوئے روح از ہیہائے اوست

اس بانسری کی آواز اسی کی پھونکوں کی وجہ سے ہے

روح کا شور و غل اس کی تنبیہات کی وجہ سے ہے

- دمدمہ: شور و غل، آوازِ نقارہ۔۔۔نائے نَے: گلا، حلقوم۔۔ہائے وہو: شور و غل۔۔۔ ہیہا: ہے کی جمع

نَے کی آواز اسی نَے نواز کی پھونکوں کی وجہ سے ہے اور روح کا شور اسی نَے نوا کی ہیہا (تنبیہ) سے ہے۔

ایسا شخص جسکو بصیرت سے ہمکنار کیا گیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ نَے کے اس سرے سے نکلنے والی آواز دراصل بانسری بجانے والے کی ہی وجہ سے ہے جو وہ دوسرے سرے سے پھونک رہا ہے۔ دراصل اس کو اس چیز کا علم ہوتا ہے کہ یہ آواز دراصل نے نواز کی پھونک کی وجہ سے ہے۔ یہاں نَے کا ذکر صرف ایک تمثیل ہے۔ تمثیل صرف بات کے مطلب کو کھولنے کے لئے ہوتی ہے۔

نفخ روح

قرآن پاک میں سیدنا آدمؑ کے بارے یوں ارشاد ہوا:

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (حجر) (۲۹)

ترجمہ:

توجب میں اسے ٹھیک کرلوں اوراس میں اپنی طرف کی خاص معزّز روح پھونک لوں

{وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ: اور میں اپنی طرف کی خاص معزز روح اس میں پھونک دوں۔} اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی روح کو اپنی طرف ان کی عزت و تکریم کے طور پر منسوب فرمایا، جیسے کہا جاتا ہے: بیتُ اللّٰہ، ناقۃُ اللّٰہ، عبد اللّٰہ ۔ (تفسیر کبیر، الحجر، تحت الآیۃ: ۲۸، ۷/ ۱۳۹)

روح ایک لطیف جسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس جسم کے ساتھ جسم میں زندگی پیدا کرنے کی عادت ڈالی ہے۔ اور اس کی سچائی تخلیق کو خالق میں شامل کررہی ہے۔ روح اس کی تخلیق سے پیدا ہوئی جسے اس نے عزت و تکریم میں اپنے ساتھ شامل کیا جیسے اوپر بیان ہوا، عبد اللہ ناقۃ اللہ، نسبت سے مترشح ہوا کہ بات اُدھر سے ہے۔ یہاں ایک اور بات جو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: جسم کے ساتھ روح کے ملاپ سے روح فاسق یا پرہیزگار ہو جاتی ہے، ورنہ جسم کے بغیر روح میں کوئی بے حیائی نہیں ہے۔

روح خدا کی مخلوق میں سے ہے۔

وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ.

"اور اس پیکر (بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی) روح پھونک دی۔"

(الحجر، 29:15)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو روح پھونکی اُس کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ لیکن انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کے اندر پھونکی جانے والی روح کی نسبت اپنی طرف نہیں فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیگر مخلوقات میں پھونکی جانے والی روح عام ہے مگر وہ روح جو انسان میں پھونکی گئی وہ عام نہیں ہے بلکہ اُس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ اسی باطنی نسبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک حدیثِ قدسی میں یوں فرمایا گیا:

اَلْاِنْسَانُ سِرِّی وَاَنَا سِرُّہٗ.

"انسان میرا راز ہے اور میں انسان کا راز ہوں۔"

یہ تو باطنی نسبت تھی، اس کے علاوہ انسان کے ساتھ ظاہری نسبت بھی قائم فرمائی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ظاہری نسبت اور مشابہت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اللہَ تَعَالٰی خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ.

"بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔"

(فتح الباری، حافظ ابن حجر، 366:6)

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت انسان جیسی ہے یا انسان اللہ جیسا ہے کیونکہ لیس کمثلہ شیء (کوئی شے اُس کی مثل نہیں) کے مصداق اُس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے، تاہم اتنا تو واضح ہو رہا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی نہ کوئی ظاہری نسبت بھی موجود ہے۔ گو ہماری عقل اُس کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

ان حقائق پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ وجود جسے انسان کہا جاتا ہے وہ کوئی معمولی وجود نہیں ہے بلکہ اس کائنات کی انمول ترین چیز ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خصوصی قدر و منزلت ہے اور جو اسرارِ الٰہیہ کا امین اور اُس کی صفات و کمالات کا مظہر ہے۔ انسان کی اسی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے تناظر میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً.

"(کہہ دو ہم) اللہ کے رنگ (میں رنگے گئے ہیں) اور کس کا رنگ اللہ کے رنگ سے بہتر ہے۔"

(البقرہ،138:2)

یہاں انسان کو اللہ کا رنگ اختیار کرنے کی جو تلقین کی گئی ہے تو اس رنگ کی وضاحت کرتے ہوئے حضور علیہ السلام نے فرمایا:

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰه.

"اللہ کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کرو۔"

گویا اللہ کے رنگ کو اپنانے سے مراد اپنے آپ پر اللہ کی صفات کا رنگ چڑھانا ہے اور اپنی سیرت و کردار میں اُن صفات کی جھلک اور عکس پیدا کرنا ہے۔ طبیعت کو اُن کا خوگر بنانا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی صفات صرف جمالی ہی نہیں ہیں جلالی اور کمالی بھی ہیں۔ وہ جس طرح رحمن و رحیم اور لطیف و ودود ہے اُسی طرح قہار و جبار اور سمیع و علیم بھی ہے۔ شخصیت کا کمال یہ ہے کہ انسان صفاتِ الٰہیہ کے امتزاج کا خوبصورت گلدستہ بن جائے جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

قہاری و جباری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت اُس کا خالق ہونا ہے۔ کقولہٖ تعالیٰ:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ.

"پھر (اس) اللہ نے (اسے) بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہے۔"

معانی سے مرصع رومی کے اس شعر کو دوبار اور سہ بار گنگنائیے تو لذت کیفیت پیدا ہو گی۔

دراصل یہ سب کچھ اسی قادر مطلق کی طرف سے ہے۔ اور ادھر سے جب نفخ پھونکی جاتی ہے تو اس عالم میں ہائے ہو کی صدائیں چلنے لگتی ہیں۔ اور اضطراب و کیفیات کا ایک طوفان برپا ہا جاتا ہے۔ تو رومیؒ گویا ہوتے ہیں

دَمدَمااین نائے از دمہائے اوسط

ہائے وہوئے روح از ہیہائے اوست

اوپر والے یہ چار اشعار مجھے ایران کی مثنوی میں نہیں ملے۔ ہمارے بر صغیر کی مثنوی میں ہیں۔

باغ میں خَندہء گُل، شاخ پہ بُلبل کا ہے غُل

مَست ہیں کُل، پیتے ہیں مُل، آتی ہے آوازِ بہار

دِلرُبایانہ ہے، کیا رنگ ہے، مستانہ ہے، کیا ڈھنگ ہے

گلشن میں عروسانہ ہے اندازِ بہار

بال سُنبل نے سنوارے، گُلوں نے قہقہے مارے

کیے نرگس نے اِشارے، کہ آنکھیں ہیں مری شوخ

واہ کیا خُوب، ہے مرغوب، ہے مطلوب، ہے محبوب

یہی عشوہ یہی غمزہ یہی نازِ بہار

بَربط وچنگ ودَف ونای کی، ہر پیڑ سے،

ہر شاخ سے، ہر پھول سے، ہر پتے سے آتی ہے صَدا

عَندلیبانِ چمن، مرغِ خوش الحانِ چمن،

زمزمہ سنجانِ چمن، چھیڑتے ہیں سازِ بہار

مست ہیں مُرغِ سحر، جُھومتی ہے شاخِ شجر

ہم کو نہیں کچھ بھی خَبر، دُھوم یہ کیسی ہے مچی

غُنچے باغوں میں جو چٹکے، تو صدا آئی صدا آئی،

کہ اَب کُھلتا ہے اَب کُھلتا ہے سب رازِ بہار

لا مکاں سے، چَمنِ خُلد سے، افلاک سے

کُرسی سے

سرِ عرش سے، ہاتف سے یہ آتی ہے نِدا

یہ مہینہ ہے، یہ تاریخ، یہ دن ہے،

یہ پہر ہے، یہ گھڑی ہے، یہی ساعت ہے سرافرازِ بہار

آج ہوتا ہے عَیاں، گَنجِ نہاں، شاہِ شِہاں،

جلوہء کون و مکاں، مہرِ جہاں، ماہِ ربیع

نُورِ رَب فَخرِ عرب، عینِ خُدائی کا سَبب

احمدِ بے میم لَقب صاحب اعجازِ بہار

مائلِ خستہ جِگر کو ہے جُدائی میں ضَرر

رحم کی اب کیجے نَظر، ہِند سے بلوائیے جلد

ہر گلی کُوچے میں یَثرب کے پِھروں

واں ہی رَہوں، واں ہی مَروں

قَبر میں آیا کرے آوزِ بہار

(کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل)

مَحْرَمِ این ہوش جُز بے ہوش نیست
مَر زبان را مُشتری جُز گوش نیست

محرم: واقف راز۔۔ ہوش: عقلمندی یہاں اس سے مرادنَے کی عشق کا بیان ہے

مر لفظ زائدہ حسن کلام کے لئے۔۔ مشتری: خریدار۔ گوش: کان

نیست: نہیں

اس ہوش کا راز داں مدہوش کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے

زبان کا خریدار کان جیسا کوئی نہیں ہے

مطلب: قصہ ٔعشق کا واقف سوائے اس شخص کے کوئی اور نہیں ہو سکتا جو مدہوش ہو یعنی ماسوااللہ سب سے بے خبر کر دیا ہو۔ اس کو سوائے اللہ کے کچھ نہ سوجھے۔

بے ہوش: اس شعر میں یہ جاہل یا بے شعور کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو مدہوش اور محبت اور سچائی کے نشے میں مست ہے۔

یہ دردناک ہے، اور کان ایک واقف شخص ہے جو بولنے والے کے درد اور نوحہ کے بارے میں جانتا ہے۔

روح کے معنی: محبت کا حقیقی معتمد وہ ہے جو محبت میں مبتلا، دیوانہ ہو۔ اسی طرح زبان کے الفاظ کو سمجھنے کے لیے کان کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

تصوف میں ادراک کی بنیاد ذہانت ہے۔

یعنی انہوں نے عام لوگوں کے لیے ایک مضمون لکھا۔ جس میں انہوں نے ہوشیار لوگوں کے لیے ایک راز چھپا رکھا تھا!

یقیناً ذہانت کا مطلب روحانی ذہانت ہے۔

معنی یہ ہے کہ کم درجے کی سمجھ سے بے ہوش ہو جائیں تاکہ آپ کو کوئی نئی ذہانت مل جائے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ آج، یہ طریقہ متضادِ استقبال کہلاتا ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس موضوع کو نہیں دیکھتے جو سب دیکھتے اور وصول کرتے ہیں، لیکن آپ اسے پردے کے پیچھے سمجھتے ہیں، اور ظاہری شکل کے علاوہ، آپ اس کے اندرونی حصے کو سمجھتے ہیں۔

تو پہلے آپ کو پاس آؤٹ ہونا پڑے گا!

یعنی فضول کی اس ذہانت کو ایک طرف رکھو اور اپنے دل میں رومیؒ سے پوچھو اور سوچو کہ تمہارے لیے ایک نئی ذہانت بیدار ہو گی۔

جب آپ کے لیے ایک نئی ذہانت کھلے گی اور بیدار ہو گی تو رومیؒ آپ کے لیے بولیں گے اور آپ سن رہے ہوں گے۔

اولیاء اللہ کی نشانیوں میں سے ایک خوف ہے، وہ اپنی محبت، پیار اور دوستی میں منفرد ہیں، لیکن ان کا خوف ہر ایک کے احترام کو متاثر کرتا ہے۔

یہ ایک ایسا جبہ ہے جو ماسوا اللہ ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ رومیؒ اس حقیقت کو نئے پیرا میں بیان کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ جذبۂ محبت ہے۔ جس سے مراد تعلق باللہ ہے، ایسی وابستگی ہے جو محبت اور دیوانگی پر مبنی ہو۔ معبود حقیقی اور اپنے خالق ومالک کے لیے انتہا درجے کے جذبات اطاعت و محبت کا نام ہی تعلق باللہ ہے۔ یہ تعلق جتنا اہم ہے اتنا ہی کمزور پڑ چکا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں جہاں دڑاریں پڑ چکی ہیں ان کی نشاندہی کر کے اصلاح احوال کے بارے میں سوچا جائے اس امر کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔

تعلق کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو بامقصد پیدا فرمایا اس کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور بغیر کسی استحقاق کے ہزارہا نعمتیں فراہم کر دیں۔ پیدا کرنے والا چاہتا ہے کہ انسان سراپا بندگی اور عجز و نیاز کا پیکر بن جائے۔ ساری ستائشیں اور چاہتیں، عشق جنون کی بے قراریاں اس کے لیے مختص کر دے تاکہ جاذبِ نظر مناظر اور دنیا کی آب و تاب اور چکاچوند اسے اپنی جانب متوجہ نہ کر سکیں۔ اگر مال و دولت، بیوی بچوں اور جاہ و منصب سے محبت تعلق بندگی پر غالب آجائے تو سمجھ لیں کہ ہم اللہ کے نہیں اپنی خواہش کے بندے ہیں۔ زن، زر، زمین اور ٹھاٹھ باٹھ کی محبت میں انسان بعض اوقات حدود انسانیت کو پھلانگ جاتا ہے۔ مال کی محبت کے بارے میں فرمایا۔

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا.

(الفجر،20:89)

''اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہو۔''

بیویوں اور اولاد کے بارے میں فرمایا یہ تمہارے دشمن ہیں۔

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ.

(التغابن،14:64)

''بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں پس اُن سے ہوشیار رہو۔''

اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کو آزمائش قرار دیا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ.

(التغابن،15:64)

''تمہارے مال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہی ہیں۔''

گویا سارے کا سارا سامان زیست فتنہ اور آزمائش ہے اس کی محبت انسان کے لیے مہلک اور زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ محبتیں اور آسائشیں پیدا ہی کیوں کی گئیں۔ جواب صاف ظاہر ہے ان کی عدم موجودگی میں آزمائش کیسے ہوتی ہے؟ پتہ چلتا ہے کہ اپنے دعوی محبت اور تعلق بندگی میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ تقاضائے محبت یہ ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ.

(البقرۃ،165:2)

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔''

کے جواب میں ہر کوئی دعویدار بن سکتا ہے۔ سچی محبت کے مقابلے میں جھوٹی محبتیں پیدا کیں اس طرح جو شخص ریاضت و مجاہدہ کرکے جھوٹی محبتوں کو مغلوب کرکے اللہ کی سچی محبت کو ان سب پر غالب کردے وہی مخلص اور سچا ہوگا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ.

(آل عمران،92:3)

''تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو''۔

اس آیت کریمہ میں ماسوا اللہ ہر چیز کی قربانی کا مطالبہ ہے۔ اللہ کی اطاعت اور محبت کے راستے میں جو بھی آئے اس سے منہ موڑ لیا جائے۔

ارشاد باری ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ] (التوبۃ:24)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے۔ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

قاضی عیاض فرماتے ہیں: اللہ کی محبت کے لزوم و وجوب اور فرضیت و استحقاق پر دلیل و حجت اور تنبیہ و خبر داری کے لیے یہ آیت کافی ہے کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ اپنے مال اور اہل و عیال کو محبوب رکھنے والے انسان کو اللہ تعالی نے اپنے اس فرمان میں دھمکی دی ہے۔

یہاں ایک بات سمجھنا از بس ضروری ہے وہ یہ ہے کہ:

اَزل واَبد کے دو کناروں کے درمیان زمان و مکان پہ مشتمل ہماری یہ کائنات رواں دواں ہے - وہ زمانہ کہ جس کی کوئی اِبتدا نہ ہو یعنی مخلوق کی پیدائش کے وقت سے پہلے کا دَور اَزل کہلاتا ہے اور جس زمانے کی کوئی اِنتہا نہ ہو اُسے اَبد کہا جاتا ہے - انسان اپنی پیدائش سے قبل بھی اللہ تعالیٰ کے حضور ایک زندگی گزار کر آیا ہے اور اپنی موت کے بعد بھی اُسے ایک نئی زندگی گزارنا ہے - جسے علامہ اقبال نے یوں واضح کیا تھا﴿ ازل اِس کے پیچھے ابد سامنے - نہ حد اِس کے پیچھے نہ حد سامنے ﴾ - انسان کی ظاہری عمر پیدائش سے لے کر موت تک ہے لیکن انسانی رُوح کا سفر اَزل سے شروع ہو کر اَبد تک جاتا ہے - غافل ہے وہ انسان جو اپنی ظاہری زندگی کو حرفِ آخر سمجھ کر اِسی پہ قناعت کر لیتا ہے -

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اَور بھی آشیاں اَور بھی ہیں
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اَور بھی ہیں

ایسا اِس لیے ہے کہ انسان اپنی رُوح سے بے خبر ہو جاتا ہے اور رُوحانی مقاصد سے نا آشنا رہتا ہے۔ اِس لیے دِین اسلام نے ایسے انسانوں کو سخت وعید سنائی جو اُخروی زندگی پہ یقین نہیں رکھتے۔ خوش بخت ہے وہ انسان جو اپنی مختصر سی ظاہری حیات میں واقعاتِ ازل کو مدِ نظر رکھتا ہے اور عرفانِ ذات کا رُوحانی مقصد حاصل کرتا ہے کہ جس کے لیے اُسے دُنیا کے کمرۂ امتحان میں بھیجا گیا۔

حضرت سلطان باھُو قدس اللہ سرہ، فرماتے ہیں کہ:

اے عزیز! انسان وہ ہے جو قدم ازل پر اور نظر حساب گاہِ قیامت پر رکھتا ہے، دنیا کو رات سمجھتا ہے اور دنیا میں مسافر کی طرح رہتا ہے۔ دنیا کافروں کے لئے جنت و جمعیت کا مقام ہے۔ دنیا آرائش و آسائش کی جگہ نہیں بلکہ امتحان و آزمائش کی جگہ ہے۔ تجھے دنیا پسند ہے یا خدا پسند ہے؟ تجھے دنیا پسند ہے یا فقرِ محمدی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پسند ہے؟ ﴿امیر الکونین: ۹۱۱﴾

انسان اپنی پیدائش سے قبل ایک زمانہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں گزار چکا ہے تصوف کی اِصطلاح میں اُس دور کو زمانۂ اَلست کہتے ہیں۔ اُس وقت اسم اللہ ذات متجلی تھا اور انوار کی بارش میں انسان کا اپنے خدا سے عشق عروج پہ تھا

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جس کا نہیں کوئی نام

محبتِ الٰہی سے سرشار انسانی اَرواح ٹکٹکی باندھ کر اسم اللہ ذات کو تکتی رہتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی اُلفت کا دم بھرتی تھیں۔ اسم اللہ ذات سے پھوٹنے والے اَنوار انسانی اَرواح کی غذا تھے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی صدائے حق سنائی دی تو اَرواح نے قالُوا بلٰی پکار کر خدا کی ربوبیت کی گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دعوٰئ عشق کو پرکھنے اور قرب کے مزید بلند درجات پہ فائز کرنے کے لیے انسانی اَرواح کو قفسِ عنصری میں مقید کر کے عالمِ ناسوت کے کمرۂ آزمائش میں بھیجا۔ حضرت سلطان باھُو قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ' فقرا اُسی دن سے مست چلے آرہے ہیں کہ جس دن اُنہوں نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ﴿کیا مَیں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟﴾ کی آواز سن کر "بلٰی" کہا تھا۔ جیسی کیفیت اُن کی اُس وقت تھی ویسی ہی اب ہے کہ اُنہوں نے دنیا کا منہ دیکھا ہی نہیں"۔ ﴿محک الفقر: ۵۶۲﴾

حضور غوث الاعظم قدس اللہ سرہ، فرماتے ہیں کہ:۔

'پھر جب ارواح کا تعلق اجسام سے قائم ہو گیا اور وہ اجسام سے مانوس ہو گئیں اور اُس قول و قرار کو بھول گئیں جو اُنہوں نے میثاق کے دن اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں قَالُوْا بَلٰی کہہ کر اللہ تعالیٰ سے کیا تھا تو اُن کا رجوع اپنے اصلی وطن کی طرف نہ رہا۔ اِس پر اللہ رحمن المستعان نے اُن پر رحم کیا اور اُن پر آسمانی کتابیں نازل فرما کر اُنہیں اُن کے اصلی وطن کی یاد دلائی جیسا کہ فرمانِ حق تعالیٰ ہے:۔ "اور یاد دلائیں اُنہیں وہ ایامِ الٰہی"۔ یعنی وہ ایامِ وصال جو وہ معیتِ حق تعالیٰ میں گزار چکے تھے۔ جملہ انبیائے کرام اِسی یاد دہانی کے لئے دنیا میں تشریف لائے۔۔۔ حتیٰ کہ سلسلۂ نبوت خاتمِ رسالت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحِ اعظم تک پہنچا جنہیں اللہ تعالیٰ نے

غفلت و گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کی راہنمائی کے لئے ہادی بنا کر بھیجا تا کہ اُنہیں خوابِ غفلت سے جگا کر اُن کی چشمِ بصیرت کو روشن کریں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور اُس کے دیدار و وصال اور جمالِ ازلی کی طرف متوجہ کیا"۔ ﴿سر الاسرار:۳۲﴾

اَلَستُ بِرَبِّکُم سنیا دل میرے، نِت قالُوا بلےٰ کوکیندی ھُو

حب وطن دی غالب ہوئی، ہک پل سون نہ دیندی ھُو

قہر پووے تینوں رہزن دنیا توں تاں حق دا راہ مریندی ھُو

عاشقاں مول قبول نہ کیتی باھُو توں نے ط کر کر زاریاں روندی ھُو

رومیؒ اُس حقیقت سے پردہ وا کر رہے ہیں: ایک دفعہ رومی کو جذب سے پڑھیں۔

محرم این ہوش جُز بے ہوش نیست

مر زبان را مُشتری جُز گوش نیست

گر نبودے نالۂ نَے را ثمر

نے جہاں را پُر نہ کردے از شکر

بانسری کی فریاد کا اگر کوئی نتیجہ نہ ہوتا

بانسری دنیا کو شکر سے نہ بھرتی

گر: اگر۔۔۔ نبودے: نہ ہوتا، نتیجہ نہ ہوتا۔۔۔ نالہ: فریاد

ثمر؛ پھل، نتیجہ

اگر نَے کی آہ وزاری کا کوئی نتیجہ نہ ہوتا تو نَے جہاں کو معرفت سے پُر نہ کرتی۔

یہاں مفتاح نے بہت خوب بات بیان کی ہے: کہ اشعار سابقہ میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ نَے کی آوازِ حقیقی نَے نواز ہی جانب کا کرشمہ تھا۔ اب اس کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ اگر نَے کی آواز کا سلسلہ کسی غیب سے نہیں تو طریقت کے اقوال و تعلیمات سے سارا عالم حلاوت معرفت سے لت گیر کیسے ہو رہا ہے؟

قلبی واردت کو الہام، کشف یا القا کہا جاتا ہے

اس شعر میں رومیؒ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے کیونکہ معنیٰ مخفی میں وہ رموز میں یہ بتا گئے ہیں کہ وارداتِ قلبی ایسے تو ممکن نہیں ہو سکتیں یہ اس وجہ سے ہیں کہ حق کی طرف سے ڈالی جا رہی ہیں۔ اسی لئے تو روح بے قرار ہے۔ دراصل ان قلبی واردت کو الہام، کشف یا القا کہا جاتا ہے۔ وہ کیا ہوتے ہیں مختصر بیان کر دیتے ہیں: جب بغیر کسی شعوری کوشش کے کسی کو غیب سے رہنمائی ملے تو اس کو کشف والہام کہتے ہیں۔ کشف والہام غیر نبی کو ہوتا ہے۔ یہ ایک مذہبی واردات یا مذہبی تجربہ کی بنیاد پر حاصل ہونے والا علم ہے مگر یہ وحی کے علم کی طرح حتمی، قطعی اور قابل اعتماد ذریعہ علم نہیں ہے۔ نہ ہی اجتہاد کی طرح اس کے قواعد و ضوابط کا تعین کیا جا سکتا ہے، اس کے قابل قبول ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ قرآن و سنت اور شریعت کے مطابق ہو۔

ذکراللہ کی کثرت سے جب قلب پر سے زنگ اُتر جاتا ہے تو یہ اسمِ ربانی کے انوارات سے روشن ہو جاتا ہے۔۔ جب قلب و روح اتنے منور اور پاکیزہ ہو جاتے ہیں تو بندے کو اس نور میں کئی ایسی چیزیں نظر آ سکتی ہیں جو جسم کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔۔ اس قلبی نگاہ کے کھلنے کو کشف کہتے ہیں۔۔ یعنی منکشف ہونا، Disclose ہونا۔۔ اس حِس کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ مشاہداتی علم کہلاتا ہے۔۔ اس میں دنیا کی اشیاء کی حقیقت بھی دکھائی دے سکتی ہے اور عالمِ غیبیہ کی اشیاء کی بھی۔۔ اسمیں شیطان گڑبڑ کر سکتا ہے اور اپنی طرف سے کچھ روشنیاں وغیرہ دکھا کر بات کو غلط interpret کرا سکتا ہے۔۔ اسلئے کشف غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔۔ اسے پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ کشف میں کہی یا بتائی یا دکھائی جانے والی شے یا بات اگر شریعتِ نبوی ﷺ کے متصادم یا خلاف ہے، یا شرعی احکام کے علاوہ کوئی حکم ہے، تو کشف باطل ہے۔۔!

ارشاد نبوی کا مفہوم ہے: "میرے بعد نبوت باقی نہیں رہے گی سوائے مبشرات کے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھے یا نیک خواب۔" (مسند احمد)

ہ ایک انتہائی عجیب و غریب بات ہے کیوں کہ وحی کے ساتھ بار بار الہام اور کشف والقاء کو جوڑنا اور ان سب کو نبوت کا جزو قرار دینا ان کے اصطلاحی معنوں سے ناواقف ہونے کی علامت ہے۔

بخاری، مسلم اور ترمذی کی حدیث میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "میں جبل احد کے پیچھے سے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔"

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے غزوہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے داہنے بائیں دو شخص دیکھے جن پر سفید کپڑے تھے اور بہت سخت لڑائی لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں دیکھا۔ یعنی وہ دونوں شخص جبرئیلؑ و میکائیلؑ تھے۔ (بخاری و مسلم)

یہاں سے غیر نبی پر علومِ غیبیہ کا منکشف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

صحابہ اور اولیاء دراصل انبیاء کے روحانی وارث ہوتے ہیں۔۔ جب نبی کو غیبی چیزیں (جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمینوں کی مخفی چیزیں، اور جیسے حضرت یعقوبؑ کو بیٹے کی قمیص کی خوشبو آنا وغیرہ) دکھا دینے پر اللہ قادر تھا تو اُمتی کو بطفیل اتباعِ نبی کچھ دکھانے دینے پر اللہ رب العزت قادر ہے۔

نبی کا کشف اور خواب دونوں حق ہوتے ہیں، اور امتیوں کیلئے ان پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔ ولی کا کشف اسکی اپنی ذات کیلئے ہوتا ہے، دوسروں پر دھونس جمانے کیلئے نہیں ہوتا۔ کشف سے بھی مضبوط تر ایک چیز ہوتی ہے جسے "وجدان" کہتے ہیں۔ اسکی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ نظر تو کچھ نہیں آتا لیکن انتہائی قسم کا قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے، بات دل میں جما اور بٹھا دی جاتی ہے اللہ کریم کی طرف سے۔ اس میں شیطان مداخلت نہیں کر سکتا!

کشف کا ہونا یا نہ ہونا بندے کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ خالص خدائی تحفہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جسے خاطر کہتے ہیں۔

خاطر کیا ہے؟

خاطر ایک تجلّی ہے جو آواز اور خطاب کی شکل میں قلب پر وارد ہوتی ہے۔ امام عبد الرزاق الکاشانی اپنی کتاب 'معجم اصطلاحات الصوفیۃ' میں فرماتے ہیں:

خاطر ایک تجلّی ہے جو قلب پر وارد ہوتی ہے۔ یہ خاطرِ ربانی بھی ہوتی ہے، خاطرِ ملکی بھی ہوتی ہے، خاطرِ نفسانی بھی ہوتی ہے اور خاطرِ شیطانی بھی ہوتی ہے۔

کاشانی، معجم اصطلاحات الصوفیۃ: 177

یعنی خاطر ایک خیال کی صورت میں دل پر وارد ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ شیطان کی طرف سے بھی وارد ہوتا ہے، اس صورت میں اُسے خاطرِ شیطانی کہیں گے۔ اگر یہ نفس کی طرف سے وارد ہو تو اسے خاطر نفسی یا خاطر نفسانی کہتے ہیں۔ ملائکہ کی طرف سے وارد ہو تو خاطر ملکی کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں فرشتہ وہ چیز قلب میں القا کرتا ہے۔ ہاں اس کی پہچان کرنا پڑتی ہے۔ طبیعت پر مرتب ہونے والے اثرات سے تعین ہوتا ہے کہ یہ خاطر کون سا ہے۔ قرآن مجید نے سورۃ الناس میں خود اس حقیقت کو منکشف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ٥ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ٥ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ٥

الناس، 114:4-6

وسوسہ انداز (شیطان) کے شر سے جو (اللہ کے ذکر کے اثر سے) پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خواہ وہ (وسوسہ انداز شیطان) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

لفظ الْجِنَّۃِ میں شیاطین کی طرف اشارہ ہے جو نفس اور صدور میں وسوسہ ڈالتے ہیں۔ یہ بھی انہی خواطر میں سے ہیں۔ اسی طرح خاطرِ ربّانی حق (اللہ) کی طرف سے آتا ہے۔ گویا یہ حق کی طرف سے حق کا القا ہے۔ جب یہ الہام کہلانے کے لیے حق کی طرف سے ہوا تو خاطرِ نفسانی بھی پیچھے رہ گیا اور اس میں سے خاطرِ شیطانی بھی نکل گیا۔ شیطان اور نفس کے اِلقا یا خاطر کو اصطلاحی معنٰی میں الہام نہیں کہیں گے۔ لغوی معنٰی میں اس کے لیے 'الہام' کہا جا سکتا ہے۔ گویا خاطرِ ربانی سے شرح صدر ہوتا ہے اور جب شرح صدر ہوتا ہے تو اسے قرآن مجید نے اسے یوں بیان کیا:

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ.

الزمر، 39:22

بھلا، اللہ نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا ہو تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر (فائز) ہو جاتا ہے۔

اس سے حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اِنشراح صدر، قلب میں ایک نور لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے تو وہ اللہ کی طرف سے نور پر ہوتا ہے۔ اُسے ایک نور مل جاتا ہے۔

آخر میں مولانا رومؒ کے س شعر کو ترنم سے پڑھیں:

گر نبودے نالۂ نَے را ثمر

نے جہاں را پُر نہ کردے از شکر

در غَمِ ما روزہا بیگاہ شُد

روزہا با سوزہا ہَمراہ شُد

غم: مراد غم عشق۔۔۔ روز: وقت، صوفیاء کے نزدیک وقت وہ حال ہے جو بندہ پار وارد ہو کر تصرف کرتا ہے۔ اور دسرے مصرعہ میں روز سے مراد زمانہ ہے

مطلب ہمارے غم کی حالت میں کیفیت نورانیہ ضائع ہوگئیں اور عمر سوز میں کٹ گئی۔

ہمارے غم میں بہت سے دن ضائع ہوئے

بہت سے دن سوزشوں کے ساتھ ختم ہوئے

جناب رومیؒ روحانیت اور تصوف کہلانے والی پروڈکٹ کے بیچنے والے ہیں، اور تقریباً اگر اس سرزمین میں تصوف اور روحانیت اتنی مقبول ہے تو یہ جناب رومیؒ کے وجود کی وجہ سے ہے۔

یہ بہت دلچسپ ہے کہ جب آپ خود رومیؒ سے دوستی کرتے ہیں اور جب آپ ان کے اشعار کو یاد کرتے ہیں تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جناب رومیؒ آپ سے بات کر رہے ہوں اور وہ آپ کو اشعار سے جواب دے رہے ہیں۔

یہ بہت ضروری ہے کہ لمحہ بہ لمحہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ یہ تصور کریں کہ جناب رومیؒ خود آپ سے براہ راست اپنی زبان میں بات کررہے ہیں، اور اس طرح آپ کے لیے نظموں کی تشریح بالکل مختلف ہو جائے گی اور دوسرے شخص، اور گویا وہ اشعار آپ کے لیے تیار کئے گئے ہیں اور آپ کو معلوم ہو گا کہ جناب رومیؒ اس نظم کے شعر میں آپ سے بات کر رہے ہیں اور رومی کی تقریر وہ تقریر ہے جسے آپ کا دل سنتا اور سمجھتا ہے۔

اب تک ہم نے پڑھا ہے کہ اس سے مراد خود جناب رومی ہیں، ایک ایسا عاشق جو اپنے محبوب سے دور ہے اور ہجرت اور دوری کی وجہ سے راز افشا کرنے لگتا ہے!

ایک اہم نکتہ جو کچھ لوگ بہت پوچھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا ہماری زندگی میں محبت کرنا ہے یا نہیں؟

عام طور پر، بزرگ اور اخلاقیات پر یقین رکھنے والے لوگ نوجوانوں کو محبت کا تجربہ نہیں ہونے دیتے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ محبت خاندان کی بنیاد اور روایات کو تباہ کر دیتی ہے اور انسان کی عقل کو کم کر دیتی ہے اور وہ ہمیشہ لوگوں کو محبت سے منع کرتے ہیں۔

جب ہم محبت کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب دو لوگوں کے درمیان پیار ہوتا ہے اور ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا دو لوگوں کے درمیان یہ محبت مقدس ہے یا خطرناک؟!

اور مجھے آج اس موضوع پر کھل کر بات کرنی ہے کیونکہ اب تک محبت اور رشتے کے حوالے سے کافی غلط معلومات سامنے آچکی ہیں۔

فطری طور پر محبت ایک ہی جنس کے دو افراد کے درمیان ہو سکتی ہے، اگر وہ ایک ہی جنس کے ہوں تو اس کا تعلق کائنات کی جسمانی ساخت اور دنیا کے فطری عمل سے ہے۔ اور اگر یہ دو مخالف جنسوں کے درمیان ہو تو اس محبت کو ایک قسم کی صوفیانہ محبت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جناب رومیؒ، جب وہ ایک ہی جنس سے محبت کرتے ہیں، تو وہ ایک صوفیانہ عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔

اور اگر ہم کہیں کہ محبت خطرناک ہے تو مثنوی کتاب کبھی تخلیق نہ ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں موجود ہر قیمتی صوفیانہ کام کو زمینی محبت کے بعد تخلیق کیا گیا ہے۔ جب آپ محبت میں پڑ جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ سحر زدہ ہو جاتے ہیں اور بھوکے ہوتے ہیں اور بھوکے سوتے ہیں، اس سختی اور نیند کے پیچھے ایک روحانیت ابھرتی ہے۔

یہاں، لوگوں کو انتخاب کرنے کا حق ہے؛

یا تو وہ اپنی محبت کو کسی اعلیٰ حصے سے جوڑ سکتے ہیں، جیسے کہ شاعری، کتابیں اور علم لکھنا، یا وہ اس محبت کو اداسی میں بدل سکتے ہیں۔

کہ اکثر لوگ اسے اداسی میں بدل دیتے ہیں اور اس میں پھنسے رہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی محبت کے تجربے کو روحانی تجربے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، تو وہ بہت بلندی تک پہنچ سکتے ہیں۔

محبت پر جائیں اور اس کے فوائد سے لطف اندوز ہوں؛ لیکن کیا سمندر میں جا کر بھیگنا ممکن ہے ؟!

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے، لیکن یہ بہتر ہے کہ ہم جو قیمت ادا کرتے ہیں اس کے اچھے نتائج حاصل کرنے کے قابل ہوں۔

جو برا ہوا وہ یہ تھا کہ ہمیں محبت اور رشتے سے دور دھکیل دیا گیا اور ایسے لوگوں میں تبدیل ہو گئے جنہیں محبت اور گہرے اندرونی احساسات کی کوئی سمجھ نہیں ہے۔

اگر آپ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ کسی کے ساتھ موہ لینے کا کیا مطلب ہے، تو آپ کبھی بھی خدا کو نہیں جان پائیں گے۔

اگر آپ کے اندر کوئی محبت پیدا ہو اور اس میں شب بیداری اور جلن کی کیفیت ہو تو آپ اسے دفع نہیں کر سکتے کیونکہ یہ انسانی ترقی اور کمال کا ایک حصہ ہے۔

قدرتی طور پر، جب آپ کسی بزرگ سے پوچھتے ہیں کہ محبت میں پڑنا ہے یا نہیں، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں اچھا نہیں ہے . . .

کیوں؟! کیونکہ ان کی عمر اب محبت کی عمر نہیں رہی. محبت کی عمر میں لوگوں کو پیار ہو جانا چاہیے جو جوانی کا زمانہ ہے۔

اور یہی چیز اس عمر میں انسانی روح کو نفیس بناتی ہے اور اگر اس عمر میں لوگ محبت میں نہ پڑیں تو وہ ساری زندگی تلخ اور اداس رہتے ہیں اور شدید محبت کے تصور کو نہیں سمجھ سکتے۔

کیونکہ ان کے جسم میں سینسر اور اعصابی رسیپٹرز یہ سمجھنے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں کہ محبت کے انماد کا کیا مطلب ہے.

مثال کے طور پر، ایک نوجوان گاڑیوں کے درمیان موٹر سائیکل کا انتخاب کرتا ہے، لیکن ایک بوڑھا آدمی موٹر سائیکل کو خطرناک سمجھتا ہے اور ایسی گاڑی کا انتخاب کرتا ہے جو زیادہ محفوظ ہو، اور دونوں صورتوں میں ان کا انتخاب درست ہے اور ان کی عمر کے مطابق ہے۔

محبت ایسی ہوتی ہے اور اس کا تعلق جوانی کے جذبے سے ہوتا ہے۔انسانوں کو اپنی جوانی میں محبت کا تجربہ کرنا چاہیے، تجربہ کار ہو تو پکتے ہیں اور پھل دیتے ہیں اور قابل استعمال ہو جاتے ہیں لیکن تجربہ کار نہ ہو تو کچے ہی رہتے ہیں اور کچا آدمی بڑھاپے میں تالو میں کڑوا اور سخت دل ہو جاتا ہے۔

محبت کا تجربہ کرنا اچھا ہے اور اسے کئی بار تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چاہے وہ محبت میں ناکام ہوا ہو۔

اور محبت کا ترک کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن یہ بہت قیمتی ہے کیونکہ اس مشکل میں اگر روحانی سمجھ ہو تو وہ بچ جائے گی اور زندگی میں کہیں نہ کہیں کام آئے گی۔

عام طور پر، لوگوں کو سب سے پہلے چھوٹی عمر میں محبت کا تجربہ ہوتا ہے، اور پھر جنسی، اور ان کی جنسی ضروریات کم ہونے کے بعد، چالیس یا پچاس سال کی عمر کے بعد، علم، تصوف اور ادراک شروع ہوتا ہے.

تو کیا نوجوان کو تصوف کی طرف جانا چاہیے؟

مثلاً گڑیوں سے کھیلنا بچپن سے تعلق رکھتا ہے اور اگر کوئی 50 سال کی عمر میں گڑیوں سے کھیلتا ہے تو اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

محبت کا تعلق جوانی سے ہے اور اگر کوئی بڑھاپے میں محبت کرے تو رسوا ہی ہوتا ہے۔

اس مثنوی اور اس رومی کی باتیں وہی سن سکتا ہے جس کا سینہ جدائی کی تشریحات سے بھرا ہوا ہو اور وہ آگ میں سینکا ہو، محبت کا.
وہ اس ذہانت کا محرم ہو اور بے ہوش ہو۔ بے ہوش وہ ہے جو اپنے آپ سے تنکے کی طرح خالی ہو اور محبت کی آگ میں پکا ہو۔

پکے کی یہ حالت کوئی کچا کبھی نہیں جان سکتا اور پکا وہ ہے جس کا سینہ جدائی کی تفصیل سے بھرا ہوا ہو اور اس کی آنکھوں آب آب ہوں۔

رومی کہتے ہیں کہ اگر تم میں اس عشق کی آگ نہ ہو اور تم بے ہوش نہ ہو، تم اس ذہانت کے محرم نہیں ہو، یعنی وہ کہتا ہے کہ کوئی اس پکار کو اس وقت تک نہیں سنے گا جب تک کہ اس کے پاس محبت کی آگ نہ ہو اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس قرآن کو کوئی نہیں چھو سکتا جب تک کہ وہ پاک نہ ہو، بظاہر کوئی مثنوی نہیں پڑھ سکتا۔ جب تک وہ محبت اور سکی آگ میں جل نہ گیا ہو۔ محبت جل جاتی ہے اور جِلا دیتی ہے۔

سرمد غمِ عشق بوالہوس رانہ دہند

سوزِ دلِ پروانہ مگس رانہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس رانہ دہند

"صوفی سرمد شہید رحمتہ اللہ علیہ"

اے سرمد، غمِ عشق کسی بوالہوس کو نہیں دیا جاتا۔ پروانے کے دل کا سوز کسی شہد کی مکھی کو نہیں دیا جاتا۔ عمریں گزر جاتی ہیں اور پھر کہیں جا کر یار کا وصال نصیب ہوتا ہے، یہ سرمدی اور دائمی دولت ہر کسی کو نہیں دی جاتی

غم عشق ہی نے کاٹی غم عشق کی مصیبت

اسی موج نے ڈبویا اسی موج نے ابھارا

میری زیست کا کیا حال پوچھتے ہو

نہ پیری، نہ طفلی نہ اس میں جوانی

جو چند ساعتیں یاد دلبر میں گذریں

وہی ہے وہی میری کل زندگانی

یہ ساری وقت کی باتیں ہیں اگر وقت کی قدر کرلی تو سب کچھ پالیا ورنہ آہ وزاری ہی ہے۔

امام شافعی رحمۃاللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مدت تک میں صوفیاء کرام کے پاس رہا، ان کی صحبت سے مجھے دو باتیں معلوم ہوئیں ان میں سے ایک یہ کہ "الوقت سیف اقطعہ والا قطعک" یعنی وقت تلوار کے مانند ہے، آپ اس کو (کسی عمل میں) کاٹیۓ ورنہ (حسرتوں میں مشغول کرکے) وہ آپ کو کاٹ ڈالے گا۔

(۲) مشہور بزرگ حضرت حسن بصری رحمۃاللہ علیہ فرماتے ہیں: "یاابن آدم! انماانت ایام، فاذاذھب یوم ذھب بعضک" یعنی اے ابن آدم! تو ایام ہی کا مجموعہ ہے، جب ایک دن گزر جائے گا تو یوں سمجھ کہ تیرا ایک حصہ بھی گزر گیا ہے۔

(۳) علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اضاعۃ الوقت اشد من الموت" (الفوائد: ۴۵۸)

(۴) علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں: وقت کی قدر ہی کی وجہ سے میری ان انگلیوں نے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں (تذکرۃالحفاظ: ۱۳۴۶)

(٦) امام رازیؒ کے نزدیک اوقات کی اہمیت اس درجہ تھی کہ ان کو یہ افسوس ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت کیوں علمی مشاغل سے خالی جاتا ہے،
چنانچہ فرمایا کرتے تھے: "وَاللّٰہِ اِنِّی اَتَاَسَّفُ فِی الْفُوَاتِ عَنِ الْاِشْتِغَالِ بِالْعِلْمِ فِیْ وَقْتِ الْاَ کْلِ فَاِنَّ الْوَقْتَ وَالزَّمَانَ عَزِیْزٌ" یعنی خدا کی قسم! مجھ کو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ وقت متاع عزیز ہے (عیون الانباء، ج: ۲ ص: ۳۴)

(٧) مولانا عبد الحیی فرنگی محلّی کی جو مطالعہ گاہ تھی اس کے تینوں دروازوں پر جوتے رکھے ہوئے تھے؛ تاکہ ضرورت کے لئے جانا پڑے تو ایک منٹ بھی ضائع نہ ہو۔

بزرگوں نے فرمایا ہے: الوقت اثمن من الذہب"

بہر کیف اسلاف کی تابناک سیرت اور پاکیزہ زندگی میں وقت کی قدردانی واضح اور عیاں ہے؛ اس لیے کہ

کہہ رہا ہے بہتا دریا وقت کا
قیمتی ہے لمحہ لمحہ وقت کا
وقت کے ساتھ جو چلتے رہے
کامیاب و کامران وہ ہو گئے
وقت دیتا ہے ہم کو سبق یہی
دوستو غفلت میں مت رہنا کبھی

ہماری اس ساری پستی وادبار کی ایک سب سے بڑی وجہ وقت کا ضیاع اور اس کا غلط استعمال ہے؛ حالانکہ دستورِ اسلام میں وقت کی بدنظمی اور اس کا ضیاع حرام ہے، درحقیقت ضیاعِ وقت ایک سمِ قاتل ہے، جس سے انسان خود کو ہلاک کرتا ہے؛ جب کہ اس کا حاصل کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں! فراغت تو ایک شیطانی وسیلہ ہے، جس سے وہ انسان کو جنسی اشتعال اور خطرناک نفسیاتی اندیشوں میں ڈال دیتا ہے، فراغت مرد کے لئے غفلت کا اندھیرا ہے، اور نسواں کے لئے شہوت رسانی کا محرک ہے، اس وقت مسلم معاشرہ مجموعی طور پر ضیاعِ وقت کی وبا کا شکار ہے، حالانکہ یورپی معاشرہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود وقت کا

قدر دان ہے، اور زندگی کو ایک نظام کے تحت گذارنے کا پابند ہے، لیکن ہم ہیں کہ وقت کی قدر سے ناآشنا خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں؛اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: "**نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس: الصحة و الفراغ**" (صحیح بخاری: ٦٤١٢)

یعنی "دو نعمتیں ہیں کہ ان کے معاملہ میں بہت سے لوگ فریب اور ٹوٹا کھائے ہوئے ہیں (اور وہ دونوں نعمتیں) "تندرستی "اور " فراغت" ہیں۔"

بڑی عجیب بات ہے کہ انسان جتنی بے دردی، لاپرواہی اور بے فکری کے ساتھ وقت ضائع کرتا ہے، اپنی کسی مملوکہ شئی کو اتنی بے دردی اور غفلت کے ساتھ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسم اٹھائی ہے ان میں سے ایک "وقت" بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفجر میں صبح کی قسم، سورۃ اللّیل میں رات کی قسم، سورۃ الضحیٰ میں چاشت کے وقت کی قسم اور سورۃ العصر میں زمانہ کی قسم کھائی ہے۔

کامیاب لوگوں کی زندگی میں "وقت" کی قدر و اہمیت اور اسے گزارنے کے روشن اصول ملتے ہیں۔ تاریخ ساز افراد نے ہمیشہ وقت کو قیمتی سمجھا اور ایک ایک پل کی قدر کی، تب جا کر اُنہیں مقام و مرتبہ ملا۔ جو لوگ وقت ضائع نہیں کرتے وہ ہمیشہ ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں کامیابی کی کلید وقت کی قدر اور بہترین منصوبہ بندی کے ساتھ اس کا استعمال ہے .

دنیا کے تمام مذاہب وقت کی پابندی کا درس دیتے ہیں۔ مذہب اسلام جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے وقت کی پابندی پر بہت زور دیتا ہے۔

قرآن کریم میں 5 نمازیں بر وقت ادا کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ یہ بھی ہمارے لئے ایک رہنمائی ہے کہ وقت کی قدر بہت ضروری ہے اور یہ کامیابی اور کامرانی کی کنجی ہے .

وقت ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں چلتا بلکہ ہم اس کے ساتھ چلتے ہیں اور غلطی سے بھی ایک لمحے کو ضائع نہیں کرتے .

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : "مِنۡ حُسۡنِ اِسۡلَامِ الۡمَرۡءِ تَرۡکُہ مَالَا یَعۡنِیۡہِ"آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ دے۔ (ترمذی شریف)

اس حدیث میں لطیف پیرایہ میں اضاعت اوقات سے ممانعت اور حفاظت اوقات کے اہتمام کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی ہر ایسے قول و عمل اور فعل و حرکت سے احتراز کرے جس سے اس کا خاطر خواہ اور معتد بہ دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوے ارشاد فرمایا "5 چیزوں کو 5 چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو:

(1) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے (2) صحت کو مرض سے پہلے (3) دولت کو عزت سے پہلے (4)

فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور (5) زندگی کو موت سے پہلے (مشکوٰۃ)

حدیث میں ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں کہ جب وہ طلوع ہوتا ہو مگر یہ کہ وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے! میں ایک نو پید مخلوق ہوں، میں تیرے عمل پر شاہد ہوں، مجھ سے کچھ حاصل کرنا ہو تو کر لے، میں قیامت تک لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ دنیا کی تمام چیزیں ضائع ہو جانے کے بعد واپس آسکتی ہیں۔ لیکن ضائع شدہ وقت واپس نہیں آسکتا۔ (مستدرک حاکم)

امام حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "اے آدمؑ کے بیٹے تیرا وجود، دنوں اور راتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ جب ایک دن گزرتا ہے تو دن نہیں بلکہ تو خود گزرتا ہے اسی طرح رات نہیں بلکہ تو خود گزرتا ہے بالکل اسی طرح سورج طلوع ہو کر جب لمبے لمبے فاصلے طے کر کے غروب ہوتا ہے تو وہ غروب نہیں ہوتا بلکہ تیری زندگی ڈوبتی ہے۔ اسی طرح رات نہیں کرتی بلکہ تیری زندگی کٹتی ہے۔ ہم دن و رات کے اوقات کو گزرتے دیکھتے ہیں اور ایک دن خود گزر جاتے ہیں۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ دن رات کے گزرنے میں تو جوانی گزری، پوری زندگی گزری

روزہا گر رفت، گو رو، باک نیست

تو بِماں اے آنکہ چون تو پاک نیستُ

اگر وقت (واردات باطنیہ) جاتا رہا تو کہہ دو کہ کوئی حرج نہیں! اے وہ محبوب کریم اگر تو موجود ہے تو کوئی پروا نہیں تو منزہ و پاک ہے اور تیرا کوئی ہمسر نہیں۔

اس شعر میں یاس و ناامیدی کا ایک شاندار علاج فرمایا ہے۔

دن اگر گزریں تو کہہ دو و گزریں پروا نہیں ہے

اے وہ کے تجھ جیسا کوئی پاک نہیں ہے تو رہے!

آپ کو ضائع ہونے والے دنوں پر افسوس نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ محبت کی حکومت جو ایک پائیدار اور مستحکم حکومت ہے، تمام خامیوں سے پاک ہے اور صرف محبت کا وجود ہی کافی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے بیت میں چونکہ ایک قسم کی خود پسندی تھی، اس لیے شاعر نے اس کی اصلاح کے لیے ایک ترمیم جاری کی، تاکہ اسے خدا کی نعمتوں کی ناشکری نہ سمجھا جائے۔

صوفی اِبنُ الوقت باشد ای رفیق

نیست فردا گفتن از شرط طریق

یہ اردو والا ابن الوقت نہیں بلکہ اس سے مراد تابع وقت و حال ہے۔ جو وقت کی قدر و منزلت سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ اس کے حال کی کیفیت ہوتی ہے۔

حال و مقام (ان کی جمع احوال و مقامات) ان واردات کو کہتے ہیں جو سالک کے دل پر نازل ہوتے ہیں لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ حال کو استقرار نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے اور مقام کو استقرار ہے جب تک اس کے آگے کا مقام حاصل نہ ہو اس مقام میں سالک کو قرار رہتا ہے

حال کی کئی اقسام ہیں

وہبی، کسبی، نسبتی، مجازی

سالک کے دل پر جو کیفیات بلا کوشش محض اللہ کریم کی طرف سے وہبی طور پر وارد ہوں اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ بوجہ صفات نفسی کے زائل ہو جائے اور کوئی کیفیت باقی نہ رہے دوسری یہ کہ کیفیت ہمیشہ کیلئے قائم رہے اول کو حال اور دوسری کو مقام کہتے ہیں

سالک کے دل پر جو واردات مثلاً قبض و بسط، حزن و طرب، ہیبت و انس اور مستی و بے خودی اچانک وارد ہونے کو حال کہتے ہیں اور سالک کی بے عملی اسے زائل کر دیتی ہے۔ یہی حال جب دائمی ہو اسے مقام کہتے ہیں۔

حال آتا اور جاتا ہے مقام میں استقلال ہے حال سے سابقہ اصحاب تلوین کو اور مقام اصحاب تمکین کا حصہ ہے اس لیئے حال سے مقام اعلیٰ ہے۔

صاحبِ حال ہونا اچھی بات ہے مگر حال کے خطرات سے بچنا چاہیے اور اِن سے ادب ہی بچا سکتا ہے ۔شرعی قانون کا ادب، اخلاقی قوانین کا ادب، مرشد کا ادب اور حلقۂ درویشاں میں اخوان کے طور طریق کا ادب لازمی ہے

صوفی ابن الوقت ہوتا ہے یعنی تابع وقت وحال ہوتا ہے جیسا کہ بیٹا باپ کے تابع ہوتا ہے پس اس قسم کا صوفی وقت وحال کا مغلوب ہوتا ہے اور صافی وہ ہے جو وقت اور حال سے فارغ ہے بلکہ ابوالوقت ہوتا ہے کیونکہ وہ وقت اور حال پر غالب ہوتا ہے

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

تو رومیؒ اس شعر میں ایک تو واردات کی بات کر گئے اور دوسرے ناامیدی کے بارے بتا گئے کہ :

شرک کے بعد کوئی گناہ ناامیدی کی نسبت بڑا گناہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی گناہ کا مرتکب انسان توبہ و استغفار کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ لیکن مایوس شخص مغفرت کے قابل اس لیے نہیں کہ وہ مغفرت اور بخشش پر بھروسہ نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ توبہ کرے اور قرب خداوندی کا طلب گار ہو جائے۔ مایوس جب اس سے آگے بڑھتا ہے تو سارے گناہوں میں لاپرواہی سے ملّوث ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ کہتا ہے کہ میں گناہ گار اور جہنمی ہوں اور دنیا میں اپنی خواہشات پوری کروں گا۔ مایوسی کفر کے ناپاک آثار کا لازمہ اور رب العزت کی عظمت وشان سے انکار کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔

ناامیدی دو طرح کی ہے, یعنی یاس اور قنوط۔

یاس

یاس یعنی رحمت خداوندی سے ناامیدی ہے۔ جو لوگ پروردگار عالم کی قدرت، فضل و کرم اور رحمت لامتناہی پر اعتقاد نہیں رکھتے تو اس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ پس مایوسی باطنی کفر ہے یا پھر اپنے پروردگار کی عظمت و قدرت سے بے خبری اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ناامیدی کی حالت میں دعا ترک کرنا یاس ہے۔ مایوس انسان کو امید نہیں ہوتی کہ دعا سے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ قرآن پاک میں اسے کافروں کی صفت قرار دیا گیا:

إِنَّهُۥ لَا يَاْيْـَٔسُ مِن رَّوْحِ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْكَٰفِرُونَ (یوسف۔87)

بے شک رحمت خدا سے ناامید نہیں ہوتا ہے مگر گروہ کفّار۔

قنوط

رحمت الٰہی کے بارے میں دل ناامیدی راسخ کرنے اور اس کی قباحت محسوس نہ کرنے کو قنوط کہتے ہیں۔ قنوط کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے پروردگار سے بدگمانی کرے کہ خدا اس پر رحم نہیں کرتا اور نہ ہی توبہ قبول کرتا ہے۔ جن مصیبتوں میں وہ مبتلا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ اپنے بُرے اعمال کی سزا پا رہا ہے۔ پروردگار عالم سے سوء ظن بلاشک گناہ کبیرہ اور مشرکین و منافقین کی صفات میں سے ہے:

وَيُعَذِّبَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱلْمُنَٰفِقَٰتِ وَٱلْمُشْرِكِينَ وَٱلْمُشْرِكَٰتِ ٱلظَّآنِّينَ بِٱللَّهِ ظَنَّ ٱلسَّوْءِ (الفتح۔6)

اور تاکہ ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو عذاب دے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والے ہیں۔

پروردگار سے حسن ظن رکھنے کا معنی یہ ہے کہ بندہ پوری امید رکھے کہ اگر گناہ سے توبہ کرلے تو اللہ اُسے بخش دے گا اور دعا کرے تو حاجت روائی کرے گا, اور اگر کوئی نیک عمل بجالائے تو امید رکھنی چاہیئے کہ اللہ قبول کرے گا اور ثواب عنایت فرمائے گا۔ البتہ اچھے اعمال کی طرف اقدام کیے بغیر ثواب کی امید کرنا سراسر جہالت اور گھمنڈ ہے۔

اسی بات کو رومیؒ نے خوبصورت پیرائے میں بیان کر دیا تو ذرا شعر کو دہرائیں

روزہا گر رفت، گو رو، باک نیست

تو بمان اے آنکہ چون تو پاک نیستُ

ہر کہ جُز ماہی، زِ آبَش سیر شُد

ہر کہ بے روزی ست، روزَش دیر شُد

جو مچھلی کے علاوہ ہے اس کے پانی سے سیر ہوا

جو بے روزی ہے اس کا وقت ضائع ہوا

ماہی: مچھلی، یہاں مراد عشق حق۔۔۔دیر شد: ضائع ہو گیا

آب: پانی۔۔۔

مچھلی: عاشق کا استعارہ اور حقیقی عاشق کی علامت/پانی: محبت کی علامت، الہی محبت کا سمندر۔

بیروزی: غریب، غریب، مفلس، محبت سے محروم/روزی، روزی: شعر کا نامکمل جملہ محبت سے مطمئن ہونے کے ناممکن پر شعر میں زور ہے۔

پہلے بند میں "مکمل ہو جانا" کا مطلب ہے ناگوار ہونا، اور جو شخص خدائی کشش کے سمندر سے آشنا نہ ہو اور اس میں تیرنے کی خواہش نہ ہو۔

مچھلی (یعنی عاشق حق) کے سوا جو لوگ ہیں وہ اُس کے (تھوڑے) پانی سے بھی سیر اب ہو جاتے ہیں. (اور) جو بیروزی (بالکل محروم) ہے, اُس کے (تو) اوقات ہی ضائع ہو گئے.

☆ وضاحت:

اربابِ توحید تین طرح کے لوگ ہیں.

ایک عاشق جن کو یہاں مچھلی سے تعبیر کیا گیا ہے .

دوسرے عامہ مسلمین جن کو مچھلی کے سوا دوسرے لوگ قرار دیا ہے.

تیسرے لوگ جو تعلیماتِ شریعت سے مستفیض نہیں ہوتے بلکہ فلسفہ وعقلیات سے توحید کے قائل ہو جاتے ہیں جیسا کہ فلاسفہ مشائین.

پانی سے مراد کلامِ حق تعالیٰ ہے, جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا ہے. مطلب یہ ہے کہ مچھلی (عاشق) کے سوا جو عام لوگ ہیں وہ صرف کلامِ حق سے سیر ہو جاتے ہیں. جو بذریعہ انبیاء اُن کو پہنچتا ہے. مگر وہ عشق سے خالی ہیں. لیکن وہ اس سے استفادہ کرتے ہیں، تاہم وہ لوگ آخرت میں نجات پا جائیں گے اور اہلِ جنت میں شامل ہو کر دیدارِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں گے .

اور جو لوگ مچھلی ہیں وہ اس تھوڑے پانی پر قانع نہیں بلکہ تقلیدِ رُسل علیہم السلام کے بعد وہ دنیا ہی میں مُشاہدۂ حق کے طالب ہوتے ہیں اور سیر و سلوک کے جس قدر مدارج طے کرتے جاتے ہیں کسی پر قانع نہیں ہوتے اور ہر دَم ترقی کے جویا، رہتے ہیں .

تیسرے گروہ کے لوگ جو اِس پانی سے بالکل محروم ہیں. اُن کا یہی حال ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا ملتا نہیں

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سِرا ملتا نہیں

فارسی ادب میں مچھلی کا بہت استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ عاشق کے جذبات کو ظاہر کرتی ہے۔ جب آپ مچھلی کو پانی سے نکالتے ہیں تو وہ تڑپتی ہے، ہلتی ہے اور خود کو اِس طرف اور اُس طرف مارتی ہے کیونکہ وہ صرف یہ سمجھتی ہے کہ پانی نہیں ہے اور جو شخص اپنے عاشق سے دور ہے وہ اس مچھلی کی طرح ہے جو باہر گر گئی ہے۔ پانی سے۔

ہم محبت کو تب تک نہیں سمجھتے جب تک ہم محبت میں ہوتے ہیں، اور جب ہم اسے کھو دیتے ہیں، تو ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کون سے قیمتی جواہر اور ڈھیر ساری محبت ہمارے پہلو میں بہہ رہی ہے، اور جب محبت اور جدائی ہوتی ہے تو ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کتنی قیمتی تھی۔

براہِ کرم اپنے رشتوں کو برقرار رکھیں کیونکہ ایک بار جب رشتہ بن جاتا ہے تو یہ بہت قیمتی ہوتا ہے اور چھوٹی چھوٹی جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اسے کھو دینا شرم کی بات ہے۔ جب دو لوگ، جو دونوں الٰہی روح ہیں، ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، محبت کی لہر پیدا ہوتی ہے، لیکن ان کے درمیان ذہنی خرابی کا ڈیٹا موجود ہوتا ہے، اور یہ دونوں ایک دوسرے تک پہنچنے کی کتنی ہی کوشش کریں، غلط جذبات و عقائد اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے درمیان ایک ایسی شدید محبت ہے جو انہیں نظر نہیں آتی اور چونکہ وہ اس محبت کو نہیں دیکھ سکتے اس لیے وہ اس مچھلی کی طرح ہیں جو پانی میں ہے لیکن پانی کو نہیں دیکھتی!

رشتہ اچھا نہ بھی ہو تو یقین ہے اس میں محبت ہے مگر تم نہیں سمجھتے کیونکہ ہجرت اور جدائی نہیں ہوئی جب ایک دوسرے کو کھو و گے تو سمجھو گے کہ محبت کیا تھی وہاں!

جاگنے والے اور ہوشیار انسان اور بیدار انسان میں فرق یہ ہے کہ وہ اس محبت کو کھونے سے پہلے محسوس کرتا ہے...

معلوم ہوا کہ مچھلی کی زندگی کا انحصار پانی کے وجود پر ہے اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مولاناؒ کی رائے کے مطابق جو عاشق مسلسل محبت میں رہتا ہے وہ اپنے محبوب سے دور نہیں رہ سکتا اور نہ ہی طمع یا بوریت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ طمع اور ملامت ان لوگوں کی صفات ہیں جو ہوا اور خواہش سے دوستی کرتے ہیں۔

روان تشنہ برآساید از وجود فرات

مرا فرات ز سر برگذشت و تشنہ ترم

"میں پیاسا ہوں، خواہ فرات ہی سامنے کیوں نہ ہو، مجھ سے دور ہو جاؤ، کیونکہ میں فرات کے پاس بھی ہو کر میں پیاسا ہوں۔"

(سعدی)

چو ماھی باش در دریای معنی

کہ جز با آب خوش ھمدم نگردد

ملالی نیست ماھی راز دریا

کہ بی دریا خود او خرم نگردد

(غزل ۶۵۸ دیوان شمس)

"مانگنے کی راہ میں طمانیت اور بوریت محرومی اور تقدیر کی کمی کی علامت ہے۔»

"معنی کے سمندر میں ایسی کون سی مچھلی ہے جو میٹھے پانی کے سوا تیر نہیں سکتی؟"

"سمندر سے مچھلی لینا بورنگ نہیں جو اپنی جان نہ لے

☆ کیا آپ نے کوئی ایسا عاشق دیکھا ہے جو اس کاروبار سے تنگ آگیا ہو؟ کیا تم نے اس سمندر سے بھری ہوئی کوئی مچھلی دیکھی ہے؟

جب محبت کی ہویدگی ہوتی ہے تو محبوب کا کلام ایک عجیب سماں باندھتا ہے۔ اس کی حلاوت رگ و پے میں سما جاتی ہے۔ اور ہر مُو سراپا بن جاتا ہے۔ سبحان اللہ!

عاشق کے اپنے معشوق کے کلام سننے کی کیفیت

جب عاشق اپنے معشوق کا کلام سنتا ہے تو اس کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور ہیبت و جلال بھی تو کیفیت حال کچھ یوں ہو جاتی ہے:

ارشاد ہوا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (الأنفال: 2)

مومنین میں ایسے لوگ ہیں جن کے دل اللہ کے کلام کی ہیبت پاتے ڈر جاتے ہیں۔ وہ نشانیاں ان کے قلوب میں رقت طاری کر دیتی ہیں۔ وہ مومنین جب مشکلات میں گھرے ہوتے ہیں، ان کے دلوں کو توانائی اس قران پاک سے ملتی ہے اور ان کے یقین میں اضافہ کرنے والی کتاب حقیقتاً قران پاک، کلامِ الٰہی ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [الحشر: 21]

اس کلام کی اثر انگیزی ایسی ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی خشیت سے ٹکرے ٹکرے ہو جاتا۔ اے کاش کہ ہمارے دل اسکی حقیقت جان بھی لیں۔ اللہ تعالیٰ کا پیار و دلار دلوں پر کیسے کیسے اثر کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: مجھے قران پاک کی تلاوت سناؤ، جواباً: اے اللہ کے رسول پاک ﷺ، میں آپ کو قران پڑھ کے سناؤں جبکہ قران کا نزول آپ پر ہی ہوا ہے؟ فرمایا: ہاں

آپ نے سورہ النساء کی تلاوت فرمائی اور جب اس آیتِ کریمہ تک پہنچے

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا (النساء: 41)

آپ کو اس آیتِ مبارکہ پر اس آواز نے روک دیا: بس کرو، استعجاباً پیچھے مڑ کے دیکھا جنابِ رسول کریم ﷺ اطہر کی آنکھوں

سے آنسو بہ رہے تھے۔

جناب رسول پاک ﷺ عملی مثال ہیں۔ ہم لوگ سنت پر چلنے کے لیے بے تاب ہیں اپنی خرد و عقل کے استعمال سے مگر اسکو عمل بجالانے میں مفلوج ہے ہمارے عمل و بدن۔ یہ سیاہ کاری کیسے چھپے گی؟ اعمال کی سیاہی دل کی سیاہی بن گئی ہے، جیسے رات کالی آگئی ہے۔ روزِ محشر اللہ کا سامنا کیسے کریں گے، ان اعمال کے سبب چھپنا بھی چاہیں تو نہ چھپ سکیں۔۔ ہم تو مسلمان ہیں جن کے دل خشیت سے خالی مگر وہ اللہ کے بندے جن تک اسلام پہنچا نہیں تھا مگر ان کے دل روشن تھے۔

دَر نیابَد حالِ پُختہ ہیچ خام
پَس سُخَن کوتاہ باید، وَالسَّلام

کوئی ناقص کامل کا حال نہیں معلوم کر سکتا

پس بات مختصر چاہیئے والسلام

پختہ: پکا ہوا، یعنی عاشق حق۔۔۔۔بدحال: خراب حال۔۔۔۔ہیچ: کمتر، گھٹیا

خام: ناقص، مراد عام لوگ

کوئی ناقص کامل کا حال نہیں جان سکتا۔ لہٰذا بات کو ختم کر دینا چاہیئے۔اس لئے بس ہمارا، سلام

اس شعر میں مولانا رومؒ نے ایک زبردست نظریہ پیش کیا ہے اس کو فرضیہ (ماٹریالیسم مکینکی) کہا جاتا ہے۔یعنی کہ اگر ہر حرکت، قوت خارجی کا معلول ہے تو اس صورت میں جہان کے مادۂ اول کے لئے بھی، کسی قوت کو فرض کرنا ہو گا کہ جو خارج سے اس کے جسم میں داخل ہوئی ہو اور اس امر کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا، ماوراءِ مادہ ایک قوت کو قبول کرنا ہو گا جو کم از کم عالم مادہ میں پہلی حرکت کا عامل بنی ہو۔

فرماتے ہیں کہ عشق پختہ کار لوگوں کا کام ہے۔ جو معشوق کے مشاہدہ میں مستغرق نہ ہو تو وہ مچھلی کی طرح ہے۔ اور جو لوگ اس سے آشنا نہیں وہ اس کیفیت سے کیسے لطف اٹھا سکتے ہیں؟ یہ تھوڑی سے بات سے سیر اب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ ان کے لئے بات کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ یہ تو محروم لوگ ہیں اس لئے انہیں سلام کہہ دینا چاہئے۔

☆ اس درخت کے نیچے کسی ایسے شخص کے پاس بیٹھو جو آپ کے دل کے بارے میں جانتا ہے جس میں زیادہ پھول ہیں۔

☆ میری زندگی میں تین سے زیادہ الفاظ نہیں ہیں، میں کچا ہوں، پکا ہوں، جلا ہوا ہوں۔

عارف کی دل شکستہ حالت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، اسی لیے عارف اپنی بات کو اشارے اور ستم ظریفی سے بیان کرتا ہے۔

رومیؒ کہتے ہیں کہ کچا آدمی میری بات نہیں سمجھتا لیکن ایک بالغ آدمی سمجھتا ہے۔

رومی کے مطابق، ایک بالغ شخص وہ ہے جس نے محبت کو سمجھا اور محبت میں گر گیا.

آپ کے پاس یہاں کئی حل ہیں۔

ایک شروع سے آخر تک محبت کی پیروی کرنا اور اس کے راستے کی نگرانی کرنا، اور دوسرا یہ کہ آپ اپنے ارد گرد موجود لوگوں میں اسی حالت میں محبت تلاش کریں۔

اور دیکھو اور جب محبت دیکھو گے تو پکے ہو جاؤ گے۔

رومیؒ کہتے ہیں کہ جو محبت میں نہیں پڑ سکتا اور محبت کو نہیں سمجھ سکتا وہ ابھی کتاب بند کر دے اور السلام علیکم! میرا مطلب ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے...

آیئے ایک ساتھ پھر سے کچھ اقدامات کو دیکھیں۔

مولاناؒ نے اس کتاب کے تعارف میں فرمایا کہ یہ فارسی زبان میں قرآن کی روحانی مثنوی ہے کہ جو اسے پڑھے گا اس کی زندگی میں برکت، رزق، نور اور اچھے اخلاق داخل ہوں گے۔

دوسرے مرحلے میں وہ کہتا ہے کہ اگر آپ کو محبت نہیں ہوئی اور محبت کی جلن کا تجربہ نہیں کیا ہے تو آپ کچے ہیں اور یہ کتاب آپ کے لیے مفید نہیں ہے اور آپ کو اسے ایک طرف رکھ دینا چاہیے، اور وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ، محبت روحانیت میں داخل ہونے کا، سب سے اہم پلیٹ فارم ہے۔

بقول ذہین شاہ تاجی

خدا کو خود بہ خود جو غالب سمجھ نہیں سکتا

وہ علم حق کے مطالب سمجھ نہیں سکتا

وہ ہے صنم کدۂ ممکنات میں آذر

جو راز ہستیٔ واجب سمجھ نہیں سکتا

جو وہم غیر میں ہے اپنے آپ سے محجوب

ہے خود حجاب کہ حاجب سمجھ نہیں سکتا

سمجھ رہا ہے جو عقل شکستہ پا کو خضر

جنوں کے جاہ و مناصب سمجھ نہیں سکتا

کلام حق کی صفت ہے ذہینؔ میرا کلام

نہ ہو خدا کا جو طالب سمجھ نہیں سکتا

خدا ہے فہم سے بالا سمجھ نہیں سکتا

سمجھ رہا ہے جو سمجھا سمجھ نہیں سکتا

بادہ در جوشش گدائے جوش ماست

چرخ در گردش اسیر ہوش ماست

بادہ: شراب۔۔۔جوشش حاصل مصدر ہے جوشیدن؛ جوش مارنا

گدا: محتاج، سوالی۔۔۔اسیر: قیدی مراد فریفتہ۔۔ ہوش: عقل،

ترجمہ: پر جوش شراب ہمارے جوش کی محتاج ہے، آسمانی گردش ہماری ہوش پر فریفتہ ہے۔

شراب جوش میں ہمارے جوش کی محتاج ہے

آسمان، گردش میں ہمارے ہوش کا قیدی ہے

جو لوگ عشق میں پختہ ہوتے ہیں اوپر ان کی منازل کا ذکر تھا، رومیؒ بھی اسی عالی مرتبت طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لئے اپنی کیفیت کو طشت از بام کرتے ہیں، کہ شراب عشق تلمیحا کہ اپنی جوش و حرارت کی وجہ سے مشہور ہے، جس سے جوش اور مدہوشی کی کیفیت ہوتی ہے، وہ ہماری ہی مرہون منت ہوتی ہے۔اور جو گردش افلاک ہے وہ اس شراب الست کے گرد گھومتا ہے وہ ہماری روحانی کیفیت پر فریفتہ ہے جو منازل عشق میں سریع السیر ہے۔

شراب عشق پی کر جو نہ بہکے ظرف اس کا ہے

کہ اک اک بوند اس کی رکھتی ہے تاثیر مے خانہ

شراب معرفت

شراب جو ان کی شاعری میں بیان ہوا ہے وہ عام نہیں بلکہ معرفت کی شراب ہے جن کے نشہ میں عالمِ ملکوت کے مناظر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔اسی طرح ان کا محبوب بھی اس عالمِ ارضی کا باشندہ نہیں بلکہ ایک ماورائے مثال ہے جن کا حسن و جمال بحرِ بیکراں اور عالمِ موجودات کا حسن اس سمندر سے ایک قطرۂ خیرات ہے۔

ورنہ شراب کے بارے تو واضح حکم آیا ہے

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِؕ-قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘-وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَاؕ-وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ۬ؕ-قُلِ الْعَفْوَؕ-كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ(۲۱۹)

ترجمہ: تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے اور تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تم فرماؤ جو فاضل بچے اسی طرح اللہ تم سے آیتیں بیان فرماتا ہے

{**یَسْــٴَـلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ : آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔**} یاد رہے کہ اِس آیت میں شراب کو حرام قرار نہیں دیا گیا بلکہ حرمت کی آیات سورۂ مائدہ میں بعد میں نازل ہوئیں اور 3 ہجری میں غزوۂ احزاب سے چند روز بعد شراب حرام کی گئی۔

شراب اور جوئے کی مذمت

اس آیت میں شراب اور جوئے کی مذمت بیان کی گئی ہے کہ جوئے اور شراب کا گناہ اس کے نفع سے زیادہ ہے، نفع تو یہی ہے کہ شراب سے کچھ سُرور پیدا ہوتا ہے یا اس کی خرید وفروخت سے تجارتی فائدہ ہوتا ہے اور جوئے میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے کبھی مفت کا مال ہاتھ آجاتا ہے لیکن شراب اور جوئے کی وجہ سے ہونے والے گناہوں اور فسادات کا کیا شمار۔ شراب سے عقل زائل ہوجاتی ہے، غیرت وحَمِیَّت کا جنازہ نکل جاتا ہے، ماں، بہن، بیٹی کی تمیز ختم ہوجاتی ہے، عبادت سے دل اکتا جاتا ہے، عبادت کی لذت دل سے نکل جاتی ہے۔ جوئے کی وجہ سے لوگوں سے دشمنیاں پیدا ہوجاتی ہیں، آدمی سب کی نظر میں ذلیل و خوار ہوجاتا ہے، جوئے باز، سٹے باز کے نام سے بدنام ہوتا ہے، کبھی کبھار اپنا سب مال واسباب جوئے میں ہار دیتا ہے، زندگی تباہ و برباد ہوجاتی ہے، محنت سے جی چرانا شروع ہوجاتا ہے اور مفت خورہ بننے کی عادت پڑجاتی ہے وغیرہا۔ ایک روایت میں ہے کہ جبریل امین عَلَیْہِ السَّلَام نے حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کو جعفر طیار کی چار خصلتیں پسند ہیں۔ سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے حضرت جعفر طیار رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے دریافت فرمایا، انہوں نے عرض کی کہ **ایک خصلت** تو یہ ہے کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی، یعنی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے بھی کبھی شراب نہیں پی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ اس سے عقل زائل ہوتی ہے اور میں چاہتا تھا کہ عقل اور بھی تیز ہو۔ **دوسری خصلت** یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی میں نے کبھی بت کی پوجا نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ پتھر ہے نہ نفع دے سکے نہ نقصان۔ **تیسری خصلت** یہ ہے کہ میں کبھی زنا میں مبتلا نہ ہوا کیونکہ میں اس کو بے غیرتی سمجھتا تھا۔ **چوتھی خصلت** یہ تھی کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کیونکہ میں اس کو کمینہ پن خیال کرتا تھا۔ (تفسیرات احمدیہ، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۱۹، ص۱۰۱ملتقطاً)

سبحان اللہ، کیا سلیم الفِطرت تھے۔ حضرت علی کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم نے فرمایا کہ اگر شراب کا ایک قطرہ کنویں میں گر جائے پھر اس جگہ منارہ بنایا جائے تو میں اس پر اذان نہ کہوں گا اور اگر دریا میں شراب کا قطرہ پڑ جائے پھر دریا خشک ہوجائے اور وہاں گھاس پیدا ہو تو میں اس میں اپنے جانوروں کو نہ چراؤں گا۔ (مدارک، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۱۹، ص۱۱۳)

سبحان اللہ! گناہ سے کس قدر نفرت ہے۔" اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بابا سیر نے اس کی کیفیت کچھ یوں بیان کی:

مستانہ ام سیر چو کشادم لب از عدم

مدر بجائے شیر بکامم شراب ریخت

"سیر نے جب آنکھ کھولی او بلایا تو مست ہوا۔ میری ماں نے گھٹی میں دودھ کی جگہ تیرے عشق کا شراب مجھے پلایا تھا۔ یہاں شاعر نے روز ازل کے سوال کہ کیا 'میں' تمہارا رب نہیں ہوں اور سوال کا جواب ہاں تو ہی ہمارا رب ہے، یعنی وعدہ الست کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عشق حقیقی میری روح کے اقرر میں شامل ہے۔ سورۃ الدھر میں ارشاد فرمایا:

عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ٘-وَّحُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍۚ-وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۲۱)

ترجمہ: ان پر باریک اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب انہیں پاکیزہ شراب پلائے گا۔

{عٰلِیَهُمْ: ان پر ہیں۔} یعنی ان جنتیوں کے بدن پر باریک اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور انہیں چاندی کے (بھی) کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب عَزَّوَجَلَّ انہیں پاکیزہ شراب پلائے گا جو کہ انتہائی پاک صاف ہو گی، نہ اسے کسی کا ہاتھ لگا ہو گا، نہ کسی نے اسے چھوا ہو گا اور نہ وہ پینے کے بعد دنیا کی شراب کی طرح جسم کے اندر سڑ کر پیشاب بنے گی بلکہ اس شراب کی صفائی کا یہ عالَم ہے کہ جسم کے اندر اتر کر پاکیزہ خوشبو بن کر جسم سے نکلتی ہے اور جنت میں رہنے والوں کو کھانے کے بعد شراب پیش کی جائے گی، اسے پینے سے ان کے پیٹ صاف ہو جائیں گے اور جو کچھ انہوں نے کھایا ہو گا وہ پاکیزہ خوشبو بن کر ان کے جسموں سے نکلے گا اور ان کی خواہشیں اور رغبتیں پھر تازہ ہو جائیں گی۔ (خازن، الانسان، تحت الآیۃ: ۲۱، ۴ / ۳۴۱)

یہ وہ لافانی شراب ہماری مستی لازوال کی گدا ہے اور آسمان باوجود اپنی عظمت اور وسیع جسامت کے ہمارے ہوش کی وسعت کا قیدی ہے۔

نوٹ: مثنوی میں یہ شعر نہیں لیکن یہ مفتاح العلوم میں موجود ہے۔

بادہ ازمامست شدنے ماازو

قالب ازماہست شدنے ماازو

شراب، ہم سے مست ہوئی نہ کہ ہم اس سے

جسم، ہماری وجہ سے پیدا ہے نہ کہ ہم اس کی وجہ سے

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست

طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

سچی بات سننے پر ہر شخص قادر نہیں ہے

انجیر، ہر حقیر پرندہ کی خوراک نہیں ہے

جناب رومیؒ کی کمال بات یہ ہے کہ وہ بنیادی معاملات کی بات کرتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ انہوں نے سچ کہنے سے زیادہ سچ سننے کو اہمیت دی ہے، یعنی اس کی توفیق ہر کس و ناکس کو کہاں ملتی ہے۔ جو سچ ہمارے دل کا ہے وہی ہماری دنیا کا ہے۔

مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ سچ کی تعریف کرتے ہیں اور یقیناً سچ کو جو اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ نے طاقت بخشی ہے وہ کمال کی بخشی ہے سچّی بات سُننے پر ہر شخص قادر نہیں ہے، مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں کہ سچ بات سُننے کا ہر شخص متحمل (بردبار) نہیں ہے۔ سچ سے مراد مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے بیان کیا ہے اور جہاں تک میرا وِجدان ہے وہ یہ کہتا ہے کہ سچ سے مراد، سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کی نُورانیت موجود ہے مگر ہر شخص اس کا مُتحمل (برداشت کرنے والا) نہیں ہو گا، وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہے گا مگر اصّل [حقیقت] کی طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا حالانکہ سچ یہ ہے کہ اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ موجود ہے اگر انسان اُس کی تلاش کرے تو پھر اسے پتہ چلے گا کہ واقعی ہر جگہ اُس کا مسکن (جائے سکونت دل) موجود ہے اور حقیقتِ انسان بھی یہی ہے کہ جس وقت انسان کسی کامل مُرشد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے اور اپنا آپ مُرشد کے سپرد کر دیتا ہے۔ یعنی بیعت ہو جاتا ہے کیونکہ

بیعت ہونادراصل خود سپردگی کا نام ہے، تو جب اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے تو پھر تمام باتیں، سوالات ختم ہو جاتے ہیں اور چُوں چُراں کی بات ختم ہو جاتی ہے۔

المختصر؛ میں یہاں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں چُونکہ ساتھ ساتھ وضاحت ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی کیونکہ یہ عشق کا موضوع ہے اور یہ عشق کا موضوع بیان ہی تب ہوتا ہے کہ جب علمِ طریقت پاس ہو، جو اِسے دل کی گہرائی سے پڑھے گا وہ طریقت کے اسرار ورموز سے بھی آشنا ہو جائے گا۔ تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حقیقتِ انسان بھی یہی ہے کہ انسان کے دل کے اندر اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ کی نُورانیت موجود ہے اسی اِدراک کے بعد پھر مقام ایسا آتا ہے کہ جب شیخ کی نِگاہ طالب پر ہوتی ہے تو وہ فنافِی الشّیخ ہو جاتا ہے، یہ مقام ایسا ہوتا ہے کہ مرید کا اپنا کچھ نہیں رہتا اسکا سب کچھ اسکا شیخ ہو جاتا ہے۔

پھر شیخ جب توجّہ کرتا ہے تو سارے حِجابات اٹھ جاتے ہیں تو طالب اپنے اندر روشنی محسوس کرتا ہے وہ روشنی ہی حقیقت ہے، تو یہ ہی سچ ہے مگر اس کا سچ کا مُتحمل کبھی بھی ہر شخص نہیں ہو سکتا۔

بَندْ بُگسِل، باش آزاد اے پسر

چند باشی بَندِ سیم وبَندِ زَر؟

اے بیٹا! قید کو توڑ آزاد ہو جا

سونے چاندی کا قیدی کب تک رہے گا

بیٹا یہ بندھن توڑ کر آزادی اختیار کرو۔۔

مثنوی کے پہلے 18 اشعار کے بعد سب سے اہم موضوع جسے مولانا اٹھانا چاہتے ہیں وہ ہے تار اور سونے کے بندھنوں سے آزادی۔ اس تمہید کے بعد پہلی مختصر کہانی، یعنی بادشاہ اور لونڈی کی کہانی، اسی موضوع پر چل سکتی ہے۔ رسی کو توڑنا اور رسی اور سونا سے آزاد ہونا۔ اس لیے یہ ایک بہت اہم موضوع ہونا چاہیے جس سے مثنوی شروع ہوتی ہے۔

فارسی صوفیانہ ادب میں، لڑکے کا مطلب ہے وہ شخص جو ابھی راستہ شروع کر رہا ہے اور ابھی ماورائی کے راستے میں داخل ہوا ہے۔اس تصوف میں وہ لڑکی کیوں نہیں کہتا؟ کیونکہ اس تصوف کی نظر میں مرد اور عورتیں نہیں ہیں۔

بہت سے ممالک میں، ان کے ادب اور زبان میں صنفی امتیاز پایا جاتا ہے، مثلاً (وہ/وہ.... تم/تم)، لیکن فارسی زبان اور ایرانی تصوف میں صنفی امتیاز نہیں ہے۔

اس نظریہ میں جہاں کہیں بھی کسی مرد کا نام آتا ہے اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو حق کی راہ پر چل پڑے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔

اور جہاں کہیں عورت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب (مرد اور عورت دونوں) میں ایک عورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہیں تو ہمیں نرم اور نسوانی مزاج کے ساتھ کرنا چاہیے.

مثال کے طور پر، عبادت اور روحانی نشوونما کے دوران، ہمیں ایک عورت کی طرح نرم مزاج ہونا چاہیے۔ ہماری باطنی حرکت سخت مردانہ اظہار کے ساتھ نہیں ہو سکتی، اور ہم تشدد کے ساتھ اچھا باطنی احساس نہیں رکھ سکتے۔

ہم سب باہر سے مردہ ہیں اور عورتیں اندر سے۔

جب ہم تحریک شروع کرتے ہیں، پہلے قدم اور اپنے رویے کے آغاز میں، ہم سب لڑکے ہوتے ہیں.

جب تک ہم بالغ اور روحانی راستے کو سمجھتے ہیں (یہاں عمر کی کوئی اہمیت نہیں ہے)، ہم سب راستے کے آدمی بن جاتے ہیں.

اور جو شخص شعور کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے وہ بوڑھا نہیں ہوتا، مرد اور عورت.

ہمارے ہاں اس سرزمین میں بہت سی عورتیں ہیں جن کے نام تذکروں میں درج ہیں، لیکن ان میں سے بہت سے نام تعصّبات کی وجہ سے مٹا دیے گئے ہیں۔

لیکن اس صوفیانہ عورت کو پیر بھی کہا جاتا ہے۔

اور بوڑھا وہ ہے جو دوسروں کی رہنمائی کے مرحلے پر پہنچ گیا ہو اور سچ بولتا ہو۔

آپ کو اس چیز کا وزن کرنا ہو گا جسے آپ روحانیت کے طور پر جانتے ہیں اور دیکھیں کہ آیا یہ واقعی آپ کے سفر میں آپ کی مدد کرتا ہے۔

آرام دہ چڑھنے کے لیے، آپ سب سے پہلے ہلکے چڑھنے کا سامان خریدتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس بھاری وزن ہے جو آپ چل نہیں سکتے۔

ہمارے عقائد اور بہت سے سماجی اصولوں کے بندھن ہیں، اور ایک متلاشی کو ان بندھنوں کو پہچاننا اور انہیں توڑنا چاہیے۔

ڈور کاٹنا احترام سے کرنے کا طریقہ نہیں ہے، لیکن آپ کو عزم کے ساتھ ڈور کاٹنا چاہیے!

کچھ سماجی رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کے وجود کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن سماجی تعریفیں اس کی تصدیق کرتی ہیں، اور آپ کو ان رشتوں کو ہمت کے ساتھ توڑنے کے قابل ہونا چاہیے، اور جب آپ اسے کاٹیں گے، تو آپ آگے بڑھ سکیں گے۔

کچھ لوگ ملک کے خاندان کے ذہنی زنجیروں میں اس قدر پھنس جاتے ہیں کہ وہ ہل نہیں سکتے اور یہ لوگ جب کسی دوسرے ملک یا شہر میں ہجرت کرتے ہیں تو بہت ترقی کرتے ہیں، کیونکہ یہ طوق اب ان کے ساتھ جڑا نہیں رہتا۔

ہم اتنے ہی آزاد ہوتے ہیں جتنا ہم خود سے بندھنوں کو دور کرتے ہیں۔

براہِ کرم اپنی زندگی کے راستے پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ آپ کے پیروں میں کتنی بیکار بیڑیاں جڑی ہوئی ہیں اور ہر ایک میں اللہ سے مدد مانگیں اور بیڑیاں کاٹنا شروع کریں۔

زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد آپ کا دماغ کھل جائے گا اور آپ سمجھ جائیں گے کہ دنیا کیسی ہے۔

رومیؒ کہتے ہیں کہ تم کتنے تار اور سونے سے بندھے ہو۔ تار اور سونے کا مطلب ہے رنگ اور چمک۔

سونا چاندی اپنے آپ میں برے نہیں ہیں لیکن اگر آپ کو ان کی وجہ سے دوسروں کے سامنے سر جھکانا پڑے تو آپ پھنس گئے ہیں۔

میں نے دنیا کے کامیاب لوگوں کی سوانح عمری پڑھی ہے۔ یہ وہ لوگ رہے ہیں جنہوں نے دوسروں سے مدد مانگنے کی وجہ سے اپنا سر نہیں جھکایا اور آزاد ہونے کے لیے اپنی ہی محنت اور کٹھن کام کیا۔ اور اگر آپ آزاد ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو آہستہ آہستہ شروع کرنا چاہیے اور خود مختار بننا چاہیے، یعنی کام کرنا۔

کیونکہ کام ہی انسان کا جوہر ہے اور انسان سے مراد تمام انسان ہیں۔ مرد اور عورت کو کام کرنا چاہیے اور کمانا چاہیے۔

منافع بخش، سجیلا اور آسان کام تلاش کرنا بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔

تم نوجوانو! جو اپنی زندگی کے راستے کا تعین کرنا چاہتے ہو، آہستہ آہستہ کام شروع کر دو۔

مثال کے طور پر خرید و فروخت یا اپرنٹس بنیں اور اپنے جسم کو استعمال کریں کیونکہ اگر آپ اپنے جسم کو کام کرنے پر مجبور کریں گے تو آپ خود کو خود مختار اور مضبوط محسوس کریں گے اور کل آپ جہاں کہیں بھی جائیں گے آپ اپنا قالین پانی سے باہر نکال سکیں گے۔

یہ شاید رومی کا پہلا اہم سبق ہے اور اس دنیا میں مصیبت زدہ انسان کو شفا دینے کا ان کا پہلا نسخہ ہے۔

آزاد ہو جا، کب تک سونے اور تار سے بندھے رہو گے؟

تمہیں زنجیریں توڑ کر آزاد ہونا پڑے گا، لڑکے! آپ کب تک بندھے رہنا چاہتے ہیں؟ اور تار اور سونا عموماً اس دنیا میں دولت اور سود سے مراد ہے۔ پچھلے حصے میں رومی اس نتیجے پر پہنچے کہ کچی چیز کبھی بھی پکی ہوئی حالت کو نہیں پا سکتی، اور ہر کسی کے پاس محبت کی وہ آگ نہیں ہوتی اور وہ بے ہوش بھی نہیں ہوتا، وہ اس ذہانت کا محرم نہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے۔ ختم ہو گیا جو اس مثنوی کتاب کے مطالعہ کا تسلسل معلوم ہوتا ہے جو نہ پکا ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں اور اس کو عشق کی آگ نے نہیں پکایا! لیکن اس حصے میں رومی ایک حل پیش کرتا ہے اور محبت کی آگ میں پکانے کا پہلا قدم زنجیر کو توڑنا اور خود کو تار اور سونے کی زنجیر سے آزاد کرنا سمجھتا ہے۔

مولانا کے مطابق اس دنیا میں انسان تار اور سونے سے بندھے ہوئے ہیں۔ تار اور سونا صرف سونا اور چاندی نہیں ہیں اور اس دنیا میں کسی بھی قسم کی ملکیت کا حوالہ دیتے ہیں، کیونکہ اگلے شعر میں وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تم سمندر کو برتن میں ڈالنا چاہتے ہو تو اس میں کتنی گنجائش ہے؟ سمندر اس دنیا کا سارا سامان ہے اور گھڑا ہمارے وجود کا کنٹینر ہے۔ یہ بات طے ہے کہ ہمارا برتن جو ایک جگ کے برابر ہے، دنیا کے سمندر سے زیادہ پانی نہیں لے سکتا۔ اس دنیا کے سمندر کا کتنا پانی ہمارے وجود کے برتن میں سما سکتا ہے؟ صرف ایک دن کا حصہ۔ لیکن لالچی کی آنکھ کا پیالہ کبھی نہیں بھرتا۔

یہ ہماری اس دنیا کی خواہشات کے بارے میں ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ زیادہ پیسہ، بہتر اور بڑا گھر، بہتر گاڑی، اعلیٰ تعلیم کی ڈگری، بہتر نوکری اور...

براہ کرم، اگر آپ کے والدین کے مالی حالات اچھے ہیں، تو ان کی طرف دیکھ کر یہ نہ کہیں کہ میں خود کام کرنا چاہتا ہوں۔

اگر آپ دنیا میں ایک موثر انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو خود مختار بن کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ آپ ایک سائٹ بنا سکتے ہیں، خرید و فروخت کر سکتے ہیں، سیکھ سکتے ہیں، متحرک رہ سکتے ہیں، اور آہستہ آہستہ آپ آزاد ہو جائیں گے اور آپ بہت اچھے اقدامات کر سکتے ہیں۔

جب میں 17 سال کا تھا تو ریڑھی پر چیزیں بیچتا تھا اور میری تھوڑی سی آمدنی ہوتی تھی اور کچھ عرصے بعد میں نے اسی جگہ پر کاروبار کیا، جمعہ کے دن بازار میں چیزیں فروخت کیں اور میرے لئے کوئی شرم نہیں تھی.

براہ کرم یہ نہ کہو کہ میں نے یونیورسٹی میں پڑھا ہے اور یہ چیزیں میرے لیے ٹھیک نہیں ہیں، یہ سوچنا درست نہیں کہ اب جب میں یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہوں تو میں خود کو کار ریپئر یا مکینک نہیں بننے دوں گا۔

براہ کرم اپنے آپ کو کھولیں، کیونکہ آزادی ہی انسان کو بڑھنے دیتی ہے۔

ہو سکتا ہے آپ کوئی نوکری شروع کر دیں اور اس کام میں زیادہ کمائی نہ کریں، لیکن پریشان نہ ہوں، اسی کام کو جاری رکھیں اور اللہ کی مدد سے آپ کامیاب ہو جائیں گے۔

ان میں سے ہر ایک دنیاوی خواہش جس سے تم ایک دن یا چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند ماہ خوش رہو گے اور پھر وہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے گی اور تم اعلیٰ درجے کا مطالبہ کرو گے، اور یہ دنیا اس کی پابند ہے۔ وہ درخواستیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں اور جب ایک گھڑا بھر جائے تو دوسرا گھڑا ضرور بھرنا چاہیے اور لالچی آنکھ کا گھڑا کبھی نہیں بھرتا اور رومی کے نزدیک اس کا مطلب بندھن میں ہونا ہے۔ اس بندھن کو توڑنے اور دنیا کے لالچ سے آزاد ہونے کا رومی کا حل قناعت ہے، اور مثنوی میں شاید یہ رومی کا پہلا عملی سبق ہے۔

ایک اور مثال جو رومیؒ دیتے ہیں وہ ایک خول ہے جو سمندر میں گہرائی میں ہے۔ اسے سیپ کہتے ہیں۔ اس سیپ کے منہ میں سمندر کا کتنا پانی ہو سکتا ہے؟ اگر یہ سیپ اپنا منہ کھولتا رہے اور سمندر سے مزید پانی مانگے تو کیا ہوگا؟ ایسا منہ جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور کبھی نہیں بھرتا۔ سیپ کو مطمئن ہونا چاہیے اور دروازہ کھولنے کے لیے اپنا منہ بند کر لینا چاہیے۔

یا سیپ کی طرح محبت سے کپڑے پھاڑ دے اور موتی کی شکل میں ظاہر ہو جائے۔

یہاں جو رومیؒ نے سیم زر کی بات کی ہے وہ نفس پرستی، انانیت وحب مال وجاہ ہے۔ اگر وہ ماسوا اللہ ہو تو مزموم ہو لیکن اگر اللہ کی خوشنودی کے لئے استعمال میں آئے تو رحمت وفضل ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يَزِيدَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عَلِيٍّ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ: سَمِعْتُ عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ قَالَ: بَعَثَ إِلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ عَلَيَّ ثِيَابِي وَسِلَاحِي، ثُمَّ آتِيهِ، فَفَعَلْتُ فَأَتَيْتُهُ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ، فَصَعَّدَ إِلَيَّ الْبَصَرَ ثُمَّ طَأْطَأَ، ثُمَّ قَالَ: "يَا عَمْرُو، إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَبْعَثَكَ عَلَى جَيْشٍ فَيُغْنِمُكَ اللَّهُ، وَأَرْغَبُ لَكَ رَغْبَةً مِنَ الْمَالِ صَالِحَةً"، قُلْتُ: إِنِّي لَمْ أُسْلِمْ رَغْبَةً فِي الْمَالِ، إِنَّمَا أَسْلَمْتُ رَغْبَةً فِي الْإِسْلَامِ فَأَكُونُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: "يَا عَمْرُو، نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ."

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جنگی لباس پہن کر اور اسلحہ لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آؤ۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا۔ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا، اور سر جھکا لیا۔ پھر فرمایا" :اے عمرو! میں چاہتا ہوں کہ تجھے ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجوں اور اللہ تعالیٰ تجھے غنیمت عطا کرے۔ میں تیرے لیے اچھے مال کی رغبت رکھتا ہوں۔ "میں نے عرض کیا: میں مال کی غرض سے اسلام نہیں لایا۔ میں تو صرف دین اسلام کی چاہت رکھتے ہوئے اسلام لایا ہوں تاکہ اللہ کے رسول کا ساتھ نصیب ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :اے عمرو! اچھا مال نیک آدمی کے لیے اچھی چیز ہے۔] "الادب المفرد/کِتَابُ/حدیث: 299[

ہاں، نیک آدمی کے لیے اچھی رقم

اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے لیے دین کو کامل کیا، ہم پر نعمت کو کامل کیا، ہماری امت کو بہترین امت بنایا اور ہم میں سے ایک رسول ﷺ بھیجا جو ہم پر اس کی آیات پڑھتا ہے، ہمیں پاک کرتا ہے اور ہمیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا اس کی وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے اہم معاملات کو واضح فرمایا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کو پورا کیا اور قوم کو نصیحت کی۔ تو خدا ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل اور اصحاب پر رحمت نازل فرمائے جو فضیلت اور عزم سے مالا مال ہیں۔

عباد الله أوصی نفسی وإیاکم بتقوی الله العظیم القائل فی کتابه الکریم (زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ)، فاتقوا الله عباد الله ولا تلهینکم الدنیا وشهواتها ومتاعها وأموالها عما

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے (یہ رقم میٹھی اور سبز ہے، جو اسے اپنے حق سے لے کر اپنے دائیں حصے میں ڈالے، تو وہ کتنی برکت والا ہے۔ ناحق لے جانے والے کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ روح اس سبز، میٹھے اور خوشنما پھل کی خواہش رکھتی ہے جس کی روح کو خواہش ہوتی ہے، پس جو شخص حلال راستے سے مال لے کر اس کو استعمال کرتا ہے۔ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے معاملات میں خرچ کرتا ہے اور اپنی حفاظت کی نیت سے اسے نیکی اور بھلائی پر خرچ کرتا ہے یا اپنی بیوی پر اچھی نیت سے خرچ کرتا ہے یا اپنی اولاد پر یا اپنے والدین پر یا رشتہ داروں پر خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے وفادار بندے پر بہت بڑی نعمت ہے، مومن جو مال اس جگہ سے لے کر جسے اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہے اس میں ڈال دیا، آخرت میں اس کے لیے مددگار ثابت ہوگا کیونکہ یہ ثواب کمانے کا ذریعہ ہوگا۔ آخرت، اس کے حق کے بغیر، تو اس نے اسے حرام طریقے سے حاصل کیا، کیونکہ وہ اس کی نعمت سے محروم رہتا ہے، اس لیے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، خواہ وہ مال بہت زیادہ کیوں نہ ہو، اور وہ اس میں مبتلا ہو جائے گا۔ قیامت کے دن .

پیسہ ایمان کا بھائی نہیں ہے، اور یہ بالکل بھی قابلِ ملامت نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک نیک آدمی کے لیے اچھا پیسہ کتنا اچھا ہے۔" تو نیک آدمی جو اپنا پیسہ لے۔ حلال طریقے سے اور خیرات کے کاموں میں خرچ کرنا نیکی اور نیکی کے پیش نظر مال خرچ کرنا نیکی ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں سب سے زیادہ سخی تھے جب ان کی ملاقات جبرائیل علیہ السلام سے ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت آندھی سے بھی زیادہ سخی تھے۔ .

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں دینے کی ایک مثال تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی تمام دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں، آخرت کی خواہش، دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں خرچ کی۔ خدا کی دعا اور سلام، اور کمزور مسلمانوں کی مدد کرنا یہاں تک کہ عن ابن عمر، قال: کنت عند النبیّ صلی الله علیه وآله وسلم وعنده أبو بکر الصّدّیق، وعلیه عباءة قد خلّها فی صدره بخلال فنزل علیه جبریل فقال: یا محمّد مالی أری أبا بکر علیه عباءة قد خلّها فی

صدره؟ فقال: يا جبريل أنفق ماله عليّ قبل الفتح، قال: فإنّ الله جل جلاله يقرأ عليك السّلام ويقول قل له: "أراض أنت عنّي في فقرك هٰذا أم ساخط؟" فقال: رسول الله: يا أبابكر! إنّ الله عزوجل يقرأ عليك السّلام ويقول لك "أراض أنت عنّي في فقرك هٰذا أم ساخط؟" فقال أبوبكر عليه السّلام أسخط على ربّي؟ أنا عن رّبّي راض، أنا عن رّبّي راض، أنا عن رّبّي راض.

"حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حال میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے عباء (لباس جو سامنے سے کھلا ہوا ہو اور اُس کو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے) پہنی ہوئی تھی جس کو اپنے سینے پر خِلال (لکڑی کا ٹکڑا، جس سے سوراخ کیا جاتا ہے) سے جوڑا ہوا تھا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: "اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عباء پہن کر اُسے اپنے سینے پر ٹانکا ہوا ہے؟" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے جبرئیل علیہ السلام! انہوں نے اپنا سارا مال مجھ پر خرچ کر ڈالا ہے۔" جبرئیل علیہ السلام نے کہا: "اللہ رب العزت آپ کو سلام فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہیں، کیا تو اپنے اِس فقر میں مجھ سے راضی ہے یا ناراض؟" اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! اللہ رب العزت تم پر سلام فرماتے ہیں اور تمہیں ارشاد فرماتے ہیں، "کیا تو اپنے اس فقر میں مجھ سے راضی ہے یا ناراض؟" ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ "میں اپنے ربِ کریم پر ناراض ہوں گا؟ میں تو اپنے رب سے (ہر حال میں) راضی ہوں میں اپنے ربِ کریم سے راضی ہوں۔ میں اپنے ربِ کریم سے راضی ہوں۔"

1. ابن جوزي، صفة الصفوة، 250:1
2. ابو نعيم، حلية الاولياء، 105:7
3. ابن کثير، تفسير القرآن العظيم، 308:4
4. محب طبري، الرياض النضره، 20:2
5. خطيب بغدادي، موضح أوهام الجمع والتفريق، 441:2

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلي الله عليه وآله وسلم: "ما نفعني مال أحد قطّ ما نفعني مال أبي بكر"

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی کے مال نے کبھی مجھے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے۔“

1. ترمذی، الجامع الصحیح، 5:609، ابواب المناقب، رقم: 3661

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب بیان کیا ہے

من شبے صدیق را دیدم بخواب

گُل زِ خاکِ راہِ اُو چیدم بخواب

"ایک رات میں نے خواب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کو دیکھا

آپ کے راستے کی خاک سے میں نے خواب میں پھول چُنے۔"

آں امن النّاس بر مولائے ما

آں کلیمِ اوّل سینائے ما

"آپ سب سے زیادہ احسان کرنے والے ہمارے مولا ہیں

آپ ہمارے طُور (نبی کریمؐ) کے پہلے کلیم ہیں۔ "

ہمّتِ اُو کشتِ ملّت را چو ابر

ثانیٔ اِسلام و غار و بدر و قبر

"آپ کی ہِمّت اُمّت کی کھیتی کے لیے بادل کی مانند ہے آپ ثانیٔ اِسلام و غار و بدر و قبر ہیں۔"

گفتمش اے خاصۂ خاصانِ عِشق

عِشقِ تو سر مطلعِ دیوانِ عِشق

"میں نے آپ سے کہا کہ آپ عِشق کے خاصوں سے بھی خاص ہیں

آپ کا عشق دیوان عشق کا پہلا شعر ہے۔"

پُختہ از دستت اساسِ کارِ ما

چارۂ فرماےِ آزارِ ما

"آپ کے ہاتھوں سے ہمارے کاموں کی بُنیاد مضبوط ہوئی

آپ ہمارے دُکھ درد کا عِلاج فرمائیں۔"

گفت تا کہ ہوس گردی اسیر

آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر

"حضرت صدیق نے فرمایا کہ کب تک اُمّت حِرص و ہوس میں مُبتلا رہے گی

اس اُمّت کو سورۂ اخلاص سے چمک دمک حاصل کرنی چاہیے۔"

ایں کہ در صد سینہ پیچد یک نفس

سِرّے از اسرارِ توحید است و بس

"یہ جو ہزاروں سینوں میں ایک ہی طرح سے سانس چل رہا ہے

یہ توحید کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔"

رنگِ اُو بر کن مثالِ او شوی

در جہاں عکس جمالِ او شوی

"اس جہاں میں تُو اس کے رنگ کو اِختیار کر کے اس کی مانند ہو جا

اس جہاں میں اُس کے جمال کا عکس بن جا۔"

آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است

از دوئی سوئے یکی آوردہ است

"وہ ذات کہ جس نے تیرا نام مسلماں رکھا ہے

وہ تجھے دوئی سے وحدت کی طرف لائی ہے۔ "

خویشتن را تُرک وافغان خواندہ ای

وائے بر تو آنچہ بودی ماندہ ای

"تُو خود کو تُرک اور افغان کہلانا پسند کرتا ہے

افسوس تجھ پر کہ تُو جو تھا اب نہیں ہے۔"

وارہاں نامیدہ را از نامہا

ساز با خم در گذر از جامہا

"تُو اس قوم کو اتنے سارے ناموں سے نجات دِلا

تو صُراحی سے موافقت کر اور پیالوں سے جان چُھڑا۔"

اے کہ تو رسوائے نام افتادۂ

از درخت خویش خام افتادۂ

"اے کہ تُو (قوم) اتنے سارے ناموں کی وجہ سے رُسوا ہو گئی ہے

اور اپنے درخت سے کچے پھل کی طرح گِر گئی ہے۔"

با یکی ساز از دوئی بردار رخت

وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

"تُو توحید سے تعلق جوڑ اور دوئی کو رُخصت کر دے

اپنی وحدت کو اس طریقے پر ٹُکڑے ٹُکڑے نہ کر۔"

اے پرستارِ یکی گر تو توئی

تا کجا باشی سبق خوانِ دوئی

"اے ایک کے پوجنے والے اگر تو تو ہے

تو کب تک دوئی کا سبق پڑھتا رہے گا۔"

تو درِ خود را بخود پوشیدۂ

در دِل آور آنچہ بر لب چیدۂ

"تُو نے اپنا دروازہ اپنے اوپر خود بند کر لیا ہے

تُو جو زبان سے کہتا ہے دِل سے بھی ادا کر۔"

صد ملل از ملّتے انگیختی

بر حصارِ خود شبیخوں ریختی

"تُو نے ایک مِلّت کی سو مِلّتیں بنالیں ہیں

اپنے قلعے پر خود ہی شب خوں مارا ہے۔ "

یک شو و توحید را مشہود کن

غائبش را از عمل موجود کن

"ایک ہو جا اور توحید کا اِظہار کر دے

اپنے عمل سے غائب کو موجود کر دے۔"

لذتِ ایماں فزاید در عمل

مُردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

"ایمان کی لذّت عمل کرنے سے بڑھتی ہے

مُردہ ہے ایمان جس میں عمل نہ ہو۔"

(علامہ اِقبال رحمتہ للہ علیہ)

تو اپنے آپ سے پوچھو اے میرے مسلمان بھائی، پیسے لینے سے پہلے اور خرچ کرنے سے پہلے، تم نے اسے کہاں سے حاصل کیا اور کس چیز پر خرچ کیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے کے پاؤں قیامت کے دن نہیں ہلیں گے جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے: اس کی زندگی کے بارے میں اور اس نے اسے کیا خرچ کیا، اس کے علم کے بارے میں اور اس کے ساتھ کیا کیا، اور اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کہاں سے حاصل کیا اور کس چیز پر؟ اسے اور اس کے جسم پر خرچ کرو، اس نے کیا پہنا تھا) میرے بھائی، پوچھنے سے پہلے اپنے آپ سے پوچھو، اور اس سے پہلے کہ تمہارا احتساب ہو، اپنے آپ کو پکڑو، جو صحت مند دل کے ساتھ خدا کے پاس آتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں اور اللہ سے اپنے اور آپ سب کے لیے معافی مانگتا ہوں۔

گر بِریزی بَحُر را در کوزہ ئے

چند گُنجَد؟ قِسمَتِ یک روزہ ئے

اگر تو دریا کو ایک پیالے میں ڈالے

کتنا آئے گا ایک دن کا حصہ

گر: اگر۔۔ ب: ساتھ۔۔۔ ریز: اٹھانا۔۔۔ بحر: دریا، سمندر۔۔ کوزہ؛ پیالہ

ترجمہ:

اگر تُو دریا کو ایک پیالے میں ڈالے، کتنا آئے گا؟ ایک دن کا حصّہ۔

شرح:

اس شعر میں مولانا روم نے کمال کی بات کی ہے کہ اگر تُو دریا کو ایک پیالے میں ڈالے تو ایک دن کا حصّہ آئے گا، یہاں مولانا روم کی اس شعر میں مراد یہ ہے کہ اگر تیرا ظرف کم ہے، چھوٹا ہے تو ظاہری بات ہے اس میں کم چیز آئے گی اور اگر تیرا ظرف وسیع ہے تو اس میں زیادہ چیز آئے گی۔ مراد جب بھی انسان اللہ کے ولی کے پاس بیٹھے تو اندر کا جتنا میل ہے، وہ میل اُتار کر بیٹھے، نیت کو صاف کر کے بیٹھے، اگر نیت صاف ہو گی تو زیادہ ملے گا اور اگر خراب نیت سے بیٹھے گا تو تجھے کچھ نہیں ملے گا اور اگر ملے گا بھی، تو بہت کم ملے گا کیونکہ تیرے کم ظرف ہونے کی وجہ سے یہ سب کچھ تیری سمجھ سے باہر ہو گا اس لیے کم سمجھ آئے گا اور کم ملے گا۔ یہاں پیالے سے مراد اپنے من کا پیالہ ہے، تو جب اللہ کے ولی کے پاس بیٹھو تو اپنے من کے پیالے کو دھو کر بیٹھو، تاکہ بھر کے لے جاؤ لیکن اگر من کا پیالہ گندا ہو گا تو گند اور غلاظت ہی لے کر جاؤ گے، یعنی من میں گند اور غلاظت لے کر بیٹھو گے تو پیالے میں بھی یہی کچھ لے کر جائو گے۔ میں یہاں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی نیتیں چونکہ صاف نہیں ہوتیں اس لیے وہ فقیر کی محفل سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

ان دونوں اشعار میں حرص و طمع سے اجتناب اور ترک کرنے کی تاکید کی گئی ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے انسانوں کے لیے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ شاعر کہتا ہے: سمندر کا پانی ایک مرتبان میں ڈالو تو وہ کتنی دیر رکھا جا سکتا ہے؟ یقینی طور پر، یہ ایک دن کی کھپت سے زیادہ نہیں. دوسرے لفظوں میں برتن کی گنجائش اس کی گنجائش کے برابر ہے، اس لیے انسان کو دنیا کی دولت سے اتنا ہی فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ وہ اسے استعمال کرتا ہے۔ اس لیے شاعر مال و دولت کے جمع ہونے پر تنقید کرتا ہے اور قناعت کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسانی حصہ ایک برتن کی مانند ہے جس کی اپنی گنجائش ہے اور اسے اپنی استطاعت سے زیادہ کھایا اور استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

شعر میں "سمندر کو برتن میں ڈالو تو کتنا ہو گا؟" ایک روزہ واقعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کے لیے بہتر ہے کہ دولت حاصل کرنے کا لالچ نہ ہو، کیونکہ دولت حاصل کرنے کا لالچ انسان کے لیے تناؤ اور تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر شخص کے لیے ایک مقررہ رزق دیا ہے اور وہ اپنی قوت ارادی اور کوشش سے ہی حاصل کر سکتا ہے اور زیادہ مال حاصل کرنے کے لیے فضول کام نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

سمندر کا پانی جار میں نہیں آتا اور اگر کوئی شخص سمندر کا پانی برتن میں ڈالنا چاہے تو اس نے یقیناً کوئی غلط اور بیکار کام کیا ہے، آپ اسے پلٹ دیں، باقی پانی جگ سے نکال کر آپ نے باہر ڈال دیا۔

لہٰذا اپنے لالچ کو ایک طرف رکھو اور اس حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو جو خدا نے تمہارے لیے مقرر کی ہے۔

واقعی، رومی کے اس شعر. کو سمجھنا اور اسے زندگی میں عملی جامہ پہنانا انسانیت کے بہت سے لاعلاج دردوں کی دوا ہے۔ اگر ہم اس یقین پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر دن کے لیے ایک یقینی تقدیر ہے جو ہماری مرضی اور حرکت کے ساتھ ہم تک پہنچے گی، تو ہم اپنی حدود سے تجاوز نہیں کریں گے اور ضرورت سے زیادہ کوششیں رائیگاں نہیں جائیں گے۔ بلکہ ہم سائز اور توازن کا احترام کریں گے۔ اس اقدام کے بعد محبِ رضا بھی ہو جائیں گے۔ جب ہمارے اندر ایسی سوچ پیدا ہو گی تو ہم ہر روز خدا کی عطا سے مطمئن اور مطمئن ہوں گے اور اطمینان کے نام پر ہمارے لیے بھلائی کا ایک اور دروازہ کھل جائے گا اور اچھائی کے پیچھے اچھائی آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نیکی کو ایک خاص نعمت دی ہے اور اسے ضرب اور بڑھنے والی حالت عطا کی ہے جیسا کہ ایک نیکی سے نیکی کی شاخیں اور دوسری نیکیاں اگتی ہیں اور اگر ہم نیکی کے راستے پر ثابت قدم رہیں گے تو اس میں وسعت اور وسعت آتی ہے۔ دوسری طرف، اس بیت کے معنی اگلے بیت سے متعلق ہیں.

ذیل میں شاعر نے قناعت کے فضائل کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص قناعت پر عمل کرے، سیپ کی طرح جو بارش کے قطرے سے چمکتا موتی پیدا کرتا ہے، تو وہ حقیقی علم کے چمکتے موتی کو بھی حاصل کر لے گا۔

جار کا معنی ہماری وجودی صلاحیت ہے اور سمندر کا معنی خدا ہے۔

اور یہ الفاظ فارسی تصوف کی ہر کتاب میں ایک ہی معنی رکھتے ہیں جو آپ پڑھتے ہیں۔

سمندر ایک استعارہ ہے اور سمندر سے مراد خدا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے نظارے میں ہم الٰہی محبت اور رحمت کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہم خدا کی رحمت کے سمندر میں ایک مچھلی کی طرح ہیں، اور چونکہ ہم خدا کے انوار کے اندر ہیں اور اس کے وجود میں غرق ہیں، اس لیے ہم مچھلی کی طرح سمندر اور خدا کو سمجھ نہیں سکتے!

رومیؒ کہتے ہیں کہ خدا کے نام پر ایک بڑا سمندر رہے کہ ہم اس میں سے صرف ایک مرتبان کے سائز کا ہی لے سکتے ہیں جو ہماری اپنی صلاحیت کے برابر ہے۔

اب اس کا حل کیا ہے؟

حل یہ ہے کہ مرتبان کو بڑا کیا جائے، اور برتن کو بڑا کرنے کے لیے ڈور کو پھاڑنا ضروری ہے!

جہاں کہیں بھی یہ آپ کو اعتماد کا احساس دلاتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ فلاں مجھے پسند کرتا ہے، وہیں آپ پابند ہوں گے اور آپ کو غلام بنایا جائے گا۔

یہ کہہ کر کہ میں خوشحال ہونے کے لیے ایک امیر گھرانے سے شادی کروں گا، ہوسکتا ہے کہ آپ کچھ اور کپڑے پہنیں اور کچھ اور دوروں کا تجربہ کریں، لیکن یہ آپ کے لیے ترقی اور بیداری کا باعث نہیں بنتا۔

بیداری اور ترقی صرف آزادی میں ہے۔

کچھ ثقافتوں میں، جب بچہ 18 سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، تو وہ اسے بتاتے ہیں کہ یہ گھر چھوڑنے اور خود مختار ہونے کا وقت ہے، اور یہ ایک بہت خوبصورت ثقافت ہے۔

قناعت کی تعریف

قناعت کا لغوی معنیٰ قسمت پر راضی رہنا ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں روزمرہ استعمال ہونے والی چیزوں کے نہ ہونے پر بھی راضی رہنا قناعت ہے۔ حضرت محمد بن علی ترمذی رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں: "قناعت یہ ہے کہ انسان کی قسمت میں جو رزق لکھا ہے اس پر اس کا نفس راضی رہے۔" اگر تنگدستی ہونے اور حاجت سے کم ہونے کے باوجود صبر کیا جائے تو اسے بھی قناعت کہتے ہیں۔ قناعت کی تفصیلی تعریف یوں ہے: "ہر وہ شخص جس کے پاس مال نہ ہو اور اسے مال کی ضرورت ہو اور اس کی حالت یہ ہو کہ مال میں رَغبت کی وجہ سے اس کی نزدیک مال کا ہونا نہ ہونے کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہو لیکن یہ رغبت اس حد تک نہ پہنچی ہو کہ حصولِ مال کے لیے بھاگ دوڑ کرے بلکہ اگر بآسانی حاصل ہو تو خوشی سے لے لے اور اگر حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑے تو چھوڑ دے اس حالت کو قناعت اور ایسے شخص کو قانع یعنی قناعت کرنے والے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

آیت مبارکہ:

اللہ عَزَّوَجَلَّ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:(وَاَنَّہٗ ھُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ۙ(۴۸)) (پ۲۷، النجم: ۴۸) ترجمۂ کنزالایمان:"اور یہ کہ اسی نے غنٰی دی اور قناعت دی۔"

مفتی احمد یار خان عَلَیْہِ رَحْمَۃ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:"یعنی امیروں کو غنا، فقیروں کو صبر و قناعت بخشی یا اپنے محبوبوں کا دل غنی بنایا اور ظاہری قناعت عطا فرمائی، بعض امیروں کو غنا کے ساتھ قناعت بھی دی، ہوس سے بچایا۔

حضرتِ سیدنا سعد بن ابی وقاص رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہسے روایت ہے کہ رسولُ اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمنے ارشاد فرمایا" :اللہ عَزَّوَجَلَّ پرہیز گار، قناعت پسند اور گمنام بندے کو پسند فرماتا ہے۔(مسلم)

قناعت حضور نبی رحمت شفیع اُمت صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمکی سنت، صحابہ کرام عَلَیْہِمُ الرِّضْوَان اور اولیائے کرام رَحِمَہُمُ اللّٰہُ السَّلَام کی مبارک سوغات ہے، ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس سوغات کو حاصل کرے، قناعت اللہ عَزَّوَجَلَّ کا محبوب بننے، اس کی رِضا پانے، قبر و حشر میں آسانی فراہم کرنے اور جنت میں لے جانے والا کام ہے۔

کوزۂ چشمِ حَریصان پُر نشُد
تا صَدَف قانِع نشُد، پُر دُر نشُد

لالچی آدمیوں کی آنکھوں کا پیالہ کبھی بھی نہیں بھرا، جب تک سیپ نے (بارش کے صرف ایک ہی قطرے پر) قناعت نہ کی، وہ موتی سے نہ بھرا۔

انسان کے اندر لالچ کے عنصر سے انکار ممکن نہیں مگر پھر بھی زندگی گزارنے کے لئے آخر انسان کو کتنا کچھ چاہیے ہے؟۔ کوئی حد تو ہوتی ہوگی۔ اگر ہم ارد گرد نظر دوڑائیں تو ہزوروں کو اس کارِ شر میں مبتلا پائیں گے۔ سینکڑوں پہ لوگوں کا حق کھانے اور کالا دھن بنانے کے الزامات ہوں گے۔

کیااس لالچ کی کوئی انتہا بھی ہے ؟سچ کہتے ہیں کہ زندگی کو ضرورت سمجھ کے گزارو ناں کہ خواہش۔ کیونکہ ضرورت فقیر کی بھی پوری ہو سکتی ہے مگر خواہش بادشاہ کی بھی ادھوری رہ سکتی ہے۔ غور کریں تو ایک انسان کو رہنے، کھانے اور پہننے کے لئے کتنے لوازمات درکار ہیں۔ سونے کے لئے ایک کمرہ بلکہ ایک بیڈ، کھانے کے لئے مناسب اشیائے خورونوش اور پہننے کے لئے چند سوٹ اور پھر بنیادی ضرورت کی اشیائے استعمال۔ بس کسی بنیادی حاجت کی محرومی باقی نہ رہے۔

جن کرپٹ سیاستدانوں، جرنیلوں کے نام پینڈورا پیپرز میں آئے ہیں۔ ان سے ہزار درجے بہتر یہ مزدور ہیں۔ جن کے ضمیر زندہ ہیں۔

اب جار اور سمندر کی مثال دیتے ہوئے رومیؒ بتاتے ہیں کہ پیسے، تار اور سونے کے لالچ کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ کبھی رکتی ہے، اور اگرچہ انسان کا وجود محدود ہے اور ضروری ہے کہ اس کے اختیارات بھی محدود ہوں۔ اس اصول کے برخلاف یہ لامتناہی ہے اور لالچی شخص اپنی دولت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا بلکہ جتنا زیادہ وہ جمع کرتا ہے اتنا ہی لالچی ہوتا جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "دنیا نمکین سمندر کے پانی کی طرح ہے۔" "آپ جتنا زیادہ کھائیں گے، پیاس اتنی ہی زیادہ لگے گی۔" اس لیے مال جمع کرنے سے ذہنی سکون حاصل نہیں ہوتا اور اسے سکون کا ذریعہ نہ سمجھا جائے۔ جو سکون ہم ڈھونڈتے ہیں وہ قناعت میں پایا جاتا ہے

شیخ سعدی نے بوستان میں درج ذیل عبارت لکھی ہے:

یکی قطرہ باران ز ابری چکید   خجل شد چو پہنای دریا بدید

بارش کا ایک ایک قطرہ بادل سے ٹپکتا ہے ۔ وہ سمندر کی چوڑائی دیکھ کر شرمندہ ہوا

دو آدمی ایک جھیل کے کنارے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تجربہ کار اور ماہر ماہی گیر تھا لیکن دوسرا مچھلی پکڑنا نہیں جانتا تھا۔

تجربہ کار آدمی جب بھی کوئی بڑی مچھلی پکڑتا تو اسے اپنے پاس موجود برف کے ڈبے میں ڈال دیتا تاکہ مچھلی تازہ رہے لیکن دوسرا مچھلی پکڑتے ہی اسے سمندر میں پھینک دیتا۔ ۔ ساتھ والا مچھیرا یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ اس شخص نے مچھلی کیسے کھو دی۔ تو تھوڑی دیر بعد اس سے پوچھا:

تم اتنی بڑی مچھلیوں کو سمندر میں کیوں پھینکتے ہو؟

آدمی نے جواب دیا: میرا پین چھوٹا ہے۔

اب رومیؒ نے ایک سیپ کی مثال دی ہے جو سمندر کے پانی سے مطمئن ہو کر اپنا منہ بھر لیتا ہے اور اس کی قناعت سے شاندار موتی پیدا ہوتا ہے۔ اور نتائج کے لیے ایک اور تشریح جو اس شعر سے کی جاسکتی ہے وہ انسانوں کی استعداد سے متعلق ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ ہر انسان میں ایک صلاحیت ہوتی ہے اور اگر آپ اسے اس کی استطاعت سے زیادہ بتانا چاہیں تو جس طرح وہ دیگ جو پانی کو اس کی طاقت سے زیادہ قبول نہیں کرتا اور اسے بہادیتا ہے تو جو شخص بھی اسے اس کی استطاعت سے زیادہ بتائے گا۔ وہ انکار کرتا ہے اور خود سے دور رہتا ہے اور کبھی قبول نہیں کرے گا۔ لہٰذا آپ کو ہر ایک کے ساتھ ان کی صلاحیت کے مطابق معاملہ کرنا اور بات کرنی چاہیے۔ بہر حال، فقیر کے نزدیک، مثنوی میں یہ شعر خاص اہمیت کا حامل ہے، بڑی گہرائی کا حامل اور بہت ہی قابل ذکر ہے۔

کثرتِ مال کی حرص کی مذمت قران وحدیث کی روشنی میں

کثرتِ مال کی حرص اور اس پر اور اولاد پر فخر کا اظہار کرنا مذموم ہے اور اس میں مبتلا ہو کر آدمی اُخروی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔

قران مجید کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

"اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ- کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ-وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ-وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانٌ ؕ-وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ "(حدید:۲۰)

جان لو کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل کود اور زینت اور آپس میں فخر و غرور کرنا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے پر زیادتی چاہنا ہے۔ (دنیا کی زندگی ایسے ہے) جیسے وہ بارش جس کا اُگایا ہوا سبزہ کسانوں کو اچھا لگا پھر وہ سبزہ سوکھ جاتا ہے تو تم اسے زرد دیکھتے ہو پھر وہ پامال کیا ہوا (بے کار) ہو جاتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے بخشش اور اس کی رضا (بھی ہے) اور دنیا کی

زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔

اور ارشاد فرمایا

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِۚ-وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ"(منافقون:۹)

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا کہ

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْۚ-وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ(۱۴)اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌؕ-وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ(۱۵)فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْؕ-وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"(تغابن:۱۴-۱۶)

اے ایمان والو! بیشک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بیشک اللہ بڑا بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہی ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا ثواب ہے۔ تو اللہ سے ڈرو جہاں تک تم سے ہو سکے اور سنو اور حکم مانو اور راہِ خدا میں خرچ کرو یہ تمہاری جانوں کے لیے بہتر ہو گا اور جسے اس کے نفس کے لالچی پن سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

احادیث کہ روشنی میں :

اور حضرت مُطَرِّف رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ "اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ" کی تلاوت فرما رہے تھے، آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "ابنِ آدم کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، اے ابنِ آدم: تیرا مال وہی ہے جو تو نے کھا کر فنا کر دیا، یا پہن کر بوسیدہ کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا۔

(مسلم، کتاب الزّہد والرّقائق، ص۱۵۸۲، الحدیث:۳)-۲۹۵۸)

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا "بندہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، اس کے لئے تو اس کے مال سے صرف تین چیزیں ہیں (1) جو اس نے کھا کر فنا کر دیا۔ (2) جو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا۔ (3) جو کسی کو دے کر (آخرت کے لئے) ذخیرہ کر لیا۔ اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ جانے والا ہے اور وہ اس کو لوگوں کے لئے

چھوڑنے والا ہے۔

(مسلم، کتاب الزّہد والرّقائق، ص ۱۵۸۲، الحدیث:۴)-۲۹۵۹)

حضرت عمرو بن عوف رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا" خدا کی قسم! مجھے تمہارے غریب ہو جانے کا ڈر نہیں ہے، مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ دنیا تم پر کشادہ نہ ہو جائے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی، پھر تم اس میں رغبت کر جاؤ جیسے وہ لوگ رغبت کر گئے اور یہ تمہیں ہلاک کر دے جیسے انہیں ہلاک کر دیا۔

(بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، باب الجزیۃ والموادعۃ مع اہل الذّمۃ والحرب، ۲/۳۶۳، الحدیث:۳۱۵۸)

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، سرکارِ دوعالَم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ " مال واَسباب کی کثرت سے مالداری نہیں ہوتی بلکہ (اصل) مالداری تو دل کا غنی ہونا ہے، خدا کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں محتاجی کا خوف نہیں ہے لیکن مجھے تمہارے بارے اس بات کا خوف ہے کہ تم کثرتِ مال کی ہوس میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

(مسند امام احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ، ۳/۶۴۵، الحدیث:۱۰۹۵۸)

حضرت کعب بن مالک رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے، حضورِ اَقدس صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا" دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان بکریوں کو اس سے زیادہ خراب نہیں کرتے جتنا مال اور عزت کی حرص انسان کے دین کو خراب کر دیتی ہے۔

(ترمذی، کتاب الزّہد، ۴۳-باب، ۴/۱۶۶، الحدیث:۲۳۸۳)

اللّٰہ تعالٰی سب مسلمانوں کو مال کی حرص اور ہوس سے محفوظ فرمائے،

آمین ثم آمین یارب العالمین

ہر کہ را جامہ زِ عشقے چاک شُد
او زِ حرص و عیَب، کُلّی پاک شُد

جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہوا

وہ حرص اور عیب سے بالکل پاک ہوا

ترجمہ: جس شخص کا لباس عشق سے چاک ہو گیا، سمجھیں وہ حرص و ہوا غرض ہر قسم کے عیب سے پاک و منزیٰ ہو گیا۔

دراصل اس شعر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عشق حقیقی تہذیب و اخلاق اور تزکیۂ نفس کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ کیونکہ قلب میں محبت الٰہیہ پیدا ہونے سے تمام اخلاق ذمیمہ خود بخود زائل ہو جاتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں؛ منافقت، جعلسازی، فریب، حرص، طمع، حسد، تکبر وغیرہ، عام روحانی بیماریاں ہیں۔ حدیثِ عشق کے فقدان کی وجہ سے ہیں۔ اگر ہر کام میں محبت کا عنصر ہو تو نہ صرف وہ پایہ تکمیل تک باحسن پہنچے گا بلکہ اگر ہر کوئی اپنے اسالیب سے محبت کرے تو یہ بیماریاں ہوتی ہی نہیں۔ کیونکہ ہر کوئی اپنے کمال پر پہنچ جائے گا۔ پر افسوس ایسا ہوتا نہیں۔

محبت جو زندگی کا خمیر ہے

الفاظ رومی جلال الدین محمدؒ کے ہیں اور محبت کی تفصیل رومیؒ کی زبان سے ہے، محبت جو زندگی کا خمیر ہے اور تحریکوں کا محرک ہے۔

مولاناؒ نے محسوس کیا ہے کہ کائنات کی بنیاد پیار اور محبت پر رکھی گئی ہے اور انسانی روح محبت کی پیاسی ہے۔ مولاناؒ کہتے ہیں کہ جس نے محبت کے لیے خود غرضی کو پھاڑ دیا وہ بڑھتا گیا۔

قدرتی طور پر، جب آپ محبت میں پڑ جاتے ہیں، تو آپ اپنے عاشق کے منہ میں کھانے کا ایک ٹکڑا بھی ڈالنا پسند کرتے ہیں۔ محبت کرنے والا شخص اپنے مفادات کو ترک کر دیتا ہے۔ محبت انسانوں کی خود غرض روح کی بہترین صفائی ہے۔

ہمیں جتنے بھی دکھ ہیں وہ ہماری خود غرضی کی وجہ سے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم کہتے ہیں کہ "میں" پریشان ہوں، "میں" کی خلاف ورزی کی گئی، "میں" کی توہین کی گئی،

کہ سب "میں" ہو گیا!

ایک خود غرض شخص ایک ناراض شخص ہے۔ ہم جتنا زیادہ اپنی انا پر توجہ دیتے ہیں، اتنا ہی ہم ناراض ہوتے ہیں، اور محبت ہماری انا کو واضح کرتی ہے، کیونکہ ہم کسی ایسے شخص سے پیار کرتے ہیں جس سے ہم خود سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔

جب ہم محبت کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں اور یہ محبت بہت مفید اور قیمتی چیز ہے۔

خدا کی مرضی، آپ سب اس رشتے میں محبت کا تجربہ کر سکتے ہیں یا اسے سمجھ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، اگر آپ شادی شدہ ہیں، تو ہو سکتا ہے آپ کو معلوم نہ ہو کہ آپ کی بیوی آپ کی محبت ہے، اور آپ کو صرف یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ جب آپ اسے کھو دیں گے تو آپ کو کتنا دکھ پہنچے گا۔

ہجراں نہ ہونے دو محبت کو بعد میں سمجھنا!

یہ قلبی "محبت" کا شدید جذبہ ہے جو تعلق کے مرکز سے فرار اور آزادی کا سبب بنتا ہے اور الہیات کی اصل میں شامل ہوتا ہے۔ حسنِ کمال کی ملاقات اور علمِ کامل کے ادراک سے عشق تقویت پاتا ہے اور شعلہ بن جاتا ہے اور ہر بار اس کی کرنیں زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور احساس ہوتا ہے کہ اس کے ازلی حسن کے مظہر سے ابدی محبت ظاہر ہو گئی ہے۔ یہیں سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ عشق اور معشوق خدا اس بنا پر مولانا رومؒ محبت اور عقیدت کو ترقی کی بنیاد اور سعادت کا کیمیا مانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ چونکہ مچھلی پانی میں رہتی ہے اس لیے سچا عاشق محبت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کی زندگی کا خمیر محبت ہے اور اسے محبت سے مدد ملتی ہے اور اس کی روح کو طاقت ملتی ہے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طَبیبِ جُملہ عِلَّت ہائے ما

خوش رہ، ہمارے اچھے جنون والے عشق

اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب

ترجمہ: اے عشق ! جو ہماراشاندار جنوں ہے۔اے ہمارے تمام (روحانی اور اخلاقی) امراض کے معالج تو ہمیشہ خوش رہے۔
دراصل اوپر کے شعر کو اخلاق کی درستگی کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔اب یہاں عشق کو کہا جارہا ہے کہ تیرا بھلا ہو کہ تو تو ہمارا طبیب ہے۔دراصل طب میں سودا ایک مزاج ہے۔

مزاج کے بنیادی اجزاء

اور مزاج کے بنیادی چار اجزا ہیں۔1۔خون جس کا مزاج گرم تر ہے۔2۔بلغم جس کا مزاج سرد تر ہے۔3۔صفرا جس کا مزاج گرم خشک ہے۔4۔سودا جس کا مزاج سرد خشک ہے۔

تواس شعر میں عشق کو ایک سوداوی کیفیت کا نام دیا گیا ہے کہ یہ میرا سودا ہے۔

اس شعر میں سودا کا مطلب تجارت اور لین دین ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ط (توبہ)

ترجمہ: بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بدلے میں خرید لئے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو قتل کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔یہ اس کے ذمہ کرم پر سچا وعدہ ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوشیاں مناؤ جو سودا تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں راہِ خدا میں جان و مال خرچ کر کے جنت پانے والے ایمان داروں کی ایک مثال بیان کی گئی ہے جس سے کمال لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالَم عَزَّوَجَلَّ نے انہیں جنت عطا فرمانا اُن کے جان و مال کا عوض قرار دیا اور اپنے آپ کو

خریدار فرمایا یہ کمال عزت افزائی ہے کہ وہ ہمارا خریدار بنے اور ہم سے خریدے۔ کس چیز کو؟ وہ جو نہ ہماری بنائی ہوئی ہے اور نہ ہماری پیدا کی ہوئی۔ جان ہے تو اس کی پیدا کی ہوئی اور مال ہے تو اس کا عطا فرمایا ہوا۔

مجازی محبت ایک ٹیڑھا طریقہ ہے، لیکن یہاں مولانا رومؒ محبت الہٰی کا درس دیتے ہیں اور نیک تمنائیں دیتے ہیں، جو کہ ہمارے تمام اسباب کا علاج۔ مولانا رومؒ نے اپنے دیوان کبیر میں اس لین دین کو ایک ایسے شخص سے بیان کیا ہے جو اسے محبت پیش کرتا ہے اور اس کے بدلے میں چیزیں دیتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہر چیز دل سے کرتے ہیں۔

چاہے پروفیشنل لائف ہو یا احساس کی دنیا وہ رشتے نبھانے میں بعض اوقات خود کو بری طرح اگنور بھی کر دیتے ہیں

ایسے لوگ اپنی ساری صلاحیتیں خلوص اور وسائل اپنے سے وابستہ شخص پہ تن من سے وار دیتے ہیں۔

اپنی ضرورت صحت اشائش کا بلکل خیال نہیں رکھتے۔ان کے پاس جو بھی ہو دوسروں میں تقسیم کر کے خود خالی دامن رہ جاتے ہیں اور خود مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ سوداوی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے اندر ایک خواہش ہوتی ہے کہ کوئی تو ہو جو ان کا درد بن کہے سمجھے کم از کم ان کے خلوص کی قدر ہی کرے لیکن جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ دوہری جنگ کا شکار ہو جاتے ہیں

ایک طرف اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبورا اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں دوسری طرف جب کوئی ان کی قدر نہیں کرتا تو خود سے بھی اور اندر کہیں دل کے نہاں خانے میں ان سب اپنوں سے ناراض رہنے لگتے ہیں۔

اندر اور باہر ایک متضاد شخصیت کی جنگ شروع ہو جاتی ہے نہ فطرت ہار ماننے کو تیار ہے نہ چاہے جانے کی خواہش دم توڑتی ہے ۔بس یہ وہ سرد جنگ ہے جو دماغ کو اتنا تھکا دیتی ہے۔

کہ انسان کسی کام کے قابل نہیں رہتا رفتہ رفتہ ڈپریشن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اوپر سے وہی اپنے جن کی محبت میں اور جن کی ناقدری کی وجہ سے وہ انسان اس حالت کو پہنچا ہوتا ہے ان کی طرف سے ہی یہ طعنے ملنے لگتے ہیں تجھے جو ڈپریشن ہے یہ سب اللہ رب العزت سے دوری کا نتیجہ ہے

جلتی پہ تیل کا کام کرتا ہے مرض بڑھتا ہے تو ایسے مریض ایگزائٹی کا شکار ہو جاتے ہیں اکثر سینے کے بائیں پہلو میں درد کی لہریں اٹھنا شروع ہوتی ہیں جو بائیں بازوں کی طرف بڑھتی ہیں پھر کیا ہے مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہ دماغ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کرنے کی ادویات شروع کروا دیتے ہیں۔

جس سے مریض کو وقتی ریلیف ملتا ہے لیکن جیسے دوا کا اثر ختم ہوتا ہے۔

یہ سرکل پھر شروع ہو جاتا ہے دواؤں کی مقدار بڑھتی جاتی ہے ساتھ طعنوں تشنوں کی بھی اور آخر میں اتنا قیمتی انسان دماغی مریض بن کے معاشرے کا ناکارا فرد بن کے رہ جاتا ہے اور اس کے زمہ دار کون ہوتے ہیں؟اس کے وہ اپنے جن پر اس نے اپنا تن من دن سب بڑے خلوص سے لٹایا ہوتا ہے جو اس سے محبت کے سب سے بڑے دعوے دار ہوتے ہیں۔

خدارا جو لوگ آپ سے پر خلوص محبت کرتے ہیں ان کی قدر کریں جن سے آپ محبت کرتے ہیں ذرا ان سے چند لمحے نکال کر ان پہ بھی نچھاور کر کے دیکھیں جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں ایک ہی قدم پر وہ حالت پڑی ہے جو مولانا رومؒ نے شعر میں بیان کر دی اور خالق حقیقی نے اس کو خرید کیا۔ لیکن ایک طرف عام اور قدم پر خاص۔ گویا اگر یہ سب کچھ اللہ کی محبت اصلیہ میں ہوتا تو کمال ہوتا۔ اور اسی پر بھروسہ ہوتا۔ محبت کریں اللہ کے لئے۔ بس!!

اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا محبت ایک ایسا جذبہ ہے اللہ بھی چاہتا ہے اس کی محبت جو نعمتوں کی شکل میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اس محبت کی قدر کی جائے اور اس بات کا یقین کامل ہو کہ اللہ رب العزت ہم سے محبت کرتا ہے۔اسی کو ایمان کہتے ہیں آخر میں دعا ہے اللہ رب العزت کسی کو وہاں سے دکھ نہ دے جہاں اس نے اپنا سکھ لٹایا ہو۔

اللہ رب العزت ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین

اے دَوائے نَخُوَت و ناموسِ ما

اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

اے ہمارے تکبر اور جھوٹی غیرت کے علاج

اے ہمارے افلاطون اور جالینوس، تو سدا خوش رہے

دوائے نخوت: تکبر کی دوا۔۔۔ناموس ما: ہماری عزت (جھوٹی عزت)۔۔۔ افلاطون: مشہور یونانی حکیم۔۔۔ جالینوس: حکیم

ان اشعار میں شاعر نے محبت کی تعریف کی ہے اور محبت کو خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے کہا ہے: تیری موجودگی کی محبت سے ہمارے خیالات درست ہوتے ہیں اور ہماری بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ آپ کے ساتھ، غرور اور امنگوں کو پیچھے ہٹا دیا جاتا ہے.

زندگی میں آسائشوں، راحتوں کے ساتھ ساتھ آزمائشوں اور تکلیفوں کا بھی سامنا ہوتا ہے، اللہ پاک اپنے بندوں کو کبھی مرض سے تو کبھی مال کی کمی سے، کبھی کسی رشتہ دار کی موت سے تو کبھی دشمن کے ڈر سے، کبھی کسی نقصان سے تو کبھی آفات وبَلِیّات سے آزماتا ہے اور راہِ دین تو خصوصاًوہ راستہ ہے جس میں قدم قدم پر آزمائشیں آسکتی ہیں، انہی مصیبتوں اور آزمائشوں کے ذریعے فرماں بردار و نافرمان، محبت میں سچّے اور محبت کے زبانی دعوے کرنے والوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔

مثنوی میں الفاظ کا استعمال بہت درست ہے یہاں رومیؒ کہتے ہیں کہ ہمارے تمام نفسیاتی مسائل کا علاج محبت ہے۔ محبت افلاطون اور جالینوس کی طرح کام کرتی ہے!

(افلاطون فکر اور انسانی علوم جیسے منطق اور فلسفے کے بہترین استاد تھے جنہیں فلسفے کا باپ کہا جاتا ہے اور جالینوس کو طب کا باپ سمجھا جاتا ہے)۔

رومیؒ کہتے ہیں کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ محبت سے آپ کے منطقی اور استدلالی دونوں مسائل حل ہو جائیں گے اور آپ کا جسمانی درد ختم ہو جائے گا۔

محبت۔ نخوت و ناموس کی دوا

مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عشق وخوش سودا کو تمام بیماریوں کا طبیب اور اسی عشق کو اپنی نخوت و ناموس کی دوا اور اسی عشق کو اپنا افلاطون اور جالینوس فرما کر اس کی مدح فرمائی ہے۔ پہلے شعر کے ساتھ ان اشعار کو ملا کر پڑھیئے۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے کلام کا مفہوم آپ پر واضح ہو جائے گا کہ زورِ گندم عشق نہیں کیونکہ وہ انسانی خواہشات کو ابھارتا اور انسان کو بیشمار امراض قلبیہ میں مبتلا کر دیتا ہے عشق تو ان کے نزدیک ایک ایسا جوہر لطیف ہے کہ اگر وہ کسی کے وجود نفسانی کا جامہ چاک کر دے تو وہ حرص اور ہر

عیب سے پاک ہو جائے وہ فرماتے ہیں۔ عشق ہی ہماری تمام بیماریوں کا طبیب اور نخوت وناموس کی دوا ہے۔ اسی عشق نے جسد خاکی کو افلاک پر پہنچایا اور اسی عشق سے پہاڑ رقص میں آیا۔

محبت

اس ضمن میں بعض حضرات نے ایک لطیف میلان قلب کا نام محبت رکھا ہے گویا ان کے نزدیک محبت میں نفسانی خواہش، زورِ گندم اور حسن وشباب سے تعلق کا شائبہ ممکن ہی نہیں حالانکہ اہل عرب کے کلام اور محاورات میں محبت کا لفظ حسن وشباب کے تعلق، نفسانی خواہش اور زورِ گندم کے معنی میں بھی بکثرت مستعمل ہے۔ حدیث میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً بخاری شریف میں ہے: اِنَّهَا کَانَتْ لِیْ بِنْتُ عِمٍّ اَحْبَبْتُهَا کَاَشَدِّ مَا یُحِبُّ الرِّجَالُ النِّسَآءَ فَطَلَبْتُ مِنْهَا فَاَبَتْ۔

ترجمہ: غار میں پھنسے ہوئے تین آدمیوں میں سے ایک نے کہا میری چچا کی بیٹی تھی جس سے میں ایسی محبت کرتا تھا جیسی شدید ترین محبت مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے لہٰذا میں نے اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ (بخاری ج ا ص ۳۱۴)

الفاظ حدیث کی روشنی میں ان حضرات کے اپنے من گھڑت عشق کے معنی اور محبت میں کیا فرق رہا؟ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے اشعار میں تو عارفین کا عشق مذکور تھا جو راحۃ العاشقین کے الفاظ سے مراد ہے۔ اب اہل لغت کی طرف آیئے تمام اہل لغت نے لفظ عشق پر کلام کرتے ہوئے اسکے معنی "فرط محبت" کے لکھے ہیں۔

مختار الصحاح ص ۴۷۳ میں ہے۔ اَلْعِشْقُ فَرْطُ الْحُبِّ اسیطرح لسان العرب ج ۱۰ ص ۲۵، تاج العروس ج ۷ ص ۱۳ اور قاموس ج ۳ ص ۲۶۵ میں ہے۔

جس طرح محبت پاکیزہ بھی ہوتی ہے اور خبیث بھی۔ اسی طرح عشق بھی پاکیزگی اور خبث دونوں میں پایا جاتا ہے ملاحظہ ہو قاموس میں ہے اَلْعِشْقُ ۔۔۔۔ اِفْرَاطُ الْحُبِّ وَیَکُوْنُ فِیْ عَفَافٍ وَفِیْ دَعَارَةٍ (ص ۲۶۵ ج ۳) یعنی عشق کا معنی افراط محبت ہے جو پاک دامنی میں ہوتا ہے اور خبث میں بھی معلوم ہوا کہ عشق اور محبت میں شدت اور افراط کے سوا کوئی فرق نہیں۔

لفظ عشق کا ثبوت

قرآن میں نہ سہی مگر حدیث میں "عَشِقَ" کے الفاظ موجود ہیں۔ بروایت خطیب بغدادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: مَنۡ عَشِقَ فَعَفَّ ثُمَّ مَاتَ مَاتَ شَهِيۡدًا ۔

اگر کسی سے عشق ہوا پھر وہ پاک دامن رہتے ہوئے مر گیا تو وہ شہید ہے۔

اس کے علاوہ دوسری حدیث بھی بروایت خطیب حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: مَنۡ عَشِقَ فَكَتَمَ وَعَفَّ فَمَاتَ فَهُوَ شَهِيۡدٌ ۔

ترجمہ: جس کو کسی سے عشق ہوا پھر اس نے چھپایا اور پاک دامن رہتے ہوئے مر گیا تو وہ شہید ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۷۵ طبع مصر)

اگرچہ ان دونوں حدیثوں میں ضعف کا قول کیا گیا ہے لیکن اس حدیث کو امام سخاوی رحمتہ اللہ علیہ نے مقاصد حسنہ میں اسانید متعددہ سے وارد کیا بعض میں کلام کیا اور بعض کو برقرار رکھا جن اسانید کو برقرار رکھا وہ ضعیف نہیں چنانچہ امام سخاوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث کی اسانید میں سے ایک سند کے متعلق فرمایا وَهُوَ سَنَدٌ صَحِيۡحٌ (مقاصدِ حسنہ ص ۴۲۰)

امام سخاوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام خرائطی رحمتہ اللہ علیہ اور دیلمی رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ بعض محدثین علیہم الرّحمہ کے نزدیک اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: مَنۡ عَشِقَ فَعَفَّ فَكَتَمَ فَصَبَرَ فَهُوَ شَهِيۡدٌ۔

ترجمہ: جس کو کسی سے عشق ہو گیا پھر وہ پاک دامن رہا اور اسے چھپایا اور صبر کیا تو وہ شہید ہے۔

اور امام بیہقی نے اسے طرقِ متعددہ سے روایت کیا (مقاصدِ حسنہ ص ۴۱۹، ۴۲۰ طبع مصر)

اہل علم جانتے ہیں کہ طرقِ متعددہ سے سند ضعیف کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ لفظ عشق حدیث میں وارد ہے۔ قرآن و حدیث میں اس سے مکمل احتراز کا جو دعوی کیا گیا ہے صحیح نہیں۔ حافظ کے مطابق

عشق می خوانم و می گریم زار

طفلِ نادانم و اول سبق است

عشق کا سبق لیتا ہوں اور زار زار رو رہا ہوں جیسے نادان بچے کا پہلا سبق ہوتا ہے

ناخدا در کشتیٔ ما گر نباشد گو مباش

ما خدا داریم، ما را ناخدا در کار نیست

اگر ہماری کشتی میں ناخدا نہیں ہے تو کوئی ڈر اور فکر نہیں کہ ہم خدا رکھتے ہیں اور ہمیں ناخدا در کار نہیں۔

حافظ !از بادِ خزاں در چمنِ دہر مرنج

فکرِ معقول بفرما، گلِ بے خار کجاست

حافظ !زمانے کے چمن میں خزاں کی ہوا سے رنج نہ کر، صحیح بات سوچ، بغیر کانٹے کے پھول کہاں ہے؟

تو اے پروانہ، ایں گرمی ز شمعِ محفلے داری

چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

اے پروانے تُو نے یہ گرمی محفل کی شمع سے حاصل کی ہے، میری طرح اپنی ہی آگ میں جل (کر دیکھ) اگر دل کا سوز رکھتا ہے۔

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

آہ گر من باز بینم روے یارِ خویش را

میں قیامت تک خدا کا شکر ادا کرتا

اگر میں اپنے محبوب کے چہرہ کا دیدار کر سکتا

جسمِ خاک از عِشقُ بَر اَفلاک شُد

کُوہ دَر رَقص آمد و چالاک شُد

خاک: مٹی۔۔رقص: ناچنا۔۔۔کوہ: پہاڑ۔۔افلاک: آسمان

ترجمہ:

خاکی جسم عشق کی وجہ سے آسمانوں پر پہنچا

پہاڑ، ناچنے لگااور ہوشار ہو گیا

زمین کے جسم سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک ہے اور آسمان سے مراد معراج ہے۔ پہاڑ کے رقص سے مراد موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی ہے جنہوں نے اللہ رب العزت سے ملاقات کی درخواست کی، جیسا کہ وہ اگلے شعر میں اس مسئلے کو واضح کرتے ہیں۔

عشق کی دنیا میں ہر چیز عاشق ہے اور عاشق ایک پردہ ہے جو محبوب کو دیکھنے سے روکتا ہے۔ اگر مادی زندگی کا یہ پردہ ہٹا دیا جائے تو رازوں کی دنیا نظر آئے گی اور جو زندہ ہے وہی ہے۔ بقول حافظ:

« توخود، حجاب خودی حافظ از میان برخیز»

"حجاب اتارو خود ہی حافظ ہے"

اس شعر میں ایک تلمیح بیان کی گئی ہے۔ اور وہ اس واقعہ کی طرف نشاندہی کرتی ہے: ارشاد فرمایا:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا (۷۲)

"بیشک ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش فرمائی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا بیشک وہ زیادتی کرنے والا، بڑا نادان ہے"۔

جب اللہ پاک نے ارادے کی امانت تمام زمینوں اور آسمانوں کو پیش کی اور پہاڑوں کو تحمیل امانت کی دعوت دی کہ میں تمہیں اپنی اطاعت اور نافرمانی دونوں کا اختیار دونگا، خلاف ورزی پہ فوری طور پہ کوئی سزا نہیں،، اطاعت پہ فوری طور پہ کوئی انعام نہیں ،، مگر پھر ایک دن تمہیں میرے حضور پیش ہونا ہو گا، اور سب حساب دینا ہو گا،، مطیع کو انعام ملے گا اور نافرمان سزا پائے گا، تین دن کے وقت کے باوجود تمام نے انکار کر دیا کہ ہم بس مطیع ہی اچھے ہیں ہمیں نافرمانی کا اختیار بھی نہیں چاہیئے اور اطاعت کا انعام بھی نہیں چاہیئے ! انہوں نے جان لیا کہ اختیار کے بعد کما حقہ اللہ کی اطاعت ممکن ہی نہیں اور ہم مارے جائیں گے !

اور بھولے منش انسان نے اسے اٹھا لیا ! ! !

آسمانوں پہ فرشتے تھے جو نورانی شفاف وجود تھا،، جنّات عبادت سے قرب تو پا سکتے تھے مگر مٹی کے بغیر تجلی کو روشنی میں کوئی چیز تبدیل نہیں کرتی ،

روشنی اصلاً ریفلیکشن ہے اور ٹرانسپیرنٹ وجود روشنی کو پلٹا کر ریفلکٹ نہیں کرتا،، سورج کی روشنی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سفر کرتی ہے اور اس کے گرد اندھیرے ہی لپٹے ہوتے ہیں، کسی کو احساس نہ ہو کہ اس کے پاس سے کتنی طاقتور روشنی گزر رہی ہے تا آنکہ وہ روشنی کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا کر منہ پیچھے کی طرف پھیرے اور ہر چیز کو چکا چوند کر دے، وہ جاتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ آتی ہوئی نظر آتی ہے، قلبِ انسانی اللہ پاک کی نورانی تجلئ ذات کو منعکس کر سکتا ہے، مخلوق میں اور کسی میں یہ صلاحیت نہیں ہے ،، انی اعلم ما لا تعلمون،، تم نیک ہو سکتے ہو، معصوم اور پرہیزگار ہو سکتے ہو، مگر جو انسان ہو سکتا ہے وہ تم نہیں ہو سکتے، یہی دھوکہ اس کو بھی ہوا جس نے انسان کو مٹی کا پتلا سمجھا اور اپنے آگ ہونے پہ مغرور ہوا،،

سمو لینا کسی کو دل میں، دل ہی کا کلیجہ ہے !

پہاڑوں کو تو بس آتا ہے جل کر طور ہو جانا !

فرشتوں کی نظر اپنی ذات پہ رہی، انکار کر دیا،،

انسان کی نظر اپنی طرف گئی ہی نہیں، اس لئے اپنی کمزوری سے بے خبر رہا، اس کی نظر تو بس اللہ پہ تھی،، ایک اعتماد تھا کہ مجھ پر میری استطاعت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالے گا،، اس اعتبار و اعتماد پہ اس نے حامی بھر لی،، گویا اللہ کی محبت اور عدل پر اعتماد کیا،،

جب والد اپنے بچے کو کہتا ہے کہ فلاں تھیلا اٹھا کر لاؤ، تو بیٹا اسی اعتماد پہ اٹھ کر چل دیتا ہے کہ میرے اٹھائے جانے کے قابل ہے تبھی تو مجھے کہا جا رہا ہے، ورنہ کیا میرا باپ جانتا نہیں کہ میں 50 کلو نہیں اٹھانے کے قابل نہیں !

There would be no meaning in an ought if it were not accompanied By a can

یہ ہے وہ خاص تعلق اللہ پاک کو اس حضرتِ انسان سے ،،

ہر ایک نے انسان کی طرف دیکھا، کبھی یہ نہ دیکھا کہ جو اس کو اتنے پیار سے بنا رھا ہے، وہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟، اس کی رحمت اس کی بلائیں نہیں لے گی،، **هو معكم اينما كنتم** ،، وہ تو جہاں یہ ہوتے ہیں وہاں ہوتا ہے،، **فأينما تولوا فثمه وجه الله**،، تم جدھر منہ پھیر لیتے ہو،،، اللہ کا چہرہ بھی ادھر ہی ہوتا ہے!!

بس!!!!!!!!!!!!

ہاں یہ محبت ہی ہے جو زمینی جسم کو زمین کی تہہ سے لے کر آسمانوں تک لے جاتی ہے اور یہ محبت ہی تھی جس نے پہاڑ کو اپنی خاموشی اور عظمت سے رقص کرایا اور اس کی حرکت میں چست کر دیا۔ وہ جذبہ جس نے پہاڑ کو زندگی بخشی تھی وہ محبت تھی، محبت کے اثر سے ہی بد صورت پہاڑ مدہوش ہونے لگا اور موسیٰ علیہ السلام محبت کی عظمت و جلال کے زیر اثر زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ عام طور پر پہاڑ استحکام کی علامت ہے۔

رومیؒ کا کہنا ہے کہ یہ پہاڑ جو ساکن ہے اور حرکت نہیں کرتا، چست ہو سکتا ہے اور محبت سے ناچ سکتا ہے۔

آپ کے دل کے لیے یہی کافی ہے کہ محبت ہو جائے اور اس میں محبت کا مضبوط اور گہرا احساس پیدا ہو جائے تو آپ کے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے اور آپ خود غرضی سے بچ جائیں گے۔

عشق کی کرشمہ سازی

عشق کی بدولت (آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وآلِہٖ وَسَلَّمَ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا) خاکی جسم آسمان پر چلا گیا (عشق کی خوشی سے) کوہِ طُور (بھی) ناچنے لگا اور مستعد ہو گیا.

یہ عشق ہی کی طاقت ہے کہ خاکی جسم کو عالمِ بالا پر پہنچادے. جہاں اجسام کا گزر نہیں ہو سکتا اور یہ عشق ہی کا کرشمہ ہے جو پہاڑ جیسی بے حِس چیز کو حرکت میں لے آئے. اور کوہِ طُور تجلّی کو قبول کرنے کے لیے مستعد تو ہو گیا مگر اِس میں تجلّی کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی. اِس لئے آخر پارہ پارہ ہو گیا. یہ طاقت اور یہ سمائی حضرتِ انسان کے دل ہی کو حاصل ہے.

عِشقُ جانِ طُور آمد عَاشِقَا

طُورُ مَست وخَرَّ مُوسیٰ صاعِقَا

اے عاشق ! عشق طور کی جان بنا

طور مست بنااور موسی بیہوش ہو کر گرے

عاشقا: شدید محبت کرنے والا یہاں الف ندا کے لئے ہے۔۔۔۔خَرَّ: گرپڑنا

صَعق: بے ہوش ہونا۔۔۔مست: مدہوش

اے عاشق ! وہ جذبہ جس نے پہاڑ کو زندگی بخشی تھی وہ محبت تھی۔ محبت کی برکت سے پہاڑ مست ہو گیااور موسیٰ علیہ السلام اپنی عظمت وشان کے باعث مدہوش ہو کر زمین پر گرپڑے۔

مندرجہ بالاآیات میں محبت کی عظمت اور کیفیت صدمہ کااظہار کیا گیاہے۔رومیؒ کہتے ہیں کہ اس منصب کے لیے ضروری تھاکہ میں محبت کے رازوں کو تفصیل سے بیان کروں۔ لیکن چونکہ محبت ذائقہ اور توکل سے بھری ہوئی ہے اوراس کے راز کو حاصل کیے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتااور دوسری طرف یہ بعض اوقات عقل سے بالاتر ہوتاہے اور غلط فہمی اور الحاد کااندیشہ ہوتاہے اس لیے میں اس کے اظہار سے معذرت کرتاہوں۔

اے عاشق ! وہ جذبہ جس نے پہاڑوں کو زندگی بخشی تھی وہ محبت تھی۔ محبت کی برکت سے پہاڑ مست ہو گیااور موسیٰ علیہ السلام اپنی عظمت وشان سے بے ہوش ہوگئے۔

یہ شعر ایک آیت کی طرف اشارہ پر مبنی اور مولانا رُوم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ کے اس شعر کا مآخذ قرآن سے ہے۔

قَالَ لَنۡ تَرٰىنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ‌-فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا‌ ۚ-

(سورۃالاعراف:143)

ترجمہ :اس (موسٰی) نے عرض کی: اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا تا کہ میں تیرا دیدار کرلوں۔ (اللہ نے) فرمایا: تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا، البتہ اس پہاڑ کی طرف دیکھ، یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا تو اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گئے۔

مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں کہ وہاں [طور] پہ اللہ ﷻ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی، دونوں کا عشق تھا تو وہاں بھی موضوع عشق بنا کہ پہاڑ پر تجلی فرمائی اور پورا پہاڑ جل کر سُرمہ بن گیا۔ طور مست ہوا کیونکہ تجلی پڑی اور حضرت سیدنا موسٰی علیہ السلام بھی تجلی کی وجہ سے مست ہوئے اور مستی میں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ تو مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرمانا چاہتے ہیں کہ چاہے حضرت سیدنا موسٰی علیہ السلام ہوں چاہے طور ہو، چاہے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوں یا چاہے تمام انبیاء عَلَیہِمُ السّلام ہوں سب کا تعلق عشق سے ہے۔

اس ضمن میں احمد رضا خان رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں:

تَبَارَکَ اللہ شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی

کہیں تو وہ جوشِ لَن تَرانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

یااللہ تو عظمت و برکت والا ہے، بے نیازی اور صمدیت تیری ہی شان ہے تو جس پر چاہے انعام واکرام کی بارشیں فرمادے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام طالبِ دیدار ہوئے تو ان کو فرمایا "لَن تَرانِی" (اے موسٰی)! تو مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ اور اپنے محبوب ﷺ کو بغیر طلب معراج کی سعادت عطا فرما رہا ہے۔

اب بزرگانِ دین کا تقاضہ عشقِ الٰہی ﷻ کا واضح کر دوں:

لَنْ تَرٰینِیْ گر رَسد گردن متاب

رَبِّ اَرِنِیْ گو تو باری شو شتاب

اگر تجھے (تُو نہیں دیکھ سکتا) کا جواب بھی ملے تو مقصد (طلب) سے مُنہ نہ موڑ،

(موسی کی طرح) ربّ مُجھے اپنا دِیدار عطا کر کہہ اور تُو (اس مقصد طلبِ دیدار میں) تیز عمل کر۔

سلطان العارفین، حضرت سلطان باھُو رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ

کھُلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی

*گیا دَورِ حدیثِ 'لن ترانی'

یہ شعر پہاڑ پر جناب موسیٰؑ کی کہانی کی طرف واپس جاتی ہے جب وہ خدائے بزرگ و برتر سے کہتا ہے کہ وہ مجھے دکھائے۔ خدا کہتا ہے، "تم مجھے دیکھنے کی کیفیت برداشت نہیں کر سکتے، اور آسمانی روشنی کا ایک ذرہ بجلی کی طرح پہاڑ سے ٹکرانے کے لیے کافی ہے، تاکہ وہ بکھر جائے۔"

کچھ لوگ جو محبت کے جال میں پھنس کر دکھی اور پریشان ہو گئے ہیں انہیں لگتا ہے کہ ان کی زندگی برباد ہو گئی ہے میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ اس محبت کے رشتے کی نوعیت جناب الوہیت کی طرف سے تھی اور آپ نے کچھ بھی نہیں کھویا۔ . کچھ اسباق کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور محبت کی قیمت جلتی ہے۔ کیونکہ آپ اس رشتے میں سب سے اہم بات چیت کا انداز سیکھتے ہیں اور آپ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا کیا مطلب ہے...

آپ کی عام حالت میں، آپ کے لیے خدا کو جاننا ناممکن ہے۔

ایک عام شخص جس نے صرف سنت کی عبادت کی اور محبت میں مبتلا نہ ہوا وہ خدا کو نہیں جان سکتا۔ وہ شخص جس نے ایک رات بھی محبت کی راہ پر چل کر نہ گذاری ہو اور اس کا سینہ جل نہ گیا وہ محبت الٰہی کی نوعیت کو کیا سمجھ سکتا ہے؟۔ جناب رومیؒ جانتے ہیں۔ زمین پر خدا کا ظہور صرف محبت کے ذریعے ہوتا ہے۔

اور لوگ چونکہ روح الٰہی سے ہیں اور وہ آنکھوں اور بھنویں سے محبت نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی روح سے محبت کرتے ہیں، اگر کسی کو شدید محبت اور پیار نہ ہو تو وہ عبادت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک لمحے کے لیے محبت، عبادت کا دروازہ ساری زندگی کے لئے کھول دیتی ہے۔

سِرِّ پنہاں ست اندر زِیر و بَم

فَاش اگر گُویم جَہاں بَر ہم زَنَم

زیر و بم میں راز چھپا ہوا ہے

صاف صاف بیان کر دوں تو دنیا کو درہم برہم کر دوں

نوٹ : یہ شعر صرف برصغیر کی مثنوی میں ہے۔

سرّ: راز۔۔۔پنہاں: پوشیدہ۔۔۔زیر: باریک آواز۔۔۔بم: موٹی آواز۔۔فاش: ظاہر۔۔۔۔بر ہم زدن: توڑ پھوڑ

ترجمہ:

ہماری نیچی اونچی سُروں میں ایک سربستہ راز (مُضمر) ہے. اگر میں اس کو صاف صاف بیان کر دوں تو (گویا) جہان کو تہ وبالا کر ڈالوں.

نَے کی زبانی مولاناؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے مُجمّل اَقوال میں وَحدَت الوجود کا راز مُضمر ہے. جس کو میں ہم کنایۃً اور اشارۃً ہی کہنے پر مجبور ہیں. اور اس مسَلہ کا مقصد یہ ہے کہ ماسوی اللّٰہ کا وجود کالعدم ہے. مگر چُونکہ یہ بات عوام کے فہم وادراک سے بَر تَر ہے. اور یہ لوگ اس مسئلے کا مطلب یہی سمجھیں گے کہ جب ماسوی اللّٰہ کُچھ نہیں ہے تَو فرض وواجب اور حلال وحرام اور امر و نہی بھی کچھ نہیں. پَس یہ لوگ احکامِ شریعت کو بے حقیقت سمجھنے لگیں گے. جو نظامِ عالم کے بگڑ جانے کا مترادف ہے. اِس لئے اس مسئلے کو صاف طور پر نہیں کہا جا سکتا.

علاوہ ازیں اسرارِ عشق کا اظہار اہلِ ظواہر کی تکفیر و تشنیع کا باعث بھی ہوتا ہے.

ہماری اُونچی نیچی سُروں میں ایک سربستہ راز چھپا ہے

اگر اسے میں صاف صاف بیان کر دوں تو (گویا) دنیا کو تباہ برباد کر دوں

اے درد کس سے کہوں بتا رازِ محبت

عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی

ایک دفعہ ایک مفتی صاحب میرے پاس آئے تو ان سے میں نے پوچھا کہ منصور الحاج رحمتہ اللہ علیہ نے جو نعرہ بلند کیا انا الحق اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو، مفتی صاحب کہتے ہیں کافر کا فتویٰ لگا تھا ان پر، اسی لئے سولی چڑھا دیا، تو میں نے مفتی صاحب سے پوچھا کے مفتی صاحب اللہ کہاں ہے تو کہتے ہیں ہر جگہ موجود ہے تو میں نے کہا پھر تو دل میں بھی ہے۔ کہتے ہیں بیشک میں نے کہا تو ہمارے اندر سے کون بول رہا ہے، کچھ پتہ کونسی طاقت اس مٹی کے پتلے سے بول رہی ہے، تو کہتے ہیں رب ہی بول رہا ہے: تو میں نے کہا پھر منصور الحاج کے اندر سے بھی رب ہی بولا کے انا الحق جیسے کلام پاک میں ارشاد ہوا

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (۵۲)

اور ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے پکارا اور ہم نے اسے اپنا راز کہنے کیلئے مقرب بنایا۔

{وَ نَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ: اور ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے پکارا۔} طور ایک پہاڑ کا نام ہے جو مصر اور مَدْیَن کے درمیان ہے۔ حضرت موسیٰ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو مدین سے آتے ہوئے طور کی اس جانب سے جو حضرت موسیٰ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے دائیں طرف تھی ایک درخت سے ندا دی گئی

"یٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" (قصص: ۳۰)

اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں، تمام جہانوں کا پالنے والا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے بلاواسطہ کلام فرمایا اور آپ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کلیمُ اللہ کے شرف سے نوازے گئے۔ آپ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو مرتبۂ قرب عطا فرمایا گیا، حجاب اٹھا دیئے گئے یہاں تک کہ آپ نے قلموں کے چلنے کی آواز سنی اور آپ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی قدر و منزلت بلند کی گئی۔ (خازن، مریم، تحت الآیۃ: ۵۲، ۳/۲۳۸-۲۳۷)

تو موسیٰ علیہ السلام کو درخت سے آواز آئی کے اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں تو موسی علیہ السلام نے فرمایا بیشک تو میرا رب ہے جب ایک خشک درخت سے رب بول سکتا ہے تو انسان کے اندر سے کیوں نہیں؟ تو یہ عشق و محبت کی باتیں عام انسان نہیں سمجھ سکتے۔

اسی لئے مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کے

سرِ پنہان ست اندر زیر و بم

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

ترجمہ:

ہماری اُونچی نیچی سُروں میں ایک سربستہ راز چھپا ہے

اگر اسے میں صاف صاف بیان کر دوں تو (گویا) دنیا کو تباہ برباد کر دوں

حضرت ابو بکر رضی للہ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ان سے سوال کیا:-

"کیا اِسلام قبول کرنے سے پہلے آپ نے

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نبوت کی نِشانیوں میں سے کوئی نِشانی بھی دیکھی تھی؟"

حضرت ابو بکر رضی للہ عنہٗ نے جواب دیا:-

"ہاں جاہلیت کے زمانہ میں ایک دِن میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہُوا تھا کہ اچانک اس کی شاخیں مجھ پر جُھکنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک شاخ جُھک کر بالکل میرے سر تک آگئی۔ میں سر اُٹھا کر اس کی طرف (حیرانی سے) دیکھنے اور کہنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسی وقت مجھے درخت میں سے آواز آئی یہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فلاں فلاں وقت میں ظاہر ہوں گے اس لیے تم ان کی طرف بڑھنے میں سب سے زیادہ خوش نصیب بننے کی کوشش کرنا۔"

میں نے اس سے کہا:-

"مجھے واضح کر کے بتاؤ کہ وہ نبی کون ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

اس نے کہا:-

"مُحَمَّد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بِن عبد للہ بِن عبد المطلب بِن ہاشم۔"

میں نے کہا:-

"وہ میرے دوست اور میرے حبیب ہیں۔"

میں نے اس درخت سے عہد لیا کہ جس وقت وہ مبعوث ہو جائیں تو مجھے خوشخبری دے دینا۔ جب اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی للہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو گئے تو اس درخت میں سے آواز آئی کہ:-

"اے ابو قحافہ کے بیٹے! وہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم. مبعوث ہو گیا ہے اب کوشش کرو اور قسم ہے ربّ موسیٰ کی! اِسلام میں کوئی تم پر سبقت نہ کرے گا۔"

جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس پہنچا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مجھے دیکھ کر اِرشاد فرمایا:-

"اے ابو بکرؓ! میں تمہیں للہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بُلاتا ہوں۔"

میں نے کہا:-

"میں گواہی دیتاہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ نے آپ کو حق دے کر روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے، میں آپ ﷺ پر ایمان لایا۔"

(سِیرتِ حلبیہ اُردو، جِلد اوّل نصف اوّل، صفحہ:۶۵۱،۶۵۰)

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، جِلد:۳، صفحہ:۳۱)

آنچہ نَے می گوید اندر ایں دو باب
گَر بگویَم مَن جَہاں گَردَد خراب

آنچہ: کون سا، کس کا۔۔ می گویَد: کہتا ہے۔ گر بگوئم: مجھے کہنے دو

باب: دروازہ۔۔دو باب سے مراد زیر و بم

ترجمہ: ان دونوں معاملوں میں بانسری جو کچھ کہتی ہے

اگر میں بیان کر دوں دنیا تباہ ہو جائے

یہ شعر بھی صرف بر صغیر والی مثنوی میں ہے

اس شعر میں بھی مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ اس راز کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں جو بانسری ان دو معاملوں کے اندر بیان کر رہی ہے۔ مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں کہ بانسری جس سے کٹی (جدا ہُوئی) اسی کا گیت گا رہی ہے یعنی نَے اس علام نیستان کی بات کر رہی ہے۔اسی کا حصہ ہے دونوں کی اصل ایک ہے انسان بھی اپنی اصل سے جدا ہو کر اسی کا ذکر کر رہا ہے تو دراصل انسان میں اسی کی نورانیت جاری و ساری ہے اس راز پہ مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ روشنی ڈال رہے ہیں کہ بانسری ان دونوں معاملوں میں جو کچھ کہتی ہے بیان کر دوں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔ (یعنی عوام الناس کم عقلی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ بدگمان ہو جائے) کیونکہ کم فہم و ادراک کے مالک، مادیت پرست لوگ ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

جیسا کہ مُرید رومی اسی بات کی یُوں ترجمانی فرماتے ہیں:

پھُول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(بالِ جبریل)

پھول کی پتی سے ہیرے کو کاٹنے کی ناممکن کوشش ممکن ہے، لیکن کسی نادان کو اشارے کنائے سے بُلند نُکات سمجھانا ممکن نہیں۔

مریدِ رُومیؒ حضرت اقبال رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں اگرچہ میری شاعری کلامِ نرم و نازک پر مشتمل ہے "لیکن بے سمجھ" لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

پھر مولانا روم رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں کہ ایک ظاہری نظامِ شریعت چل رہا ہے یہ بود و باش یہ نظامِ زندگی سے اگر ان کہ حقیقت بیان کر دوں تو اِک ہلچل (خرابی) مچ جائے گی، اِک (بدگمانی) کم فہمی کی خلل پڑ جائے گی۔ سارا نظام درہم برہم (خراب) ہو جائے گا۔

ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ(۱۶)

اور بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم دل کی رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

{ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ : **اور بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا۔** } اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا حال بیان کیا گیا ہے چنانچہ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور یہ اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کی ایک اعلیٰ دلیل ہے اور ہم اس وَسْوَسے تک کو بھی جانتے ہیں جو اس کا نفس ڈالتا ہے اور اس کے پوشیدہ اَحوال اور دلوں کے راز ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں اور ہم اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے انسان کے دل کی رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور بندے کے حال کو خود اس سے زیادہ جاننے والے ہیں ۔

علامہ علی بن محمد خازن رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں : وَرِید وہ رگ ہے جس سے خون جاری ہو کر بدن کے ہر جُزْوْ میں پہنچتا ہے، یہ رگ گردن میں ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے اَجزاء ایک دوسرے سے پردے میں ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پردے میں نہیں۔(تفسیر خازن، ق، تحت الآیۃ: ۱۶، ۴ / ۱۷۶)

نکہت طرۂ مشکیں جو صبا لائی ہے

کوئی آوارہ ہوا ہے کوئی سودائی ہے

بے خودی سے ہے یہاں بے خبری کا عالم

خود نمائی کو وہاں شغل خود آرائی ہے

اپنی ہی جلوہ گری ہے یہ کوئی اور نہیں

غور سے دیکھ اگر آنکھ میں بینائی ہے

ہے مجھے کشمکش سعی و طلب سے نفرت

دل مرا ترک تمنا کا تمنائی ہے

جز دل پاک نہ پایا حرم خاص کہیں

دیر و کعبہ میں عبث ناصیہ فرسائی ہے

ناز کی جلوہ گری کے لئے منظر ہے نیاز

ناتوانی مری ہم رنگ توانائی ہے

جب طبیعت ہی نہ حاضر ہو تو بے سود ہے فکر

شعر گوئی تو کہاں قافیہ پیمائی ہے

منہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائیں ابھی

بات جو پیر خرابات نے سمجھائی ہے

خود منادی و منادیٰ ہوں نہ غیبت نہ حضور

عالم غیب سے یوں دل میں ندا آئی ہے

دل یہ کہتا ہے کہ حاصل کی ہے تحصیل عبث

نہ تمنا کوئی شے ہے نہ تمنائی ہے

(مولانا اسماعیل)

ایرانی طرز

بالبِ دَمسازِ خود گر جُفتَمی

هَمچونِی من گُفتنی ها گُفتَمی

بر صغیر طرز

بالبِ دَمساز خود گر جُفتَمے

هَمچُو نَے مَن گُفتنی ها گُفتَمے

لب: ہونٹ۔۔۔ جفتمے: ملا ہوا۔۔۔ ہمچو: اسی طرح۔ کی طرح۔۔ گفت: کہتا۔ بیان کرتا

اگر میں اپنے یار کے ہونٹ سے ملا ہوا ہوتا

بانسری کی طرح کہنے کی باتیں کہتا

لب، دمساز اور نَے میں صنعت مراۃالنظیر ہے۔

فارسی لکھنے والے خوبصورت الفاظ سے کھیلتے ہیں۔

سانس وہ ہوا ہے جو منہ سے نکلتی ہے، اور ساز ہوا کا آلہ ہے جس میں ہوا چلائی جاتی ہے۔

دمساز کا مطلب ایک سرکنڈے کے آلے میں پھونک مارنے والا

اسرار عشق

اسرار عشق چونکہ عوام کی سمجھ سے بالا ہیں اس لئے ان لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے عوام کے غلط فہمی اور غلط خیالات پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی لئے مولانا رومؒ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش ہم کو کسی ہم خیال اور صاحب فراست سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

رومیؒ کا کہنا ہے کہ اگر ایک بانسری بجانے والے کے ہونٹ، یعنی جو آلہ بجانا چاہتا ہے، اس کا تعلق میرے ساتھ جوڑ دیا جائے تو میں سچائی کا اظہار کر سکتا ہوں۔

بانسری بجانے والے کے ہونٹ سرکنڈے کو چھوتے ہیں تو ایک آواز سنائی دیتی ہے... جناب رومیؒ کہتے ہیں، "میرے پاس اپنے بارے میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے، اور یہ سرکنڈہ ہے جو سرکنڈے کی زبان سے بولتا ہے۔

جناب مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اگر میں سماع کی حالت میں کوئی بات کہوں تو وہ میری طرف سے نہیں، الفاظ کہیں اور سے آتے ہیں۔

سماع صوفی رقص کی ایک شکل ہے جس میں انسان اپنا کنٹرول کھو بیٹھتا ہے اور گویا کوئی اور قوت اسے رقص پر لے جاتی ہے۔ اور اگر آپ کا صوفی اور رومانوی رقص، الہی کلام میں بدل جائے تو آپ میں سے ہر ایک میں سے ایک مثنوی نکلے گی!

اہم بات یہ ہے کہ جب بھی آپ کو لگتا ہے کہ آپ خود کچھ کر رہے ہیں، آپ نے کام کو برباد کر دیا ہے۔ رومیؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ میں خود کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ تنکا ہے جو بولتا ہے۔

جب بھی آپ نے اعلیٰ شعور کے ساتھ کوئی بات کہی ہے تو براہ کرم اس لفظ کو اپنی طرف منسوب نہ کریں تاکہ آگاہی برقرار رہے، کیونکہ اگر آپ اسے اپنے آپ سے منسوب کریں گے تو آپ اپنی انا کو موٹا تازہ کریں گے اور اگر آپ دکھاوے میں پھنس گئے تو دماغی کھیل۔ شروع ہو جائے گا اور آخر میں، یہ فضول اور بکواس اور کم درجے کے خیالات پر ختم ہوتا ہے۔

پوری تاریخ میں بہت سے لوگوں نے رومیؒ کا راستہ اختیار کیا لیکن وہ رومیؒ کے اختتام تک نہ ٹھہر سکے اور کچے راستے سے ٹکرا گئے۔

یہ رومیؒ ہی تھے جنہوں نے آخر میں جا کر کہا کہ میرے پاس اپنے الفاظ نہیں ہیں اور تمام الفاظ الٰہی ہیں۔

مثنوی کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے ماضی کے لوگوں کا علم کافی نہیں تھا اور اب آپ اس کتاب کے علم کو کوانٹم علم اور کمپیوٹر لٹریسی سے بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہر کہ اواز ہم زبانے شد جدا

بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

حدیث مبارکہ میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللهَ عزوجل قَالَ: إِذَا تَلَقَّانِي عَبْدِي بِشِبْرٍ، تَلَقَّيْتُهُ بِذِرَاعٍ. وَإِذَا تَلَقَّانِي بِذِرَاعٍ، تَلَقَّيْتُهُ بِبَاعٍ، وَإِذَا تَلَقَّانِي بِبَاعٍ، جِئْتُهُ أَتَيْتُهُ بِأَسْرَعَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

3: أخرجه مسلم فی الصحيح، كتاب: الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب: الحث على ذكر الله تعالى، 4/ 2061، الرقم: 2675، وأحمد بن حنبل في المسند، 2/ 316، الرقم: 8178، وأيضاً، 3/ 283، الرقم: 14045.

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میرا بندہ ایک بالشت میری طرف بڑھتا ہے، میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف دو ہاتھ بڑھتا ہے تو میں تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہوں (یعنی بکثرت اس پر اپنی رحمت اور مدد و نصرت فرماتا ہوں)۔“ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

مام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے حدیث میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں اپنے بندے سے اس کے گمان کے مطابق برتاؤ کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل

میں یاد کرتا ہوں۔ اور جب وہ مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آجاتا ہوں

صحیح بخاری التوحید:7405

اللہ جل شانہ کی دو صفات

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی کئی ایک صفات پر مشتمل ہے اور اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں۔ ثبوتیہ اور سلبیہ۔

صفات ثبوتیہ: سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنے لیے ثابت کی ہیں جیسے علم اور قدرت وغیرہ۔

صفات سلبیہ: سے مراد وہ صفات ہیں۔ جن کی اللہ تعالیٰ نے خود یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان کی نفی کی ہے جیسے نیند اور تھکاوٹ وغیرہ۔ پھر صفات ثبوتیہ کی دو اقسام ہیں۔

ذاتیہ اور فعلیہ۔ ذاتیہ سے مراد وہ صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ متصف رہتا ہے جیسے صفت علو اور صفت عظمت وغیرہ۔

فعلیہ سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وابستہ ہیں۔ اگر چاہے تو انہیں کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے جیسا کہ استواء علی العرش اور نزول الی سماء الدینا۔

آخری قسم کی صفات کو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے شایان شان ثابت کیا جائے۔ اس میں تمثیل یا تکییف کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث مذکور میں جو صفات ہیں وہ ثبوتیہ فعلیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق ہیں۔ شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین اس قسم کی نصوص کو ان کے حقیقی اور ظاہری معنی پر ہی محمول کرتے ہیں اور ان صفات کو اللہ رب العزت کے شایان شان ثابت کرتے ہیں ان کے لیے کوئی تمثیل یا کیفیت کو متعین نہیں کرتے، اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے قریب ہونے کو بیان کیا گیا ہے وہ اپنے بندے کے جب چاہے جس طرح چاہے قریب ہو سکتا ہے، باوجود اس کے وہ بلند و بالا بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا کی طرف نزول اور اپنے عرش پر مستوی ہونا ثابت ہے۔

شیخ عبداللہ غنیمان رحمۃاللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر جود و کرم کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بہت جلد متوجہ ہوتا ہے اور اس پر اپنا فضل و کرم کرنے میں جلدی کرتا ہے، باوجودیکہ اس کی عبادت اس کرم و فضل کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی وہ اپنے علاوہ ہر چیز سے بے پرواہ ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز اس کی محتاج ہے۔

ہَر کہ اُو از ہَم زَبانے شُد جُدا
بے زبان شُد، گَرچہ دارد صَد نَوا

اس لیے کہ جو شخص اپنی زبان کے ساتھی سے جدا ہو جائے، خواہ اس کے پاس سو دھنیں ہوں (سامان)، تب بھی وہ گونگا اور گونگا ہی رہے گا۔

ہر کہ: ہر کوئی۔۔۔۔ہم زبان: ہم خیال، ہمراز۔۔۔۔نوا: سامان

ا-اہل سالک کے آداب میں سے ایک "خاموشی" ہے اور یہ دو طرح کی ہے، ایک عامی خاموشی اور دوسری نجی خاموشی۔ عام خاموشی سے مراد یہ ہے کہ ابتدائی طالب علم اپنی زبان کا خیال رکھے اور اس کا استعمال کم کرے تاکہ غلطیاں کم ہوں۔ کیونکہ زبان ایک نافرمان مرکب کی مانند ہے کہ اگر اس کی بندش نہ ہو تو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور خاص لوگوں کی خاموشی سے مراد یہ ہے کہ مکمل عرفان اور آخری متلاشیوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ طریقت کے راز اور حقیقت کو کسی شخص کی اہلیت کے سوا کسی تک پہنچا دیں۔ (فضیلۃ سیر والسلوک پر کتاب، ص 83 اور ط۔ قشیریہ، ص 181) یعقوب چرخی کہتے ہیں: صوفیاء کے پاس ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا اظہار کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا، اور اسی خاص زبان میں وہ رازوں کا اظہار کرتے ہیں۔ آپس میں سچ، جسے وہ نہیں جانتا کہ اس کے سامنے تصوف نہیں کہا جا سکتا۔ (رسالہ نائیہ، ص 20) ابن عربی خاموشی کے راز میں کہتے ہیں: مکمل خاموشی درست نہیں کیونکہ بندہ خدا کو یاد کرنے پر مامور ہے۔ بلکہ یہ خاموشی صرف اس کے ظاہر میں ہے نہ کہ اس کے باطن میں۔ (الفتوحات المکیہ، ج 2، ص 180)]

اس شعر میں ایک عام قاعدہ کا اظہار کیا گیا ہے جو پچھلے شعر کی تکمیل ہے۔ رومیؒ کہتے ہیں: جو شخص اپنی زبان سے الگ ہو (چاہے وہ بولنے والا اور محقق ہی کیوں نہ ہو) تب بھی کنفیوزڈ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے دل کی خواہشات کا اظہار نہیں کر پاتا۔

سب ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، خاموش ہو گئے اور مزید کچھ نہ بول سکے۔

یعنی اگر جناب رومیؒ بولتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انسانوں کو پوری تاریخ میں انہیں سننے کے لیے کان ملے ہیں۔

"سننے والے نے بولنے والے کو ہوش میں لایا"

اگر آپ کے پاس کوئی سننے والا نہیں تو آپ کیسے بول سکتے ہیں؟

رومیؒ کے روحانی راز پوری تاریخ میں سامعین پر آشکار ہوتے ہیں۔ مثنوی کی کتاب کے رموز سننے والوں کی قدر سے کھلتے ہیں، مثنوی کی کتاب کی قدر سے نہیں۔

اگر آپ خالی برتن لے کر اس کتاب کے پاس جائیں تو مثنوی آپ پر اس کے راز کھول دے گی۔

چُونکہ گُل رَفت و گُلستاں در گُذشت
نشنوی زِیں پَس زِ بُلبُل سر گذشت

جب پھول ختم ہوا اور باغ جاتا رہا

اس کے بعد تو بُلبل کی سر گزشت نہ سنے گا

گل رفت: پھول کا موسم ختم ہوا۔۔۔گلستان: باغ۔۔۔نشنوی: نہ سنے۔۔۔ز بلبل سر گذشت: بلبل کی سر گزشت

ترجمہ:

جب پھُول (کا موسم) جاتا رہااور باغ اُجڑ گیاتو اس کے بعد تُم بُلبُل سے سر گذشت (عشق یعنی اُس کے چہچہے) نہ سُنو گے. یعنی پھُول کا حُسن ہی تھا جو بُلبُل کے چہچہے کا مُحرّک تھا. جب وہ نہ رہے تو بُلبُل اپنے آشیانے میں دَم بخُود ہو کر بیٹھ جاتی ہے .

انھیں جانا انھیں مانا نہ رکھا غیر سے کام

لِلّٰہِ الحَمدُ میں دُنیا سے مسلمان گیا

(امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃاللہ علیہ)

گُل چہ می داند کہ سیرِ نکہتِ اُوتا کجاست

عاشقاں راا‌ز سرانجامِ دلِ شیدا مپرس

پھُول کیا جانے کہ اُس کی خوشبو کہاں کہاں تک پہنچتی ہے، لہٰذا عاشقوں سے اُن کے دلِ شیدا کے سرانجام کے بارے میں کچھ مت پوچھ۔

از عالمِ پُر شور مجو گوہرِ راحت

کایں بحر بجز موج خطر ہیچ ندارد

فتنہ و فساد و شورش و آشوب سے بھرے عالم میں راحت کے موتی مت تلاش کر کہ اِس دریا میں موج خطر کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جُملہ مَعشُوق ست و عَاشِق پردۂ

زِندَہ مَعشُوق ست و عَاشِق مردۂ

تمام کائنات معشوق ہے اور عاشق پردہ ہے

معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ ہے

یعنی راز عشق کو جو وحدت الوجود کا مسئلہ ہے۔ عوام کے سامنے بیان کرنا موجب فتنہ قرار دیا تھا یہاں اسے خواص کے لئے مثل مردہ مراد لیا ہے۔

سارا شعر کنایات پر مشتمل ہے۔ معشوق سے مراد ذات حق سبحانہ و تعالیٰ۔ عاشق بمعنی ممکنات، پردہ سے مراد وجود ظاہری مراد لیا گیا ہے۔

ہر طرف حق تعالیٰ ہی کے مظاہر جلوہ گر ہیں۔ عاشقوں کا اپنا ہی وجود پردہ ہے، اگر اپنے انا کو فنا کر دیں تو اللہ تعالیٰ ہی کی تجلی ہر طرف نظر آئے گی

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مطابق:

جملہ معشوق است عاشق پردۂ زندہ معشوق است عاشق مردۂ

(قصص الاکابر ص ۱۰۹)۔

دنیا میں موجود تمام اشیاء حقیقت واصل میں معشوق کی کوئی نہ کوئی شکل ہے عاشق اپنی شکل میں معشوق کا پردہ ہے حقیقت میں معشوق یعنی رب تعالیٰ ہی زندہ ہے عاشق وباقی کائنات مردہ ہے۔

ہر چیز عاشق ہے اور عاشق پردے سے زیادہ کچھ نہیں

ہر چیز عاشق ہے اور عاشق پردے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور جو حقیقی معنوں میں زندہ ہے وہ صرف بے جان جسم کا عاشق ہے۔

اگر ہم پردے کو عاشق کے انسانی وجود کے پردے کی طرف اشارہ کے طور پر لیں تو اس کا مطلب ہے کہ عاشق کا وہم انسانی وجود ایک پردہ ہے جو اسے محبوب سے جدا کرتا ہے۔

ایک جگہ جناب رومیؒ نے حضرت مسیحؑ کا قصہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ اسے سکھائیں کہ مردوں کو کیسے زندہ کیا جائے، اور مسیح نے اس سے کہا کہ تم خود مر چکے ہو، تم کس کو زندہ کرنا چاہتے ہو؟!

رومیؒ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے پردہ ہے وہ تمام لوگ مر چکے ہیں اور صرف محبوب زندہ ہے اور جب ہم محبوب کے پاس پہنچتے ہیں تو ابدی زندگی تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔

اور پردہ وہ عاشق ہے جس نے روشنی کو روکا!

جناب حافظ فرماتے ہیں:

تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

آپ خود ہی حافظ کا حجاب اٹھاؤ

یہاں یہ سمجھنا ہو گا کہ وحدت الوجود کیا ہے؟

وحدت کا لفظی معنٰی ہے 'ایک' اور وجود کا معنٰی ہے 'ہست یا ہونا' جس کا متضاد 'نیست' ہے۔ اس لیے وحدۃ الوجود سے مراد وجود کا اکیلا پن ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک 'وجود' سے مراد وہ چیز ہے جو 'موجود' ہے۔ انہوں نے اس کی تین قسمیں بنائی ہیں:

- واجب الوجود
- ممکن الوجود
- ممتنع الوجود۔

- واجب الوجود ایسے وجود کو کہتے ہیں جو اپنے ہونے اور قائم رہنے میں کسی غیر کا محتاج نہ ہو۔ یہ صرف اللہ تبارک و تعالٰی کی ذات ہے، اس کے علاوہ کوئی اور ذات واجب الوجود نہیں ہے۔
- ممکن الوجود ایسے وجود کو کہتے ہیں جو موجود ہونے میں کسی کا محتاج ہو اور اسکو قائم رہنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہو۔ کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات ممکن الوجود ہیں، یہ وجود تو ہیں لیکن کامل درجہ کا وجود نہیں ہیں۔
- ممتنع الوجود ایسا وجود ہے جو نہ تو از خود ہو اور نہ ہی موجود ہونے میں کسی کا محتاج ہو۔ ایسا وجود پوری کائنات میں نہیں ہے۔

لہٰذا باقی دو قسم کا وجود رہ گیا: واجب الوجود اور ممکن الوجود۔ چونکہ کامل درجہ کا وجود صرف ایک ہی ہے جو کہ واجب الوجود ہے اور وہ ذات باری تعالیٰ ہے اس لیے صوفیاء نے وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق حقیقی معنوں میں کامل وجود صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے اور باقی تمام موجودات ممکن الوجود ہیں

اصطلاحِ صوفیہ میں ''وحدت الوجود'' کے دیگر عنوانات توحید، عینیت اور مظہریت بھی ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود کامل ہے اور اس کے مقابلہ میں تمام ممکنات کا وجود اتنا ناقص ہے کہ کالعدم ہے، عام محاورہ میں کامل کے مقابلہ میں ناقص کو معدوم سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے کسی بہت بڑے علامہ کے مقابلہ میں معمولی تعلیم یافتہ کو یا کسی مشہور پہلوان کے مقابلہ میں معمولی شخص کو کہا جاتا ہے کہ یہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں، حالانکہ اس کی ذات اور صفات موجود ہیں مگر کامل کے مقابلہ میں انھیں معدوم قرار دیا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کامل کے سامنے تمام مخلوق کے وجود کو حضرات صوفیہ معدوم قرار دیتے ہیں۔ یعنی وحدت الوجود کے یہ معنیٰ نہیں کہ سب ممکنات کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وجود کامل صرف واحد ہے، بقیہ موجودات کالعدم ہیں جیسے کوئی بادشاہ کے دربار میں درخواست پیش کرے، بادشاہ اسے چھوٹے حکام کی طرف رجوع کا مشورہ دے اور یہ جواب میں کہے کہ حضور آپ ہی سب کچھ ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب حکام آپ سے متحد ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے سب حکام کالعدم ہیں۔

نظریہ ''وحدت الوجود'' کا صاف، واضح اور درست مطلب یہی ہے، اس کے علاوہ کچھ فلسفی اور ملحدین کی طرف سے اس عقیدے کی ایسی تشریحات بھی کی گئی تھیں جن کی بناء پر ہر نظر آنے والی شے پر اللہ تعالیٰ کا اطلاق درست ہے۔ چنانچہ ایسی ملحدانہ تعبیر کے مقابلے میں شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس نظریے کی اصلاح کے لیے اس کے مد مقابل ایک نیا نظریہ پیش فرمایا جسے وحدت الشہود کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے خالق اور مخلوق دونوں کا وجود بالکل الگ الگ ہے، البتہ مخلوق اپنے وجود کے لیے ہر لحظہ خالق کی محتاج ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے سورج اور اس کی روشنی، کہ روشنی کا وجود ہر لمحہ سورج ہی کے دم سے ہے مگر اس کے باوجود روشنی سورج سے علیحدہ وجود کی حامل ہے۔ ان دونوں نظریات کو اگر اسی تشریح سے سمجھا جائے تو دونوں ہی درست ہیں۔

میرے شیخ نے ایک خوبصورت مثال دی کہ دیکھیں سورج آسمان پر ہے اور اگر شیشے کے ٹکڑے ادھر رکھ دئے جائیں تو ان میں سے سورج کی کرنیں تو مل سکتی ہیں پر کیا وہ سورج ہیں؟ نہیں ان میں سے اسے دیکھا جاسکتا ہے لیکن دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئیے۔ اسی طرح کا معاملہ ہی ہے جو اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے پاس بہت سے حجاب ہیں۔ پہلے پردے جسمانی ہیں جیسے جھوٹ بولنا، فیصلہ کرنا اور دوسرے برے کام۔

جب ہم تمام پردوں کو ہٹا دیتے ہیں، ہم اندھیرے کے آخری پردے تک پہنچ جاتے ہیں جو انسان کے لیے باقی رہتا ہے، اور وہ اس کا جسم ہے۔ اس وقت انا نہیں رہے گی۔

پہلے مصرعہ میں دعویٰ وحدت الوجود کا ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس کی تفسیر جو کہ اصل میں جملہ "محبوب جملہ" ہے، متذکرہ مسئلہ کی واضح تفسیر ہے۔ واضح رہے کہ پہلے بند میں عاشق کے معنی امکانات کا وجود ہے، جو تمام کے تمام خدا کے قبضے میں ہیں، اور پردے کے معنی کوئی بھی ظاہری وجود ہے جو پردے سے ڈھکا ہوا ہے اور اس سے دور ہے۔ روحانی کمالات کو سمجھنا۔ دوسری طرف سچے وجود کو پردے سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ یہ ڈھکا بھی ہے اور چھپا ہوا بھی۔

مختصر یہ کہ تمام امکانات صرف ظاہری ہستی ہیں اور حقیقت میں حقیقت کے جوہر کے علاوہ کوئی ہستی مکمل نہیں ہو سکتی۔

یہ روزمرہ کی گفتگو کے مطابق تشریح ہے، جس طرح جب کوئی جج کے پاس جاتا ہے تو جج اس سے پوچھتا ہے کہ کیا تم نے تھانے جا کر شکایت درج کروائی یا میرے پاس آنے سے پہلے کسی وکیل سے مشورہ کیا؟ اس کے جواب میں مدعی کہے: تھانہ، وکیل وغیرہ سب آپ کے ہیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم سب ایک جیسے ہو اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تمہارے سامنے کسی چیز کو شمار نہیں کرتے اور تم پر پورا اختیار ہے۔

خدا کے بارے میں یہ جاننا چاہیے کہ "سب کچھ اس کا ہے" کے معنی یہ نہیں کہ تمام مخلوقات اس کی ہیں اور وہ تمام مخلوقات ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا کے سامنے کسی کا اعتبار نہیں اور وہ نامکمل ہے، حالانکہ تمام مخلوقات کا وجود ایک اصول کے طور پر ہے۔

دوسرا مصرعہ دراصل اسی موضوع کی تشریح اور تشبیہ ہے، چونکہ ہر صفت کے دو درجات ہوتے ہیں، ایک کامل اور دوسرا نامکمل، اور وہ نامکمل بمقابلہ کامل ایک عام اصول سمجھا جاتا ہے، اور یہ اسی طرح ہے۔ ایک گاؤں میں حافظ صاحب کو قرآن کے پانچ سپارے حفظ ہیں۔ وہ گاؤں والے ان لوگوں کے سامنے ایک مشہور حافظ سمجھا جائے گا جو صرف قرآن پڑھ سکتے ہیں۔

ویسے وہاں ایک شخص رہنے آتا ہے جو پورا قرآن پاک کا حافظ ہے۔ سات اور دس کا قاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی حالت میں اگر باہر سے کوئی گاؤں میں داخل ہو کر گاؤں والوں سے پوچھے کہ اس گاؤں میں کتنے قرآن پڑھنے والے ہیں؟ تمام دانشور یہ جواب دیتے ہیں کہ ایک ہی حافظ جی ہیں اور اگر کوئی اس جواب پر اعتراض کرے کہ فلاں بھی حافظ ہے تو وہ جواب دیں گے کہ فلاں کو اس

کے سامنے حافظ نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ ایک تشریح میں اس شخص کو متولی بھی سمجھا جاتا ہے لیکن چونکہ وہ اس معاملے میں نامکمل ہے اس لیے اسے مکمل متولی کے مقابلے میں غیر متولی سمجھا جاتا ہے۔

جملہ معشوق اور پردہ دار عاشق ہے۔

تمام وجود محبوب ہے اور اس وجود میں محبوب کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ساری دنیا محبوب کے چہرے کا مظہر ہے۔ عاشق صرف ایک پردہ اور پردہ ہے جو محبوب پر پڑتا ہے۔ ہمارا وجود دراصل پردہ ہے۔ اگر یہ پردہ گر جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہم اور میرا وجود نہیں ہے اور دنیا کا جملہ عاشق ہے اور عاشق دراصل ایک پردہ ہے جو پردہ بن چکا ہے۔

صرف محبوب ہمیشہ زندہ ہے اور اس وجود میں باقی سب کچھ برباد ہے۔ صرف عاشق باقی رہ جاتا ہے اور عاشق اصل میں مر چکا ہوتا ہے۔

دوسرا بند سورہ قصص کی آیت نمبر 88 کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے: خدا کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

یا سورہ الرحمن کی آیات 26 اور 27 کہتی ہیں: دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے جب کہ تیرے رب کی ذات باقی ہے۔

اگر معشوق یا معشوق کو محبوب کے پاس جانے کا خوف اور تمنا نہ ہو تو وہ اس دنیاوی دنیا میں بغیر پروں کے پرندے کی طرح رہتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔ افسوس اس بے پنکھ مرغی پر جو اس کے پاس اڑنے کی پرواہ نہیں کرتا۔

جانتے ہو آئینہ اداس کیوں نہیں ہوتا؟

کیونکہ یہ زنگ آلود ہو چکا ہے اور تم اس سے زنگ اتار کر اپنے دل کے آئینہ کو پالش کرو تاکہ اس میں نور چمکے اور تمہارے دل کا آئینہ اداس ہو جائے۔ اور یہ پوری مثنوی اس لیے کہی گئی تھی کہ دل کے آئینے سے زنگ اتر جائے۔

اس مثنوی نے دل کے آئینے سے زنگ اتارنا ہے۔

للہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے، لیکن اس کی ذات کو کسی ایک مقام کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ زمان و مکاں سے پاک ہے۔ ہماری عقلیں اُس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے

کہ وہ ذاتاً ہر جگہ موجود ہے کیونکہ وہ مکان سے پاک اور مبرا ہے، البتہ اُس کا علم اور اس کی قدرت ہر چیز کو محیط ہے۔ اُس کی معیت ہر کسی کو حاصل ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

جسم کو ایک اگر موبائل سمجھ لیں تو روح کو مائکروچپ سمجھیں

جتنا موبائل کو اندرونی اور بیرونی اچھے طریقے سے سنبھال کر رکھیں گے صاف ستھرا بغیر خراش ڈالے رکھیں گے کسی گندی جگہ نہیں گرنے دیں گے اتنا ہی آسان ہو گا موبائل سے چپ کو الگ کرنا۔

اگر دھول اور زنگ آلود کر لیں گے تو مائکروچپ نکالنے والوں نے ہر صورت میں چپ الگ کرنی ہے اگر چپ کا مقام زنگ آلود نہ ہوا تو بڑی آسانی سے الگ ہو جائے گی اگر زنگ لگا تو پھر ہتھوڑے بھی استعمال ہوں گے ضربیں بھی لگیں گی تیزاب کا استعمال بھی ہو سکتا ہے چاہے موبائل کے چیتھڑے اڑانے پڑیں۔

حق جلوہ گر زِطرز وبیانِ محمد است

ایک دوسرا پہلو:

جو غالب نے انتہائی خوبصورت شکل میں پیش کیا ہے وہ بھی ذوق کے لئے ملاحظہ کر لیں

حق جلوہ گر ز طرز وبیان محمد است

آرے کلام حق بہ زبان محمد است

1. محمد ﷺ کے طرز وبیان سے حق ظاہر ہوتا ہے۔ کلام حق تعالیٰ آپ کی ہی زبان مبارک سے ظاہر ہے (یعنی وحی الٰہی امت کے افراد آپ کی زبان سے ہی سنتے تھے، اور کسی کو جبرئیل امین کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آپ کی حق بیانی کی اس سے بڑی دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی)۔

آئینہ دار پر تو مہر است آفتاب

شان حق آشکار ز شان محمد است

2. آفتاب تو آپ کے پر تو حسن کا آئینہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان محمد مصطفےٰ ﷺ کی شان سے ظاہر ہوتی ہے (یعنی شان محمد ﷺ اتنی عظیم ہے تو ان کے خالق کی شان کتنی اعلی ہو گی۔

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است

اما کشاد آں ز کمان محمد است

3. قضا کا تیر بہر حال اللہ تعالیٰ کے ترکش میں ہے لیکن ااس کی۔ (تیر کا چھوٹنا) محمد رسول اللہ ﷺ کے کمال سے ہوتی ہے۔ (شاعر کا مقصود یہ ہے کہ تقدیر کے فیصلے نبی ﷺ کے اشارے پر ہوتے ہیں یا آپ کی رائے سے۔ یہاں قضا یعنی تقدیر سے قضائے معلق بھی مراد لی جاسکتی ہے اگر قضائے مبرم (جو بدلتی نہیں ہے) مراد لی جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ آپ فیصلۂ خداوندی سے راضی اور اس سے واقف ہیں۔ بہر صورت شاعر کا مقصود یہ نہیں ہے کہ آپ کا فیصلہ اور مرضی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر غالب ہے)۔

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز است می خورد

سوگند کردگار بہ جان محمد است

4. ہر شخص اپنے پیاروں اور عزیزوں کی قسم کھاتا ہے اللہ تعالیٰ محمد مجتبیٰ ﷺ کی جان کی قسم کھاتا ہے (یعنی محمد ﷺ اللہ کے پیارے ہیں اس لیے اللہ نے قرآن میں ان کی جان کی قسم کھائی ہے۔ الفاظ یہ ہیں العمرک آپ کی زندگی کی قسم)۔

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فروگذاشت

کایں جا سخن ز سرو روان محمد است

5. واعظ نے بھی سایۂ طوبیٰ کی بات چھوڑ دی کیوں کہ یہاں تو محمد ﷺ کے سرو رواں یعنی سرو کے جیسے قد و قامت کا ذکر ہے جس کے سامنے طوبیٰ کی خوش قامتی بھی ہیچ ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم

کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

6. غالب! آنحضور خواجۂ عالم ﷺ کی مدح وثنا میں نے اللہ پر چھوڑی (یعنی مین ان کی تعریف کا حق ادا کرنے سے عاجز ہوں) کیوں کہ وہی ذات پاک محمد ﷺ کی مرتبہ شناس ہے۔

ماٰخذ: **کتاب** :نغمات الانس فی مجالس القدس(Pg. 169)

فارسی طرز

چُون نبَاشد عِشق راپَرواىِ او

اُوچومُرغی مانُدبی پَر،واىِ او

ہندوستانی طرز

چوں نہ باشد عشق راپروائے او

اوچو مرغے ماند بے پر، وائے او

جب عشق کواس سے پردہ نہ ہو

وہ بے پر کے پرند کی طرح ہے اس پر افسوس ہے

چوں نہ باشد: کیوں نہیں؟۔۔۔ عشق راپروائے او: اس سے محبت کرو

ماندبت پر: بغیر پر کے۔۔۔ وائے او: اس پر افسوس

ترجمہ عام: جب معشوق کو اس کی پروانہ ہو تو وہ ایک بے پر پرندے کی طرح رہ گیا۔ اس کی اس حالت پر افسوس

مندرجہ بالا شعر میں مولانا نے محبت کی تعریف کرتے ہوئے اور کچھ رازوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محبت ایک عظیم پیغام رساں ہے اور سالک کو جلد محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔

اب یہ واضح ہونا چاہیے کہ جناب رومیؒ نے محبت کو کیوں اور کس وجہ سے جوڑا اور شمار کیا۔ یہاں ہم ایک اور اصل وجہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ترسیل کی وجہ یہ ہے کہ خود عاشق (جسے مبالغہ آرائی سے عشق کہا جاتا ہے) سے مراد حضرت حق ہیں؛ وہ عاشق کو توجہ اور پیار دیتے ہیں۔ اور اگر یہ پیار نہ ہوا تو غریب عاشق اس بھرے مرغے کی طرح ہو جائے گا جس کی حالت پر رحم کیا جانا چاہیے۔

مولاناؒ نے مندرجہ بالا شعر میں بتایا کہ محبت ایک حیرت انگیز اثر پہنچانے والا عمل ہے، اور متلاشی کو جلدی سے محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔ عاشق ایک پردہ ہے جو ابدی زندگی صرف محبوب کے ساتھ پاتا ہے اور محبت کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر وہ بے پنکھ مرغی کی طرح ہوتا ہے۔

اگر عاشق کی نگاہوں کا گوشہ عاشق پر نہ ہو تو عاشق دوست کی پرواہ کیے بغیر اپنے خیالات اور ذہانت پر بھروسہ کر کے کہیں بھی نہیں ملتا۔

یہ شعر مواد کے لحاظ سے پچھلے شعر کی تکمیل اور تائید کرتا ہے۔

اگر عشق عاشق پر توجہ نہ دے تو عاشق شکاری پرندے کی طرح ہوتا ہے۔

ایک عام آدمی کہتا ہے کہ مجھے محبت ہو گئی، لیکن ایک صوفی یہ نہیں کہتا کہ مجھے محبت ہو گئی، بلکہ یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری محبت کا انتخاب کیا۔ محبت کے رجحان میں انسان کے ہاتھ اور پر بندھے ہوتے ہیں اور وہ خود سے کچھ نہیں کر سکتا۔

محبت ایک فطری جذبہ ہے جو کسی بھی انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، بلکہ انسان کی زندگی بھی مکمل طریقے سے ابتداء تا انتہا اس کے ساتھ ہی گزرتی ہے۔ صحیح محبت کے لئے توفیق الٰہی اصل ہے، بلکہ اللہ رب العزت نے جب روحوں کو پیدا کیا اسی وقت انہیں ایک دوسرے سے محبت کا خوگر بنایا، ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ منها ائْتَلَفَ، وَما تَنَاكَرَ منها اخْتَلَفَ" "روحوں

کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں، پھر جنہوں نے ان میں سے ایک دوسرے کی پہچان کی تھی وہ دنیا میں بھی ایک دوسرے سے الفت و محبت کرتی ہیں اور جو وہاں الگ تھیں یہاں بھی الگ رہتی ہیں۔" (صحیح بخاری/3336، صحیح مسلم/6376)۔

اسلامی شریعت نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق بھی بہترین رہنمائی کی ہے، اور اس کے کچھ اصول و قواعد اور ضوابط بیان کیا ہے۔ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سلسلے میں ڈھیر ساری روایتیں منقول ہیں کہ آپ کس طرح اپنی ازواج مطہرات، اولاد، اہل بیت، صحابہ کرام خصوصا اصحاب بدر اور بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں سے محبت کرتے تھے، اسی طرح دین کے شعائر خاص طور سے نماز سے آپ کو کتنی محبت تھی، نیز آپ خوشبو سے بھی محبت کرتے تھے۔ (دیکھئے: سنن النسائی/3939، مسند احمد/13079)۔

شریعت کے بیان کردہ محبت کے ضوابط کے علاوہ اساطیری اور خیالی کہانیوں، افسانوں اور ڈراموں نے دنیا کے سامنے اس کا جو مفہوم پیش کیا ہے، ایک منتشر داور منتشر ذہن کے لئے وقتی آسودگی کا سبب تو بن سکتا ہے، لیکن سماج کے بیگاڑ اور بربادی کا ایک مضبوط حربہ بھی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب ایک انفعالی اور افسانوی جذبہ کو معاشرتی اور اصلاحی روایات کے برخلاف حقیقی روپ دے کر پیش کیا جائے گا تو معاشرے میں خرابی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ دیکھا جائے تو آج زیادہ تر معاشرہ اسی سبب سے بدکاری و بد فعلی، ذہنی انتشار اور روایتی بھٹکاؤ کا شکار ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرہ اس فطری اور صالح معاشرہ اور خوشحال زندگی اور کامیاب آخرت کے لئے ضروری وسیلہ اور بہترین صفت کو اچھی طرح سمجھے اور صحیح وغلط کا فرق معلوم کرے، اور اسے یہ بھی پتا ہو کہ اسلام کے اندر محبت کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، اور کس قسم کی محبت سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ دیگر عبادات وامور کی طرح محبت بھی عمل اور استعمال کے اعتبار سے عبادت واباحت اور وجوب وحرمت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

محبت کا معنی

محبت کا لغوی معنی: " محبت " یا "حب" یہ بغض کا نقیض ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے، لازم پکڑنا اور ثابت قدم رہنا۔ (تھذیب اللغۃ للازھری: 8/4، مقاییس اللغۃ: 26/2، لسان العرب: 290/1)۔

محبت کے لئے بسا اوقات جب خالص محبت ہو تو " ود " اور " مودة " کا استعمال بھی ہوتا ہے، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں مختلف صیغوں کے ساتھ کئی جگہوں پر اس کا استعمال کیا ہے۔ اسی سے " ودود " بنا ہے جو اللہ رب العزت کے اسماء حسنی میں سے ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے " بہت محبت کرنے والا " کیونکہ وہ انبیاء وصالحین اور اپنے نیک بندوں سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔

" مودة " اور " محبت " میں ایک دقیق فرق ہے، جیسے : " محبت " کا تعلق دل میں استقرار سے ہے، جبکہ " مودة " کا تعلق انداز و بیان کے ذریعہ اظہار سے۔ چنانچہ ہر " ودود " محبت کرنے والا ہوتا ہے لیکن ہر محبت کرنے والا " ودود " نہیں ہوتا۔

اسی طرح محبت ان چیزوں میں ہوتی ہے جن میں طبیعت کا میلان اور حکمت دونوں ہو جبکہ " مودة " صرف طبیعت کا میلان ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے : مجھے فلاں سے محبت ہے اور اس سے مودة ہے، اور نماز کے سلسلے میں کہا جاتا ہے : مجھے نماز سے محبت ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے نماز سے مودت ہے۔ (دیکھئے : الفروق اللغویۃ/ ص 122)۔
اسی طرح مختلف اسالیب میں کچھ فرق کے ساتھ محبت کے معنی میں رغبۃ، شوق، رجاء، الفت اور تمنا جیسے الفاظ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ مختلف مواقع سے قرآن وسنت میں بھی ان الفاظ اور ان سے مستفاد معانی کا ذکر موجود ہے۔ محبت کے لئے لغات میں تقریبا ساٹھ ناموں کا ذکر آتا ہے۔ محبت کا اصطلاحی معنی : اہل لغت نے محبت کی مختلف الفاظ میں تعریف کی ہے : جیسے المعجم الوسیط (ص 151) کے اندر ہے کہ : " محبت خوش کن چیز کی طرف مائل ہونا ہے "۔

امام راغب نے اس کی تعریف یوں کی ہے : " نفس جس چیز کے اندر اچھائی محسوس کرے اسے محبت کہتے ہیں " (الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ/ ص 256)۔

اور ھروی کے بقول : " المحبَّۃ: تعلق القلب بین الھمۃ والانس ،في البَذْل وَالمنْع علی الإفْرَاد " " روح ونفس کا محبت کرنے والے کی ہمت اور محبوب کی خالص انسیت کے مابین معلق ہونا محبت ہے "۔ (منازل السائرین/ ص 88)۔

محبت کی قسمیں

محبت کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں : خاص محبت۔ عام (یا مشترک) محبت۔

خاص محبت : اس کی دو قسمیں ہیں : شرعی محبت اور حرام اور ناجائز محبت۔

شرعی محبت کی چند قسمیں ہیں :

(1) اللہ تعالی سے محبت : یہ محبت واجب ترین محبت ہے، کیونکہ یہ دین کی اصل ہے اور اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، جب کسی کے اندر اللہ کی محبت کامل ہو تو اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے اور توحید کی تکمیل ہوتی ہے، اور جس کے اندر اس محبت میں نقص یا خرابی ہو اس کی توحید بھی ناقص ہوتی ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ * وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ) (سورۃ البقرہ/165) (بعض لوگ ایسے ہیں جو اوروں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے۔ اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں)۔

(2) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی دین کے واجبات میں سے ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی دین مکمل نہیں ہوتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : " : "لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من ماله وولده والناس أجمعين "۔ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی دولت، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں "۔(صحیح بخاری/15، صحیح مسلم/44)۔

(3) انبیاء وصالحین اور مؤمنین سے محبت : یہ محبت بھی واجب ہے اہل طاعت اور نیک لوگوں کی محبت بھی اللہ کی محبت کو لازم ہے، اور جس کا حکم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: " "لا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا...

" "تم جنت میں نہیں جاؤ گے، جب تک ایمان نہ لاؤ گے اور ایماندار نہ بنو گے، جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ رکھو گے۔۔۔" (صحیح مسلم/194)۔

حرام محبت : خاص محبتوں میں سے حرام محبتیں بھی ہیں جیسے معصیت میں کسی سے کوئی محبت کرے یا وہ محبت جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے بعینہ وہی محبت غیر کے ساتھ کرے اور بعض حرام محبتیں شرک تو نہیں ہوتیں لیکن وہ بھی حرام اور ممنوع ہیں، جیسے آل واولاد، مال ودولت اور تجارت ونوکری سے اتنی محبت کرتا ہو کہ انہیں اللہ کے واجب کردہ امور جیسے ہجرت، جہاد اور دیگر فرائض وواجبات پر ترجیح دے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: (قُل إِن كانَ آباؤُكُم وَأَبناؤُكُم وَإِخوانُكُم وَأَزواجُكُم وَعَشيرَتُكُم وَأَموالٌ اقتَرَفتُموها وَتِجارَةٌ تَخشَونَ كَسادَها وَمَساكِنُ تَرضَونَها أَحَبَّ إِلَيكُم مِنَ اللَّهِ وَرَسولِهِ وَجِهادٍ في سَبيلِهِ فَتَرَبَّصوا حَتّى يَأتِيَ اللَّهُ بِأَمرِهِ وَاللَّهُ لا يَهدِي القَومَ الفاسِقينَ) (سورۃ التوبۃ/24) (آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے

خاندان اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالی اپنا عذاب لے آئے۔ اور اللہ تعالی فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

عام (یا مشترک) محبت: اس میں کئی طرح کی محبتیں ہیں:

عمومی جائز محبت، جیسے: کسی آدمی کی کسی اچھی خصلت سے متاثر ہو کر یا کسی پسندیدہ شیئی سے محبت کرنا۔

طبعی و فطری محبت: مثلا: آدمی اپنے نفس کے میلان کے مطابق کرتا ہے جیسے: بھوکے کا کھانا سے، پیاسے کا پانی سے اور اس کے علاوہ انسان کا حسب ضرورت وچاہت محبت کرنا۔

عطف ورحم والی محبت: جیسے باپ اور ماں کا بیٹے سے وغیرہ وغیرہ۔

انس والفت والی محبت: جیسے کسی بھی فن وحرفت، علم، تجارت یا سفر میں شریک لوگوں کے ساتھ محبت۔

محبت اور عشق کا فرق

محبت کے لئے "عشق" کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

لفظ عشق عربی کے عَشِقَ سے بنا ہے جس کا معنی ہوتا ہے "اس کا دل ھوی وخواہشات سے متعلق ہو گیا" چنانچہ محبت میں افراط کو عشق کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عشق کا مطلب گہری چاہت اور فرط محبت بھی بیان کیا جاتا ہے۔

ارشاد فرماتا ہے: (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ) (سورۃ البقرہ/165)۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالی نے اپنے بندوں سے اپنی محبت کا جہاں بھی ذکر کیا ہے اسی لفظ کے ساتھ کیا ہے، فرماتا ہے: (إن الله يحب المحسنين) (سورۃ البقرہ/195) (اللہ تعالی احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔) (إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ) (سورۃ البقرہ/222) (اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔) (،) إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ) (آل عمران/159) (اللہ تعالی توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔ ان کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں جن میں صرف اور لفظ "محبت" کا ذکر ہے۔

کسی انسان کی دوسرے سے خواہش اور حد درجہ فریفتگی کی تعبیر میں بھی اللہ رب العزت نے لفظ "محبت" ہی کا استعمال کیا ہے، عزیز مصر کی بیوی نے جو یوسف علیہ السلام جیسے پاکباز نفس کو آمادہ گناہ کرنا چاہا اور آپ نے پاکدامنی کا بے مثال نمونہ پیش کیا،

اس خبر کو اللہ رب العزت نے کس اسلوب میں پیش کیا ہے ملاحظہ کریں **وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَّفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ** (سورۃ یوسف/30) (اور شہر کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو بہلانے پھسلانے میں لگی رہتی ہے، بے شک اس کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے، ہم تو اسے صریح گمراہی میں دیکھتے ہیں۔)

محبت ایمان کی تکمیل ہے: ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَن أحبَّ للہِ وأبغضَ للہِ، وأعطى للہِ ومنعَ للہِ فقدِ استَكملَ الإيمانَ '' "جس نے (اہل ایمان سے) اللہ کی رضا کے لئے محبت کیا اور (اہل معصیت سے) اللہ کی رضا کے لئے نفرت کیا، اور اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا اور کسی کو اللہ کی رضا کے لئے منع کر دیا تو اس نے (اپنا) ایمان مکمل کر لیا" (سنن ابی داود/4681، الطبرانی/7613۔

محبت ایمان کی مٹھاس ہے

ایمان کی مٹھاس پانے والے لوگوں میں سے وہ آدمی بھی ہے جو اللہ کی رضا کے لئے کسی سے محبت کرتا ہے، انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ثلاثٌ من كن فيه وجد حلاوة الإيمان إن يكون الله ورسوله إحب إليه مما سواهما، وإن يحب المرء لايحبه إلا الله، وإن يكره إن يعود في الكفر كما يكره إن يقذف في النار"۔ "تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں یہ پیدا ہو جائیں اس نے ایمان کی مٹھاس کو پا لیا۔ اول یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بن جائیں، دوسرے یہ کہ وہ کسی انسان سے محض اللہ کی رضا کے لیے محبت رکھے۔ تیسرے یہ کہ وہ کفر میں واپس لوٹنے کو ایسا برا جانے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے۔" (صحیح بخاری/16، صحیح مسلم/174)۔

محبت کرنے والا قابل رشک ہوتا ہے

قیامت کے دن اللہ کے لئے دو محبت کرنے والوں پر رشک کیا جائے گا، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالی فرماتا ہے: المتحابُّون في جلالي لهم منابرُ مِن نور يغبطُهم النبيون والشهداء" میری عظمت و بزرگی کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے قیامت کے دن نور کے ایسے منبر ہوں گے جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے"۔ (سنن الترمذی/2390، علامہ البانی نے اسے صحیح کہا ہے)۔

لوگوں سے محبت کرنے والا اللہ کا محبوب ہوتا ہے

اللہ کی محبت بھی اللہ کے لئے دو محبت کرنے والوں کو ہی ملتی ہے، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالی فرماتا ہے: وجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ۔۔۔۔" "میری رضا کے لئے آپس میں محبت کرنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہو گئی"۔ (مسند احمد/22030، مؤطا الامام مالک: 953/2، علامہ البانی نے صحیح الترغیب/2581 کے اندر اس کی تصحیح کی ہے)۔

محبت کرنے والے کو قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہو گا

اللہ کے لئے محبت کرنے والوں کو قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہو گا، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إِنَّ اللَّهَ يقولُ يَومَ القِيامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحابُّونَ بجَلالِي، اليومَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَومَ لا ظِلَّ إلَّا ظِلِّي" "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جو میری بزرگی اور اطاعت کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے آج کے دن کہ میں ان کو اپنے سایہ میں رکھوں گا۔ اور آج کے دن کوئی سایہ نہیں ہے سوائے میرے سایہ کے۔" (صحیح مسلم /2566)۔ اسی طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ان سات لوگوں کا ذکر ہے جن کو سایہ نصیب ہو گا، ان میں سے اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے بھی ہوں گے۔ (صحیح بخاری/660، صحیح مسلم/1031)۔

محبت اور اطاعت

یہاں ایک اہم وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے کسی سے محبت کا معیار للہ فی اللہ رکھا ہے، یعنی اگر کسی سے محبت یا نفرت کرے تو صرف اور صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کو پیش نظر رکھے، اس محبت کے ساتھ کوئی بھی دنیاوی غرض یا شہوت و ناجائز اشتیاق نہ ہو یہ اس محبت کی روح کو مار دیتا ہے بلکہ بسا اوقات اللہ رب العزت کی ناراضگی اور سزا و عذاب کا سبب بھی بنتا ہے۔

اسی طرح محبت کے لئے اطاعت ضروری ہے، اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعوے دار ہے تو ان کی نافرمانی سے بچنا اور ان کی اطاعت کرنا فرض ہے، اس کے بغیر کوئی نہ صحیح محبت کرنے والا ہو سکتا ہے اور نہ ہی مؤمن، اللہ تعالی

فرماتا ہے قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی) (سورہ آل عمران/31) (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت واتباع کرو)۔

اسی طرح اگر کوئی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے سے محبت کرتا ہو تو ان کی اطاعت صرف معروف اور بھلائی کے کاموں میں ہی کرنی ہے ، اللہ تعالی کی معصیت میں ان کی اطاعت سے بچنا ضروری ہے ، مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا طاعة في معصية،إنما الطاعة في المعروف "۔ "اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے اطاعت صرف نیک کاموں میں ہے" (صحیح بخاری/7257،4340، صحیح مسلم /1840)۔

تو مولانا رومؒ نے اس شعر یہ یہ سب باتیں پرو دی ہیں۔اگر یہ محبت کی غایت نصیب ہو جائے تو تو عشق ہے۔جو بارگاہ حق کی طرف لے جاتا ہے۔ورنہ وہ بے پر کے مرغ کی طرح ہے۔جو اڑ نہیں سکتا اور نہ فرط غایت پا سکتا ہے۔

ایرانی طرز

من چگونہ ہوش دارم پیش وپَس

چون نباشد نورِ یارَم پیش وپَس؟

میرے پاس پہلے اور بعد کی عقل کیسے ہے؟

میرے دوست سے پہلے اور بعد میں روشنی کیوں نہیں ہے؟

ہندوستانی طرز

مَن چِہ گُویَم ہُوش دَارَم پِیش وپَس

چُوں نہ بَاشَد نُور یَارَم ہَم نَفَس

میں کیا کہوں کہ میں آگے پیچھے کا ہوش رکھتا ہوں

جب کہ میرے دوست کا نور ساتھی نہ ہو

من چہ گوئم : میں کیا کہہ رہا ہوں ۔۔۔ ہوش دارم : میرے پاس ذہانت ہے۔۔۔پیش و پس : آگے پیچھے کا

نباشد : نہ ہو ۔۔۔باشد : ہونا۔۔۔نور : روشنی۔۔۔یارم : میرا دوست

ترجمہ : جب میرے یار کا نور آگے پیچھے (ہر طرف) نہ ہو تو میں کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے پس و پیش کا ہوش باقی ہے۔

اگر محبوب کا باطن میرے سامنے اور میرے پیچھے نہیں تو میں اس محدود عقل و فہم کے ساتھ اپنی راہ کیسے تلاش کروں اور اس میں برتاؤ کروں؟ تمام روحانی علوم اور انسانی روحانی ادراک کا سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باطنی نور ہے۔

مولاناؒ کہتے ہیں کہ جب نور یار میرے قدموں کے سامنے نہیں تو میں کیسے چلوں گا۔

حضرت رومیؒ کی مثنوی سے اگر میرے محبوب کے علم کی روشنی میرے وجود کو منور نہیں کرے گی تو میں اپنے ارد گرد کی خبر کیسے رکھوں گا؟

عاشق کو معشوق اور ملاقات کی روشنیوں کا نگران قرار دیا جاتا ہے۔عاشق کا تقاضا ہے کہ عاشق اس کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہ سوچے۔

محبت کی انتہا میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ محبوب کے سوا آدمی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔اس جذبے کی شدت دماغ کے اوپر والے حصے میں موجود عقل کو معطل کر دیتی ہے۔اس کی تمام ترجدوجہد اسی ایک تمنا تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے Obsession کا مریض۔گویا یہ مریض محبت بن جاتا ہے۔

محبت ہر ذی روح کا انتہائی اہم عنصر ہے یہ سب سے زیادہ چمکدار، روشن اور طاقتور ترین چیز ہے جو باقی سب چیزوں کو روک کر ان پر حاوی ہو سکتی ہے۔ محبت ہر اس روح کو بلندی عطا کرتی ہے جو اسے اپنے اندر جذب کرے اور اس کی روح کو ابدی سفر کیلئے تیار کرتی ہے۔وہ ارواح جو محبت کے توسط سے ابدیت تک پہنچ جاتی ہیں وہ اس ابدیت سے جو کچھ حاصل کرتی ہیں اس کو باقی ارواح میں جا گزیں کرنے کیلئے انتھک کوشش کرتی ہیں۔وہ اپنی زندگی کو اس مقدس فریضے میں صرف کر دیتی ہیں وہ فریضہ جس کی خاطر وہ ہر طرح کی صعوبتوں کو برداشت کرتی ہیں اور جس طرح وہ اپنی زندگی کے آخری سانس کے ساتھ لفظ "محبت" ادا کرتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن اٹھتے وقت بھی ان کی سانسوں میں "محبت" ہی ہو گی۔

وقف الهویٰ بی جیت انت فلیس لی...... متآخر عنه ولا متقدم

محبت نے مجھے جما کر کھڑا کر دیا جہاں پر کی تو ہے۔۔اب نہ میں اس جگہ سے آگے بڑھ سکتا ہوں اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔

اجد الملامة فی هواك لذیزة...... حبّا لذ کوك فلیلمنی اللوم

مجھے تیرے عشق میں ملامت بھلی معلوم ہوتی ہے۔۔یہ تیرے تذکرے کو محبوب رکھنے کی بنا پر۔لہذا ملامت کرنے والے اب چاہے جتنی ملامت کریں۔

اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہی دراصل محبت ہے

پہلے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہی دراصل محبت ہے۔اللہ تو ہم سے اتنی محبت کرتا ہے جتنی ہماری ماں ہم سے نہیں کرتی جی ہاں وہ ماں جو ہمیں پیدا کرتی ہے پالتی پوستی اور کسی قابل کرتی ہے اور جو ہماری خوشی پر خوش اور ہماری تکلیف پر تڑپ جاتی ہے۔اللہ عزوجل ہم سے ہماری ماؤں کی نسبت ستر گنا زیادہ محبت کرتے ہیں تو اندازہ لگا لیجیے اللہ عزوجل کی ہم سے محبت کا۔ اور جہاں تک محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے تو ہم میں سے کوئی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک ہم کو ہمارے ماں باپ،بیوی بچوں غرض دنیا کی ہر ہر شے سے زیادہ محبت محبوب اللہ یعنی ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ ہو جائے۔ ایک جگہ قرآن میں ارشاد پاک ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ اللہ عزوجل پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے گویا ہوتے ہیں

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دو کہ اگر تم (مسلمانوں) چاہتے ہو کہ اللہ تم (یعنی مسلمانوں) سے محبت کرے تو پیروی کرو (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی) اللہ تم (مسلمانوں) سے محبت کرنے لگے گا اور تمہیں (مسلمانوں) کو معاف کرے گا"

ہمیں یہ ماننا ہو گا کہ ہم میں سے اکثر نے صرف محبت کا نام سنا ہے 'اس کے تقاضوں سے واقف نہیں۔ہمیں کوئی پسند آجائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس سے محبت ہو گئی ہے۔پسند آنے اور محبت ہونے میں بڑا فرق ہے 'کسی کو پسند کرنا محبت نہیں ہوتا لیکن محبت تک پہنچنے کے لیے پہلا زینہ ضرور ہوتا ہے۔میں نے بے شمار لوگوں کو انا کے خول میں لپٹے محبت کرتے دیکھا ہے 'یہ محبت میں بھی اپنی برتری چاہتے ہیں 'ان کے نزدیک محبت میں بھی سٹیٹس ہوتا ہے 'حالانکہ محبت میں تو محمود و ایاز کی طرح ایک ہونا پڑتا ہے '

مولاناؒ نے اس شعر میں بڑی راز کی بات کی ہے۔ جو "جب میرے یار کا نور آگے پیچھے (ہر طرف) نہ ہو تو میں کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے پس و پیش کا ہوش باقی ہے۔" میں پوشیدہ ہے۔

سیدنا ابو بکر صدیقؓ کا سرکار دو عالم ﷺ سے کمال محبت کا ایک نمونہ

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوگئے اور بیماری کی شدت کی وجہ سے بستر پر سو رہے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عیادت کے لیے حاضر خدمت ہوئے اور آپ ﷺ کو بستر مرض پر پڑے دیکھ کر غمگین ہو گئے

جب واپس اپنے گھر گئے تو غم کی شدت کی وجہ سے بیمار پڑ گئے اور صاحب فراش ہو گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم شِفایاب ہوئے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ اقدس پر نظر پڑتے ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا اور انہوں نے دو شعر کہے

ترجمہ

میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہوئے تو میں نے انکی عیادت کی، پھر میں انکے غم میں بیمار ہو گیا، جب میرے حبیب شِفا یاب ہو گئے تو وہ میری عیادت کو آئے اور انکے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں بھی شفایاب ہو گیا

یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آپ ﷺ کے ساتھ کمال محبت کا ایک نمونہ تھا۔

اللہ ہمیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اسی طرح کی سچی محبت نصیب فرمائے - آمین ثمہ آمین یارب العالمین

(من وصایاالرسول ص:265)

وہ ارواح جو محبت سے عاری ہوں ان کا انسانی تکمیل کے آفاق تک پہونچنا ناممکن ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ سینکڑوں برس تک زندہ رہیں وہ تکمیل کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ جو محبت سے محروم ہیں یعنی جو خود غرضی کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتے اور اس حالت میں مرتے ہیں کہ ان کو محبت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا حالانکہ یہ تو ہر ذی روح جاندار کے اندر گہرائی میں ودیعت کی ہوئی چیز ہے۔

اصل میں مولانا رومؒ شعر کے مطلب حقیقی: ''اگر محبوب کا باطن میرے سامنے اور میرے پیچھے نہیں تو میں اس محدود عقل و فہم کے ساتھ اپنی راہ کیسے تلاش کروں اور اس میں برتاؤ کروں؟ تمام روحانی علوم اور انسانی روحانی ادراک کا سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باطنی نور ہے۔'' پر زور دے رہے ہیں جس کا مطلب ہے کہ

ساری کائنات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات نصف النہار کے سورج کی طرح عیاں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت دل کا اطمینان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت شرطِ ایمان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل آوری وصفِ مسلمان ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل محبت اور سچے عشق کے ساتھ ساتھ بھرپور عمل بھی تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف حکم بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہر عمل کو بھی اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا۔ انفرادی ہو یا اجتماعی زندگی، شخصی معاملات ہوں یا ملکی یا بین الاقوامی معاہدات، حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، مصلے پر ہو یا بسترِ حرم پر، ہر موقع پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اُسوہ کو اپنے دامنِ عمل سے پیوستہ رکھا۔ بعد والوں کے لیے وہ مقدس جماعت مینارۂ منزل بن گئی۔ اتباعِ سنت کے لیے انہیں نہ بادشاہ کی پرواہ ہے، نہ باپ کی، آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بجالانے میں نہ دریا حائل ہوتا تھا، نہ جنگل و بیاباں اور صحراء نہ گلستاں، اسی بنا پر باطل ان کے رعب سے لرز اُٹھتا۔

قرآنِ پاک میں بے شمار مقامات پر اللہ رب العزت نے ایمان باللہ کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر بکثرت کیا ہے:

''اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَہُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ۔'' (الکہف: ۱۰۷)

ترجمہ: ''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں بھلے کام، ان کے واسطے ہے ٹھنڈی چھاؤں کے باغ مہمانی۔'' آپ خود ہی حافظ کا حجاب اٹھو

صرف محبوب ہمیشہ زندہ ہے اور اس وجود میں باقی سب کچھ برباد ہے۔ صرف عاشق باقی رہ جاتا ہے اور عاشق اصل میں مر چکا ہوتا ہے۔

دوسرا بند سورہ قصص کی آیت نمبر 88 کا حوالہ دے سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے: خدا کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

یا سورہ الرحمٰن کی آیات 26 اور 27 کہتی ہیں: دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے جب کہ تیرے رب کی ذات باقی ہے۔

اگر معشوق کو محبوب کے پاس جانے کا خوف اور تمنانہ ہو تو وہ اس دنیاوی دنیا میں بغیر پروں کے پرندے کی طرح رہتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔افسوس اس بے پنکھ مرغی پر جو اس کے پاس اڑنے کی پرواہ نہیں کرتا۔

جانتے ہو آئینہ اداس کیوں نہیں ہوتا؟

کیونکہ یہ زنگ آلود ہو چکا ہے اور تم اس سے زنگ اتار کر اپنے دل کے آئینہ کو پالش کرو تاکہ اس میں نور چمکے اور تمہارے دل کا آئینہ اداس ہو جائے۔اور یہ پوری مثنوی اس لیے کہی گئی تھی کہ دل کے آئینے سے زنگ اتر جائے۔

نُورِ اُو دَر یُمن ویُسر و تَحت و فَوق

بَر سر و بَر گردنَم مانندِ طَوق

نور: روشنی۔۔۔او: اسکا۔۔۔یمن: دائیں طرف۔۔۔یسر: بائیں طرف۔۔۔تحت: نیچے۔۔۔فوق: اوپر

اس کا نور دائیں بائیں، نیچے اوپر ہے

تاج اور طوق کی طرح میرے سر اور گردن میں ہے

مولانا رومؒ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ

ترجمہ: اس کا نور دائیں بائیں، نیچے اوپر (ہر طرف جلوہ گر ہے اور) میرے سر اور گردن پر طوق کی طرح (حاوی ہے)

اس شعر میں وہ خدا کی موجودگی کا بھی حوالہ دیتے ہیں کہ خدا کا نورِ نگہداشت اور فضل مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

نوٹ: یہ شعر بھی صرف برصغیر کی مثنوی میں ہے۔

نور کا لغوی و اصطلاحی معنی

نور کے لغوی معنی روشنی، چمک دمک اور اُجالا ہے نیز اُسے بھی نور کہا جاتا ہے جس سے روشنی اور اجالا نمودار ہو۔ نور کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ نور وہ ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے۔ پھر نور کی دو قسمیں ہیں : **نورِ حسی اور نورِ معنوی۔** نورِ حسی وہ جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے، جیسے دھوپ اور چراغ کی روشنی، یہ نور خود ظاہر ہیں اور اپنے دائرے میں آنے والی اشیاء کو دیکھنے والے کے لیے ظاہر کر دیتے ہیں۔ نورِ معنوی وہ ہے جس کی روشنی آنکھ تو محسوس نہ کر سکے، لیکن عقل کہے کہ اس سے تاریکی کا ازالہ ہو رہا ہے، اس سے عقلی و معنوی اُمور ظاہر ہو رہے ہیں، یہ نور ہے، یہ روشنی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اسلام، قرآن، ہدایت اور علم کو نور کہا جاتا ہے۔

عام طور پر ہر مسلمان کو تین انوار کی ضرورت ہے، ایک نور 'نورِ ہدایت' ہوتا ہے، ایک نور 'نورِ کفایت' ہوتا ہے اور ایک نور 'نورِ عنایت' ہوتا ہے۔ آدمی کا کفر سے ایمان کی طرف آجانا نورِ ہدایت کہلاتا ہے۔ آدمی کا بڑے بڑے گناہوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر آجانا نورِ کفایت کہلاتا ہے۔ آدمی کا غفلتوں سے، بُرے خیالات اور بُری خواہشات سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف آجانا نورِ عنایت کہلاتا ہے۔ ہر ایمان والے کو ان تین انوار کی ضرورت ہے۔ تینوں انوار کے نتائج الگ الگ ہیں۔ جس کو نورِ عنایت ملتا ہے وہ خاص الخاص ہو جاتا ہے۔ جس کو نورِ عنایت تو نہیں ملا لیکن نورِ کفایت مل گیا اور بڑے بڑے گناہوں سے بچ جاتا ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک وہ ہوتا ہے جس کو نہ نورِ عنایت ملا اور نہ نورِ کفایت ملا لیکن کم از کم وہ ایمان کے دائرے میں تو آگیا اُسے نورِ ہدایت مل گیا۔

نورِ ہدایت کفر سے ایمان کی طرف آجانا، نورِ کفایت بڑے بڑے گناہوں سے بچ جانا اور نورِ عنایت بُرے خیالات اور بُرے وساوس سے بچنے کی صلاحیت کا دل کے اندر پیدا ہو جانا۔ ایک مرحلے پر آدمی اللہ تعالیٰ سے تعلق پر ایسا آجاتا ہے کہ اُس کی غفلت دُور ہو جاتی ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ یاد رہتے ہیں اور اُس کو بُرے خیالات اور بُرے وساوس نہیں ستاتے، بلکہ جو خیالات اور وساوس آتے ہیں وہ بھی اچھے ہوتے ہیں، اُس میں بھی بڑی بڑی نیکیاں شامل ہوا کرتی ہیں۔ اُس کو حق تعالیٰ کی مرضیات والے خیالات آتے ہیں حالانکہ اچھے سے اچھا خیال آنے سے آدمی کا مرتبہ نہیں بڑھتا اور بُرے سے بُرا خیال آنے سے آدمی کا مرتبہ نہیں گھٹتا کیونکہ خیال آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے عرض کر دی کہ بعض دفعہ جب بُرے خیال آتے ہیں تو آدمی سمجھتا ہے کہ میں بُرا ہو گیا بعض مرتبہ آدمی کچھ رہتا نہیں اور اپنے آپ کو بڑا اور اللہ والا سمجھتا ہے۔ اس لیے بُرے سے بُرے خیالات کا آنا آدمی کو بُرا

نہیں بناتا۔ اگر ایک آدمی کو بُرا سے بُرا خیال آ گیا لیکن اُس نے اس کے تقاضہ پر عمل نہیں کیا تو وہ بُرا نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی کو اچھے اچھے خیالات آتے ہیں لیکن وہ اُس پر وہ عمل نہیں کرتا تو ان خیالات سے اُس کا اللہ تعالیٰ کے پاس مرتبہ نہیں بڑھتا۔ یہ اسلام کا ضابطہ ہے کہ جو چیز غیر اختیاری ہوتی ہے اُس میں آدمی کا مؤاخذہ نہیں ہوتا ہے، البتہ ایمان اور اعمال کے ساتھ جو غیر اختیاری حالات آتے ہیں اُس میں آدمی کا مرتبہ گھٹتا اور بڑھتا ہے۔

ضیاء اور نور کا فرق

ضیاء اور نور میں فرق یہ ہے کہ نور کا لفظ عام ہے اور ضیاء کا خاص۔ گویا ضیاء بھی نور ہی کی ایک قسم ہے نور میں روشنی اور چمک ہوتی ہے جبکہ ضیاء میں روشنی اور چمک کے علاوہ حرارت، تپش اور رنگ میں سرخی بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے عموماً ضیاء کا لفظ سورج کی روشنی کے لیے اور نور کا لفظ چاند کی روشنی کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

''نور بہترین رمق ہے جو رازق حقیقی نے ہمیں عطا کیا ہے۔'' بظاہر یہ جملہ بے معنی لگتا ہے لیکن قرآن حکیم کے نظام اصطلاحات میں 'رزق' کے معنی صرف روزی روٹی تک محدود نہیں ہیں۔ علم، خوش حالی، صحت، جوانی، زندگی، والدین، شریکِ حیات، اولاد، بدلتے موسم، سورج چاند ستارے، غرض ہر وہ شے جو بنی نوع انسان کو نفع پہنچائے رزق ہے۔ اس لحاظ سے نور بھی رزق ہے اور بہترین رمق ہے جس کی تخلیق کا بنیادی مقصد اس کرۂ ارض کو جنت نشان بنانا ہے!

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے نور کو بالواسطہ طور پر انسان کی روزی روٹی سے جوڑ رکھا ہے۔ شعاعی ترکیب (photosynthesis) کا عمل نہ صرف انسانوں بلکہ تمام ذی روح انواع کی غذا سازی کا ذمہ دار ہے۔ شعاعی ترکیب کے عمل میں نور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دیگر تمام عوامل واجزاء کی موجودگی و فراہمی کے باوجود نور کے بغیر یہ عمل وجود میں نہیں آ سکتا۔

نور اس لحاظ سے بھی رزق ہے کہ وہ ہماری آنکھوں میں بصارت کے عمل کو انگیز کرتا ہے۔ نور کے بغیر بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں۔

نور کی ماہیت کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کوئی بھی نظریہ نور کی اصلیت اور اس کے مختلف و متضاد رویوں و مظاہر کو پورے طور پر واضح کرنے میں ناکام رہا ہے۔

بہر حال یہ ایک انرجی ہے۔ سائنس کیا کہتی ہے یہ ایک دوسری بات ہے۔ پر یہ ایک ایسی قوت حیات ہے جو انسان کو ایک راہ کا تعین سکھاتی ہے۔ نبی دوعالم، سر دلبراں، شفیع امم، سید العرب والعجم محمد الرسول اللہ ﷺ نے ایک دعا فرمائی ہے جو روایتی دعاؤں میں سے ایک میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّسَارِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّعَصَبِیْ نُوْرًا وَّلَحْمِیْ نُوْرًا وَّدَمِیْ نُوْرًا وَّشَعْرِیْ نُوْرًا وَّبَشَرِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

اے اللہ! کر دے میرے دل میں نور اور میری آنکھوں میں نور اور میرے کانوں میں نور اور میرے دائیں نور اور بائیں نور اور میرے اوپر نور اور میرے نیچے نور اور میرے آگے نور اور میرے پیچھے نور اور کر دے میرے لئے نور ہی نور اور میری زبان میں نور اور کر دے میرے پٹھے نورانی اور میرا گوشت نورانی اور میرا خون نورانی اور میرے بال نورانی اور میری جلد نورانی اور میرا نفس نورانی اور بڑھا دے میرے لئے نور، اے اللہ! مجھے نور عطا فرما۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿سورہ نور آیت نمبر 35﴾

ترجمہ: اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا، اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے جو نہ پورب کا نہ پچھم کا قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اُٹھے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ نور اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں: آیت کے اس حصے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا ہادی ہے تو

زمین و آسمان والے اس کے نور سے حق کی راہ پاتے ہیں اور اس کی ہدایت سے گمراہی کی حیرت سے نجات حاصل کرتے ہیں۔"

بعض مفسرین نے فرمایا: "اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو منور فرمانے والا ہے اور اُس نے آسمانوں کو فرشتوں سے اور زمین کو انبیاء کرام عَلَیۡہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے منور کیا۔(تفسیر خازن، النور، تحت الآیۃ:۳۵، ۳/۳۵۳، چشتی)

مَثَلُ نُوۡرِہٖ: اس کے نور کی مثال۔ بعض مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے نور سے مومن کے دل کی وہ نورانیت مراد ہے جس سے وہ ہدایت پاتا اور راہ یاب ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُمَا نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس نور کی مثال ہے جو اس نے مومن کو عطا فرمایا۔ بعض مفسرین نے اس نور سے قرآن مراد لیا اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس نور سے مراد سیّدِ کائنات، افضلِ موجودات، رحمتِ عالَم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہیں۔

ایرانی طریقہ

عشق خُواھد کین سُخَن بیرون بُوَد

آیِنہ غَمّاز نَبُوَد چون بُوَد؟

ہندوستانی طریقہ

عشق خواہد کیں سخن بیروں بود

آئینہ ات غماز نبود چوں بود

عشق چاہتا ہے کہ یہ بات ظاہر ہو

تیرا آئینہ غماز نہ ہو تو کیوں کر ہو

عشق خواید: شدید محبت چاہتی ہے۔۔۔ کیں: کہ۔۔۔ سخن: بات۔۔۔ بیرون: باہر۔۔۔ بیرون بود: ظاہر ہو

غماز: عکس نما،۔۔۔ات: تیرا

عشق تو چاہتا ہے کہ یہ بیان (یعنی نور خدا کا مخلوق میں جلوہ گر ہونا) ظاہر کر دے لیکن جب آئینہ (ضمیر) عکس نما نہ ہو تو یہ کیونکر ہو سکے گا؟

مطلب: محبت چاہتی ہے کہ ہر چیز کھلی اور شفاف ہو، لیکن تمہارے دل کا آئینہ اتنا صاف نہیں کہ سچائی کی روشنی کو منعکس کر سکے۔

دل کا آئینہ ہوا جاتا ہے دھندلا دھندلا

کب ترا عکس اسے اپنی صفائی دے گا

ازل سے محو ہوں آئینہ دل کی صفائی میں

تیرے قابل بناتا ہوں تیرے قابل نہیں ہوتا

یہاں جنابِ رومیؒ کہتے ہیں کہ آئینہ منہ کا عکس دکھاتا ہے، یہ آپ کے تمام پہلو دکھاتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب آپ کے وجود میں محبت داخل ہو جاتی ہے۔

محبت اگر انسان کے اندر حقیقت بن جائے تو؟

محبت اگر انسان کے اندر حقیقت بن جائے تو اس کا اثر اس کی حرکات وسکنات میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انسانوں سے متعلق اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے کہ جب ہمیں واقعات کا سامنا ہو تو ہمیں اس کے فطری اثر کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اپنے آپ میں واقعات کی عکاسی کرتے ہیں یا نہیں؟ مجموعی نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی لحاظ سے جو کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر کو اتنا خشک اور ٹھوس اور لچکدار نہیں بنانا چاہیے کہ وہ اپنے اندر کے کسی بھی جذباتی اور غیر نمایاں عوامل کو بے اثر کر دے، بلکہ اسے ان عوامل کو کرنا چاہیے۔ انسانی شخصیت کو پارہ پارہ نہ کریں اور نہ ہی اسے کثیر شخصیت بنائیں۔

اس لیے ہمیں خوشی کے اسباب کو خوشی اور غم کے عوامل کو غم کے اسباب سمجھنا چاہیے۔

جس طرح مختلف مخلوقات، شکلوں اور رنگوں کے ساتھ ہمارا ظاہری رابطہ ہماری عقل و فکر کی اصلیت کو نہیں بدلتا بلکہ صرف استحصال کا باعث بنتا ہے اور بس اسی طرح لذت و درد اور دیگر نفسیاتی مظاہر بھی ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں، ان کے عکس کے اثرات۔ ہم میں پیدا کریں، لیکن اس حد تک نہیں کہ یہ ہماری شخصیت کو تباہ کرے۔

اس مسئلے کا سماجی اثر یہ ہے کہ ہم محرکات کے سامنے ایسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کرتے کہ گویا ہم بے حس ہیں اور جذبات نہیں رکھتے اور مثال کے طور پر ہم غریبوں کے رونے اور اذیتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ عذاب دینے والوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مٹ گیا زنگِ خودی دل کی صفائی ہو گئی

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کَرّے (سخت) اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کوتکوں (بُرے کاموں) سے بے خبر نہیں

تمہارے دل سخت ہو گئے (یہ بدلنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، وہ کٹر ہو جاتا ہے)، وہ پتھر کی طرح ہو گیا، پتھر سے بھی زیادہ سخت، اور یہ مثال ہے: پتھر کی تین حالتیں ہوتی ہیں، کچھ پتھروں میں مختلف دراڑیں ہوتی ہیں اور ایک ندی بہتی ہے۔ انہیں کچھ شگاف اور ایک ریلا باہر آتا ہے۔ ان میں سے کچھ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، گر جاتے ہیں، غرور کی چوٹی سے نیچے آ جاتے ہیں، کچھ لوگوں کے وجود سے ہزار نعمتیں اور نیکیاں ہوتی ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس تھوڑی سی نیکیاں ہوتی ہیں اور صرف فیصلہ کرتے ہیں اور کچھ لوگ انا کے محل سے اتر جاتے ہیں لیکن کچھ لوگوں میں ان صفات میں سے کوئی بھی نہیں ہوتا لیکن جانتے ہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے بے خبر نہیں ہے۔

لہٰذا انسانی اصول ہمیں بتاتا ہے

ہمیں اپنے محرکات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے اور ان کا اظہار ہماری فطرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان مظاہر کی عکاسی اور اظہار کیسے کریں اور یہ نہ بھولیں کہ ہماری جسمانی فطرت کے برعکس ایک فطرت بھی۔ روح کے لیے موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانی روح زندگی کے میدان میں اپنی شخصیت کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ محبت عاشق

کی شخصیت کو بدل دیتی ہے، جب شخصیت بدل جائے گی تو انسان کی تمام داخلی اور خارجی حرکات میں اس کا عکس بہت فطری اور ضروری ہو گا۔ مجازی محبت پوشیدہ ہو سکتی ہے اور اس کا کوئی نشان باہر سے ظاہر نہیں ہو سکتا، لیکن مطلق محبت، یعنی افلاطونی محبت، انسان کو اس کی فطری حالت میں نہیں چھوڑ سکتی۔ سچی محبت کو کیسے چھپایا جائے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عشقِ مطلق انسان کو انسانیت کے درجے سے بلند کرتا ہے اور اسے انسانوں کے درمیان ایک الٰہی ہستی کا درجہ دیتا ہے اور جب انسان محبتِ الٰہی کے سائے میں اس مقام پر پہنچ جائے تو اسے کیسے چھپا سکتا ہے؟

علامہ محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیہ تحریر فرماتے ہیں، بلاشک وریب چاندی اور تانبے کی طرح دل بھی زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس کی صفائی اللہ کے ذکر سے مطمئن ہے، ذکر الٰہی دل کو (صیقل کر کے) چمکتے ہوئے آئینہ کی طرح کر دیتا ہے اور جب ذکر کو ترک کر دیا جاتا ہے تو دل پھر زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ جب کہ

زنگ لگنے کے دو سبب ہیں

ا:۔ غفلت، ۲:۔ گناہ

اور زنگ آلود دل کی بھی صفائی کے بھی دو طریقے ہیں:

ا:۔ استغفار، ۲:۔ اللہ رب العزت کا ذکر

کثرت غفلت سے قلب انسانی پر دبیز تہہ جم جاتی ہے اور جب قلب زنگ آلود ہو جاتا ہے تو معلومات کی حقیقی تصاویر اس میں منعکس نہیں ہوتیں۔ پھر اس وجہ سے اس کے نزدیک حق و باطل میں تمیز نہیں رہتی، وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔ کیونکہ جب اس کے دل پر تہہ در تہہ زنگ جم جاتا ہے تو اسکا دل تاریک ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حقائق کی اصل تصاویر اُس پر ظاہر ہی نہیں ہوتیں۔ پھر مزید سیاہ ہو کر اس پر "رین" جم جاتا ہے۔ اس کا تصور اور ادراک فاسد ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہ تو حق کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی باطل کا انکار کرتا ہے اور یہ دل کے لیے سخت سزا ہے اور اس کا سبب غفلت اور خواہشات نفسانیہ (کی کثرت) ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں دل کے نور کو مٹا کر بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "اور نہ پیروی کیجئے اس (بدنصیب) کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش (نفس) کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔ (الکھف۔۲۸) (الوابل الصیب)

امام فخر الدین رازی تحریر فرماتے ہیں: جہنم میں داخل ہونے کا سبب اللہ کے ذکر سے غفلت ہے اور عذاب جہنم سے چھٹکارا اللہ کے ذکر سے ہی ممکن ہے۔ اصحاب ذوق و محبت فرماتے ہیں، جب دل اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے اور دنیا اور اس کی خواہشات کی طرف متوجہ ہو کر حرص و حرمان میں پڑ جاتا ہے اور پھر وہ ایک رغبت سے دوسری رغبت کی طرف اور ایک طلب کی طرف سے دوسری طلب کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ تاریکیوں میں گر جاتا ہے لیکن جب انسان کے دل پر اللہ کے ذکر اور معرفت کا دروازہ کھولتا ہے تو ان تمام آفات اور مصائب سے نجات مل جاتی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی معرفت کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

تو مولانا رومؒ اسی زنگ کے خاتمے کی بات کرتے ہیں: جب یہ ختم ہوتا ہے تو کیفیات یوں بن جاتی ہیں: بقول شاعر

جان سے گذرا تو جاناں تک رسائی ہو گئی

ہے دلِ روشن میں جلوہ صاف شمع طور کا

میرے گھر میں یار کی جلوہ نمائی ہو گئی

شش جہت میں ایک ہی صورت نظر آنے لگی

ہے خدا کی شان آئینہ خدائی ہو گئی

جو نہ دیکھا ہو کوئی کوزہ میں دریا دیکھ لے

میرے باطن میں دو عالم کی سمائی ہو گئی

ساتھ کثرت کا نہ چھوٹا ہم نے لی وحدت کی راہ

جب خدا اپنا ہوا ساری خدائی ہو گئی

روبرو آئینہ رو کے ہوں بہ شکلِ آئینہ

آج کل اس طرح کی مجھ کو صفائی ہو گئی

در پہ اس مشکل کشا کے تم رہو حاضر وطنؔ

دونوں عالم کی جہاں عقدہ کشائی ہو گئی

ایرانی طرز

آئینہَ ت دَانی چرا غمّاز نیست؟

زَانکہ زَنگار از رُخَش مُمتاز نیست

ہندوستانی طرز

آئِینَہ ات دَانی چرا غمَّاز نیست

زَانکہ زَنگار از رُخَش مُمتَاز نِیست

تو جانتا ہے تیرا آئینہ غماز کیوں نہیں ہے؟

اس لئے کہ زنگ اس کے چہرے سے علیحدہ نہیں ہے

غماز: بہت باتونی، آنکھوں اور بھنویں سے اشارہ کرنا - زنگار: دھاتوں اور شیشوں کا زنگ لگنا، آئینے کا بادل

ترجمہ: کیا تجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا، آئینہ (دل) عکس نما نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے چہرے سے زنگار (غفلت) دور نہیں ہے

اس شعر میں رومیؒ ان متلاشیوں سے بات کر رہے ہیں جو ابھی تک ہدایت یافتہ نہیں ہوئے ہیں اور چونکہ ان کے دل ابھی تک پوری طرح سے پالش نہیں ہوئے ہیں اس لیے وہ زنگ سے آلودہ ہو گئے ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں: اے سالک، تجھے معلوم ہے

کہ اس کے مال واسباب کیوں ظاہر ہوتے ہیں۔ تجھ میں محبوب ظاہر نہیں ہوئے کیونکہ وہ آئینے کی طرح چمکائے نہیں گئے اور زنگ آلودہ ہیں جب تک دل ان بندشوں اور تخریبات سے بالکل آزاد نہ ہو جائے محبوب کا مقام نظر نہیں آئے گا۔

تصوف اور تصوف کی دنیا میں بعض عرفاء نے خوف وہراس کے ساتھ زندگی بسر کی ہے اور اپنا وقت ہمیشہ عبادت وریاضت میں گزارا ہے۔ رومیؒ کا تصوف عشق کا تصوف ہے۔ اس کا مطلب خوف، انصاف اور فضل کے تصوف کے برعکس ہے۔

محبتِ تصوف، تصوف کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ محبت کے تصوف میں انسان وحدت تک پہنچتا ہے۔ رومیؒ کی مثنوی میں گمشدہ اور الجھے ہوئے شخص کو اس کی الجھنوں سے نجات دلانے کے لیے الفاظ ہیں۔ مولاناؒ نے نفسیات کے نقطہ نظر سے انسان کا بہت بغور مطالعہ کیا ہے اور انسانی نفسیات کا مختلف اقسام اور شکلوں میں تجزیہ اور تحقیق کی ہے۔ یہ مثالیں نہایت دلچسپ قصوں کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور اس کے علاج کے لیے بہت مفید نسخے بھی منسلک ہیں۔ مولانا متعدد بار اور مختلف طریقوں سے متنبہ کرتے ہیں کہ انسان کی قید، اس کی اسیری اور اس کے تمام مصائب کا سبب ہے، ایک قسم کی سوچ.

تمہارا آئینہ تمہیں کچھ کیوں نہیں دکھاتا؟

یہاں رومیؒ کہتے ہیں تم جانتے ہو تمہارا آئینہ تمہیں کچھ کیوں نہیں دکھاتا؟ کیونکہ زنگ آلود ہے۔

کیونکہ آپ نے اپنے آئینے سے بہت زیادہ دھول نہیں ہٹائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کچھ محسوس نہیں کرتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے آئینے پر دھول ہے اور آپ کے سینے کے اندر جو آئینہ ہے وہ آپ کا دل ہے!

اہم بات یہ ہے کہ تمام لوگوں کے اندر ایک آئینہ ہوتا ہے جو الٰہی روشنی کو چمکا سکتا ہے اور وہ آئینہ بالکل لوگوں کا جسمانی دل ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے، سالوں کے دوران، دل کو غلطی سے ایک واحد آسمانی مضمون کہا جاتا ہے، جبکہ اس کی جگہ بالکل ہمارے سینے میں ہوتی ہے، اور دل ایک ایسا عضو بن سکتا ہے جس سے روشنی نکلتی ہے۔

جرمنی میں دو صوفی سائنسدانوں نے ایک تجربہ کیا، ذکر جیسے کہ نور یا منور النور وغیرہ کہنے کے بعد، وہ ذکر سے آنے والے فوٹون یا روشنی کی کرنوں کو ذکر کے سامنے رکھے ہوئے ایک فوٹون میٹر سے ناپ سکتے تھے۔ ذکر کا شمار کیا جا سکتا تھا اور انہوں نے دیکھا کہ آدمی جب بھی ذکر پڑھتا ہے تو اس کے دل سے نور نکلتا ہے۔

بالکل یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جب کوئی شخص ہلکا ذکر کرتا ہے تو اس کے دل سے فوٹون خارج ہوتے ہیں۔

دل میں آئینے جیسی حالت ہوتی ہے جو اس سے ٹکرانے والی روشنی کی عکاسی کرتی ہے۔

ہمارادل زیادہ روشنی سے چمک نہیں سکتا کیونکہ یہ نفرت اور غلط اعداد وشمار کے سامنے ہے !

مثال کے طور پر ایک عام آدمی اپنے دل سے 20 فوٹون فی سیکنڈ روشنی خارج کرتا ہے اور جو شخص مراقبہ میں داخل ہو کر اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے اس کے فوٹون کی تعداد فی سیکنڈ 100 ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

لہٰذا یہ شمارہ کوئی تجریدی مسئلہ نہیں ہے اور اس کا مضمون بھی iraninlight.com پر ہے۔

یہ ظاہر اور مکمل طور پر سائنسی ہے اور آپ اپنے دل پر کام کر کے روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن کا دل ایک آئینے کی طرح ہے ،روح کا آئینہ نہیں ہوتا، دوست کا چہرہ ہوتا ہے۔

روح کا اندرونی آئینہ کچھ بھی نہیں بلکہ پیارے دوست کا چہرہ ہے جس میں انسان کی اندرونی کیفیت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس مدد کا آئینہ ہے جو سچائی اور محبت کی سرزمین سے آتی ہے، زمین سے نہیں۔

جب دل کا آئینہ ہموار اور زنگ سے پاک ہو گا تو اس پر غیب کی دنیا کے چہرے اور راز نقش ہو جائیں گے اور تم انہیں دیکھو گے۔

ایک قول مبارک میں جسے سلطان العارفین حجرت سلطان باھوؒ نے اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے اَلْمُوْمِنُ مِرْآۃُ الرَّحْمٰن

ترجمہ: مومن رحمٰن کا آئینہ ہے۔

مومن مومن کا آئینہ ہے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

المومن مرآۃ المومن

(سلسلہ الصحیحۃ ۶۲۹)

اور حدیث پاک میں ایک روایت یوں ہے

عَنْ أَنَس رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: "اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ" (معجم الأوسط للطبراني: ۲/ ۳۲۵، الصحیحۃ رقم ۹۲۶

خادمِ رسول اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اَللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مؤمن مؤمن کا آئینہ ہے"

یہ حدیث بڑی ہی مختصر مگر بہت ہی جامع ہے، اَللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حدیث میں ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کے لیے آئینہ کی مانند قرار دیا ہے، اِس حدیث میں تعلیم وتربیت سے متعلق ایک اہم نکتہ موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کو سمجھانے اور اُسے ذہن نشین کرانے کے لیے تشبیہ کا اسلوب اختیار کیا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسائل اگر مثال اور تشبیہ کے ذریعہ بیان کیے جائیں تو وہ بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ہر فن کے اُصول اور قواعد ضوابط کی کتابیں مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

یہ محبت مومن ہی ہے جو اس کے اندر تابنا کی پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کا چہرہ مانند اائینہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ایک مومن کے لئے درج ذیل فوائد کا حامل ہا سکتی ہے تو اللہ کریم کے لئے پھر کیا حال ہو گا؟

چند باتیں جو آئینے پر غور وخوض کرنے پر ہمیں پتہ چلیں وہ یہ کہ

آئینہ کے سامنے فقیر کھڑا ھو یا بادشاہ وقت بے خوف وخطر حقیقت کا اظہار کر تا ھے.

ایک مومن کو بھی دوسرے کو برائی سے روکنے میں اور نیکی کا حکم دینے میں کسی سے ڈرنا نہیں چاھئے اور کسی کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اس کو منکر کی آزادی نہیں دینی چاہیے.

آئینہ کی خوبیاں

✵ آئینہ تب ہی کچھ بولتا ہے جب اس کے سامنے کھڑے ہوتے ھیں بغیر پوچھے کسی کی شہادت نہیں دیتا. ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ شہادت تب دے جب اس سے شہادت طلب کی جائے.

✵ آئینہ منہ کی بات منہ پر ہی کہتا ہے، دل میں کچھ نہیں رکھتا

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ کسی مومن کو غلطی پر مطلع کرنے کے بعد دل میں اسکے خلاف بُری سوچ نہ رکھے.

✵ آئینہ اسی وقت ہی بولتا ہے جب اس کے سامنے آئیں گے

ایک مومن کو بھی اسی وقت اصلاح کرنی چاہیے جب کوئی اس کی بات سننے اور سمجھنے والا ھو بے موقع و محل و وقت ضائع نہ کرے.

✵ آئینہ اسی وقت تک مخاطب رہتا ھے جب تک آپ اسکے سامنے کھڑے رہتے ھیں،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ جب تک لوگ اس کی بات سننے کے خواہش مند ہوں تب تک ان سے مخاطب رہے اور جب لوگ اکتا جائیں تو بات ختم کر دے.

✵ آئینہ آپ کی خامی صرف آپ کو ہی بتاتا ھے پیٹھ پیچھے کسی سے نہیں کہتا،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی خامی صرف اسی کو بتائے پیٹھ پیچھے اس کی غیبت نہ کرے.

✵ آئینہ کبھی کسی کے متعلق جھوٹ نہیں بولتا،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بھائی کی متعلقہ بات میں جھوٹ سے مکمل طور پر اجتناب کرے.

✵ آئینہ اچھایاں اور برائیاں دونوں بیان کرتا ہے کسی ایک پر اکتفا نہیں کرتا،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ جب بھی کسی شخصیت پر تبصرہ کرے تو دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھے.

✵ آئینہ ہر چیز کو اس کی اصل مقدار و کیفیت میں پیش کرتا ہے مبالغہ آرائی یا تنقص نہیں کرتا ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ ایک مومن کے تعلق سے کسی بھی قسم کی مبالغہ آرائی یا تنقیص سے کام نہ لے.

✵ آئینہ کسی کا راز دوسرے کو نہیں بتاتا،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کے رازوں کو راز ھی میں رکھے کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرے.

✵ آئینے پر اگر سونا بھی لگا دیا جائے تو آئینہ اپنا اصل کام (اصلاح) سے منہ نہیں موڑتا

اگر کسی مومن کے پاس مال و دولت بھی آجائے تو وہ اللہ کے ذکر اور لوگوں کی اصلاح سے اعراض نہیں کرے.

✵ آئینہ کسی سے حسد نہیں کرتا کہ اسکی صرف خامیوں کو ذکر کرے بلکہ خامیوں اور اچھائیوں دونوں کو واضح کرتا ھے

ایک مومن کو بھی اپنے بھائی سے حسد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے دل کو اسکے متعلق صاف رکھے.

✵ آئینے کے سامنے کتنے لوگ ھی کیوں نہ کھڑے ھوں وہ آپ کے عیب صرف آپ ھی کو بتاتا ھے لوگوں میں اس کی تشہیر نہیں کرتا

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ جس بھائی میں کوئی عیب دیکھے وہ صرف اسی کو بتائے

لوگوں کے سامنے اس کو بیان نہ کرے جس سے اس کو شرمندگی وندامت اٹھانی پڑے.

☸ آئینہ کا مقصد ھر وقت ھر کسی کی اصلاح ھے

لہٰذا مومن کو بھی چاہیے کہ وہ ھر وقت اپنے بھائیوں کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے.

☸ آئینہ باوجود ایک شخص کے عیوب دیکھنے کے اس سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اس کے عیوب اسکی اصلاح کے لئے اسکے سامنے نمایاں کرتا رھتا ھے

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ جس بھائی میں کوئی عیب دیکھے تو اسکو اس سے دور کرنے کی کوشش کرے اس عیب کی وجہ سے اس سے نفرت نہ رکھے بلکہ پیار اور محبت سے اسکی اصلاح کرے

☸ آئینہ جب بھی کسی کی اصلاح کرتا ہے تو لوگ فوراً اس کی بات کو مان لیتے ھیں اس کے چھوٹا بڑا سستا مہنگا ھونے کی طرف نہیں دیکھتے.

لہٰذا ایک مومن کو بھی چاہیے کہ جب بھی کوئی اصلاح کرے تو اس اصلاح کرنے والے کی قدر و منزلت کی طرف نہ دیکھے بلکہ اپنی اصلاح کی فوراً کوشش کرے.

☸ آئینہ سے انسان کا تعلق صرف ظاہر کی اصلاح کے لئے ھوتا ھے

جبکہ ایک مومن کا دوسرے سے ظاھری و باطنی اصلاح کے لئے تعلق ھونا چاہیے.

☸ آئینے کو اگر توڑ بھی دیں تو پھر بھی آپ سے نفرت نہیں کرتا بلکہ پہلے سے بڑھ کر آپ کی اصلاح کی فکر میں رھتا ھے،

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ لوگوں کی تکالیف کی پرواہ نہ کرے بلکہ مرتے دم تک مسلمین کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے.

☸ آئینہ کسی کی اصلاح کسی لالچ کی غرض سے نہیں کرتا اور نہ ہی کسی سے طمع رکھتا ھے

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ ایک بھائی کی اصلاح صرف "رضائے الہی" کے حصول کے لیے کرے کسی لالچ و طمع کی امید نہ رکھے.

✵ آئینہ صرف اپنے مقصد (اصلاح) سے تعلق رکھتا ہے

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اپنے مقصد سے ھی تعلق رکھے فضولیات ولغویات سے اجتناب کرے.

✵ آئینے کا کام صرف اصلاح کرنا ھے لوگوں کو بتانا ھے اس پر عمل کروانا نہیں

لہذا داعي کو بھی چاہیے کہ وہ لوگوں کی اصلاح کرتا رھے چاہیے کوئی عمل کرے یا نہ کرے.

✵ آئینہ کسی شخص کا عیب دیکھ کر اسکو طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بناتا بلک اس کو صرف مطلع کرتا ھے

لہذا ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ کسی کا عیب دیکھ کر اس کو طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بنائے بلکہ فوراً اس کی اصلاح کرے.

✵ آئینہ کبھی کسی شخص کو ماضی کے عیبوں کا طعنہ نہیں دیتا

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کے ماضی کے گناہوں اور غلطیوں کا طعنہ نہ دے.

✵ آئینہ اپنا ھو یا کسی کا جب بھی اس کے سامنے سے گزریں گے وہ آپ کی اصلاح کرے گا

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ جہاں بھی برائ دیکھے تو اس کو فوراً دور کرنے کی کوشش کرے.

✵ آئینے کے سامنے ھم اس لیئے آتے ہیں کہ وہ ھماری اصلاح کرے اور اس کیلیئے ھم خود خوشی سے آتے ھیں

ایک مومن کو بھی چاہیے کہ وہ خود دوسرے مسلم بھائی کے پاس جائے تا کہ اپنے ایمان ودین کی اصلاح کر سکے •

اللہ رب العالمین ھم سب کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے

"آمین"

آئینہ کز زنگ و آلایش جداست

پر شعاع نور خورشید خداست

وہ آئینہ جو زنگ اور میل سے دور ہے

وہ خدا کے نور کے آفتاب کی شعاعوں سے بھرا ہے

کز زنگ: جو زنگ آلود۔۔۔آلائش: میل۔۔۔جداست: دور ہے۔۔۔۔پر شعاع نور: نور کی شعاعوں سے بھرپور۔۔۔خورشید: سورج

حدیث شریف میں وارد ہے صوفیاء کے نزدیک یہ روایت معتبر ہے لیکن ناصر البانیجیسے محققین اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔لیکن چونکہ یہ حدیث قدسی کے طور پر بیان ہوئی ہے اس لئے یہ اہم ہے۔

"**قلب المؤمن عرش الله تعالیٰ**"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مؤمن کا دل خدا تعالیٰ کا عرش ہے۔

عرش کا وجود بدلتا نہیں اور علم اختراعات میں اول چیز ہے اور وہی عالم ابد ہے اور اسی کی طرف روحوں کو عروج ہوتا ہے اور اسی میں عقلوں کے مرتبے ہیں اور رحمت کے انوار بھی اسی میں ہیں۔ بعض عارفین کو اس عرش کا مکاشفہ اسی طور سے ہوا ہے جس طرح کہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو ہوا تھا۔

دل کے اندر تین جوف ہیں

1۔ اوپر کی طرف جہاں سے کہ وہ موٹائی میں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس جوف کے اندر ایک نور روشن ہے اور وہی جگہ اسلام کی ہے۔

2۔دوسرا جوف وسط قلب میں ہے۔اس میں بھی ایک نور روشن ہے اور وہ ذکر و فکر کا مقام ہے۔۔۔۔یعنی اطمینان روح کے خیالات کا محل ہے۔

3۔ تیسرا جوف قلب کے آخر میں ہے اور یہ حصہ سارے قلب میں نرم و لطیف ہے اور اسی کا نام فواد ہے۔ایمان اور عقل،نور

اور تصوف اور اسرار کی جگہ بھی اسی میں ہے۔ یہی عقل کی میزان اور حکمتوں کا منبع ہے۔ اسی فواد کی ایک نورانی آنکھ ہے جس سے یہ عالم ملکوت کے حقائق کو اور عالم علوی کلی جزئی اسرار اور موازین حقائق کو ادراک کرتا ہے یہی فواد انوار وہبی اور اسرار علوی کا محل ہے اسی چشم بصیرت کی شان میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور"

دل کے تینوں جوفوں کی نورانی آنکھیں ہیں۔

روحیں تین ہیں

روح الامین،

روح القدس،

روح الامر۔

روح الامین کی وحی دل کے جوف اول پر دلالت کرتی ہے۔

روح القدس کی جوف دوئم پر۔

روح الامر کی جوف سوئم پر۔

دل کا نقشہ اور اس کی نورانی آنکھوں کا نقشہ یہ ہے

پس اپنے دل کو تمام کدورتوں سے اور کینہ و بغض و حسد سے اور عداوت سے خالی کرکے صرف اللہ کے ذکر سے معمور کیا جائے۔ دل کی درستگی سے ایمان درست اور دل کی کجی سے ایمان کی کجی ہے۔ دل کی درستگی سے تمام اعضائے بنی آدم درست ہیں۔ دل کی کجی سے تمام اعضائے بنی آدم کج ہیں۔ نجات اسی کے لیے ہے جس کا دل سلیم ہے۔

خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں:

"الّا من اتی اللہ بقلب سلیم"

مگر جو خدا تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا۔

عرش الٰہی کے انوار کا نزول بھی سلیم اور ایمان دار انسان پر ہوتا ہے اور یہی باعث نجات ہے۔ (الغزالی)

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے قلب وروح کا آئینہ روحانی راز اور سچائیاں کیوں نہیں دکھاتا؟ کیونکہ آپ نے اس سے زنگ نہیں ہٹایا۔

لہٰذا روح کی ہوا پر قابو پانے کا مقصد دل کے آئینہ کو صاف کرنا اور اس میں موجود غیب کی روشنیوں اور چھپے رازوں کو منعکس کرنا ہے اور جب تک انسان کے دل کو زنگ نہیں لگے گا، آسمانی سچائیاں اور صوفیانہ راز نہیں ہوں گے۔ اس میں نقوش.

خدا کے اولیاء

سینہ، یاد اور خیال میں چمکدار *** تاکہ یہ دل کے آئینہ کو قبول کرے، قدیم نقش (مستانہ)

خدا کے اولیاء نے اپنے سینوں کو ذکر الٰہی اور صالح خیالات سے چمکایا ہے اور اسی تطہیر اور پاکیزگی کی وجہ سے وہ اپنی قدیم خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔

مرحوم شیخ محمد بہاری نے کہا: ایک دن میں اپنے کمرے میں دوپہر کا کھانا پکانے کے لیے چاول صاف کر تا تھا۔ اس دوران میں نے عظیم اتحاد کا ذکر کیا۔ اچانک پروفیسر "مولا حسین قلی ہمدانی" نے مجھے عددی وحدت کی وضاحت کی۔ میں نے پوچھا آپ کو میرے راز کی خبر کیسے ہوئی؟ فرمایا: خدا نے مومن کے دل کو دنیا کا آئینہ بنادیا ہے، اب تمہاری حاجت میرے دل میں جھلک رہی ہے۔

اس کیفیت کا اظہار اس حدیث پاک سے اظہر من الشمس ہو رہا ہے۔

(عَنِ الْحَارِثِ بْنِ مَالِكٍ الْأَنْصَارِيِّ رضی الله عنه أَنَّهُ مَرَّ بِرَسُوْلِ اللهِ صلی الله علیه وآله وسلم، فَقَالَ لَهُ: كَيْفَ أَصْبَحْتَ يَا حَارِثُ، قَالَ: أَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا.
فَقَالَ: انْظُرْ مَا تَقُوْلُ، فَإِنَّ لِكُلِّ شَيءٍ حَقِيْقَةً، فَمَا حَقِيْقَةُ إِيْمَانِكَ؟ فَقَالَ: عَزَفَتْ نَفْسِي عَنِ الدُّنْيَا وَأَسْهَرْتُ لِذَالِكَ لَيْلِي وَاطْمَأَنَّ نَهَارِي، وَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى عَرْشِ رَبِّي بَارِزًا (وفی روایة: قَالَ عَزَفَتْ نَفْسِي عَنِ الدُّنْيَا وَأَسْهَرْتُ لَيْلِي وَاظْمَأْتُ نَهَارِي وَ كَأَنِّي أَنْظُرُ عَرْشَ رَبِّي بَارِزًا) وَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فِيْهَا، وَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ النَّارِ يَتَضَاغُوْنَ فِيْهَا. قَالَ: يَا حَارِثُ، عَرَفْتَ فَالْزَمْ، ثَلَاثًا.
رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ

حوالہ جات:

أخرجه الطبراني في المعجم الكبير، 3/266، الرقم: 3367، والبيهقي في شعب الإيمان، 7/362، الرقم: 10590-10591، وابن أبي شيبة في المصنف، 6/170، الرقم:، 30423، وعبد بن حميد في المسند، 1/165، الرقم: 445، والهيثمي في مجمع الزوائد، 1/57، وقال: رواه البزار، وابن رجب في جامع العلوم والحكم، 1/36.

وفی روایۃ: عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنه: فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیه وآله وسلم: أَصَبْتَ فَالْزَمْ، مُؤْمِنٌ نَوَّرَ اللهُ قَلْبَهُ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالْهَيْثَمِيُّ وَاللَّفْظُ لَهُ.

أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف، 6/170، الرقم: 30425، والبيهقي في شعب الإيمان، 7/363، الرقم: 10592، وفي كتاب الزهد الكبير، 2/355، الرقم: 973، وابن المبارك في الزهد، 1/106، الرقم: 314، والهيثمي في مجمع الزوائد، 1/57، وقال الهيثمي: رواه البزار.

’حضرت حارث بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے حارث! تو نے کیسے صبح کی؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے سچے مومن کی طرح (یعنی حقیقت ایمان کے ساتھ) صبح کی، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یقیناً ہر ایک شے کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے، سو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا: (یارسول اللہ!) میرا نفس دنیا سے بے رغبت ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے اپنی راتوں میں بیدار اور دن میں (دیدارِ الٰہی کی طلب میں) پیاسا رہتا ہوں اور حالت یہ ہے گویا میں اپنے رب کے عرش کو سامنے ظاہر دیکھ رہا ہوں اور اہل جنت کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور دوزخیوں کو تکلیف سے چلاتے دیکھ رہا ہوں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے حارث! تو نے (حقیقتِ ایمان کو) پہچان لیا، اب (اس سے) چمٹ جا۔ یہ کلمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔‘‘

’’اور یہی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ مروی ہے: حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے حقیقتِ ایمان کو پالیا، پس اس حالت کو قائم رکھنا، تو وہ مومن ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نور سے بھر دیا ہے۔‘‘

رَو، تُوزَنگاَر ازرُخِ اُوپاک کُن

بَعدَازاں آں نُورِرَا اِدراک کُن

ادراک: سمجھ پالینا۔۔۔زنگار: گدھلاپن۔۔۔رخ او: اس کے منہ کے سامنے۔۔۔بعدازاں: اس کے بعد

(اے طالب) جاپہلے اس آئینۂ دل کے منہ سے زنگار صاف کر۔ پھر اس نور کو حاصل کر۔

یعنی اپنے آئینۂ دل کو نور حق سے منور کرنے کے لئے جو کام سب سے پہلے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کو تعلقات ماسوااللہ سے پاک و منزیٰ کرو۔

جا، اس کے رخ سے زنگ کو صاف کر

اس کے بعد اس نور کو حاصل کر

عرفان کے معنی

عرفان کے معنی ہیں جاننا، ہستی کو جاننااور عرفان کا معنی حق کو پہچاننا ہے۔ یہ علم الٰہی تک پہنچنے کا سائنسی نام ہے۔

حقیقت کی شناخت دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک اہل علم کے استدلال سے اور دوسرا تزکیۂ نفس اور باطنی الہام کے ذریعے، جو عرفان اور اولیاء کا طریقہ ہے۔

نتیجے کے طور پر، صوفیاء کے مطابق، خالص دل حقیقی معرفت کا ذریعہ ہے، اور بس، اور وہ (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) کے حقیقی معنی کو جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسانی دل ایک آئینہ ہے۔ جس میں تمام الٰہی صفات کا ظہور ہونا چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو یہ آئینہ کی آلودگی کی وجہ سے ہے، اور تم اس کے زنگ اور غبار کو دور کرنے کی کوشش کرو۔ اپنے دل کے آئینے میں خدا کی محبت کی تصویر نہیں دیکھی جاسکتی، کیونکہ اس پر گناہوں کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس لیے پہلے اس سے گناہ کا زنگ ہٹ جائے، پھر علم کی روشنی سمجھ میں آئے گی۔

جس طرح دھات کا آئینہ میلا اور غبار آلود ہو جاتا ہے، اس کی عکاسی کی قوت اور حساسیت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح باطنی روحانی حواس، جسے عرفان دل کی نظر، (بصارت کی آنکھ) اور (بصیرت کی آنکھ) کہتے ہیں۔ جب یہ مادی تعینات اور لغزشوں سے آلودہ ہو جائے تو یہ نور وحدت کی بات نہیں کر سکتا جب تک کہ غبار اور آلودگی بالکل ختم نہ ہو جائے اور دل کے آئینہ کے تزکیہ کا انحصار خدا کے فضل بس اس کے فضل سے ہوتا ہے۔ جسے صوفی اصطلاح میں توفیق کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کے مطابق روح کو مکمل کرنے اور دل کی تطہیر کے لیے کوشش کرنا بھی خدا کے فضل اور ایک قسم کی کامیابی کی وجہ سے ہے۔

سلطان العارفین سلطان باہوؒ فرماتے ہیں

مَن عَرَفَ نَفسَهٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّهٗ

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا یاد رہے محدث ابو المظفر السمعانی نے فرمایا ہے کہ یہ عبارت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی حیثیت سے معروف نہیں ہے بلکہ یہ یحیٰ بن معاذ الرازی کے قول کی حیثیت سے بیان کی جاتی ہے۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باھو رحمۃ اللہ علیہ اسی قول کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

مَن عَرَفَ نَفسَهٗ بِالفَنَآءِ فَقَد عَرَفَ رَبَّهٗ بِالبَقَآءِ

جس نے خود کو فنا کی حالت میں پہچان لیا

پس تحقیق اس نے اپنے رب کو بقا کی حالت میں پہچان لیا!

کیونکہ سورۃ رحمٰن میں فرمایا گیا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (٢٦) وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (٢٧) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (٢٨)

زمین پر جتنی مخلوق ہے سب فنا ہونے والی ہے۔ اور تمہارے رب کی عظمت اور بزرگی والی ذات باقی رہے گی۔ تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

ہر شے کو فنا ہے مگر عظمت والے تیرے رب کے جمال کو بقا ہے

آدمی عمر بھر اپنی آرزوئیں اپنے ارادے اپنے جذبات دل میں سِینت سینت کر رکھتا ہے، کیا کیا خواب اپنے اندر لیئے پھر تا ہے،

"کوئی "غالب" ہے جو اسکے جذبات اور خواہشات کے سومنات مُنہدم کر تا آتا ہے

یہ نہیں جانتا کہ اسکے تمام خواب اسکی نیند یعنی غفلت کی وجہ سے ہیں اور

نہیں جانتا کہ اسکے دل کی شکستگی ہی اسکی نایابی ہے

اندر کے لات و منات کا ٹوٹ جانا ہی اسے بیدار کر کے مصروفِ مناجات کر تا ہے

تب کہیں جا کر اسے وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمرِہٖ کی پہچان کا خزانہ ہاتھ آتا ہے،

بقول مولائے کائنات سیّدنا علی کرم اللہ وجہ الکریم

میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا

جو دل دا محرم ہووے حضرت باھو

سوہی رَب پہچانے ھو

اِیں حَقِیقَت رَا شَنو اَز گُوشِ دل

تا بَروں آئی بکلی زِآب و گِل

اس حقیقت کو دل کے کان سے سن

تاکہ تو پانی اور مٹی سے بالکل نکل آئے

ایں: اس۔۔۔ حقیقت: اصلیت، راز۔۔۔ گوشِ دل: دل کے کان مراد دل سے سننا۔۔۔ بروں: باہر۔۔

ترجمہ: اس اصلی اور حقیقی بات کو دل کے کانوں سے سنو تاکہ تو پانی، مٹی کے چکر سے بالکل چھوٹ جائے۔ یعنی صفائیٔ باطن، تزکیہ و تصفیہ سے جو ہدایت منجانب الہ ہے اس کو توجہ اور دل کے کانوں سے سن اور اس پر عمل کر۔ کیونکہ علائق سفلیہ و جسمانیہ انسان کو عالم قدس کی سیر سے باز رکھتے ہیں۔

مثلاً کوئی شخص سمندر پر آیا اور اسے کھارے پانی اور وہیل اور مچھلیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا تو اس نے کہا یہ جواہر کہاں ہیں؟ صرف سمندر کو دیکھ کر کون جواہر حاصل کر سکتا ہے؟ اب اگر وہ ایک لاکھ بار سمندر سے گزرے تو اسے جوہر نہیں ملے گا۔ اس مقصد کے لئے غوطہ خوری کی طرف جانا چھوگا، اور پھر ہر غوطہ خور ہوشیاری اور ہنر مندی سے

ہر قسم کے جواہر کو تلاش کرنے کا طریقہ جانتا ہوگا اور سمندر کے پانی میں سے کسی خزانے جگہ تک چلا جائے گا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو فنون لطیفہ سے آراستہ ہیں اور جن کے پاس دولت اور خوبصورتی ہے لیکن ان میں وہ معنی پانے کی لیاقت نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس شخص کے لیے بھلائی ہے جس کی ظاہری شکل خراب ہو، اس کا چہرہ اچھا نہیں لیکن فصاحت و بلاغت ہے، وہ معنی کے غایت کو جان جاتا ہے جو اس میں باقی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ انسان اس کی وجہ سے معزز اور باوقار ہے اور اس کی وجہ سے اسے دوسری مخلوقات شیر، وہیل اور شیر پر فوقیت حاصل ہے۔

اے درویش! محبوب کے حسن نے عاشق کے دل کو ایسا گھیر لیا

کہ اس کے علاوہ کسی چیز کی اجازت نہ تھی، عاشق اپنے سوا کچھ نہیں دیکھتا، محبوب سب کچھ دیکھتا ہے۔ اے درویش! جس نے محبت نہیں کی وہ پاک نہیں ہوا اور جو پاک نہیں ہوا اس نے پاکیزگی حاصل نہیں کی اور جس نے محبت کی اور اپنی محبت کا کھلم کھلا اظہار کیا وہ نجس رہا اور پاک نہیں ہوا کیونکہ آگ آنکھوں سے اس کے دل میں داخل ہوتی ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ نفسانی رذائل اور قلبی خواہشات کا زنگ دل سے اتار، تب اللہ کے انوار و تجلیات آئیں گے۔ تن تیرا دنیا کے ماحول میں رہے، فرائض ادا کرے، ضرورت، ضرورت رہے، شہوت و محبت نہ بنے اور من احوالِ محبت کی طرف راغب رہے اور اللہ کی طرف متوجہ رہے۔

یاد رکھیں! رسمی عبادات کرنے سے ایک حجاب غفلت بھی نہیں اترتا، ایک زنگ بھی نہیں اترتا۔ سارے امور کا اجر و ثواب تو ملتا ہے مگر نور کا نصیب ہونا، حجابات کا رفع ہونا اور روحانی ترقی کا نصیب ہونا نہیں ملتا۔ اس کے لیے مجاہدہ درکار ہے۔ صرف رفاقت ہی سے

سب کچھ نہیں۔ کسی کی نسبت از خود حال نہیں بدلتی، رفاقت و بیعت دل کی ارادت کا نام ہے۔ خالی اور رفاقت فارم کے پر کرنے سے حال نہیں بدلتا۔ خالی نسبت سے فیض کی کئی صورتیں ملتی ہیں، برکت ملتی ہے مگر دل کا زنگ نہیں اترتا، دل میں ورودِ تجلیات نہیں ہوتا، یہ کام ریاضت سے ملتا ہے۔

ارادت، صحبت اور ریاضت تینوں چیزوں کو جوڑا جاتا ہے تب دل کے زنگ اترتے اور روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی ڈگری اور کوئی بھی فن سیکھنے کے تقاضے پورے کئے بغیر نہیں ملتی۔ جب کسی بھی میدان میں ریاضت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تو عاشق بغیر کسی ریاضت کے کس طرح بن سکتا ہے۔

اس لیے فرمایا: زنگ سے دل کو صاف کر اور ماسوا اللہ سے جو چیز دور لے جائے اس سے بھی اپنے آپ کو پاک کر۔

روحانی ترقی کے لیے درج ذیل مراحل ہیں

1. تزکیہ (نفس کی زنگار سے صفائی)
2. تصفیہ (دل کی غبار سے صفائی)
3. جب نفس رذائل سے پاک ہو جائے اور دل ماسوی اللہ میں غرق ہونے سے محفوظ ہو جائے تو تیسری منزل التخلی ہے یعنی دل کو تب خلوت ملتی ہے اور دل اللہ کا خلوت کدہ بنتا ہے جب اس کی محبت و قربت دل میں بس جائے تو یہ التخلی ہے۔ ہر تمنا کے دل سے رخصت ہو جانے سے دل خلوت کدہ محبوب بنتا ہے جب غیر بیٹھے ہوں تو بات کرنا تو دور کی بات ہے محبوب دیکھتا بھی نہیں ہے۔
4. اس کے بعد مرحلہ التجلی ہے۔ خلوت ہو گی تو تجلی ہو گی۔ تجلی کا مطلب ہے دیکھنا۔ بندہ نور کو دل پر گرتے محسوس کرتا ہے۔
5. اس کے بعد مرحلہ التحلی ہے۔ اس مقام پر بندہ پر اللہ کے اخلاق کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ یہ عبدیت کاملہ اور عبودیت صحیحہ ہے۔ اس کی صفات کا رنگ بندے پر چڑھ جاتا ہے اور اللہ اپنے اخلاق کا زیور اس بندے کو پہنا دیتا ہے۔

دفتر اول ــ بخش ۲ ــ عاشق شدن پادشاہ بر کَنیزکِ رَنجور وتَدبیر کردنُ در صِحَّتِ او

بادشاہ کالونڈی پر عاشق ہونا۔ رنجیدہ ہونا اور اسکی صحت کے لئے تدبیر کرنا

بِشُنَوید اے دوستان ایں داستان

خودُ حقیقت نَقدِ حالِ ماست آن

اے دوستو! اس قصہ کو سنو۔۔ وہ خود ہمارے موجودہ حال کی حقیقت ہے۔

خلاصہ

بادشاہ اپنے سپہ کے ساتھ شکار کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ درمیان میں اس نے ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھا اور اسے پیار ہو گیا۔ وہ دل ہار گیا اور اسے اور اس کے ساتھی کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنے محل میں لے آیا۔ اسے ہر طرح کے انعام و آرام فراہم کیا۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ کنیز بیمار پڑ گئی۔ لونڈی کے بیمار ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور بادشاہ نے لونڈی کے علاج کے لیے چاروں طرف سے حاذق ڈاکٹروں کو بلایا۔ ڈاکٹروں میں سے ہر ایک نے اپنے علم اور مہارت سے اس کا علاج کرنے کا دعویٰ کیا۔ اس وجہ سے، انہوں نے قادر مطلق کو نظر انداز کیا، جو کہ اعلیٰ ترین وجہ ہے۔ اس لیے وہ جتنا زیادہ کوشش کرتے، مریض کی حالت اتنی ہی خراب ہوتی گئی۔ جب بادشاہ تمام فطری اسباب سے مایوس ہو گیا تو اس نے خدا کی طرف رجوع کیا اور دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔ دعا و مناجات کی گرمی میں وہ سو گیا اور نیند کے دوران ایک باضمیر بوڑھے نے اس سے کہا: عقلمند! ڈاکٹر

تمہارے پاس آرہاہے۔ اگلی رات بادشاہ نے وعدہ شدہ ڈاکٹر کو پایااور اسے لونڈی کے بستر پر لے گیا۔ اس نے امتحان شروع کیااور فراست سے اس کو پتہ چلا کہ ملازمہ کی بیماری کی وجہ جسمانی عوامل نہیں ہیں بلکہ وہ محبت کی بیمار ہے۔ ہاں، وہ کنیز سمرقند میں رہنے والے ایک سنار کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس روحانی طبیب کے مشورے کے مطابق بادشاہ نے کچھ لوگوں کو سمرقند بھیجا کہ اسے بادشاہ کے دربار میں لے آئیں، جب وہ سنار کو بادشاہ کے پاس لے آئے تو بادشاہ نے طبیب کے حکم کے مطابق اس کی شادی اس لونڈی سے کر دی، اور دونوں زندہ رہے۔ خوشی سے چھ ماہ تک ایک ساتھ۔ یہ مدت ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر نے خدا کے حکم کے مطابق سنار کو جلاب پلادیا جس سے اس کی خوبصورتی اور جاذبیت کم ہوگئی اس کی خوبصورتی جاتی رہی وہ جو حسن ظاہر اس کنیز کو متاثر کرتا تھاوہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیااس کا رنگ روپ جاتا رہااور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ کنیز کے دل سے وہ غمار محبت جاتا رہااور وہ آہستہ آہستہ نوکرانی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

البتہ یہ حکم اسی طرح تھاجو سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھااور یہ بھی اسی طرح ہے جیسے اس لڑکے کو سیدنا خضرؑ نے قتل کیا تھا۔ لہٰذا ان معاملات میں ایک معمہ ہے جس کا سمجھنا عقل کے دائرہ سے باہر ہے۔

مذکورہ کہانی کا ماخذ فردوس الحکمہ اور چار نثری مضامین ہیں۔ پچھلی کتاب میں اس قسم کے سلوک کو ابو علی سینا کی طرف مزید تفصیل سے منسوب کیا گیاہے۔ اس روایت کے مطابق اس نے اپنے ایک رشتہ دار قابوس واشمگیر کو شفا بخشی جو محبت کی بیماری میں مبتلا تھا۔

سید اسماعیل جرجانی (متوفی 531یا535ہجری) نے بھی اپنی کتاب خوارزم شاہی کی کتاب محبت کے علاج میں کہاہے: وہ شخص جس کے پاس محبت ہو اور ایک خفیہ عاشق کا نام، اس طرح سے معلوم ہو سکتاہے کہ اس کا عاشق کون ہے، اور یہ نبض ہے۔ نبض ڈاکٹر کی انگلی کے نیچے ہے۔ اوراس نے اسے اچانک ان لوگوں کے نام بتانے کو کہاجو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان سے محبت کر رہاہے، اور وہ ہر ایک کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، اور وہ ہر ایک کی حالت بیان کرتے ہیں، اور کئی بار کوشش کریں جب تک کہ اس شخص کا نام اور خصوصیات سن کر اس کی نبض کی تبدیلی قریب نہ آجائے، اس کا نام کون اور کیاہے؟

لیکن اشعار کے مندرجات سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب رومیؒ یہ کہنا چاہتے تھے کہ انسان اپنی خواہشات کی تلاش میں دنیا کے شکار پر ہے، اس سے بے خبر کہ دنیا کے ہر مشروب میں ہر ذائقہ ملاہواہے۔ دنیا محرومیوں سے ملی ہوئی ہے۔ اور جب انسان کسی

آفت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے مختلف ذرائع اور دروازوں کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ ان کے فراہم کرنے سے نجات اور نجاتِ یقینی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ان سب کا دعویٰ ہے کہ وہ انسان کی باطنی حقیقت کو جانتے ہیں اور اس کے روحانی مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر وہ نسخہ جو وہ بنی نوع انسان کو بچانے کے لیے لکھتے ہیں نہ صرف اس کی حالت بہتر نہیں کرے گا بلکہ اس کی حالت مزید خراب کر دے گا۔

اسباب اور افراد سے مایوس ہونے کی وجہ سے وہ دعاؤں کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس صورت میں اگر اس کا دل ایمانداری سے ٹوٹ جائے تو اس کی دعائیں قبول ہوں گی اور اس کی حاجتیں پوری ہوں گی۔ اس کہانی کے علاوہ جنابِ رومیؒ محبت کو تعریف سے ماورا سمجھتے ہیں اور زبان کو اس کے اظہار کے لیے عاجز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خیالی محبت ہمیں حقیقی محبت کی طرف لے جاتی ہے۔
کیونکہ محبت چہرے کی تعمیر ہوتی ہے، انسان کو کسی چہرے سے محبت ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ چہرہ مٹ جاتا ہے تو انسان کی محبت اسی چہرے سے ہو جاتی ہے۔ ہوشیار شخص وہ ہوتا ہے جو گلابی اور رنگین عاشق سے چھٹکارا پاتا ہے اور ایک زندہ اور مستحکم عاشق سے محبت کرتا ہے۔

جناب رومیؒ کہتے ہیں، صوفیانہ راستے دشوار گزار راستے ہیں اور جو کوئی بھی روحانی راستے میں داخل ہوتا ہے وہ کائنات کے سب سے مشکل عنصر ''خود'' میں داخل ہوتا ہے۔

یہ کہانی دراصل ہم انسانوں کی حالت کے مطابق ہے۔ اس کہانی میں رومیؒ نے مذکورہ خط و کتابت کی وجہ بیان کی ہے۔ جس طرح بادشاہ کو لونڈی سے محبت ہو جاتی ہے اسی طرح لونڈی کی روح بادشاہ بھی فرمانبردار ہو جاتا ہے اور اپنی حیوانی روح سے محبت کرتا ہے اور لونڈی کو سنار سے جو حسی محبت ہوتی ہے اس کے مطابق انسان کی روح بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اور کرپشن اور بدعنوانی کی دنیا کی لذتوں سے مسحور۔ اس تمثیلی کہانی میں رومیؒ بتاتے ہیں کہ نامکمل گروؤں اور شیخوں کا حوالہ دینا مفید نہیں ہے، جس طرح بادشاہ کا بیرونی ڈاکٹروں کا حوالہ مفید نہیں تھا، اور آخر میں لونڈی کے جذباتی درد کی دوا دینے والے نے کہا جو ایک کامل اور غیر مرئی طبیب تھے، اس لیے دنیا کن اور فساد کی رغبت اور محبت کے علاج کے لیے بھی ایک کامل شیخ کی ضرورت ہے جو انسان کے دل سے دنیاوی لذتوں کی محبت کو نکال دے اور "سالک" کو جسمانی بیماریوں سے بچا سکے۔ تاکہ وہ روح کے بادشاہ کی طرف سے قبول اور مطلوب

ہونے کے لیے تیار ہو۔ چنانچہ درس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آپ اپنے اندر کا زنگ دور کرنا چاہتے ہیں تو "شیخ کامل" سے رجوع کریں اور ان کی ہدایات پر عمل کریں۔

ایرانی طرز

بود شاہی در زمانی پیش ازین

مُلکِ دنیا بودَش و ہم مُلکِ دین

ہندوستانی طرز

بود شاہے در زمانے پیش ازیں

مُلکِ دنیا بودش و ہم مُلکِ دین

وہ ماضی میں ایک بادشاہ تھا۔

وہ دنیا کا بادشاہ بھی تھا اور دین کا بھی

بود: تھا۔۔۔ شاہے: ایک بادشاہ۔۔۔ پیش ازین: پہلے وقتوں میں۔۔

ملک دنیا: دنیا کا بادشاہ

ترجمہ: پہلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کے دنیا کا ملک بھی تھا اور (نیک اعمال کے لحاظ سے) دین کا ملک بھی تھا۔

اِتّفاقاً شاہ روزی شُد سَوار   باخواصِ خویش از بہرِ شکار

خواص: خاص لوگ۔ نوکر چاکر۔۔۔۔ روزے: ایک دن۔۔۔

ترجمہ: اتفاق سے ایک روز بادشاہ اپنے مصاحبوں سمیت شکار کی غرض سے سوار ہوا۔

یک کَنیزَک دید شَہ بر شاہ رُاہ

شُد غُلامِ آن کَنیزَکُ پادشاہ

یک: ایک۔۔۔ کنیزک: اس کی لونڈی۔۔۔ دید: دیکھی۔۔۔ شہ: بادشاہ۔۔۔ شد: ہوا، بنا

ترجمہ: اس نے شاہراہ پر ایک لونڈی دیکھی اور بادشاہ اس لونڈی کا غلام بن گیا۔

کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب بادشاہ، جو بادشاہ اور مذہبی رہنما دونوں تھا، اپنی عزیزوں، لوگوں کے ساتھ شکار پر جاتا ہے اور راستے میں غلطی سے ایک نوکرانی کو دیکھتا ہے اور اس میں دلچسپی لیتا ہے، اسے خریدتا ہے اور اپنے گھر لے جاتا ہے۔ لیکن نوکرانی بہت جلد بیمار ہو جاتی ہے

یہاں سے رومی انسانی زندگی کے ایک عالمگیر نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عام طور پر جب ایک طرف سے کامیابی حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف سے ناکامی اور نحوست ہوتی ہے اور سعدی کی تشریح کے مطابق انسان کی زندگی میں:

« فانَّ مع العسرِ یُسرا. انَّ مع العسرِ یُسرا. » ،(سورہ انشراح،5-6)

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاۙ(۵)

تو بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

{فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا: تو بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔} یعنی اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ،جو شدت اور

سختی آپ کفار کے مقابلے میں برداشت فرمارہے ہیں،اس کے ساتھ ہی آسانی ہے کہ ہم آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو ان پر غلبہ عطا فرمائیں گے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ مشرکین رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور صحابۂ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کو فقر کی وجہ سے عار دلاتے تھے یہاں تک کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو یہ گمان ہوا کہ مسلمانوں کی تنگدستی ان کفار کے اسلام قبول کرنے میں رکاوٹ ہے،اس پر اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے حبیب! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ، آپ ان کافروں کی باتوں سے غمزدہ نہ ہوں عنقریب تنگدستی کی یہ دشواری ختم ہو جائے گی۔(مدارک، الشرح، تحت الآیۃ: ۶، ص ۱۳۵۸، خازن الم نشرح، تحت الآیۃ: ۶، ۴ / ۳۸۹، ملتقطاً)

مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی مشکل،مصیبت یا دشواری کے آجانے کی وجہ سے گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ اللّٰہ تعالیٰ سے مشکل اور مصیبت دور ہو جانے اور دشواری آسان ہو جانے کی امید رکھتے ہوئے دعا کرنی چاہئے،اللّٰہ تعالیٰ نے چاہا تو بہت جلد آسانی مل جائے گی۔اللّٰہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَاؕ-سَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا“(طلاق:۷)

اللّٰہ کسی جان پر بوجھ نہیں رکھتا مگر اسی قابل جتنا اسے دیا ہے، جلد ہی اللّٰہ دشواری کے بعد آسانی فرمادے گا۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاؕ(۶)

بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے

{اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا: **بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔**} اس آیت کو دوبارہ ذکر کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک تنگی کے بعد دو سہولتیں اور آسانیاں ہیں۔حضرت حسن رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں ”ایک دن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ (اپنے کاشانۂ اقدس سے) خوشی اور سُرُور کی حالت میں مسکراتے ہوئے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا ”ایک تنگی دو

آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آئے گی، تو بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ (مستدرک، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الم نشرح، ۳ / ۳۸۰، الحدیث: ۴۰۰۴)

"خزانہ، سانپ، پھول، کانٹا، غم اور خوشی ایک ہی ہیں" اس دنیا میں "عسر" اور "یوسر" ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:

"العسر، یسرا کے ساتھ" یہ یسرہ کی مشکل کے ساتھ ہے۔ (سورہ انصرہ، 5-6)

وہ جگہ جہاں سعادت دائمی اور مستحکم ہے وہ جنت ہے اور فردوس میں بسنے کے بعد اہل جنت کی زبان یہ ہے: "الحمدللہ الذی اذھب انا الحزن"، (فاطر، 34) اس دنیا میں، "رانوں کے گرد" اور گردن" اور غم اور خوشی ایک ساتھ ہیں:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَؕ-اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۴)

اور وہ کہیں گے سب خوبیاں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بیشک ہمارا رب بخشنے والا، قدر فرمانے والا ہے۔

{وَقَالُوا: اور وہ کہیں گے۔} یعنی جنت میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی حمد کرتے ہوئے کہیں گے: سب خوبیاں اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے ہمیں جنت میں داخل کرکے ہم سے غم دور کر دیا۔ اس غم سے مراد یا دوزخ کا غم ہے، یا موت کا، یا گناہوں کا، یا نیکیوں کے غیر مقبول ہونے کا، یا قیامت کی ہَولناکیوں کا، غرض انہیں کوئی غم نہ ہوگا اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کریں گے اور کہیں گے کہ بیشک ہمارا رب عَزَّوَجَلَّ بخشنے والا اور قدر فرمانے والا ہے کہ گناہوں کو بخشتا ہے اگرچہ گناہ بہت زیادہ ہوں اور نیکیاں قبول فرماتا ہے اگرچہ نیکیاں کم ہوں۔ (روح البیان، الملائکۃ، تحت الآیۃ: ۳۴، ۷ / ۳۵۳-۳۵۲، خازن، فاطر، تحت الآیۃ: ۳۴، ۳ / ۵۳۶، مدارک، فاطر، تحت الآیۃ: ۳۴، ص ۹۸۰، ملتقطاً)

نوٹ: رومی کی تقریر کا ایک بڑا حصہ "توحید" اور "شیخ کامل کے بارے میں ہے۔

انسانوں کے لیے سب سے سخت اذیت قید تنہائی ہے، کیونکہ وہ خود اس کا سامنا کرتے ہیں۔

عام طور پر راستے پر چلنے والا سالک وقتاً فوقتاً تھک جاتا ہے اور شیخ اس کی تھکن دور کرنے کے لیے اسے زندگی کا پانی پلاتا ہے تاکہ اس میں اپنا سفر جاری رکھنے کا جوش پیدا ہو۔

صوفیانہ طریق میں عموماً شیخ نیندیا روشنی کے ذریعے سالک کو توانائی دیتا ہے تا کہ سالک تھک نہ جائے اور جناب رومیؒ مثنوی کتابوں میں کہانیاں سنانے لگتے ہیں تا کہ سننے والا تھک نہ جائے۔

کیونکہ یہ اشعار خود شناسی ہیں، بیت بہ بیت، اور خود شناسی میں درد اور تکلیف ہوتی ہے، اور اس تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے، مولاناؒ نے کہانی نما اشعار لکھے اور ان کہانیوں کے پیچھے سالک کو خود شناسی کا سبق دیا۔

جناب رومیؒ اس کہانی کی پہلے شعر میں کہتے ہیں، دوستو یہ کہانی سنو، یہ ہمارے موجودہ حالات پر تنقید ہے۔ یہ کہانی اس دنیا میں ہماری موجودہ صورتحال پر تنقید ہے۔ تنقید اس دنیا میں انسانی حالت ہے اور بادشاہ بیمار ہے۔ بادشاہ کو ایک نوکرانی سے محبت ہو گئی ہے جو ایک سنار کی محبت میں گرفتار ہے۔

ہم وہ بادشاہ ہیں جو اس دنیا میں اپنے سفر کے ایک حصے میں ایک نوکرانی سے پیار کرتے ہیں، نوکرانی اس دنیا سے ہمارے تعلق کا مجسمہ ہے۔ ہم نے پیسے دے کر لونڈی خرید لی اور بدقسمتی سے لونڈی بیمار ہو گئی۔ اس دنیا کے تمام رشتے ایسے ہی ہیں اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ غلط ہوتا ہے

بادشاہ سب سے پہلے اس لونڈی کا علاج کرنے کے لیے دنیا کے ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے اور جب ان سے کچھ کام نہیں بنتا اور بادشاہ کی امید ڈاکٹروں سے بالکل منقطع ہو جاتی ہے تو وہ ننگے پاؤں اور آنکھوں میں آنسو لیے مسجد اور قربان گاہ کی طرف جاتا ہے۔ خواب میں وہ اسے خوشخبری دیتے ہیں کہ کل تمہارے پاس ایک شیخ آئے گا کہ وہ ہم میں سے ہے۔ بادشاہ کل شیخ سے ملتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا اصل عاشق اور حقیقی ضرورت تو مرد پیر ہے نہ کہ نوکرانی۔

لونڈی: لونڈی، کیا اس دنیا کے سارے رشتے ہیں کہ ہم ان رشتوں کو راستے میں کہیں دیکھتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں اور ان دنیاوی رشتوں کے غلام ہیں؟

ہر ایک کی اپنی ترجیحات ہیں۔ تعلیم، رتبہ، عہدہ، عزت، دولت، حتیٰ کہ عورت سے اتنی ہی محبت، یہ سب ایک لونڈی کے مظاہر ہیں؟ کنواری ہمارے تمام دنیاوی رشتوں کا مجسمہ ہے؟ کیا نوکرانی واقعی ہماری انا کی علامت ہے؟ وہ تو ہماری خدمت کے لیے آئی ہے، لیکن کیا واقعی ہم ہی ہیں جنہوں نے دنیا اور اپنی روح کی دنیاوی خواہشات کی خدمت کی ہے؟ نوکرانی نے تو ہماری خدمت کرنی تھی لیکن اس لیے کہ ہم نے لونڈی کو دنیا دی اور ہم لونڈی بن گئے۔

استعارات

شاہ = روح

دنیاوی خواہشات اور دنیاوی لذتوں کا سنار

کنیزک = نفس عمارہ

عقل - خدا کی آیات کی نشانیاں

طبیب یا حکیم - ایک الٰہی طبیب جو باطنی طور پر شفا دیتا ہے۔

وہ خدا کا نمائندہ ہے جسے خدا کے راز ملے ہیں۔

ماضی میں ایک بادشاہ تھا جو اس دنیا میں حکومت کرتا تھا اور اس کے پاس دوسری دنیا اور مافوق الفطرت دنیا کی بہت سی نعمتیں تھیں اور دوسرے لفظوں میں اس بادشاہ کو دونوں جہانوں کی خوشیاں حاصل تھیں۔ آخرت کی دنیا میں، اس کتاب کا مطلب یہ ہے کہ انسانی روح میں قابلیت اور قابلیت ہے جو دونوں جہانوں کی خوشیاں حاصل کر سکتی ہے۔

جانئے - خدا آپ کو خوش رکھے - کہ جب بھی انسان اپنے باطن کو صاف کرتا ہے اور دل کے آئینہ کو صاف کرتا ہے تو وہ آسمانی فرشتوں کے پاس جائے گا، کیونکہ آسمانی فرشتے پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں اور علم و پاکیزہ ہوتے ہیں۔

اے درویش! انسانی روح آسمانی فرشتوں سے تعلق رکھتی ہے اور ایک خالص جوہر ہے لیکن اس کو بدن نے آلودہ اور تاریک کر دیا ہے۔ جب وہ جسمانی لذتوں اور شہوتوں کو ترک کر کے علم و طہارت حاصل کر لے گا اور اپنے اندر اور باہر کو پاک کر لے گا اور دل کے آئینہ کو صاف کر لے گا تو وہ دوبارہ پاک و صاف ہو جائے گا۔ جب وہ پاک اور صاف ہو گیا تو اس کی روح کا موازنہ آسمانی فرشتوں سے کیا گیا۔ جب موقع ملے تو انہیں دو واضح آئینے کی طرح ایک دوسرے کا سامنا کرنے دیں۔ جو اس میں ہے وہ اس میں پائے گا اور جو کچھ اس میں ہے وہ اس میں ظاہر ہو گا اور یہ ملاقات جاگتی زندگی میں بھی ہو گی اور خواب میں بھی تھی خواب میں تو بہت ہوں گے مگر تھوڑا بیدار زندگی میں. اور بیداری میں یہ ملاقات خوشی اور الہام کا سبب تھی اور خواب میں یہ نیند کی نیند کا سبب تھی۔

اس قصے کو مثنوی کے اس حصے میں اور نے کے اشعار کے بعد سنانے کی وجہ یہ ہے کہ رومیؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نی کی واپسی کے لیے جو اپنے وجود سے الگ ہو گئی تھی یا دوسرے لفظوں میں اس کی واپسی کے لیے۔ روح کو اس دنیا کی طرف جانا چاہیے، جہاں سے وہ جدا ہوئی تھی۔ روح کو اس بلند دنیا تک پہنچنے کے لیے دنیاوی رکاوٹوں اور رشتوں کو عبور کرنا چاہیے جس میں بادشاہ اور اس کے خادم کی محبت ایک اشارہ اور راز ہے۔

مُرغِ جانَش دَر قَفَس چُوُن می طَپید

دادمال و آن کَنیزَک راخرید

مرغ جانش: اس کی جان۔۔۔ قفس: پنجرہ۔۔۔ می طپید: تم نے شکست دی

ترجمہ: چونکہ اس کا طائرِ جان جسم کے پرندے میں عشق سے جل رہا تھا۔ اس لئے اس نے پیسے دے کر کنیز کو خرید لیا۔

صوفی ادب میں روح کو پرندے سے اور جسم یا مادی زندگی کو پنجرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس نظم میں پرندہ اس درجہ کمال تک نہیں پہنچا ہے کہ وہ سچائی کی طرف اڑنا چاہتا ہے اور پھر بھی جسم سے جکڑا ہوا ہے۔ جسمانی ضروریات. کیونکہ بادشاہ کی روح پنجرے میں پھڑ پھڑا رہی تھی اس لیے اس نے پیسے دے کر اسے خرید لیا۔

پرانے زمانے میں شادیاں خریدی جا سکتی تھیں۔ یعنی پیسے دیے اور لڑکی لے گئے۔ آج کل بھی بعض جگہ ایسا ہوتا ہے۔

جب بادشاہ نے لونڈی کا مالک بن کر اس سے رشتہ کیا تو کچھ عرصہ بعد لونڈی بیمار پڑ گئی!

ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ ایک بنیاد غائب ہے: اس کا مطلب ہے کہ آپ کو لگتا ہے کہ اس دنیا میں لذت مکمل نہیں ہے اور 100 فیصد تک نہیں پہنچتی!

مشکل دیگر ہم بر ایتان رومی شود!

و اینھا قانون نانوشتہ جہان ہستی است.

جب بھی آپ کی کوئی خواہش ہوتی ہے اور پھر آپ اسے حاصل کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ خواہش آپ کے لیے معمول بن گئی ہے اور آپ کو کچھ اور پریشانیاں بھی پیش آئیں گی۔

اور یہ کائنات کے غیر تحریری قوانین ہیں...

چون خرید او را و بَرخوردار شُد
آن کَنیزک از قضا بیمار شُد

چوں: چونکہ۔۔۔ خرید او: اسے خریدا۔۔۔ آن کنیزک: وہ لونڈی۔۔۔ از قضا بیمار شد: ستم ظریفی سے بیمار ہو گئی

کیونکہ اس نے اسے خریدا اور اس سے لطف اندوز ہوا۔

وہ نوکرانی ستم ظریفی سے بیمار ہو گئی۔

جس کے پاس گھڑا تھا لیکن پانی نہیں تھا اور جو پانی ملا اس نے گھڑا توڑ دیا! اور یہ تفصیل بد قسمت لوگوں کا حال بیان کرتی ہے اور اس سے مراد وہ بادشاہ ہے جسے اب محبت مل گئی ہے اور اس کی محبت بیمار ہو گئی ہے!

ایک چیز ملنے سے ہم دوسری چیز سے محروم ہو جاتے ہیں

ان دو تمثیلوں کا مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز ملنے سے ہم دوسری چیز سے محروم ہو جاتے ہیں جیسے بادشاہ کو لونڈی مل گئی لیکن اس کی بیماری کی وجہ سے وہ اس کے تعلق سے محروم ہو گیا کیونکہ اس میں پوری لذت نہیں ملتی۔ "لات مارنے" سے مراد وہ اضطراب اور تکلیف ہے جو بادشاہ کو پہنچی اور اس کے نتیجے میں اس نے لونڈی کو خرید لیا۔

جب بادشاہ نے اس لونڈی کو خرید لیا اور اس کے تعلق سے لطف اندوز ہوا تو وہ لونڈی بیمار پڑ گئی۔ اس وقت جب بادشاہ کسی جگہ پر حملہ کرتے تھے تو وہ یا تو معذور افراد کو چھوڑ دیتے تھے یا انہیں مار دیتے تھے اور اپنے ساتھ ایسے نوجوانوں کو لے آتے تھے جو انہیں

محنت مزدوری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، اس شخص کی صحت کو یقینی بنانے کے لیے، وہ جانور کی طرح اس کے دانت گنتے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا وہ اچھی طرح سے کھا سکتا ہے اور اسے کوئی بیماری ہے یا نہیں...

اگر وہ مرد ہوتا تو اسے کھیتوں اور فوج میں استعمال کرتے اور اگر وہ عورت ہوتا تو اسے جنسی طور پر استعمال کرتے اور اگر اس عورت سے ان کا کوئی بچہ ہوتا تو بھی وہ اس کی طرف نظر نہیں کرتے۔ ایک بیوی، لیکن ایک نوکرانی اور غلام کے طور پر، ایک شے کے طور پر، انہوں نے بیٹے کو وراثت میں حصہ دیا، اور بیٹا تجارت اور اپنی ماں کو بیچ سکتا تھا، جو اسے صرف ایک غلام کی طرح ہی دیکھتی تھی! لوگوں کو غلام کے طور پر استعمال کرنے کی وجہ نظریات کا فرق تھا۔

طاقتور حکومتیں دوسرے ممالک سے ایسے لوگوں کو اپنے ملک میں لے آتیں جو ان کے نظریے کے خلاف تھے۔

وہ لڑکوں کو ایک ڈاکٹر اور بابا کی انتہائی تکلیف دہ سرجری کے ذریعے نامرد بناتے اور پھر جنسی معاملات میں ان کی نااہلی کی وجہ سے گھر میں ان کا بھروسہ کیا جاتا اور وہ گھر کے معاملات سنبھالتے۔

افسوسناک بات یہ ہوئی کہ ملک میں بچگانہ غلامی بہت مشہور ہوگئی جس کا ذکر جناب حافظ نے بھی اپنے دیوان میں کئی بار کیا ہے جس کا تذکرہ حافظ کی تفسیر روحانی میں ہے۔

ہزارستان سیریز کی آخری اقساط میں غلام بچہ نام کا ایک کردار بھی ہے۔

خوش قسمتی سے، لوگوں کے شعور میں اضافہ ہوا کہ سب کو احساس ہوا کہ ہر ایک کو انسانی حقوق حاصل ہیں۔

انسانی حقوق، جو اب ہمارے ہاتھ میں ہیں، بہت قیمتی ہیں کیونکہ ان کے لیے خون بہایا گیا ہے، اور بہت سے لوگوں کو تکلیف در تکلیف پہنچی ہے تاکہ لوگ انسانی حقوق کو سمجھیں۔

انسان بیداری کے میدان میں اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ آج جانوروں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پچھلے دس سالوں تک جانوروں کو بالکل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا اور انہیں مقابلوں میں پریشان کن طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن آج، لوگ جبلی طور پر ترقی کر چکے ہیں اور ایک دوسرے کو بہتر جانتے اور احترام کرتے ہیں۔ کیونکہ سب کچھ زیادہ شفاف ہو گیا ہے۔

لہٰذا، لونڈی وہ ہے جو قابل فروخت شے ہے اور اس کی شکل انسانی ہے، اور معاشرہ اس کو کوئی حقوق نہیں دیتا

سابقہ ادوار میں غلامی کا مسئلہ مکمل طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور لوگ اس کے بارے میں جانے بغیر جہالت میں مبتلا تھے۔

لہٰذا ہمیں اپنی آنکھیں کھولنی چاہئیں اور ہوش سے کام لینے کی کوشش کرنی چاہیے اس سے پہلے کہ کسی بھی قسم کا نظارہ ہماری پیشانی پر داغ لگ جائے۔

جناب رومیؒ محبت میں پڑنے کے عمل کو کہانیوں کی شکل میں بتاتے ہیں۔ اور اس قسط میں بادشاہ خود رومیؒ ہے اور لونڈی بھی وہ محبت ہے جو رومیؒ کے دل میں ہوئی تھی۔ بے شک بادشاہ ہم میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کے پاس ریاست ہو اور وہ مکمل حفاظت میں ہو۔ لیکن ایک جگہ وہ اچانک اپنا دل ہار بیٹھتا ہے اور بادشاہ کے راستے میں آنے والی ایک لونڈی سے محبت کرتا ہے۔

فارسی ادب میں لفظ شاہ کی بہت اہمیت ہے۔ اکثر بزرگوں کے نام کے آگے لفظ "شاہ" لگا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مرکزی سڑکیں شاہراہیں کہلاتی ہیں اور اس شعر میں شاہ رومیؒ کی زندگی کی شاہراہ مراد ہے۔

ہائی وے وہ جگہ ہے جہاں راستے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ تو بادشاہ کی شاہراہ ایک نوکرانی کا انتخاب ہے جس سے بادشاہ کو پیار ہو جاتا ہے۔

آن یکی خَر داشت و پالانَش نبود

یافت پالان، گُرگ خَر رادَر رُبود

آن یکے: وہ ایک۔۔۔ خر داشت: گدھا رکھتا تھا۔۔۔ پالانش بود: اسے کے پاس پالان نہ تھا۔۔۔ یافت پالان: پالان پایا۔۔۔ گرگ: بھیڑیا۔۔۔ خررادر ربو: گدھے کو لیکر رفوچکر ہوا

ترجمہ: ایک شخص گدھا رکھتا تھا مگر اس کے پاس پالان نہ تھا۔ لیکن جب پالان ملا تو گدھے کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔

مولاناؔ گونڈی کو کیوں ذلیل کرتے ہیں؟

کیونکہ وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ نوکرانی کو کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں تھا اور جو محبت ہوئی وہ اس درجہ کی نہیں تھی۔

جب آپ کسی رشتے میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو آپ پہلے یہ تحقیق کرتے ہیں کہ دوسرا فریق بھی آپ جیسا ہی ہے لیکن شادی میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا جو آپ چاہتے تھے۔

لہٰذا مماثلت اچھے رشتے کی ضمانت نہیں ہوتی اور بعض اوقات محبت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور لوگ بلاوجہ اور بغیر مماثلت کے پیار کرتے ہیں۔

یہاں، نوکرانی اچانک بادشاہ کے دل میں آجاتی ہے اور بادشاہ کی روح بن کر اس کا دل چرا لیتی ہے...

یعنی مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس گدھا تھا، لیکن پالنا نہیں، جیسے ہی اس نے پالا تیار کیا، ایک بھیڑیا آیا اور گدھے کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

کوزہ بودَش، آب می نامد بہ دست

آب را چون یافت، خودُ کوزہ شِکَست

کوزہ: برتن۔۔۔ بودش: اس کے پاس۔۔ آب: پانی۔۔۔ می نامد بہ دست: اس کے ہاتھ پانی نہ آیا۔۔۔ اب را چوں یافت: جب پانی دریافت ہوا۔۔۔ خود کوزہ شکست: برتن ٹوٹ گیا

ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک جگ تھا، لیکن اس نے جتنا بھی تلاش کیا، اسے پانی نہ ملا، اور جیسے ہی اسے پانی ملا، اس کا جگ ٹوٹ گیا۔

مذکورہ بالا دو تمثیلیں اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے استعمال کی گئی ہیں کہ اس دنیا میں کسی بھی لمحے انسان اپنے مقصد کو مکمل طور پر حاصل نہیں کرتا اور تمام پہلوؤں سے اس کا مقدر نہیں بنتا۔

کیونکہ انسان کے ہمیشہ ادھورے خواب ہوتے ہیں اور ہر خواہش لذت اور ناکامی اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔

شہ طبیبان جمع کرد از چَپّ و رَاست

گُفت جانِ ہر دو دَر دستِ شُماست

شہ: بادشاہ۔۔۔طبیب: حکیم۔۔۔۔چپ: بایاں۔۔۔راست: دایاں۔گفت: کہا۔۔۔دست شما: تمہارے ہاتھ میں

ترجمہ: الغرض بادشاہ نے دائیں بائیں سے حکماء کو جمع کیا اور ان کو کہا میری جان (لونڈی) تمہارے ہاتھ میں ہے۔

بادشاہ نے جب دیکھا کہ کنیز بے حد بیمار پڑ گئی ہے تو اس نے شاہی طبیب اکٹھے کئے اور انہیں کہا کہ اب دیکھیں کہ میری کنیز سخت بیمار ہے اس کی جان تو آپ کے ہاتھ میں ہے ہی پر یاد رکھنا کہ یہ اس کی جان نہیں بلکہ میری جان آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اگر اسے کچھ ہوا تو سمجھیں کہ میں گیا؟

وہ تمام طریقے اور مکاتب جو انسانوں کے ساتھ سلوک کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اس دلیل سے نابلد ہو سکتے ہیں اگر ان کا تعلق وحی کے ماخذ اور عام وجہ اور عمومی عقل سے نہ ہو۔ اس دنیا کے ڈاکٹر ہزار دعوے لے کر آتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک آفاقی مسیح ہے اور ہر بیماری کو اپنے پیروں پر ٹھیک کرتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر، اس دنیا کے تمام طریقے، تکنیک اور طریقے استعمال کر سکتے ہیں جو ہماری مدد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی حقیقت میں کچھ نہیں کرتا کیونکہ ان کے علاج کا طریقہ خدا کا طریقہ نہیں ہے اور وہ خدا کے وحی اور الہام کے ذریعہ سے منسلک نہیں ہیں۔

جانِ من سَہْل است، جانُ جانَم اوست

دَرد مند و خستہ ام، دَرمانَم اوست

جان من: میری جان۔۔۔ سہل: آسان۔۔۔ خستہ: کمزور

میری زندگی آسان ہے، میری زندگی اس کی ہے، میں درد اور تھکا ہوا ہوں، میرا علاج اس کا ہے۔

بادشاہ کہتا ہے کہ میرے لیے زیادہ فکر نہ کرو اور مجھے چھوڑ کر اس کا خیال رکھنا۔

ایک اچھی چیز جو ہمیشہ محبت میں ہوتی ہے وہ قربانی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے لیے انتھک کچھ بھی کر لیتا ہے لیکن جب بھی اس کی محبت میں کمی آتی ہے تو وہ محبوب کے لیے اپنے نیک اعمال اور عفو و درگزر کا اظہار کرتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک محبت ہوتی ہے لوگ قربانیاں دیتے ہیں لیکن جب محبت ختم ہو جاتی ہے تو فضیلت اور پیائش فرو ہو جاتی ہے۔

جب تک لوگ محبت میں ہیں، وہ فیاض اور معاف کرنے والے، لاپرواہ، بے لوث اور مہربان لوگ بن جاتے ہیں۔

یہاں بادشاہ کہتا ہے کہ میری جان اس کی ہے۔

فارسی ادب میں زندگی کا مطلب جسم کے علاوہ کچھ بھی ہے...

ہر کہ دَرمان کرد مَرجانِ مرا
بُرد گنج و دُرّ و مَرجانِ مرا

ہر کہ: کوئی بھی۔۔۔ درمان: درست کرنا، مرجان: یہاں مر زائدہ ہے مراد (محبوبہ)،،، برد: جیت۔۔۔ گنج: خزانہ۔۔ مرجان: موتی، جواہرات وغیرہ

ترجمہ: جس نے میری جان (محبوبہ) کو علاج سے تندرست کر دیا وہ میرے موتی، جوہرات کے خزانے لینے کا حقدار ہو گا۔

بادشاہ نے طبیبوں سے کہا: میری جان لونڈی کی زندگی کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن در حقیقت میری جان میری جان ہے اور میں ایک درد مند اور تھکا ہوا انسان ہوں اور وہی میرا علاج ہے۔

میری روح ایک لونڈی ہے اور اگر اس کا علاج کیا جائے تو میری درد مند اور تھکی ہوئی روح کا علاج آسانی سے ہو جائے گا اور لونڈی کے علاج سے یہ بھی ٹھیک ہو جائے گی (تم ڈاکٹر اس کا علاج کرو تا کہ میرا بھی علاج ہو جائے)۔

طالب کو کچھ مانگنے کے لیے کچھ اور کھونا پڑتا ہے

تم میں سے ہر ایک (طبیب) لونڈی کو شفا دیتا ہے جو میری زندگی کی نمائندگی کرتی ہے، اس عمل میں اس نے ایک خزانہ، ایک جواہر اور ایک اچھا موتی حاصل کیا ہے، جناب رومیؒ یہاں یہ واضح کرتے ہیں کہ طالب کو کچھ مانگنے کے لیے کچھ اور کھونا پڑتا ہے، جو کہ ایک لین دین ہے اور یہاں تک کہ خدا نے جنت کے سامنے کہا،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَؕ-یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ۫-وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِؕ-وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖؕ-وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۱۱) (توبہ)

بیشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بدلے میں خرید لئے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو قتل کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔ یہ اس کے ذمہ کرم پر سچا وعدہ ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوشیاں مناؤ جو سودا تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

{اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى: بیشک اللہ نے خرید لئے۔} اس آیت میں راہِ خدا میں جان و مال خرچ کرکے جنت پانے والے ایمان داروں کی ایک مثال بیان کی گئی ہے جس سے کمال لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالَم عَزَّوَجَلَّ نے انہیں جنت عطا فرمانا اُن کے جان و مال کا عوض قرار دیا اور اپنے آپ کو خریدار فرمایا یہ کمال عزت افزائی ہے کہ وہ ہمارا خریدار بنے اور ہم سے خریدے۔ کس چیز کو؟ وہ جو نہ ہماری بنائی ہوئی ہے اور نہ ہماری پیدا کی ہوئی۔ جان ہے تو اس کی پیدا کی ہوئی اور مال ہے تو اس کا عطا فرمایا ہوا۔ (مدارک، التوبۃ، تحت الآیۃ: ۱۱۱، ص۴۵۶، ملخصاً)

شانِ نزول: جب انصار نے رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے شبِ عَقبہ، بیعت کی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے عرض کی کہ یا رسولَ اللہ! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے لئے اور اپنے لئے کچھ شرط فرما

لیجئے جو آپ چاہیں۔ ارشاد فرمایا ’’میں اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے لئے تو یہ شرط کرتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لئے یہ کہ جن چیزوں سے تم اپنے جان ومال کو بچاتے اور محفوظ رکھتے ہو اس کو میرے لئے بھی گوارا نہ کرو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ’’ہم ایسا کریں تو ہمیں کیا ملے گا؟ ارشاد فرمایا ’’جنت۔ (خازن، التوبۃ، تحت الآیۃ: ۱۱۱، ۲ / ۲۸۴)

{وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ: یہ اس کے ذمہ کرم پر سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں۔} یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں سے جو وعدہ فرمایا ہے وہ جس طرح قرآن میں موجود ہے اسی طرح تورات اور انجیل میں بھی تھا۔ (خازن، التوبۃ، تحت الآیۃ: ۱۱۱، ۲ / ۲۸۴)

یہاں لونڈی حاصل کرنے کے لیے۔، بادشاہ اپنا خزانہ اور زیورات دیتا ہے (سالک کو کچھ حاصل کرنے کے بدلے میں کچھ اور چھوڑ دینا چاہئے)۔

جُملہ گُفتَندَش کہ جانبازی کُنیم
فَہم ِگرد آریم واَنبازی کُنیم

جملہ: تمام۔۔۔ گفتندش: انہوں نے کہا۔۔۔ جانبازی: جان پر کھیل کر۔۔۔ گرد آوردن: جمع کرنا۔۔۔ انبازی: شرکت، ساتھ

ترجمہ: سب حکیم ایک زبان بولے اس اس سے کہنے لگے کہ ہم اس سلسلہ میں اپنی مقدور بھر کوشش کریں گے مل کر سوچ سمجھ کر کام کریں گے۔

تمام ڈاکٹروں نے بادشاہ کو بتایا کہ ہم دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں، ہم اپنے خیالات کو ایک ساتھ ڈال رہے ہیں اور ہم اس کے علاج کے لیے تعاون کر رہے ہیں، شراکت دار بن رہے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔

فہم سے مراد ہے

- عقل، خرد، سمجھ، سمجھ بوجھ
- ادراک، دریافت، علم، سمجھنا، ادراک حاصل کرنا

ذاتی تجربے یا مقبول حکمت پر مبنی علم،

عقائد اور وضاحتوں کا مجموعہ، جو ایک برادری کے ذریعہ مشترکہ ہو اور یہ کہ وہ سمجھدار، منطقی اور درست سمجھے جاتے ہوں۔

عام فہم، خیال پر مبنی ہے **یہاں اصولوں، اقدار، افکار اور طرز عمل کا ایک سلسلہ ہے جو پورے معاشرے کے اشتراک سے ہو اور** سب کے لئے مشترک ہو۔

یہ ہماری روز مرہ کی زندگیوں میں، ذاتی تجربات سے یا مشترکہ تجربات سے بے ساختہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح، یہ اصولوں اور اقدار، روایات اور عقائد، زیادہ سے زیادہ اور اقوال کی شکل میں بھی نسل در نسل منتقل ہو۔

فہم کی تین اقسام ہیں

۱۔ فہمِ غیر شعوری

دراصل جبلت کے تحت سرزد ہونے والے اعمال و افعال کا دوسرا نام ہے۔ یہ فہم جانوروں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر بہت سی باتیں جانتے ہیں۔ بطخ کا بچہ پہلے دِن جانتا ہے کہ اُسے پانی کے تالاب میں کُود جانا ہے۔ چُوزہ جانتا ہے کہ چیل کی آواز سنتے ہی ماں کے پروں تلے چھپ جاتا ہے۔ چوپایوں کے بچے گھنٹے کے اندر اندر ماں کے تھنوں کو خود ہی ڈھونڈ کر دودھ پینا شروع کر دیتے ہیں۔ انسانوں میں بھی فہمِ غیر شعوری ہم انہی جبلی اعمال کو ہی کہیں گے۔ اگرچہ انسان کا بچہ سانپ کو پکڑ کر منہ میں ڈال سکتا ہے۔ انگاروں سے ہاتھ جلا سکتا ہے۔ چیل، کوّے، کتے بلی سے خوف اُس کی جبلت کا حصہ نہیں۔ دوسرے جانوروں کے بچوں کے مقابلے میں انسان کا بچہ رونا جانتا ہے۔ اُس کی مہارتیں عام جانوروں سے مختلف ہونا ضروری ہیں کیوں کہ اسے دو پاؤں پر چلنا ہے۔ من دو من کے وزنی وجود کو دو ستونوں پر سہارنا اور پھر مشکل سے مشکل حرکات و سکنات سرانجام دینا خاصی سرکس کا کام ہے جو انسانی ہے۔ اسی مہارت کو سیکھتے سیکھتے انسانی بچہ دو تین سال لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی بچے کی ایسی عادات جنہیں جبلت

کہا جائے یا میری ترکیب کی رُو سے فہم غیر شعوری کہا جائے بظاہر بہت کم ہیں، لیکن پھر بھی ہیں۔ رونا، ہنسنا، مسکرانا، نقلیں اُتارنا اور طرح طرح کے مبہم الفاظ بولنا جبلی اعمال ہی ہیں۔ اسے جسمانی سے کہیں زیادہ نفسیاتی زندگی گزارنا ہوتی ہے سو فطرت نے اس کے لیے ایسی جبلتوں کا انتظام کیا ہے جو اس کی نفسیاتی زندگی کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔ رونا، ہنسنا، مسکرانا، نقلیں اتارنا اور مبہم الفاظ بولنا یہ سب نفسیاتی کیفیات کا جسمانی اظہار ہیں۔

فہمِ غیر شعوری پیدائش کے ساتھ ہی کسی نوع کے افراد میں موجود ہوتا ہے۔

۲۔ فہمِ شعوری

یہ صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ دراصل مقامِ ادراک ہے۔ فہمِ شعوری تمام کا تمام، "معلومات" بھی کہلاتا ہے، یعنی جاننا۔ جب ہم کسی اور سے کچھ سنتے ہیں یا معاشرے سے سیکھتے ہیں تو ہمیں شعوری طور پر اشیا کا ادراک ہوتا ہے۔ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں معلوم ہے کہ سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے، سو یہ ہے وہ فہم جو شعوری طور پر ہمیں حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقط شعوری فہم سے انسان اِس قابل نہیں ہو جاتا کہ اس کے اعمالِ جسمانی میں تبدیلی آجائے۔ مثلاً ایک چھوٹے بچے کو آپ زبانی طور پر سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ "یہ آگ ہے، آگ پر ہاتھ جل جاتا ہے۔" آپ اُسے مختلف طریقوں سے ڈرا دیں اور وہ آگ کے نزدیک نہ جائے تو ہم کہیں گے کہ اس نے فقط فہمِ شعوری کی بدولت اپنا عمل بدل دیا۔ فہمِ شعوری صرف تھیوری ہوتا ہے۔ یہ پریکٹس میں آتے ہی فہمِ حقیقی بننا شروع ہو جاتا ہے۔

۳۔ فہمِ حقیقی

یہ فہمِ شعوری کے مرحلے سے گزرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ گویا تھیوری (فہمِ شعوری) کا پریکٹکل ہے۔ فرض کریں ہم نے ایک بچے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ، "یہ آگ ہے، اس پر ہاتھ جل جاتا ہے۔" لیکن اس بچے نے ہماری بات نہیں مانی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کا ہاتھ آگ پر جل گیا۔ اب گویا اسے فہمِ حقیقی حاصل ہو گیا۔ اب وہ دوبارہ کبھی آگ میں ہاتھ نہ ڈالے گا۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فہمِ حقیقی مقامِ انکشاف ہے۔ فہمِ حقیقی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے حصول سے عمل میں لازمی طور پر تبدیلی آجاتی ہے۔

تو طبیبوں نے تمام طریقہ ہائے فہم استعمال کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ لیکن فراست کے بارے کچھ نہ کہا

پانچ غیر مادی ذرائع

فراست علم کے پانچ غیر مادی ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جو حواس خمسہ کے بغیر حاصل ہوتا ہے پہلا درجہ "فراست" دوسرا "حدس" تیسرا "کشف" چوتھا "الہام" اور پانچواں درجہ "وحی" کا ہے۔

دلوں کی باتوں یا لوگوں کے حالات پر اللہ کے نور سے آگاہ ہونا فراست کے معنی ہماری زبان میں "تاڑ جانے" کے ہیں اور تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور علم کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والا ایسا سمجھتا ہے کہ گویا وہ غیب کی باتیں بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانیوں پر مبنی ہوتا ہے اور فراست کا ملکہ نیک و بد دونوں میں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناخواندہ فراست کا ملکہ رکھتے ہیں اور بعض خواندہ فراست کے ملکہ سے بالکل کورے ہوتے ہیں کیونکہ روح بہر حال دونوں میں موجود ہوتی ہے اور نیک و بد کی فراست میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ نیک فراست نیک اور بد کی نیک نہیں ہوتی نبی اعظم و آخر سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد عالی ہے کہ (اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ) (ترمذی) مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی روشنی سے دیکھتا ہے۔

توطبیب کیا فراست کو استعمال کریں گے؟ کہ فہم تک ہی رہیں گے؟

ہر یکے از ما مَسیحِ عالَمے ست

ہر اَلَم را در کَفِ ما مرہَمے ست

ہر: کوئی۔۔۔یکے: ایک۔۔ مسیح: عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ کسی کوڑھی کو ہاتھ لگاتے تو صحت یاب ہو جاتا۔ یا کسی کو دم کرتے تو وہ صحت یاب ہو جاتا۔ اسی صفت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر طبیب کو مسیحؑ سے تشبیح دی گئی۔

عَالَم: جہاں۔۔۔الم: دکھ، تکلیف، مرض۔۔ در کف: ہاتھ میں۔۔ مرہمے: مرہم کے ساتھ

ڈاکٹروں نے بادشاہ کو جواب دیا کہ ہم میں سے ہر ایک مسیحا ہے جو کسی بھی بیماری کو آسانی سے شفا دیتا ہے اور ہمارے پاس ہر درد کا علاج ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک عیسیٰؑ کی حکمت و طاقت کا حامل ہے۔ جنھوں نے مردوں کو زندہ کیا، الم کا مطلب ہے درد اور تکلیف اور ہم کسی بھی تکلیف اور تکلیف کا علاج کر سکتے ہیں، ایک بار پھر، اس آیت سے مراد وہ قرآنی آیات ہیں جو عیسیٰ سے متعلق ہیں، جنھوں نے اندھے کو دیکھا اور مُردوں کو زندہ کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے حکم سے، میں پیدائش سے اندھے کو شفا دوں گا اور مردوں کو دوبارہ زندہ کروں گا، اور کوڑھی جو سفید ہو جاتا وہ بلکل تندرست ہو جائے ہو جائے گا۔ بقول سعدیؒ

گر خدا خواہد نگفتند از نظر

پس خدا بود شان عجز بشر

اگر خدا نخواستہ رائے سے کہے گا۔

تو سمجھ لیجئے کہ خدا کی شان کے سامنے انسان عاجز ہے۔

تمام ڈاکٹروں نے کہا کہ ہم لونڈی کے علاج کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور ہم لونڈی کے علاج میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور آپس میں مشورہ سے عمل کرتے ہیں۔ ہمارے پاس بیماری کے علاج میں اتنی مہارت ہے اور ہم میں سے ہر حضرت

عیسیٰؑ کے علم کی طرح عقلمند ہے جس کے پاس ہر درد کی دوا اور علاج ہے (حقیقت میں، ڈاکٹروں نے اپنے علم اور شفا کی طاقت پر بھروسہ کیا اور خدائی طاقت کو بالکل نہیں مانا، اس کی ایک اور وجہ ہے۔ کہ وہ ڈاکٹر صرف جسم کے ڈاکٹر تھے)

ڈاکٹر اور طبیب کے پاس اس دنیا کے تمام طریقے، تکنیک اور طریقے ہو سکتے ہیں جو ہماری مدد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی حقیقت میں کچھ نہیں کرتا کیونکہ ان کے علاج کا طریقہ خدا کا طریقہ نہیں ہے اور وہ خدا کے وحی اور الہام کے ذریعہ سے منسلک نہیں ہیں۔

وہ تمام طریقے اور مکاتب جو انسانوں کے ساتھ سلوک کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اس دلیل سے نابلد ہو سکتے ہیں اگر ان کا تعلق وحی کے ماخذ اور عام وجہ اور عمومی عقل سے نہ ہو۔ اس دنیا کے ڈاکٹر ہزار دعوے لے کر آتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک آفاقی مسیح ہے اور ہر بیماری کو اپنے پیروں پر ٹھیک کرتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ دوائی ایک میڈیم ہے نہ کہ شفاء۔ شفاء من جانب اللہ ہوتی ہے۔

تب سے دعویٰ شروع ہوا!

فخر واقعی کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے ؟؟؟؟؟؟

باباؤں نے کہا کہ ہم سب ایسے ہیں اور ہم ایک مسیح کی طرح اس کے درد کا علاج کر سکتے ہیں!

مسیح کے پاس شفایابی کی جگہ ہے اور یاد رکھیں کہ شفا دینے والے (طبیب) کو اپنے آپ کو مسیح نہیں سمجھنا چاہیے۔

اگر آپ زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتے ہیں تو براہ کرم اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھیں۔

معمولی رہو اور اپنے آپ کو اعلیٰ مقام پر مت سمجھو!

شدیداً انسان را کم هوش میکند.

جهان هستی هم با آدم مغرور نمی سازد و او را به زمین می زند.

قابلیت حاصل کریں اور اسے روز بروز بڑھائیں لیکن غرور کے دیو میں نہ پھنسیں کیونکہ غرور انسان کو بہت کمزور بنا دیتا ہے۔

کائنات انسان کو مغرور نہیں کرتی اور اسے گرا دیتی ہے۔

نردبان این جهان ما و منی است

عاقبت این نردبان افتادنیست

لاجرم هر کس سہ بالاتر نشست

استخوانش سخت تر خواهد شکست...

اس دنیا کی سیڑھی میں او ہم ہیں۔

اس سیڑھی کا اختتام گر رہا ہے۔

لامحالہ، جو بھی اونچا بیٹھتا ہے، گرتا ہے

اس کی ہڈیاں سخت ٹوٹ جائیں گی...

بزرگوں نے ہمیشہ کہا ہے کہ جب تم زمین پر چلو تو غرور کے ساتھ مت چلو اور یہ محسوس کرو کہ زمین ایک جاندار ہے جو تمہیں رزق دیتا ہے اور زمین پر ہمیشہ عزت اور شائستگی کے ساتھ چلو کیونکہ یہ عاجزی کا سبب بنتا ہے اور اس سے آپ کے اعمال بہت آسان طریقے سے آگے بڑھتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ اپنا کام زور سے کریں گے تو وہ مقبول ہوں گے، لیکن کائنات مغرور لوگوں کو انعام نہیں دیتی۔ آپ جتنے عاجز ہوں گے اتنے ہی کامیاب ہوں گے۔

مثال کے طور پر جب آپ کسی میٹنگ میں داخل ہوں تو شائستگی اور احترام سے پیش آئیں، مدد کریں، برتن دھوئیں اور یہ نہ کہیں کہ یہ میری جگہ نہیں، اگر آپ ایسا سلوک کریں گے تو کائنات آپ کو پسند کرے گی۔ عام طور پر نوجوان اپنی سوچ کے آغاز میں اپنے والدین کو متعصب سمجھتے ہیں، لیکن انہیں محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو ادنیٰ اور خود کو اونچا نہ سمجھیں۔

لوگ بعض اوقات اپنی حاصل کردہ نئی معلومات کی وجہ سے مغرور ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں جو کہ ایک انتہائی قابل مذمت رویہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بزرگ، والدین اور دوسرے لوگ غلط برتاؤ کریں، لیکن ان کے ساتھ غرور اور خود پسندی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے۔

براہ کرم بحث نہ کریں، دوسروں کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کی لڑائی نہ کریں

متکبر لڑتا ہے اور عاجز آدمی کم پڑ جاتا ہے اور کام کرتے ہوئے اپنے مقام سے تکبر نہیں کرتا۔

انسان کس چیز پر مغرور ہو سکتا ہے؟ حسن پر؟ ابلتا تیل تو بہت بڑی چیز ہے، ابلتا دودھ بھی سارے حسن کو غارت کرنے کیلئے کافی ہے۔ دولت پر؟ یہ ایسی بے وفا محبوبہ ہے جسے کہیں قرار نہیں، آج آپ کے لاکر کی زینت تو کل میرے گلے کا طوق، پرسوں ہم دونوں کو طلاق دے کر کسی اور کے ساتھ آشنائی کرے۔ جوانی یا توانائی پر؟ روز ڈھلتے سورج سے کوئی تو سبق حاصل ہونا چاہئے۔ ذہانت وعلم پر؟ ارسطو اور سقراط سب کچھ تھے مگر مغرور نہیں۔ عہدہ؟ کس کا باقی رہا؟ کل جن پر حکم چلاتے تھے ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن انہیں کی خدمت میں حاضر ہو کر پنشن کیس نپٹوانا ہے! الغرض فانی چیزوں پر غرور کیونکر؟ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ یا تو اللہ کا عطا کردہ ہے یا ہم نے غلط راستوں سے اس کو ہتھیا لیا ہے۔ دونوں کو ہم سے چھیننے کا کلی اختیار اللہ کے ہاتھ میں۔ جس چیز میں دوام نہیں اس پر غرور کرنا انتہائی پست درجے کے لوگوں کا کام ہے۔

غرور چونکہ ایک شیطانی صفت ہے اسلئے یہ انسان سے اس کی انسانی صفات چھین لیتا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھ کر ان سے بے اعتنائی اور کنارہ کشی اختیار کرنا اس کا پہلا لازمی نتیجہ ہے۔ اس طرح انسان دوسروں کی محبت، رفاقت اور نیک مشوروں سے محروم ہو جاتا ہے۔ خود اس کے اندر چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سماج سے الگ تھلگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ وقت ضرورت اسے اپنی خود پر عائد کردہ تنہائی کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن "اب کیا پچھتانا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"؟

ابتدائے آفرینش سے منتہائے کائنات تک سب سے زیادہ باسعادت شخصیت اور عجز

انسانی تاریخ میں جو عظیم ترین ہستی وجود میں آئی ہے اور تا قیام قیامت جس کا ثانی پیدا نہیں ہو گا وہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفی کی ذات بابرکت ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آپ ابتدائے آفرینش سے منتہائے کائنات تک سب سے زیادہ باسعادت شخصیت ہیں۔ ان تمام انعامات اور اکرام کے باوجود جو

اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ پر عنایت فرمائیں، آپ کا اپنے رب کے سامنے انکساری کا یہ عالم تھا کہ راتوں طویل قیام و سجود سے پائے نازنین میں ورم ظاہر ہو جاتا اور لوگوں کے ساتھ تعلق کا عالم یہ کہ جب کوئی آپ سے ہم کلام ہو جاتا تو صرف اپنا روئے انور اس کی طرف نہیں کرتے بلکہ اپنے پورے جسم مبارک کو اس کی طرف موڑ دیتے۔

آپ نے ہمیں تعلیم دی کہ تکبر صرف اللہ کو زیب دے سکتا ہے کیونکہ اس کی صفات ازلی ہیں، کوئی ان کو چھین نہیں سکتا اور اس کے کمالات کو کوئی زوال نہیں۔ بندے تکبر میں گھر جائیں تو ابدی عذاب میں مبتلا ہونگے۔ چنانچہ اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتا جس میں رتی برابر بھی غرور ہو! یہاں تک کہ لباس سے بھی اگر غرور کا اظہار ہو جائے تو اس پر زبردست وعید فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا۔ "اللہ اس شخص کی طرف قیامت کے روز نگاہ نہیں کرے گا جو اپنا چوغہ تکبر میں پیچھے سے زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلے۔" حضرت ابو بکر نے عرض کیا۔ "میرے چوغہ کا ایک سرا لٹک ہی جاتا ہے جب تک کہ میں اس کے بارے میں بے حد احتیاط نہ کروں۔" تو آپ نے فرمایا۔ "لیکن آپ ایسا تکبر کی بنا پر نہیں کرتے ہیں۔" (صحیح بخاری)

اللہ نے اپنے کلام میں جگہ جگہ متکبرین کو وعید سنائی ہے اور ان کیلئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔ غرور کا چور دروازہ انسان کے اندر صرف یہ معمولی سا احساس ہے کہ میں کسی معاملے میں کسی سے برتر ہوں۔ یہ احساس جہاں شروع ہوا سمجھ لیجئے کہ شیطان نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔

ہمیں ہر وقت اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم فانی، ہمارے پاس جو کچھ وہ بھی فانی۔ فانی پہ غرور؟ کمال گمراہی! اپنے کو اوروں سے کم تر سمجھنے میں ہی عافیت ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں برتری یا ابتری کا فیصلہ ہی کیا ہو گا۔ فیصلہ تو یوم

الفصل کو ہو گا۔ کیا معلوم اس دن کون بار گاہ خداوندی میں مقبول ہو اور کون معتوب۔ اللہ ہمیں غرور اور تکبر کے ادنیٰ شائبے سے بھی بچائے۔ آمین

تو یہاں ڈاکٹروں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہم کسی بھی درد کا علاج کر سکتے ہیں اور لگتا ہے کہ یہ ڈاکٹر نعروں اور آزاد باتوں کے لوگ تھے!

گر خُدا خَواہَد نگُفتَند از بَطَر

پَس خُدا بِنمود شَان عَجْزِ بَشَر

گر خدا خواہد:: اگر اللہ نے چاہا یعنی ان شاء اللہ۔۔۔ بَطَر: تکبر، غرور۔۔۔ عجز: عاجزی، بے بسی

ترکیب: گر خدا خواہد مقولہ دوسرے مصرعہ میں بنمود کا فاعل خدا اور شان اور عجز بشر مفعول بہ

ترجمہ: ان حکیموں نے تکبر میں آکر ان شاء اللہ نہ کہا تو خدا نے ان کو انہی کی انسانی کمزوری دکھا دی

ایک اور نکتے پر دلالت کرنے کے لیے مولانا رومؒ ان طبیبوں کا تعارف کراتے ہیں جن کو اپنے علم کی طاقت پر بڑا بھروسہ ہے اور وہ خود کو عالمگیر مسیحا بھی سمجھتے ہیں اور کسی عمل کو انجام دینے میں بیماری کے علاج کے لیے ان کی مرضی کو کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ ان میں سے ایک شرط ہے۔ کسی بھی کام کے حصول کے لیے انسان کی مرضی ہوتی ہے لیکن حصول کے اسباب ضرور فراہم کیے جاتے ہیں (یہ اسباب انسانی نظروں سے پوشیدہ ہیں) اور یہ ڈاکٹر جنہوں نے غفلت کی وجہ سے اپنے علم پر بھروسہ کیا اور خدا کی عطا کو یاد نہیں رکھا۔ دلوں میں اس لیے خدا نے بیماری کے علاج کے لیے ان کی عاجزی اور عجز ظاہر کر دیا۔

اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں: فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (١٥٢) (بقرۃ)

تو تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

یاد رہے:

ذکر کی اقسام

ذکر تین طرح کا ہوتا ہے:۔ **(۱)** زبانی۔**(۲)** قلبی۔**(۳)** اعضاءِ بدن کے ساتھ۔

زبانی ذکر میں تسبیح و تقدیس، حمد و ثناء، توبہ و استغفار، خطبہ و دعا اور نیکی کی دعوت وغیرہ شامل ہیں۔

قلبی ذکر میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنا، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی عظیم قدرت کے دلائل میں غور کرنا داخل ہے نیز علماء کا شرعی مسائل میں غور کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

اعضاءِ بدن کے ذکر سے مراد ہے کہ اپنے اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے بلکہ اعضاء کو اطاعتِ الٰہی کے کاموں میں استعمال کیا جائے۔(صاوی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۵۲، ۱/۱۲۸)

بطر ایک قسم کی فخریہ خوشی اور ایک قسم کی لذت ہے جس میں انا اور غرور ہے۔

امام راغب اصفہانی عَلَیْہِ رَحْمَۃُ اللہِ الْغَنِی لکھتے ہیں: ”تکبر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھے۔ جس کے دل میں تکبر پایا جائے اسے ” مُتَکَبِّر “ اور مغرور کہتے ہیں۔

اللہ عَزَّوَجَلَّ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے: (اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ(۲۳)) (پ۱۴، النحل: ۲۳) ”بیشک وہ مغروروں کو پسند نہیں فرماتا۔“

ایک اور مقام پر فرماتا ہے: (وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًاۚ-اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا(۳۷))(پ۱۵، بنی اسرائیل: ۳۷) ”اور زمین میں اتراتا نہ چل بیشک تو ہرگز زمین نہ چیر ڈالے گا اور ہرگز بلندی میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا۔“

کافر متکبرین کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:(فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاؕ-فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ(۲۹))(پ۱۴، النحل: ۲۹) ”اب جہنّم کے دروازوں میں جاؤ کہ ہمیشہ اس میں رہو تو کیا ہی برا ٹھکانا مغروروں کا۔“

حدیث مبارکہ، متکبرین کے لیے بروز قیامت رسوائی:

حضور نبی کریم رؤف رحیم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”قیامت کے دن متکبرین کو انسانی شکلوں میں چیونٹیوں کی مانند اٹھایا جائے گا، ہر جانب سے ان پر ذلت طاری ہو گی، انہیں جہنم کے بُولَس نامی قید خانے کی طرف ہانکا جائے گا اور بہت بڑی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ان پر غالب آجائے گی، انہیں طِیْنَۃُ الْخَبَال یعنی جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔“ ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، ج۴، ص۲۲۱، حدیث: ۲۵۰۰۔

تکبر کی تین قسمیں اور ان کا حکم

(1)... ”اللہ عَزَّوَجَلَّ کے مقابلے میں تکبر۔“

تکبر کی یہ قسم کفر ہے جیسے فرعون کا کفر کہ اس نے کہا تھا: (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى(۲۴) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى(۲۵))(پ۳۰، النّٰزعات: ۲۴۔ ۲۵) ”میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں تو اللہ نے اسے دنیا و آخرت دونوں کے عذاب میں پکڑا۔“

فرعون کی ہدایت کے لیے اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حضرت سیِّدُنا موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت سیِّدُنا ہارون عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو بھیجا مگر اس نے ان دونوں کو جھٹلایا تو رب عَزَّوَجَلَّ نے اسے اور اس کی قوم کو دریائے نیل میں غرق کر دیا۔ الحدیقۃ الندیۃ، البحث الثانی من المباحث۔۔۔الخ، ج۱، ص۵۴۹۔

مفسرین کرام رَحِمَہُمُ اللّٰہُ السَّلَام فرماتے ہیں: ”اللہ عَزَّوَجَلَّ نے فرعون کو مرے ہوئے بیل کی طرح دریا کے کنارے پر پھینک دیا تاکہ وہ باقی ماندہ بنی اسرائیل اور دیگر لوگوں لیے عبرت کا نشان بن جائے اور ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ جو شخص ظالم ہو اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی جناب میں تکبر کرتا ہو اس کی پکڑ اس طرح ہوتی ہے کہ اسے ذلت واہانت کی پستی میں پھینک دیا جاتا ہے۔“ لزواجر، الباب الاول فی الکبائر۔۔۔الخ، ج۱، ص۱۷۔

(2)... ”اللہ عَزَّوَجَلَّ کے رسولوں کے مقابلے میں تکبر۔“

تکبر کی یہ قسم بھی کفر ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ تکبر جہالت اور بغض وعداوت کی بنا پر رسول کی پیروی نہ کرنا یعنی خود کو عزت والا اور بلند سمجھ کر یوں تصور کرنا کہ عام لوگوں جیسے ایک انسان کا حکم کیسے مانا جائے ، جیسا کہ بعض کفار نے حضور نبی کریم رؤف رحیم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے بارے میں حقارت سے کہا تھا: (اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ

رَسُوْلًا (۴۱)) (پ۱۹، الفرقان: ۴۱) ”کیا یہ ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا۔“ اور یہ بھی کہا تھا: (لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱)) (پ۲۵، الزخرف: ۳۱) ”کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر۔“

(3)..."بندوں کے مقابلے میں تکبر۔"

یعنی اللہ عَزَّوَجَلَّ اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے علاوہ مخلوق میں سے کسی پر تکبر کرنا، وہ اس طرح کہ اپنے آپ کو بہتر اور دوسرے کو حقیر جان کر اس پر بڑائی چاہنا اور مساوات یعنی باہم برابری کو ناپسند کرنا۔ یہ صورت اگرچہ پہلی دو صورتوں سے کم تر ہے مگر یہ بھی حرام ہے اور اس کا گناہ بھی بہت بڑا ہے کیونکہ کبریائی اور عظمت بادشاہ حقیقی عَزَّوَجَلَّ ہی کے لائق ہے نہ کہ عاجز اور کمزور بندے کے۔

اللہ کے بندے جو بھی کامیاب اقدام کرتے ہیں، فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی تھی اور اسے اپنی طرف منسوب نہیں کرتے، کیونکہ دکھاوے کے لوگوں میں ناکامی کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ لوگ جو اپنا کام خود کرتے ہیں لیکن دکھاوا نہیں کرتے۔ وہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر وطبیب اپنے غرور اور پیسے کی محبت کی وجہ سے جوش میں آگئے اور خدا ان کو ان کی کمزوری دکھانا چاہتا تھا کہ علاج اور شفاء خدا کے اختیار میں ہے۔

آپ کی سوچ اس بات کا تعین کرتی ہے کہ کسی چیز یا دوا کے اندرونی توانائی کے پیکج کیسے رکھے جائیں گے۔ جب انسان مغرور ہوتا ہے تو ذرات کی کوانٹمی حالت بھی بگڑ جاتی ہے اور نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

طرز ایرانی

تَرکِ اِسْتِثْنا مُرادَم قَسْوَتی ست

نہ همین گفتن، کہ عارِضْ حالَتی ست

تَرکِ اِسْتِثْنا مُرادَم قَسْوَتے ست
نے ہمیں گفتن، کہ عارِضُ حالَتے ست

استثنیٰ کا مطلب ہے کہ اللہ کی مرضی یعنی ان شاء اللہ کہنا۔۔۔ماردام: میرا مطلب ہے۔۔۔ قسوت: سنگدلی۔۔۔۔عارض: نا پائندار۔۔۔

صنائع: دوسرے مصرعہ میں کلمہ "نے" رجوع کے لئے ہے۔ لطیف نکتہ کے لئے استعمال میں آتا ہے

ترجمہ: ان شاء اللہ نہ کہنے سے مراد سیاہ دلی ہے۔ زبانی طور پر ان شاء کہنا بھی دل کی سختی کی طرف نشاندہی کرتا ہے اگرچہ یہ عارضی حالت ہی ہے۔

روحانی لوگ ہمیشہ ایسی بات نہیں کرتے جس میں یہ اظہار ہو کہ یہ میں نے ہی کیا، بلکہ وہ اپنے الفاظ میں "خدا کی مرضی" کا استعمال کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ ہمیشہ اندر سے خدا سے جڑے رہتے ہیں اور اپنا کام خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔

کام کو اللہ پر چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنا کام چھوڑ دیں، بلکہ اللہ کی مرضی کہہ کر ہم اس کام کے پیچھے ایک عزم کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں، اس طرح ایک مضبوط توانائی اللہ کریم کی طرف سے مدد کی صورت میں میسر آجاتی ہے۔

"انشاءاللہ" نہ کہنے سے مراد "دل کی سختی" ہے، ورنہ اس پاک جملے کو صرف کہنا مقصود نہیں ہے، ظلم اور سختی کو ترک کیے بغیر، اس کا اظہار ایک عارضی کیفیت ہے۔

اوپر والے فقرے میں رضائے الٰہی نہ کہنے کی مذمت کا اظہار کیا گیا ہے، بصورت دیگر یہ جملہ نہ کہنا ایک عارضی حالت ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔

ظلم کا مطلب دل کی سختی ہے جو کہ ایک پتھر کی مانند ہے اور اگر طالب نے دل کو پالش نہ کیا ہو تو دل میں یہ پتھر موجود رہتا ہے۔

اللہ تعالی قادر مطلق ہے، ہر کام اس کی مشیئت سے انجام پذیر ہوتا ہے۔ ہر کام میں اس سے استعانت طلب کرنا شریعت کا مطلوب ہے۔ یہی درس دینے کے لیے قرآن کریم میں (6) مقامات پر ان شاء اللہ کا کلمہ وارد ہوا ہے۔ سورۃ التکویر میں ہے۔ (وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العلمین) (التکویر: 27) یعنی اور تم تو تب ہی چاہو گے کہ جب اللہ چاہے گا، جو تمام جہان کا رب ہے۔ پیر کرم شاہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تم از خود اس کی خواہش بھی نہیں کر سکتے جب تک توفیق الٰہی دستگیری نہ کرے، فہم و خرد کے سارے چراغ بجھے رہتے ہیں، راہ راست پر ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا، جب اس کی نظر لطف چارہ سازی کرتی ہے تو سب حجاب اٹھ جاتے ہیں، ساری رکاوٹیں دور جاتی ہیں انسان پوری یکسوئی کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالی اپنے محبوب مکرم ﷺ کا خود ہی معلم، خود ہی مربی اور خود ہی مؤدب ہے۔ چنانچہ سورۃ الکھف میں نبی اکرم ﷺ سے یوں خطاب فرمایا ہے۔ (ولا تقولن لشیء انی فاعل ذلك غدا الا ان یشاء الله...الخ) "اے حبیب ﷺ! اگر آپ یہ ارادہ کریں کہ کل آپ فلاں کام کریں گے تو یوں مت کہو کہ کل میں ایسا کروں گا"۔ اس سے "ان شاء اللہ" کہنے کی اہمیت واضح ہوئی کہ اگر امام الانبیاء ﷺ کو بھی یہ حکم ہے کہ ہر کام میں ان شاء اللہ ضرور فرمایا کریں تو یہاں سے ہمیں اندازہ لگانا ہو گا کہ بارگاہِ رب العزت میں اس پر کتنی تاکید فرمائی گئی ہے۔ بلاشبہ کسی کے پاس وسائل کی کتنی فراوانی ہو اگر اللہ تعالی نہ چاہے تو اس کی ساری مساعی بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہر چیز کے وقوع پذیر ہونے کا انحصار اسی کی مشیت پر ہے۔

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کا قصہ بیان ہوا ہے جب اللہ تعالی نے انہیں ایک جرم کی پاداش میں ایک مخصوص حلیہ والی گائے جو چند صفات سے متصف ہو، ذبح کرنے کا حکم دیا تو وہ اسے قریہ قریہ تلاش کرتے رہے ایسا کرنے میں انہیں بڑی دقت بھی ہوئی اور کامیابی بھی حاصل نہ ہوئی لیکن جب انہوں نے کلمہ "ان شاء اللہ" کہا تو ان کو اللہ کی طرف سے راہنمائی حاصل ہوئی اور بالآخر مطلوبہ گائے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ قرآن کریم میں ان کا حال یوں بیان ہوا ہے۔ (قالوا ادع لنا ربك یبین لنا ما هی ان البقر تشبه علینا وانا ان شاء الله لمهتدون) یعنی آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں یہ بیان کرے کہ اس کے اوصاف کیسے ہیں؟ بے شک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت پا جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ یہ کلمہ نہ کہتے تو قیامت تک یہ معاملہ ان پر واضح نہ ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ان شاء اللہ کہنے کی برکت سے کام جلدی اور بطریق احسن مکمل ہوتا ہے کیونکہ جب تک انہوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا گائے تک نہیں پہنچ پائے۔ قرآن میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ وعدہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔(قَالَ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعۡصِیۡ لَکَ اَمۡرًا) کہا عنقریب اللہ چاہے تو تم مجھے صابر پاؤ گے اور میں تمہارے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔(الکہف:69)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یاجوج وماجوج ہر روز (اپنی دیوار) کھودتے ہیں یہاں تک کہ جب قریب ہوتا ہے کہ سورج کی روشنی ان کو دکھائی دے تو جو شخص ان کا سردار ہوتا ہے وہ کہتا ہے: اب لوٹ چلو (باقی) کل کھودیں گے، پھر اللہ تعالیٰ اسے ویسی ہی مضبوط کر دیتا ہے جیسی وہ پہلے تھی، یہاں تک کہ جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی، اور اللہ تعالیٰ کو ان کا خروج منظور ہو گا، تو وہ (عادت کے مطابق) دیوار کھودیں گے جب کھودتے کھودتے قریب ہو گا کہ سورج کی روشنی دیکھیں تو اس وقت ان کا سردار کہے گا کہ اب لوٹ چلو، ان شاء اللہ کل کھودیں گے، اور ان شاء اللہ کا لفظ کہیں گے، چنانچہ (اس دن) وہ لوٹ جائیں گے، اور دیوار اسی حال پر رہے گی، جیسے وہ چھوڑ گئے تھے، پھر وہ صبح آ کر اسے کھودیں گے اور اسے کھود کر باہر نکلیں گے (سنن ابن ماجہ:4080)

وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ۫ وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ وَقُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّہۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ ہٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

اور ہر گز کسی چیز کے متعلق نہ کہنا کہ میں کل یہ کرنے والا ہوں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب تم بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کر لو اور یوں کہو کہ قریب ہے کہ میرا رب مجھے اس واقعے سے زیادہ قریب ہدایت کا کوئی راستہ دکھائے۔

{اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ: مگر یہ کہ اللہ چاہے۔} یہاں دو آیتوں میں اسلامی تعلیمات کی ایک بنیادی چیز بیان فرمائی کہ مسلمان کو چاہیے کہ اپنے ارادے میں اِنْ شَاءَ اللّٰہ ضرور کہا کرے، چنانچہ فرمایا گیا کہ اور ہر گز کسی چیز کے متعلق نہ کہنا کہ میں کل یہ کرنے والا ہوں مگر ساتھ ہی یہ کہا کرو کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ چاہے تو میں کرلوں گا، مراد یہ ہے کہ جب کسی کام کا ارادہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ اِنْ شَاءَ اللّٰہ ایسا کروں گا، بغیر اِنْ شَاءَ اللّٰہ کے نہ کہے۔ اِس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے جب روح، اَصحابِ کہف اور حضرت ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کیا تھا تو حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ کل بتاؤں گا اور اِنْ شَاءَ اللّٰہ نہیں فرمایا تھا تو کئی روز وحی نہیں آئی پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(خازن، الکہف، تحت الآیۃ:۲۳-۲۴، ۳/۲۰۷)

{وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ:اور جب تم بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرلو۔} حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں :اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اِنْ شَاءَاللہ کہنا یاد نہ رہے تو جب یاد آئے کہہ لو۔ یاد آنے کی مدت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں کہ اگرچہ ایک سال بعد یاد آئے اور امام حسن بصری رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا ہے کہ جب تک اس مجلس میں رہے، اِنْ شَاءَاللّٰہ کہہ لے۔(خازن، الکھف، تحت الآیۃ:۲۴، ۳/۲۰۷)

اس آیت کے معنی سے متعلق تفسیروں میں کئی قول مذکور ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آیت کا معنٰی یہ ہے ’’اگر کسی نماز کو بھول گیا تو یاد آتے ہی ادا کرلے۔(مدارک، الکھف، تحت الآیۃ:۲۴، ص۶۴۸) نماز کے بارے میں حضرت انس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا’’جو نماز پڑھنا بھول جائے تو اسے چاہئے کہ جب یاد آئے (اس وقت) نماز پڑھ لے، اس کا یہی کفارہ ہے۔(بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب من نسی صلاۃ فلیصلّ اذا ذکرہا۔۔۔ الخ، ۱/۲۱۷، الحدیث:۵۹۷)

{وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ:اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔} ’’تکویر:۲۹‘‘یعنی تم اللہ تعالیٰ کے چاہے بغیر کچھ چاہ بھی نہیں سکتے، تمہارا ارادہ اور چاہنا اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تابع ہے۔

آیت ’’وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ‘‘ سے معلوم ہونے والے مسائل

اس آیت سے 4 مسئلے معلوم ہوئے۔

(1)… انسان اپنے اختیاری کام میں مختار ہے۔

(2)… انسان کا اختیار مستقل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مَشِیَّت کے تابع ہے۔

(3)… دنیا کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی مَشِیَّت اور ارادے سے ہے مگر اس کی پسندیدگی سے نہیں۔

(4)… اللہ تعالیٰ بندے کے ہر کام کا ارادہ فرماتا ہے مگر اسے برے کام کی رغبت یا مشورہ نہیں دیتا بلکہ اس سے منع فرماتا ہے، برے کاموں کی رغبت ابلیس لعین دیتا ہے۔

خواجہ عبد اللہ انصاری فرماتے ہیں: "جاہلوں پر دل کا ظلم بے رحمی اور حق کی رحمت سے دوری ہے۔" اور دل کی طاقت سے عرفان کے حق میں! کہ جب کام کمال کو پہنچے گا اور پاکیزگی اور علم پختہ ہو جائے گا تو سارے ملک کے بادشاہ کی محبت روح کو سمیٹ لے گی اور نوحہ خوشی و مسرت کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

ایرانی طرز

ای بَسانا وَرْدہ اِسْتِثْنا بہ گفت

جانِ او با جانِ اِسْتِثْناست جُفت

پاکستانی طرز

اے بَسانا وَرْدہ اِسْتِثْنا بگفت

جانِ او با جانِ اِسْتِثْناست جُفت

بسا: بسا اوقات۔۔۔گفت: کہا۔۔۔جان او با جان: جان کے ساتھ اس کی زندگی۔۔۔استثنا: ان شاء اللہ کہنا۔۔۔جفت: متحد، دو دوسرے کلمہ میں صنعت مشاکلہ (دو مختلف چیزوں کا ذکر کیا جائے اور ان میں تشبیہ، استعارہ، محاورہ یا روز مرہ کے استعمال سے باہمی ربط ظاہر کیا جائے)

ترجمہ: اے (مخاطب) کئی دفعہ ایسا شخص دیکھنے میں آیا ہے جو زبان سے استثناء نہیں کہتا مگر اس کی جان استثناء کے معنی میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

روز مرہ کے معاملات میں ہر لمحہ استعمال ہونا والا یہ جملہ، جو کہ بے شمار اپنے اندر حکمتوں کو سموئے ہوئے ہے لیکن اس جملہ کے برعکس اس سے بے رغبتی اور نسیان (بھول) بہت بڑے چیلنج کا سامنا بن جاتی ہے، تعلیم امت کی خاطر ہمیں وہ مضمون جو "ان شاء اللہ" کے تحت قرآن پاک میں موجود ہے یاد آرہاہے جو کہ سورہ کہف میں مذکور ہے، ہر انسان کا عقل و قلب تحتِ قدرتِ الٰہی ہے.

ان شاء اللہ" کہنے کی اہمیت

"ان شاء اللہ" کہنے کی اہمیت واضح ہے کہ اگر امام الانبیاء ﷺ کو بھی یہ حکم ہے کہ ہر کام میں ان شاء اللہ ضرور فرمایا کریں تو یہاں سے ہمیں اندازہ لگانا ہو گا کہ بار گاہِ رب العزت میں اس پر کتنی تاکید فرمائی گئی ہے کہ پندرہ دن وحی نازل نہیں ہوئی، اس لئے ہر انسان کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانا ہو گا کہ ان شاء اللہ ضرور کہا کریں گے۔

اگر ہم اس کو دوسرے زاویے سے دیکھیں تو یہ ذکر الٰہی بھی ہے اور ذکر میں بھی وہ ذکر جس میں اسم ذات موجود ہے جو تمام صفاتی نام پر ہر لحاظ سے فضیلت رکھتا ہے جب کام اور وعدہ کے دوران ذکرِ الٰہی کیا جائے تو احادیث کی رو سے اس کام اور وعدہ میں دین و دنیا کی حسنات اور کام میں برکت و آسانی ہو جاتی ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو لفظ "انشاء اللہ" کہے بغیر ہی ان کی روح اس کی سچائی سے وابستہ ہو جاتی ہے، اس لیے وہ ہر معاملے کے وقوع پذیر ہونے کو خدا کی عطا پر منحصر سمجھتے ہیں۔ (صوفیانہ دنیا میں حقیقی موثر کو صرف وحدانیت کے طور پر جانتا ہے اور بس

قرآن کے معانی کا گہرا فہم کسی ایسے شخص سے سیکھنا چاہیے عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللَّهَ لَا ينظر إِلَى صور كُمْ وَلَا أموالِكم وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یقیناً اللہ تمہاری صورتوں اور اموال کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔" رواہ مسلم۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

القلب ملک والاعضاء جنودہ فاذا طاب الملک طابت جنودہ واذا خبث القلب خبثت جنودہ (التحفۃ العراقیۃ)

دل بادشاہ ہے اور اعضاء اسکی فوج۔ جب بادشاہ صحیح رہتا ہے تو فوج بھی صحیح ہوتی ہے اور جب بادشاہ بگڑ جائے تو فوج بھی بگڑ جاتی ہے
۔

دلوں کے بارے میں بحث کرنے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اکثر لوگ اپنے دلوں سے غافل ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر مدارس کے طلبہ باریک اور چھوٹی باتوں اور اعمال پر بحث کرتے ہیں اور ان میں عجیب و غریب قسم کی تفقہ کا اظہار کرتے ہیں مثلاً انگلی کو (نماز میں) حرکت دینا سنت ہے؟ کب اور کیسے حرکت دینی ہے......؟ اگر چہ ایسے مسائل پر بحث ضروری ہے مگر اس وقت جب لوگ ان سے بے پروائی کریں مگر اس سے زیادہ ضروری بحث دل کے بارے میں ہے کہ لوگ اس سے غفلت اختیار کر چکے ہیں۔

لوگوں کی اکثر مشکلات اور خصوصاً طلبہ علم کی پریشانیوں کا سبب وہ امراض ہیں جو دلوں کو لاحق ہیں یہ مشکلات ان بیماریوں کا اظہار ہے جو دلوں میں موجود ہیں مثلاً حسد، کینہ، تکبر، غرور، بدگمانی وغیرہ ان بیماریوں اور مشکلات و پریشانیوں کا حل یہ ہے کہ دلوں کا علاج کیا جائے ورنہ یہ امراض اسی طرح موجود رہیں گے اور وقتاً فوقتاً ان کا اظہار ہوتا رہے گا اگر ہم ایک نظر معاشرے پر ڈالیں اور لوگوں کی اجتماعی مشکلات کا جائزہ لیں لوگوں کے آپس کے اختلافات، مالی جھگڑے، اور دیگر معاملات پر نظر ڈالیں تو ہماری اس بات کا ثبوت مل جائے گا۔

دل کی سلامتی

دل کی سلامتی اس کا خلوص دنیاوی اور اخروی سعادت و خوش بختی کا سبب ہے بے ایمانی اور حسد جیسی بیماریوں سے دل کا محفوظ رہنا دنیا اور آخرت میں خوش بختی و اطمینان کا باعث ہے۔

بخاری و مسلم میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب

آگاہ رہو کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ صحیح رہتا ہے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔

اہل دانش کی نصیحت اور عبرت و موعظت کے لئے یہی بات کافی ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَخْرُجُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ رِجَالٌ يَخْتِلُونَ الدُّنْيَا بِالدِّينِ يَلْبَسُونَ لِلنَّاسِ جُلُودَ الضَّأْنِ مِنَ اللِّينِ، أَلْسِنَتُهُمْ أَحْلَى مِنَ السُّكَّرِ، وَقُلُوبُهُمْ قُلُوبُ الذِّئَابِ، يَقُولُ اللَّهُ: أَبِي يَغْتَرُّونَ، أَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِئُونَ؟ فَبِي حَلَفْتُ لَأَبْعَثَنَّ عَلَى أُولَئِكَ مِنْهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيمَ فِيهِمْ حَيْرَانَ"

(رواه الترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آخری زمانہ میں کچھ ایسے مکار لوگ پیدا ہوں گے جو دین کی آڑ میں دنیا کا شکار کریں گے، وہ لوگوں پر اپنی درویشی اور مسکینی ظاہر کرنے اور ان کو متاثر کرنے کے لیے بھیڑوں کی کھال کا لباس پہنیں گے، ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی، مگر ان کے سینوں میں بھیڑیوں کے سے دل ہوں گے، (ان کے بارے میں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، کیا یہ لوگ میرے ڈھیل دینے سے دھوکہ کھا رہے ہیں، یا مجھ سے نڈر ہر کر میرے مقابلے میں جرأت کر رہے ہیں، پس مجھے اپنی قسم ہے کہ میں ان مکاروں پر انہی میں سے ایسا فتنہ کھڑا کروں گا جو اُن کے عقلمندوں اور داناؤں کو بھی حیران بنا کے چھوڑے گا۔ (جامع ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ریاکاری کی یہ خاص قسم کہ عابدوں زاہدوں کی صورت بنا کر اور اپنے اندرونی حال کے بالکل برعکس اُن خاصان خدا کی سی نرم و شیریں باتیں کر کر کے اللہ کے سادہ لوح بندوں کو اپنی عقیدت کے جال میں پھانسا جائے، اور ان سے دنیا کمائی جائے، بدترین قسم کی ریاکاری ہے، اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اس دنیا میں بھی سخت فتنوں میں مبتلا کئے جائیں گے۔

جناب رومیؒ نے کتنی خوبصورتی اور نفسیاتی طور پر ان مختصر اشعار میں پچھلے شعر کے موضوع کی تصدیق کی ہے کہ ان شاء اللہ کہنا یا نہ کہنا، اللہ کی مرضی کے ساتھ ساتھ دل پر بھی منحصر ہے، زبان پر نہیں۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو رضائے الٰہی نہیں کہتے لیکن ان کے دل اس کی سچائی سے معمور ہیں جو معاملات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی مدد و نصرت پا لیتے ہیں۔

ہر چہ کردند از عِلاج واز دَوا

گشت رَنجُ اَفزون وحاجَت ُنارَوا

ہر چہ: ہر کسی نے۔۔۔ کردند: انہوں نے کیا۔۔۔ رنج: دکھ، تکلیف۔۔۔ افزوں: زیادہ

ترجمہ: ان طبیبوں اور حکماء نے جو بھی علاج ودوا کی اس سے بیماری اور زیادہ ہوگئی اور مقصد حاصل نہ ہوسکا۔

اس شعر میں، جناب رومیؒ نے اس بند کے موضوع کی وضاحت کی ہے "پس خدا نے انہیں انسان کی کمزوری دکھائی"۔ یعنی چونکہ انہوں نے خدا کی عطا کو نظر انداز کیا اس لئے انہیں کامیابی نہیں ملی۔

ڈاکٹروں نے کنیز کو ٹھیک کرنے کی کتنی ہی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے اور اس کی تکالیف میں اضافہ ہوتا گیا اور نتیجتاً بادشاہ کی خواہش پوری نہ ہوسکی کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی عطا کو نظر انداز کر دیا تھا اور وہ اپنی حکمت کے سحر میں مبتلا تھے۔

روز بروز نوکرانی کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی اور کوئی دوا اسے ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔ مسیحا ہونے کا دعویٰ کرنے والے ڈاکٹر کچھ نہ کر سکے!

کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے لیے سیدنا مسیحؑ، نبی اور شفا دینے والے کی جگہ پر اپنے آپ کو لا کھڑا کرے، حالانکہ جناب حضرت سیدنا عیسیٰؑ کے نعلین اٹھانے کا حق نہیں رکھتے۔

یہ سیدنا عیسیٰؑ اور انبیا مقدسہ ہی تھے جن کو اللہ جل شانہ نے مختلف معجزات سے نوازا تھا۔ یا اللہ کریم اپنے مخصوص اولیائے کاملین کو انبیائے مقدسہ کے فیض سے ہمکنار فرما دیتا ہے جس سے وہ بھی انہی خوبیوں سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ لیکن طبیب دعویٰ تو بڑا کر بیٹھے لیکن ہنوز دلی دور است!!!!!

قرآن مجید میں عیسیٰؑ کے معجزات میں سے چند ایک یوں بیان ہوئے۔

مٹی سے پرندہ بنا کر اللہ کے حکم سے زندہ کرنا:

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں ایک بات بھی ذکر فرمائی ہے کہ آپ مٹی سے ایک پرندے کی شکل بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ پرندہ اللہ کے حکم سے جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

سورۃ اٰل عمران، رقم الآیۃ: 49

ترجمہ: اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں اور وہ یہ کہ میں تمہارے سامنے گارے چکنی مٹی سے پرندے کی ایک شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ بے جان مٹی کا پتلا (اللہ کے حکم سے) جیتا جاگتا صحیح سالم پرندہ بن جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کے دو حصے ہیں

حصّہ اول:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا پہلا حصّہ مِٹّی سے پرندے کی شکل بنانا ہے مِٹّی کا ہر ذرّہ نقطہ ہے اس کے اندر حواس موجود نہیں ہیں۔ مِٹّی کے بے شمار ذرے مل کر ایک پرندے کا جسم بناتے یعنی بہت سارے نقطوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس سے پرندے کی PHYSICAL صورت بناتے تھے۔

حصّہ دوم:

مِٹّی کے پتلے یا پرندے میں پھونک مار دیتے تھے تو وہ اڑ جاتا تھا۔ پھونک مارنا رُوح پھونکنے کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح پھونکنے کے عمل کو امر ربی کہا ہے اور رُوح کو امر رب کا ایک حصّہ قرار دیا ہے۔ امر رب کی تعریف یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے۔ ہو جا۔ اور وہ ہو جاتی ہے۔ (سورۃ یسین)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اَمر ربی یعنی رُوح کا فارمولا بتایا ہے۔ کہ امر کے ارادے میں جب کوئی شے آتی ہے تو وہ کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب امر ربّی کی حیثیّت سے اللہ تعالیٰ کے اذن سے رُوح پھونکنے کا عمل کرتے ہیں تو خود آپ کی رُوح کی روشنیاں جو کہ امر ربی کی روشنی ہے۔ پھونک کے ذریعے مِٹّی کے ذرّوں کے خلاؤں میں بھر جاتی ہے۔ اور رُوح کی ہر روشنی

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی روشنی ہے یہ دائرہ یا CIRCLE ہے یعنی اس کے اندر TIME AND SPACE نہیں ہے یہ روشنی ENERGY کا کام کرتی ہے جیسے ہی یہ انرجی مِٹّی کے پتلے یا پرندے میں آتی ہے پرندہ حرکت میں آجاتا ہے یعنی اس کے اندر رُوح آجاتی ہے۔

اگر کوئی بندہ اس نیابت کو جو اللہ تعالیٰ نے اس کو ازل میں دی ہے اگر تلاش کرنا چاہے تو سب سے پہلے اس کے یقین میں یہ بات راسخ ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صفتِ رحیمی سے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے ازل میں آدم کو صفت رحیم بھی منتقل ہوئی ہے۔ سالک اگر اسم رحیم کا مراقبہ کرے یعنی وہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جائے کہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمی کا ضو ہے تو اس کے اوپر تخلیقی علم منکشف ہو جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس ہی اسم رحیم کا تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے کیا ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کے جانور میں پھونک مار کر اڑا دیا کرتے تھے یا پیدائشی اندھے یا کوڑھی کو
اچھا کر دیا کرتے تھے۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیارات سے اسم رحیم کی صفت کو عملاً جاری فرما دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کا تذکرہ کر کے تخلیق کا ایک فارمولہ بیان کیا ہے۔ تخلیقی فارمولہ یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی روح کام کر رہی ہے۔ جب تک انسان کے اندر یا آدم زاد کے اندر روح موجود نہیں ہے، آدم کا وجود نا قابل تذکرہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے اندر اپنی روح پھونک دی تو اس کے اندر حواس متحرک ہوئے۔

اسی سے

پیدائشی اندھے کی بینائی لوٹائی

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں ایک بات یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ آپ مادرزاد پیدائشی لاعلاج اندھے پر ہاتھ پھیرتے تو اللہ کے حکم سے اس کی بینائی آجاتی۔ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ

سورۃ اٰل عمران، رقم الآیۃ:49

ترجمہ: اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے کو تندرست کر دیتا ہوں۔

مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرنا

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں ایک بات یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ آپ مردوں کو مخاطب کر کے فرماتے کہ اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ تو وہ زندہ ہو جاتے تھے۔

وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ

سورۃ اٰل عمران، رقم الآیۃ:49

ترجمہ: اور میں مُردوں جس میں بظاہر زندگی کے آثار دکھائی نہ دیں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ سبحان اللہ!

مرورِ زمانہ کی ایک اور حقیقت ملاحظہ کریں کہ پہلے اگر لوگ موٹے ہوتے تو صحت مند ہوتے، اس کے بر عکس، اب جتنے پتلے ہیں، اتنے ہی صحت مند ہیں۔

قدیم زمانے میں، متعدی بیماریوں کا انسانی جسم کے ساتھ ایسا باہمی تعلق نہ تھا، اور انسانی خوراک جسم سے ہم آہنگ ہوتی تھی اور قدرتی طور پر، انسان صحت مند ہوتا تھا۔ لیکن جب اس کے الٹ عمل ہوتا تو پھر، اور وہ شخص جس کا جسم تنزلی کا شکار ہو چکا ہوتا تھا اور صحت مند جسم رکھتا تھا، وہ بیمار ہو کر دبلا پتلا ہو جاتا تھا۔ یہاں بھی مراد یہ ہے کہ نوکرانی بیماری کی وجہ سے بالوں کی طرح پتلی تھی۔

ایرانی طرز

آن کَنیزَک از مَرَض چون موی شُد

چَشمِ شَہ از اشکِ خونُ چون جوی شُد

پاکستانی طرز

آں کنیز از مرَض چوُں موئے شُد
چَشمِ شاہ از اشکِ خُونِ چوں جُوئے شُد

مو: بال۔۔۔ چشم شاہ: بادشاہ کی آنکھوں سے۔۔ اشک خوں: خون کے آنسو۔۔۔ جوئے شد: بہنا شروع ہو گئے۔ ندی کی طرح مبالغہ

ترجمہ: لونڈی بیماری کی شدت سے دبلی پتلی ہو گئی اور اس کے غم میں بادشاہ کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے لگے۔

ڈاکٹروں نے جتنی بھی کوشش کی لیکن کام نہ ہوا اور بیماری بڑھ گئی۔

بیماری کی شدت سے لونڈی ایسی دبلی پتلی ہو گئی کہ وہ ایک بال سے زیادہ نہ رہی اور بادشاہ کی آنکھیں خونی آنسوؤں کی طرح رواں ہو گئیں۔

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خون دل
غم کھاتے کھاتے منہ کا مزہ تک بگڑ گیا

از قضا سِر کنگبینُ صفُر افزود
روغَنِ بادامُ خُشکی می نِمود

سرکنگبین: سرکہ اور انگبین، جس کا مطلب ہے سکنجبین، ایک شربت ہے جو عام طور پر چینی اور سرکہ سے بنایا جاتا ہے اور بعض اوقات چینی کی جگہ شہد (انگبین) استعمال کیا جاتا ہے اور پرانے ڈاکٹر اسے صفرا (ایک مادہ ہے جو معدے میں پیدا ہوتاہے اور کھانے کے ساتھ مل کر اسے ہضم کرتا ہے زیادہ ہوجائے تو باعث بد ہضمی ہوجاتا ہے) کو خارج کرنے میں مفید سمجھتے ہیں۔

صفرا: چار مرکبات (پت، سودا، خون، بلغم) میں سے ایک جو گرم اور خشک بلغم ہے۔

بادام کا تیل: میٹھے بادام سے حاصل ہونے والا تیل جلاب ہے۔

ترجمہ: تقدیر سے سکنجبین نے صفرا کو زیادہ کیا اور روغن بادام نے خشکی کی۔

مطلب: ہر دوا مخالف پڑتی تھی اور اصول علاج ناکارہ ثابت ہو رہا تھا۔ چونکہ مولانا رومؒ یہاں طب کے دو اصولوں کو زیر بحث لائے ہیں اور عام قاری کو اس سے آگاہی نہیں لہذا ضروری ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔

ڈاکٹروں نے نوکرانی کو باقاعدہ جلاب دیا لیکن اس کا جسم کمزور ہو گیا اور سوکھ گیا اور نتیجہ اس کے برعکس نکلا جو حکمت کے اصول تھے جس میں جلاب ایک ایسا علاج ہے جو بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکماء کا قول ہے کہ معدہ درست، انسان تندرست۔ قبض ٹوٹا ہر بلا چھوٹا۔ قبض سینکڑوں بیماریوں کی جڑ ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی میں ان دونوں باتوں کا خیال رکھیں گے تو زندگی بھر بیمار نہ ہوں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

یونانی طرز علاج (unani treatment) جیسے کہ نام سے پتا چلتا ہے کہ علاج کا یہ طریقہ یونان میں دریافت ہوا۔ یونان میں (460-377) Physician Hippocrates اس طرز علاج کو متعارف کروانے والے پہلے معالج تھے۔ اسکے بعد ہندوستان میں بھی حکیم اجمل جیسے اعلیٰ پائے کی طبی ماہر گزرے۔ یونانی علاج دراصل علاج کا ایک ایسا منفرد طریقہ (ancient herbs) ہے جو آج کے اس جدید دور میں بھی مقبول ہے کیونکہ اس طریقہ علاج سے انسانی صحت پر کوئی برے اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اسلامی ممالک خاص کر پاکستان، ایران اور سعودی عرب جیسے ملکوں میں لوگ یونانی علاج کو بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ اس طریقہ علاج کو اسلامی طریقہ علاج کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

ربِ ذوالجلال نے جب اس کائنات کو تخلیق کیا تو ساتھ انسانوں کی بقا کے لئے کئی ایسے درخت اور پودے بھی زمین سے نکالے جن کی جڑی بوٹیوں میں اللہ نے شفا رکھ دی۔ اسی لئے پرانے دور میں حکیم اور طبیب علاج (unani treatment) کے لئے جڑی بوٹیوں

کا سہارا لیا کرتے تھے۔ دراصل جڑی بوٹی انسانی جسم میں پائے جانے والے ہارمونز کو متوازی رکھنے کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے اور کسی بھی بیماری کے جرثوموں کو ختم کرنے کے لئے قدرت نے ان جڑی بوٹیوں (ancient herbs) میں ایسی صلاحیت رکھی ہے جس کے استعمال سے نہ صرف مریض کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ بیماری کے بعد ہونے والی کمزوری سے بھی نجات حاصل ہوتی ہے۔

دراصل انسانی جسم میں موجود ہارمونز اگر متوازی ہوں تو انسان صحت مند اور توانا رہتا ہے۔ اللہ تعالی نے اس کائنات میں کئی ایسی معدنیات اور ذخائر رکھے ہیں جن سے آج کے اس جدید دور کے معالج بھی بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے یونانی طریقے (unani treatment) استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی جدید مثال حجامہ ہے علاج کے اس طریقہ سے آج بہت سے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ حجامہ کے ذریعے جوڑوں اور پٹھوں کے درد میں نمایاں کمی آتی ہے۔ ایلوویرا یہ کائنات میں اللہ کا دیا ہوا ایک انعام ہے ایلویرا میں اللہ نے کئی بیماریوں کی شفا رکھی ہے شوگر کا مرض ' جوڑوں کا درد' چہرے پر موجود دانے' کیل اور مہاسے کے علاوہ پیٹ کے امراض کا بھی خاتمہ ممکن ہے۔ آج کے دور میں جدید سائنس نے بھی ان طریقوں کو اپنا کر ادویات میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ مگر انگریزی طرز اور یونانی طرز میں ایک واضع فرق ہے انگریزی میں کیمیکل کا استعمال ہے دراصل انگریزی طریقہ علاج اُس وقت تک اثر نہیں کرتا جب تک اُس میں کیمیکل کی ایک مخصوص مقدار کو شامل نہیں کیا جائے جبکہ یونانی طریقہ علاج کی بنیاد ہی قدرتی اصولوں (ancient herbs) پر رکھی گئی ہے۔ مشہور فزیشن اور کیمسٹ الرازی' ابن سینا کی خدمات طب یونانی میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتابوں جن میں 'کو نٹینس' اور 'دی کینن آف میڈیسن' آج بھی دنیا بھر میں جہاں طب یونانی پڑھایا جا رہا ہے وہاں پر ان کتابوں کو نصاب کا حصہ بنایا ہوا ہے۔ بلکہ دور جدید میں بھی ان کتابوں کو سائنس دان ریسرچ کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

ایک بہت ہی کارآمد طبی نسخہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چہرے یا ہونٹوں کی جلد خشک ہو تو بادام کا تیل یا وایلیٹ فلاور آئل یا کوئی اور تیل ناف میں ڈال کر مساج کریں اور جلد کی خشکی فوراً دور ہو جائے گی۔

یہاں یہ بات بھی بے جا نہیں ہو گی کہ 1120ء میں ایک مسلمان طبیب اپنے مریض کے معائنے کے لیے جا رہا تھا۔ مریض اشبیلہ کا حکمران تھا۔ طبیب نے سڑک کے کنارے ایک دوسرا مفلس مریض پڑا دیکھا جس کے قریب پانی کا ایک گھڑا تھا، اس کا پیٹ سوجا ہوا تھا اور سخت تکلیف میں تھا۔

"کیا تم بیمار ہو؟" طبیب نے اس سے پوچھا اور بیمار آدمی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تم نے کیا چیز کھائی ہے؟"

"صرف روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے اور اس گھڑے سے پانی"

"روٹی تمھیں بیمار نہیں کر سکتی "طبیب نے کہا۔"ہاں پانی سے ممکن ہے۔ کہاں سے پانی بھرا تھا؟"

"بستی کے کنویں سے"

طبیب نے کچھ دیر سوچا۔"بستی کا کنواں صاف ہے لیکن گھڑے میں شاید کچھ ہو، اسے توڑ دو اور دیکھو کہ اس میں کیا ہے؟"

آدمی چلانے لگا۔"نہیں، میرے پاس صرف یہی ایک گھڑا ہے"

"اب دیکھتے ہیں کہ اس گھڑے سے کیا بر آمد ہوتا ہے؟"طبیب نے جواب دیا اور آدمی کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا" نیا پیٹ خریدنا ناممکن اور گھڑا خریدنا آسان ہے"

آدمی نے پھر چیخنا چلانا شروع کیا لیکن طبیب کے نوکروں میں سے ایک نے پتھر اٹھایا اور گھڑے پر دے مارا، ایک مردہ مینڈک بدبودار پانی کے ہمراہ اس میں سے بر آمد ہوا۔

"میرے دوست! دیکھو تم کیا پیتے رہے؟ یہ مینڈک اپنے ساتھ تجھے بھی مروا دیتا۔ یہ اشرفی لو اور جاؤ نیا گھڑا خرید لو"!

کچھ دن بعد جب طبیب اس راستے سے گزر رہا تھا تو اس نے مریض کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ اس کا پیٹ صحیح سالم تھا، وزن کچھ بڑھ گیا تھا اور رنگ وروپ بھی نکل آیا تھا۔ اس نے طبیب کو دیکھ کر دعائیں دینا شروع کی۔

ماخذ: (تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور ادیب اور مؤرخ ابن ابی اصیبعہ)

جس طبیب کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس نے سڑک کے کنارے ایک غریب مریض کا معائنہ کر کے اس کا علاج کیا تھا وہ اشبیلہ کا طبیب ابو مروان عبد الملک ابن زہر تھا جو لاطینی میں Avenzoar کے نام سے معروف ہے، وہ 1091ء کو اشبیلہ میں پیدا ہوا۔ بنو زہر (اندلس کے معروف طبیب خانوادے کا نام) میں علمِ طب سات پشتوں تک جاری رہا اور ابو مروان ابن زہر بھی اس خاندان کی تیسری پشت سے تعلق رکھتے تھے اور پانچ اس کے بعد پیدا ہوئے۔ اس لیے ابن زہر کے پیشے کے متعلق کوئی ابہام باقی نہیں رہتا کہ وہ طب کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا۔

استدلال کا یہ مذکورہ بالا فکری عمل (جس میں حقائق سے نتائج کے حصول کے لیے عمومی اصول وضع کیے جاتے ہیں) جس وقت مسلم اسپین میں اپنی جگہ بنا رہا تھا، عیسائی یورپ میں علاج کا عمل اس کے مقابلے میں لنگڑا لنگڑا کر اس نقطہ نظر کے مطابق چل رہا تھا کہ طبیب، مریض کا علاج کر کے خدا کی مرضی کو للکارتا ہے۔ مریض کو علاج اور ادویات کی بجائے جھاڑ پھونک سے اچھا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

مشرق میں اسلام کی اشاعت ساتویں صدی عیسوی کی اول میں شروع ہوئی۔ پہلے سے موجود علوم کا انجذاب اور ان میں ترقی کا ایک ہالہ نمودار ہوا۔ جن میں علم ادویہ بھی شامل تھا۔ عرب فاتحین نے نئے رعایا سے مسلسل یہ علوم اپنے اندر جذب کر لیے۔ عربی زبان نے مشرق میں وہی رتبہ حاصل کیا جو مغرب میں یونانی اور لاطینی کو حاصل تھا۔ عربی زبان علم و فن اور ادب کی زبان بن گئی۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر عربی دانشوروں کی زبان بن گئی۔ مکہ مکرّمہ میں حج کی عبادت ہر سال لاکھوں زائرین ایک جگہ جمع کرتی اور ایک دوسرے کے ساتھ کتابوں، نظریات اور خیالات کے تبادلے کا موقع فراہم کرتی تھی۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور اس کے بیٹے مامون الرشید نے عربی زبان میں یونانی علوم و فنون کے ترجمہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اسے سہل الحصول بنانے کے لیے بغداد میں ایک دارالترجمہ (Translation Bureau) بیت الحکمت کے نام سے قائم کیا۔ بیت الحکمت کا مطلب ہے "دانائی کا گھر"۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس کی ابتدا ہوئی۔ اس ادارے نے مسلمانوں کے مقبوضہ اور باہر علاقوں میں اپنے نمائندے بھیجے تا کہ ہر زبان کے علم و دانش کے مخطوطات کو تلاش کریں۔ عربی میں ترجمہ شدہ ان قیمتی کتابوں نے اُس دور میں مسلم سائنس کی مضبوط بنیاد قائم کی جو صرف علم العلاج پر مبنی نہیں تھا۔

یونان کی طرح مسلم دنیا میں بھی علمِ طب کی بنیاد چار عناصر والے نظریے (اخلاطِ اربعہ) پر تھی جسے دوسری صدی عیسوی کے یونانی طبیب جالینوس نے پیش کیا تھا۔ جب بدن میں چاروں اخلاط تناسب کے ساتھ موجود ہوں گے تو آدمی تندرست ہو گا اور جب طبعی تناسب سے باہر ہوں گے تو وہ بیمار ہو گا۔ جالینوس لکھتا ہے کہ معالج کی ذمہ داری ان اخلاط کے توازن کو غذا، ورزش اور حتمی سرگرمیوں یا دیگر اقدامات کے ذریعے بحال کرنا ہے۔ مثال کے طور پر، بخار خون کی کثرت کے سبب لاحق ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ فصد تجویز کرتا ہے تا کہ خون کی زیادتی رک جائے۔

تاہم مشرق میں، غلط طور پر صحت اور امراض کے بارے میں جالینوس کے عقلی تناظر نے اپنی جگہ بنالی جبکہ قرآن کریم میں یہ یقین دہانی موجود تھی کہ "ہر بیماری کے لیے علاج ہے"(۱)۔ مسلمان معالجین اپنے آپ کو علاج کرنے والے اور صحت کے محافظ سمجھتے تھے نہ کہ امراض کو مافوق الفطرت ہستی کے اسباب کا نتیجہ۔

اس وقت جبکہ مترجمین، بیت الحکمت میں سخت محنت کر رہے تھے، مسلمان معالجین نے جدید ہسپتالوں کی ابتدائی شکل "بیمارستان" کو ترقی دی جو بعد ازاں صرف "مارستان" کہلایا جانے لگا۔ جس کے دروازے سب کے لیے بلا تفریق کھلے رہتے، جس میں بیماروں کو علاج کے لیے خوش آمدید کہا جاتا اور چھوٹی موٹی تکالیف، زخموں اور ذہنی امراض سے نجات دلائی جاتی تھی۔ بڑے بڑے "مارستان" طبی کالجوں اور کتب خانوں سے ملحق ہوتے تھے جہاں نامور معالجین پڑھاتے، تشخیص کرتے اور آج کل کی طرح پریکٹس کی اجازت دیتے تھے۔

ہسپتالوں کی طرح علم الادویہ کو بطور پیشہ متعارف کروانا بھی اسلامی ایجاد ہے۔ مارستان میں تربیت یافتہ ماہرین، ادویات کی تیاری اور تجویز ماضی کی نسبت بہتر انداز میں کرتے، ان کے فارماکوپیا (قرابادین) میں ہر چیز کی جغرافیائی نوعیت، طبعی خواص اور جن امراض کے استعمال میں وہ برتے جاتے ہیں، تفصیلی طور پر موجود ہے۔ مامون کے عہد تک اطبا کی طرح ادویہ سازوں سے بھی امتحان لے کر دواسازی کی اجازت دی جانے لگی اور عوام کو غلطی اور نقصان سے بچانے کے لیے سرکاری انسپکٹر دواسازوں کے مرہموں، گولیوں، شربتوں، مربوں، ٹنکچروں، شافوں اور inhalants کی نگرانی کرتے تھے۔ مارستان میں دواسازی کے شعبے کا سربراہ علاج کے شعبے کے برابر عہدے کا حامل ہوتا تھا۔

عباسی خلفاء، بیت الحکمت اور ابتدائی بیمارستانوں (اسپتالوں) کے ساتھ ساتھ اسلامی طریقۂ علاج کے سنہرے دور کی ابتدا کر چکے تھے۔ علم کا مرکز اور ترقی کا سفر آٹھویں صدی عیسوی میں مغرب کی جانب جسے آج کل جنوبی اسپین اور اس وقت اندلس کہلاتا تھا، کو منتقل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

عباسیوں نے اقتدار، دمشق کے حکمران خاندان بنو امیہ سے قبضہ کیا تھا۔ 758ء میں بنواُمیہ کے دسویں خلیفہ کا پوتا عبدالرحمن اپنے رشتہ داروں کے قتل عام کے وقت فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور سپین میں پناہ حاصل کر لی۔ چند سالوں میں یہ نڈر حکمران اپنے دارالحکومت قرطبہ میں بنو عباس کے مقابلے میں ایک متوازی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوا، اور دسویں صدی عیسوی کے آخر تک قرطبہ علمی اور سائنسی سرگرمیوں میں بغداد کو پیچھے چھوڑ گیا۔

توطب یونانی میں سکنجبین ایک ایسی میڈیسن ہے جو صفراء کی زیادتی کو چونکہ کم کرتی ہے اس لئے کنیز کو وہ دیا گیا اس کے ساتھ روغن بادام ایک تو جلابی کیفیت کا حامل ہے اور دوسرا خشکی کو چونکہ ختم کرتا ہے اس لئے وہ بھی ساتھ دیئے گئے۔ لیکن نوکرانی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مزید خشک ہو گئی۔

خدا کے فرمان کا تقاضا تھا کہ اگرچہ سرکانگبین قدرتی طور پر صفرا کو دور کرنے والا ہے، لیکن اس نوکرانی کے معاملے میں صورتِ حال اُلٹ ہو گئی اور اس کی وجہ سے اس کا پت بڑھ گیا، اور بادام کا تیل، جو قدرتی جلاب اور چکنا کرنے والا ہے، زیادہ خشکی اور قبض کا باعث بنا۔ سرکانگبین ایک ایسا شربت ہے جو عموماً چینی اور سرکہ سے بنایا جاتا ہے اور بعض اوقات پرانے زمانے میں چینی کی جگہ شہد استعمال کیا جاتا تھا۔ پرانے ڈاکٹر اسے صفرا کو دور کرنے کے لیے سمجھتے تھے۔ لیکن اس نے بھی الٹا اثر کیا۔

از ہَلیلہ قَبُض شُد، اِطلاق رَفت

آبِ آتش رامَدد شُد ہَمچو نَفت

ہلیلہ: عربی ہلیلج اور انگریزی میں (Chebulic Myrobalan) کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑے درخت کا پھل ہے جس کے لمبے اور تنگ پتوں ہیں، اس کا پھل ایک گچھے کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہلیلہ جلاب کی ایک قسم ہے۔

قبض شد: قبض ہو، قبض ایک عام سی بیماری ہے جس میں آپ کا فضلہ با آسانی نہیں نکل پاتا یا کمی کے ساتھ خارج ہوتا ہے۔

قبض کو 'ام الامراض' کہتے ہیں جو کہ عموماً طرز زندگی میں تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دریافت کرکے اس کی وجہ کا فوری علاج ضروری ہے ورنہ یہ بہت سے مسائل کی جڑ ہے۔

اگرچہ کبھی کبھار قبض بہت عام ہے لیکن اگر علاج نہ کرایا جائے تو کچھ لوگوں کو دائمی قبض کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کے روزمرہ کے کام کرنے کی صلاحیت میں مداخلت کر سکتا ہے۔

اطلاق: پیٹ کا جاری ہونا یعنی دست لگنا۔۔۔ آبِ آتش: آگ والا پانی یعنی تیل۔۔۔۔ نفت: مٹی کا تیل

ترجمہ: ہلیلہ جو دراصل قبض کشاء ہے اس کے استعمال سے کنیز کو قبض ہو گئی۔ اور کھل کر مواد خارج نہ ہو سکا۔ اسی طرح پانی، جو ایک ٹھنڈی چیز ہے وہ بھی مٹی کے تیل کی طرح آگ بن گیا۔

مطلب یہ کہ ہر دوا مخالف پڑنے لگی اور ہر کوشش کا الٹا اثر ہوا۔

ہلیلہ ایک ہندوستانی پھل ہے جس کے کئی ماڈل ہیں، اور ایران میں زیادہ تر سیاہ ہلیلہ استعمال کیا جاتا ہے؛ جو کہ بہت سخت بیج ہے، اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔ ہلیلہ ذہانت اور یادداشت اور بالوں کے قبل از وقت سفید ہونے کے علاج کے لیے بہترین ہے، جس کا یقیناً ایک خاص فارمولا ہے۔

ہلیلہ کچھ جوش پیدا کرتی ہے اور قبض کو دور کرتی ہے۔

یہاں جناب رومیؒ فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے نوکرانی کو ہلیلہ دیا تو اس کا اسہال ختم ہو گیا اور اس سے قبض بھی ہو گئی جو اس کے مزاج کے خلاف ہوا کیونکہ ہلیلہ قبض کشاء تھا لیکن وہ قابض ہو گیا۔ کنیز کے لیے پانی بھی تیل کی طرح کام کرنے لگا اور اس کی آگ بجھانے کے بجائے اسے مزید جلایا اور ڈاکٹروں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔

اسی طرح ہلیلہ جلاب اور معدہ کو چکنا کرنے کے بجائے خشکی اور قبض کا باعث بنا اور پانی نے آگ بجھانے کے بجائے شعلے کو تیل کی طرح تیز اور تیز کر دیا ہے۔ ان اشعار میں جناب رومیؒ نے ہمیں بتایا کہ کیسے لوگ اچانک محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور محبت میں کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔

اور یہ کہ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے پیچھے کوئی روحانی قوت نہیں ہے، تو معاملات الٹ طریقے سے ہو جائیں گے، یعنی تقدیر بدل جاتی ہے اور نتیجہ الٹا ہی نکلتا ہے۔ اس لئے اپنے ہر کام میں روحانی قوتوں سے مدد مانگیں اور ہمیشہ کہیں۔

'اللہ نے چاہا تو'

ان اشعار میں مولانا رومؒ کا مفہوم یہ ہے کہ حکم الٰہی سے، یا یوں کہ لیں اتفاق سے ڈاکٹروں کے غرور اور غفلت کے نتیجے میں دوا نے الٹا اثر دیا اور نقصان دہ ہو گیا۔

اسلام کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ اس میں تعلیم پر بھرپور توجہ دی گئی اس سلسلہ میں یہ تمام مشاہیر نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے حامل تھے بلکہ

مولانا رومؒ بحر العلوم تھے ان علوم پر دسترس رکھتے تھے

(1)علم القرآن(2)قرأت(3)تجوید(4)تفسیر(5)علم حدیث(6)تخریج(7)فقہ(8)علم الکلام(9)علم العقائد(10)علم البیان(11)علم المعانی(12)علم المناظرہ(13)فتویٰ نویسی(14)سیرت نگاری(15)فلسفہ

(16)منطق(17)تنقیدات(18)فضائل و مناقب(19)ادب(20)شاعری(21)نثر نگاری(22)حاشیہ نگاری(23)اسماء الرجال(24)علم الاخلاق(25)روحانیت(26)تصوف(27)سلوک(28)تاریخ وسیر(29)جدول(30)صرف ونحو

(31)بدیع(32)علم الانساب(33)علم الفرائض(34)ردات(35)پندو نصائح(36)مکتوبات(37)ملفوظات(38)خطبات

(39)جغرافیہ(40)تجارت(41)شماریات(42)صوتیات(43)مالیات(44)اقتصادیات(45)معاشرت(46)طبعیات

(47)معاشیات(48)ہیئت(49)کیمیا(50)معدنیات(51)فلکیات(52)نجوم(53)جفر(54)ارضیات(55)تعلیم و تعلم

(56)علم الحساب(57)زیجات(58)زائرچہ(59) تعویذات(60)طب(61)ادویات(62)لسانیات(63)رسم الخط

(64)جرح وتعدیل(65)وردو اذکار(66)ایمانیات(67) تکسیر(68)توقیت(69)اوفاق(70)علم ریاضی(71)بنکاری

(72)زراعت(73)تاریخ گوئی(74)سیاسیات(75)علم الاوقات(76)موسیقی(77) قانون(78) تشریحات(79)تحقیقات

(80)علم الادیان(81)ماحولیات(82)علم الایام(83) تعبیر(84)عروض و قوانی(85)علم البر والبحر(86)علم الاوزان

(87)حکمت(88)نقدو نظر(89)تعلیقات(90)موسمیات(91)شہریات(92)علم المناظر(93)نفسیات(94)صحافت

(95)علم الاموال(96)عملیات(97)علم الاحکام(98)علم النور(99)مابعد الطبعیات(100)عمرانیات(101)علم رمل

(102)لغت(103)استعارہ(104)حیاتیات(105)نباتات

وغیرہا دراصل اس دور میں حتیٰ کہ آج بھی مولانا رومؒ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپ اطلس علم کا آفتاب تھے لیکن جب جناب شیخ شمس الدین تبریزیؒ کی صحبت میسر آئی تو انہوں نے کندن بنا دیا اور اس راہ کا مسافر کر دیا جس سے تمام حجابات اٹھ گئے۔ دراصل

اولیائے کاملین کا طریقہ ہے کہ وہ ہر چیز سے معرفت الہ العالمین تلاش کرتے ہیں

اولیائے کاملین کا طریقہ ہے کہ وہ ہر چیز سے معرفت الہ العالمین تلاش کرتے ہیں۔ مجھے اپنے بچپن کا منظر یاد ہے جب میرے قبلہ نانا جی صوفئ باکمال، زندہ دل وروشن ضمیر عظمت رفتہ کی عظیم نشانی جناب محمد عظیم الہاشمی القادری قدس سرہ العزیز! مثنوی شریف پڑھتے اور سنتے تو ہر شعر سے وہ لذت و آشنائی ملتی کہ روح مسرور ہو جاتی حالانکہ ہمارا دور طفلگی تھا۔ اکثر پھل بالخصوص کینو کو جب کھاتے تو اس کی پھانک کو چیرتے اس کے اندر سے چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ظاہر ہوتیں تو زبان سے سبحان اللہ پکارتے آنکھوں میں آنسو ہوتے، کچھ دیر کے لئے منہمک ہو جاتے اور فرماتے اللہ کریم کی صناعی پر قربان کہ اس نے کس طرح انسان کے لئے اہتمام کیا ہے۔ اس میں سے اللہ کی معرفت کی باتیں بتاتے۔ اللہ کریم ان تمام بزرگوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں قرب محمدی ﷺ عطا فرمائے آمین!

ڈاکٹروں، طبیبوں، حکیموں نے جو کچھ دیا اور علاج کیا، وہ اپنے مقصد تک نہ پہنچے اور درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔۔

یہاں دلچسپ دلائل دیے جاسکتے ہیں جو ہمیں اصل کہانی سے ہٹا دیتے ہیں۔ طبی سائنس اور صحت اور جسم کے ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں گفتگو۔ میڈیکل سوشیالوجی میں بہت سے ایسے رجحانات ہیں جو (بنیادی طور پر مائیکل فوکو کے خیالات پر مبنی) آج کی میڈیکل سائنس کو ایک "ڈسکورس" (ڈسکورس اینالسس جس کا درست ترجمہ "اظہارِ خیال کا جائزہ" بنتا ہے جدید لسانیات کا ایک نہایت اہم اور پسندیدہ موضوع ہے)

سمجھتے ہیں جو موجودہ دنیا میں عقلیت پسندی اور سائنس کے غلبہ کی وجہ سے دوسرے ڈسکورس پر حاوی ہے۔ دوسرے مباحث جنہیں "متبادل یا" متبادل دوا" کہا جاتا ہے۔ اس میدان میں بحثیں بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں، لیکن اب میرے پاس اتنی معلومات اور جگہ نہیں ہے کہ اس کو توڑ سکوں۔ لیکن مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ کچھ لوگوں کے لیے موجودہ طبی سائنس کی درستگی قابل اعتراض ہے۔ مثال کے طور پر، ہم سنتے ہیں کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں کئی بار مختلف ڈاکٹروں کے پاس گیا اور ہر بار انہوں نے مجھے دوائی دی جس سے میری حالت خراب ہو گئی۔ لیکن علاج کے اس نئے طریقہ (مثلاً ہومیوپیتھی یا ایکیوپنکچر یا دیگر اقسام کی دواؤں اور معجزاتی جڑی بوٹیوں) سے واقف ہونے کے بعد میری بیماری کی تمام علامات یک دم غائب ہو گئیں۔

کیا طبی سائنس کے نقطہ نظر اور صحت اور علاج کے بارے میں سچائی کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ یا دوسرے میکانزم کی وجہ سے آج دوا غالب ہے؟

بہر حال بادشاہ نے کہا کہ اگر آپ اسے ٹھیک کر دیں تو میں تمام لوگوں کا مال و دولت دینے کو تیار ہوں۔

جب پیسے کی بات آتی ہے تو ہر کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے اور آپ کو یقین دلاتا ہے کہ پریشان نہ ہوں، ہم اسے ٹھیک کر دیں گے!

حکیموں نے کہا کہ ہم آپس میں مشورہ کریں گے اور اس کا علاج تلاش کریں گے۔

بعض نسخوں میں دو طرح کے اشعار آئے ہیں لیکن ان کا محل آگے آئے گا۔ وہ 1000 ویں اشعار کے بعد کے ہیں لیکن برصغیر کی مثنوی میں اس جگہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ویسے بے محل نہیں۔

چوں قضا آید طبیب اَبلہ شود

آں دوا در نفعِ خود گمرہ شود۔

جب موت آتی ہے تو طبیب بیوقوف ہو جاتا ہے۔ وہ دوا اپنا نفع پہونچانے میں گمراہ ہو جاتی ہے۔

یعنی جب موت کا وقت آجاتا ہے تو طبیب کی بھی عقل ناکارہ ہو جاتی ہے، موت کا کوئی علاج نہیں اس وقت حکیم بھی بے وقوف بن جاتا ہے

یا چوں قضا آید شود دانش بخواب

مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب

جب قضا آتی ہے تو عقل سو جاتی ہے

چاند سیاہ ہو جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے.

جب قضا آتی ہے تو عقل سو جاتی ہے چاند کالا ہو جاتا ہے، سورج گرہن ہو جاتا ہے۔

قضا کے سامنے انسان اندھا ہو جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ اذا اراد انفاذ امر سلب کل ذی لب لبہ

جب اللہ اپنے کسی فیصلے کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر عقلمند کی عقل سلب کرلیتا ہے

(جامع صغیر از امام سیوطی ج ١، ص ٦٦)

ان اللہ اذا اراد امضاء امر نزع عقول الرجال حتی یمضی امرہ فاذا امضاہ رد الیھم عقولھم ووقعت الندامۃ

جب اللہ اپنے حکم کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کی عقل سلب کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حکم نافذ ہو جاتا ہے پھر ان کی عقلیں واپس لوٹا دی جاتی ہیں اور پھر ان کے پاس ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

(جامع صغیر ج ١، ص ٦٦)

مثنوی مولانا —دفتر اوّل —بخش ٣ —ظاہِر شُدنِ عَجزِ حکیمانْ از مُعالجۂ کَنیزک و رویْ آوردنِ پادشاہْ بہ دَرگاہِ اِلہ و در خواب دیدنِ او وَلی یی را

مولانا کی مثنوی- دفتر 1- دفعہ 3-

لونڈی کے علاج سے حکیموں کی کمزوری کا ظاہر ہونا اور بادشاہ کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ کے ولی کو خواب میں دیکھنا

ایک بادشاہ کی لونڈی سے محبت کرنے کی کہانی کا خلاصہ

بادشاہ اپنے نوکروں کے ساتھ شہر سے باہر شکار کے لیے چلا گیا۔ بیچ راستے میں اس نے ایک خوبصورت نوکرانی کو دیکھا اور اس سے پیار کیا اور اسے اپنے ساتھ محل میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن لونڈی کے بیمار ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور بادشاہ نے اپنی لونڈی کے علاج کے لیے ہر طرف سے حاذق طبیبوں کو بلایا۔ ہر ایک ڈاکٹر نے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے علم اور تکنیک سے اس کا علاج کریں گے۔ لہٰذا، انہوں نے خدا کے قادر مطلق کو نظر انداز کر دیا، جو اسباب سے بالاتر ہے۔ اس لیے وہ جتنا زیادہ کوشش کرتے، مریض کی حالت اتنی ہی خراب ہوتی گئی۔ جب بادشاہ تمام فطری اسباب سے مایوس ہو گیا تو اس نے خدا کی طرف رجوع کیا اور دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔ دعا و مناجات کی گرمی میں وہ سو گیا اور جب وہ سو رہا تھا تو ایک عقلمند بوڑھے نے اس سے کہا: کل ایک عقلمند طبیب تمہارے پاس آئے گا، اگلی رات بادشاہ نے وعدہ کیا ہوا ڈاکٹر پایا اور اسے اپنی لونڈی کے بستر پر لے گیا، اس نے امتحان شروع کیا اور فراست سے آگہی حاصل کی۔ "نوکرانی کی بیماری کی وجہ جسمانی عوامل نہیں ہیں، بلکہ وہ محبت کی بیمار ہے۔ ہاں، نوکرانی کو سمرقند میں رہنے والے ایک سنار سے محبت تھی۔ اس روحانی طبیب کے مشورے کے مطابق بادشاہ نے کچھ لوگوں کو سمرقند بھیجا کہ اسے بادشاہ کے دربار میں لے آئیں اور جب وہ سنار کو بادشاہ کے پاس لے آئے۔ ڈاکٹر کے حکم کے مطابق بادشاہ نے اس کی شادی اس لونڈی سے کر دی اور وہ چھ ماہ تک خوش و خرم ساتھ رہے لیکن یہ مدت ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر نے سنار کو جلاب پلا دیا جس سے اس کی خوبصورتی اور جاذبیت کم ہو گئی۔ آہستہ آہستہ نوکرانی کی نظروں سے گر گیا.

بادشاہ اور نوکرانی کی کہانی یہاں تک پہنچی کہ ڈاکٹر اس کی چاپلوسی اور دکھاوے کی وجہ سے اس کا علاج نہیں کر پا رہے تھے اور اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

جناب رومیؒ یہاں اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بہت سے علاج دماغ میں ہوتے ہیں، جسم سے نہیں!

آج کے ڈاکٹر اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ اگر کسی کی ذہنی حالت اور باطن ٹھیک ہو جائے تو اس کی بہت سی بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں اور اسے دوا کی ضرورت نہیں ہوتی اور نفسیاتی علاج سے بہت سے دکھوں اور تکالیف کو دور کیا جا سکتا ہے۔

کیونکہ ہمارے بہت سے درد اور تکلیفیں دماغ اور نفسیات سے جنم لیتی ہیں اور اگر وہ جگہ صاف ہو جائے تو بیماری بھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر، صحیح نہیں تھے اور ان کی معلومات کافی نہیں تھیں اور وہ لونڈیوں کا مسئلہ نہیں سمجھتے تھے؛

اور یہیں بادشاہ بے بس ہو گیا اور خود کو شکست خوردہ سمجھ کر خدا کی طرف ہاتھ پھیلا دیا۔

شرح اول

بعض شارحین نے اس قصے کی مفصل تشریح کی ہے جس کا خلاصہ آسان زبان میں درج ذیل ہے۔

بادشاہ روح کا راز ہے۔ متکبر ڈاکٹروں کی جزوی حکمت یا ظاہری شیخوں کا راز ہے۔ شادی بیاہ جانور یا فطری روح یا ابتدائی متلاشی کا ضابطہ ہے۔ سنار دنیا کا راز ہے۔ اور وہ روحانی ڈاکٹر عمومی حکمت یا حقیقی شیخ کا راز ہے۔

روح (بادشاہ) روح (غلام) سے محبت کرتی ہے تاکہ اسے پاکیزہ اور بااعتماد روح کے درجے پر لے جائے کیونکہ تزکیہ نفس کے ساتھ ہی روحانی علم اور کمال کے درجات حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن روح (کنیز) فطری طور پر دنیا (سنار) سے محبت کرتی ہے اور ظاہری اور ٹھوس دنیا کا باطنی اور پوشیدہ دنیا سے تبادلہ نہیں کرنا چاہتی۔ ابتدائی طور پر، جزوی عقل (مغرور ڈاکٹر) روح (کنیز) کے جنسی منسلکات کا علاج کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور دنیا (سنار) سے اس کا لگاؤ بڑھ جاتا ہے. جب روح (بادشاہ) مطیع ہو کر در الٰہی کی طرف متوجہ ہوتی ہے، تو خدا عام عقل (روحانی طبیب) کو دنیا کی تباہی اور زوال کی حقیقت دکھانے کے لیے تفویض کرتا ہے، اور اس کی خواہش روح (کنیز) اور آخر میں روح سے نکال دی جاتی ہے۔ بادشاہ کی طرف ایک جانور کی روح (روح) واپس آئے گی اور ایک پر اعتماد روح کی حیثیت کو پہنچ جائے گی۔

شرح دوئم

لیکن اشعار کے مندرجات سے جو بات نکلتی ہے، جناب رومیؒ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ایک شخص اپنی خواہشات کے پیچھے دنیا کے شکار میں ہے، اس سے بے خبر کہ دنیا کے ہر مشروب میں کڑواہٹ اور دنیا کا ہر چیز میں ذائقہ ملا ہوا ہے۔ نقصان کے ساتھ ملایا جاتا ہے،

اور اس لیے کہ ایک شخص بد بختی میں گرفتار ہوتا ہے، وہ پہلے قدرتی ذرائع اور دروازوں کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ ان کے فراہم کرنے سے نجات یقینی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اسباب، اور افراد سے مایوس ہونے کی وجہ سے وہ دعاؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس دوران اگر اس کا دل ایمانداری سے ٹوٹتا ہے تو اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اس کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔

اس کہانی کے علاوہ جناب رومیؒ محبت کو تعریف سے بالاتر سمجھتے ہیں اور اس زبان کو اس کے اظہار سے قاصر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجازی محبت ہمیں حقیقی محبت کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان ایک چہرے سے محبت کرتا ہے لیکن جب وہ چہرہ بگڑ جاتا ہے تو اس وقت انسان کی محبت اس چہرے سے رخ موڑ کر چلی جاتی ہے۔ درست وہ ہے جو گلابی اور رنگین عشق سے چھٹکارا پاتا ہے اور زندہ اور مستحکم عاشق سے محبت کرتا ہے۔

ایرانی طرز

شَہ چُو عَجْزِ آن حَکیمان رابِدید

پابِرِہنہ جانِبِ مَسجد دَوِید

پاکستانی طرز

شَہ چُو عَجْزِ آں طَبِیبَاں رابِدید

پابِرِہنہ جانِبِ مَسجد دَوِید

عجز: عاجزی۔۔۔ رابدید: کو دیکھیں۔۔۔ پابرہنہ: ننگے پاؤں۔۔۔ جانب: کی طرف۔۔۔ مسجد دوید: مسجد کی طرف دوڑا

ترجمہ: بادشاہ نے جب طبیبوں کی کمزوری ملاحظہ کی تو ننگے پاؤں مسجد کی طرف دوڑا یعنی اللہ کی طرف رجوع کیا

بادشاہ جو ایک طرف لونڈی کی محبت میں گرفتار تھا اور دوسری طرف طبیبوں کی اپنی محبوبہ کا علاج کرنے میں ناکامی دیکھ کر بے بس اور بے چین ہو گیا اور اسی بے بسی کے احساس نے اس کے دل کی آنکھیں واحدِ حقیقی سے امید کے لیے کھول دیں۔ اب وہ ہر چیز سے منہ موڑ کر خدا سے امیدیں لگائے ہوئے تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جلدی جلدی مسجد کی طرف چلا گیا۔

جب انسان بے بسی اور عاجزی کی وجہ سے خدا سے فریاد کرتا ہے تو یہ بہت پاکیزگی اور بلندی ہے۔ جب انسان

کسی وقت، ڈاکٹروں کے علاج سے مایوس ہو جائے جو اس دنیا کے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، تو وہ آنسوؤں اور ننگے پاؤں کے ساتھ خدا کی طرف لوٹ جائے، اپنی پچھلی زندگی پر افسوس اور انداامت اختیار کرے۔

ہماری کہانی کا بادشاہ بھی ننگے پاؤں روتے ہوئے مسجد کی طرف بھاگا اور عبادت گاہ بادشاہ کے آنسوؤں سے پانی سے بھر گئی۔

بادشاہ کچھ دیر کے لیے سجدے میں حواس کھو بیٹھا تھا اور جب وہ اپنے ہوش میں آیا تو اس نے خدا کی حمد و ثناء کے لئے منہ کھولا۔

اے کائنات کے مالک! میں کیا کہوں کہ تمہیں میرا راز معلوم ہے؟

تم جو ہمیشہ ہماری خواہش پوری کرتے ہو، میں ایک بار پھر غلط راستے پر چلا گیا اور اپنی خواہش کسی اور سے مانگ لی!

ایک بار پھر ہم سے غلطی ہوئی. معاف کرنے والے معاف فرمادے!

فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِؕ-اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ(۵۰)وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَؕ-اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ(۵۱)

تو اللہ کی طرف بھاگو بے شک میں اس کی طرف سے تمہارے لیے صریح ڈر سنانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ اَور معبود نہ ٹھہراؤ بے شک میں اس کی طرف سے تمہارے لیے صریح ڈر سنانے والا ہوں

{ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ: اور اللہ کی طرف بھاگو۔} اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اے پیارے حبیب! صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، آپ فرمادیں کہ جب عبادت کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے تو اے لوگو! تم کفر سے ایمان کی طرف، اللہ تعالیٰ کی

نافرمانی سے اطاعت کی طرف، اپنے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کی طرف دوڑتے ہوئے آؤ اور اس کے علاوہ سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی عبادت کرو تاکہ تم اس کے عذاب سے نجات پاجاؤ اور اس کی طرف سے ثواب حاصل کر کے کامیاب ہو جاؤ، بیشک میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفر اور نافرمانی پر اس کے عذاب سے کھلم کھلا ڈر سنانے والا ہوں۔(خازن، الذّٰریٰت، تحت الآیۃ: ۵۱-۵۰، ۴ / ۱۸۵، قرطبی، الذاریات، تحت الآیۃ: ۵۰-۵۱، ۹ / ۴۱، الجزء السابع عشر، ابو سعود، الذّٰریٰت، تحت الآیۃ: ۵۰-۵۱، ۵ / ۶۳۲-۶۳۳، ملتقطاً)

ایرانی طرز

رَفت در مسجد سویِ مِحُراب شُد

سَجُدہ گاہ از اشک شَہُ پُر آب شُد

پاکستانی طرز

رَفت در مسجد سُوئے مِحُراب شُد

سَجُدہ گاہ از اَشک شَاہُ پُر آب شُد

رفت: گیا۔۔۔ در مسجد: مسجد کی طرف۔۔۔ سوئے: کی طرف۔۔۔ محراب: مسجد کا محراب۔۔۔ سجدہ گاہ: سجدہ کرنے کی جگہ

اشک شاہ: بادشاہ کے آنسو۔۔۔ پر آب: پانی پانی

ترجمہ: مسجد میں جاکر سیدھا محراب کی طرف گیااور سجدہ میں گر کر اس قدر رویا کہ آنسوئں سے سجدے کی جگہ پانی سے بھر گئی

پلیز رونے سے مت بھاگو۔

جو لوگ اپنے غصے اور مایوسی کو نگل لیتے ہیں ان میں دل کی بیماری کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

براہ کرم جہاں ضروری ہو رونے کے لئے آزاد محسوس کریں اور شرمندہ نہ ہوں....

براہ کرم کسی رونے والے کو پرسکون کرنے کی کوشش نہ کریں۔

آپ اسے گلے لگا سکتے ہیں اور پیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے رونے سے مت روکو۔ کیونکہ رونا انسانی وجود کے زخموں کا بہت اچھا علاج ہے!

جو نہیں روتے وہ خود کو تکلیف دیتے ہیں!

جو بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ روتا ہے اور یہی رونا اس بچے کی صحت کی علامت ہوتا ہے۔

بادشاہ نے رب سے اتنا رویا کہ اس کا سجدہ گاہ آنسوؤں سے تر ہو گیا!

۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ننگے پاؤں کے معنی دنیا و آخرت سے گزر جانا اور معدومیت کی منزل تک پہنچنا ہے۔

بادشاہ نے جب ان طبیبوں کی نااہلی دیکھی اور ان کے علاج سے مایوس ہوا تو ننگے پاؤں مسجد کی طرف بھاگا۔ قرآن مجید کے مطابق، مسجد ایک ایسی جگہ ہے جہاں صرف خدا کا نام لیا جاتا ہے، اور مسجد میں قربان گاہ وہ جگہ ہے جہاں وہ سجدہ کرتے ہیں۔ جب بادشاہ دوسروں کے سلوک سے مایوس ہوا تو خدا کے حضور جاکر سجدہ کیا اور آنسو بہائے۔ جناب رومیؒ کی رائے میں آنسو بہت قیمتی ہیں اور بہت سے مقامات پر وہ اس آنسو بہانے کو خدا کی طرف لوٹنے کا حل اور ایک طریقہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ وہ آنسو نہیں ہے جو دنیاوی چیزوں کے کھونے کے غم میں یا ندامت میں یا دنیا کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے بہایا جاتا ہے۔

یہ آنسو بہانا ایک طرح کا ندامت اور اندرونی درد ہے جس کی وجہ سے انسان اس کو تاہی کا شکار رہا ہے اور اس نے حقیقی حل بنانے والے کو اس وقت نہیں دیکھا جب اسے دیکھنا چاہیے تھا۔

رومیؒ اور دیگر صوفیاء کے نزدیک دعا کے قبول ہونے کی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کی بے بسی اور عاجزی اور خدا کے دروازے کی ضرورت کا اعلان کیا جائے، جو عام طور پر خلوص کے رونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا نے اس مفہوم کو مثنوی کے دوسرے مقامات پر بھی ذکر کیا ہے، بشمول شیخ احمد خدریز کے قصیدہ مثنوی کی دوسری کتاب میں جہاں وہ فرماتے ہیں:

تا نگرید کودک حلوا فروش　　بحر رحمت در نمي آيد به جوش

اي برادر طفل طفل چشم توست　　کام خود موقوف زاري دان درست

گر همي خواهي كه آن خلعت رسد　　پس بگريان طفل ديده بر جسد

جب تک آپ بچے کو حلوہ بیچتے ہوئے نہ دیکھیں گے، بہر رحمت نہیں اُبلے گی۔

اے بھائی تیرے بچے کا بچہ تیری آنکھوں کا بچہ ہے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ وہ لباس پہنچے تو میت پر بچے کی طرح روؤ

اللہ کا کوئی ایسا بندہ نہیں جس کے دل و دماغ دنیا کی ہمہ ہمی، چمک دمک اور رنگ رلیوں سے متاثر نہ ہوتے ہوں، نفسانی خواہشات، دنیا کی مختلف لذتیں اور پھر شیطانوں کے مختلف جہتوں سے تسلسل کے ساتھ حملے ہیں جن کے سبب ولی صفت انسان بھی غفلت کا شکار ہو کر گناہ اور قصور کر بیٹھتا ہے، لیکن جب وہ ندامت، شرمندگی اور اللہ کے نزدیک جواب دہی کا احساس پیدا کرتا ہے اور اپنے کو مجرم اور خطاوار سمجھ کر معافی اور بخشش مانگتا اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اللہ کی نظر میں اتنا محبوب اور پیارا انسان ہو جاتا ہے جیسا کہ اس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو، قرآن مجید میں توبہ واستغفار کرنے والے بندوں کے لیے صرف معافی اور بخشش ہی کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و محبت اور اس کے پیار کی بشارت سنائی گئی ہے، ارشاد باری ہے "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ" (بقرہ، آیت ۲۲۲) "بے شک اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے۔"

غلطی اور گناہ کا احساس اور پھر گریہ وزاری اللہ کو بہت پسند ہے، جب کوئی انسان جرم اور گناہ کرنے کے بعد اپنے مالک حقیقی کے سامنے روتا ہے تو وہ اس سے بے انتہا خوش ہوتا ہے گویا اس نے اپنی بندگی، عاجزی اور اللہ کی عظمت کا اعتراف کر لیا اور یہی وہ تصور ہے جس کے استحکام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب اور بڑی نعمتوں اور رحمتوں کا وعدہ فرمایا ہے، ایک موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ سے اتنا خوش ہوتا ہے جیسا کہ وہ سوار جس کی سواری کھانے، پانی کے ساتھ کسی چٹیل میدان میں کھو جائے اور وہ مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے سو جائے، جب آنکھ کھلے تو دیکھے کہ وہ سواری کھڑی ہے۔ (صحیح مسلم)

ظاہر ہے کہ اگر کوئی سوار تنہا جنگل میں سفر کر رہا ہو اور راستہ بھر کے لیے کھانے، پینے کا سامان بھی اس جانور پر لدا ہوا ہو اور پھر وہ سفر کے دوران کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اترا اور آرام کی نیت سے سو گیا، جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کی سواری کا جانور اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ غائب ہے تو اسے بہت سخت تکلیف ہو گی، اور پریشانی کی شدت سے دوچار ہو کر موت کی تمنا کرے گا لیکن جب کچھ دیر کے بعد اسے سواری اور اس کے ساتھ تمام سامان مل جائے تو اس کی خوشی کی انتہاء نہیں رہے گی اور وہ رقص و سرور کے عالم کیف میں غرق ہو جائے گا، اسی طرح جب جرم و گناہ کے بعد کوئی بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور سچے دل سے توبہ کے ذریعہ اللہ کا قرب چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس مایوس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے اور وہ اپنے خطاکار بندہ کو اپنا محبوب بنالیتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک کوئی چیز دو قطروں سے زیادہ محبوب نہیں، ایک آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلا ہو اور دوسرا خون کا وہ قطرہ جو اللہ کے راستہ میں گرا ہو۔ (مشکوٰۃ، ص:۳۳۳)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ندامت کا آنسو شہیدوں کے خون کی مانند اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا رومی فرماتے ہیں:

قطرۂ اشکِ ندامت در سجود

ہمسری خون شہادت می نمود

(ندامت کے آنسوؤں کے وہ قطرے جو سجدہ میں گنہگاروں کی آنکھوں سے گرتے ہیں، اتنے قیمتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو شہیدوں کے خون کے برابر وزن کرتی ہے)

چون بہ خویش آمد زِ غَرقابِ فَنا
خوشؔ زبان بُگشاد در مَدح و دُعا

بخویش آمد: اپنے آپ میں آنا۔۔۔ غرقاب: پانی کی گہرائی۔۔۔ فنا: بے خودی

فنا کو غرقاب سے تشبیہہ دی گئی ہے

ترجمہ: جب بادشاہ محویت کی گہرائی سے نکل کر اپنے حواس میں آیا تو اللہ جل شانہ کی مدح و تعریف میں زبان سے عرض گذار ہوا۔

یہاں جناب رومیؒ نماز پڑھنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ عام طور پر، کوئی جو اداس اور غمگین ہے وہ محب یا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

خواجہ عبد اللہ انصاری کا خط بہت اچھی طرح سکھاتا ہے کہ خدا سے محبت کیسے کی جاتی ہےَ؟ جب بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہ ہو اور آپ اپنے دل میں غمگین ہوں تو پہلے رو رو کر اپنے غم کو صاف کریں اور پھر اللہ سے بات کریں جو کہ بہت موثر ہے۔

اور جو نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں وہ آپ کے رونے اور دل ٹوٹنے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس تعریف اور شکر کی وجہ سے ہے جو آپ کو خدا کے ساتھ ملا ہے.

گنہگاروں کی ندامت اور شرمندگی کی غیر معمولی اہمیت

علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں سورہ انَّآ اَنۡزَلۡنَا کے ذیل میں ایک روایت نقل کی ہے، جس سے گنہگاروں کی ندامت اور شرمندگی کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ گنہگاروں کا رونا، آہ کرنا، گڑگڑانا مجھے تسبیح پڑھنے والوں کی سبحان اللہ کی آوازوں سے زیادہ محبوب ہے۔

کبھی طاعتوں کا سرور ہے کبھی اعتراف قصور ہے

ہے مَلک کو جسکی نہیں خبر، وہ حضور میرا حضور ہے

شاعری کی دنیا میں غالب کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مجرم اور گنہگاروں کے بارے میں ان کا ایک مشہور شعر ہے:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی

مولانا شاہ محمد احمد الہ آبادی فرماتے تھے کہ غالب نے امت کو مایوس کر دیا، کیوں کہ جو گنہگار بندے ہیں وہ بقول غالب اس لائق نہیں کہ کعبہ جائیں اور اللہ کے گھر کی زیارت کریں، ایسی مقدس جگہ جاتے ہوئے خطاکاروں اور عاصیوں کو شرم آنی چاہیے کہ ہم گناہوں میں ملوث ہیں کس منہ سے کعبہ جائیں، مولانا فرماتے تھے کہ یہ شعر قرآن وحدیث کے اعتبار سے اصلاح کے قابل ہے اور میں نے اس شعر کی اس طرح اصلاح کی ہے۔

میں اسی منہ سے جاؤں گا

شرم کو خاک میں ملاؤں گا

ان کو رو رو کے میں مناؤں گا

اپنی بگڑی کو یوں بناؤں گا

(حقوق النساء، از مولانا اختر پاکستانی، ص:۲۰)

یعنی گناہ اور قصور تو انسان کی صفت ہے، کیا اس کی وجہ سے اللہ کا دربار چھوڑ دیا جائے اور اللہ کا دربار چھوڑ کر جائے پناہ بھی کہاں ہے جس کا سہارا لیا جائے، اس لیے تمام گنہگار اللہ سے توبہ کریں اور ندامت کے آنسو بہا کر اللہ سے معافی مانگیں وہ یقیناً معاف کرے گا اور خطاؤں کو بخش دے گا۔

گناہ پر اصرار یعنی بے فکری اور بے خوفی کے ساتھ گناہ کرتے رہنا اور اس پر قائم و دائم رہنا بڑی بد بختی اور بہت برے انجام کی نشانی ہے اور ایسا عادی مجرم اللہ کی رحمت کا مستحق نہیں، اس لیے احادیث میں گناہ پر ندامت اور توبہ کی تاکید کی گئی ہے۔ اگرچہ بظاہر گناہ کا کوئی عمل معلوم نہ ہو پھر بھی توبہ کی عادت بنا لینی چاہیے، اس لیے کہ توبہ عاصیوں اور گنہگاروں کے لیے مغفرت ورحمت کا ذریعہ اور مقربین و معصومین کے لیے درجات قرب و محبوبیت میں بے انتہا ترقی کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک دن میں ستر مرتبہ اور ایک روایت کے مطابق سو مرتبہ توبہ و استغفار فرماتے تھے۔ اس میں صالحین اور نیکوکاروں کے لیے

بڑی نصیحت اور عبرت مضمر ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی گناہ ہو گیا ہو اور یاد نہ ہو تو توبہ کے ذریعہ وہ معاف ہو جائے گا اور اگر واقعتاً کوئی گناہ نہیں ہوا ہے تو ترقی کا ذریعہ ثابت ہو گا جس کا ہر شخص محتاج ہے۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا جذب میں ڈوبا ہوا کلام سنئے:

جو ناکام ہوتا رہے عمر بھر بھی

بہر حال کوشش تو عاشق نہ چھوڑے

یہ رشتہ محبت کا قائم ہی رکھے

جو سو بار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

یعنی کوشش رہے کہ ایک مرتبہ توبہ کے بعد توبہ نہ ٹوٹے، لیکن اگر بسیار کوشش کے باوجود توبہ ٹوٹ ہی گئی اور وہی گناہ دوبارہ سرزد ہو گیا تو مایوس نہ ہو، پھر توبہ کر کے خدا سے اپنا تعلق جوڑ لو اور ایک دن میں بار بار یہ واقعہ پیش آئے تو ہر بار اللہ کے حضور توبہ کر کے گناہوں سے نجات حاصل کر لو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور شان کریمی کی بات ہے کہ ایک گنہگار اور مجرم کے لیے پوری زندگی اللہ کی طرف رجوع کرنے کا موقع فراہم کیا گیا کہ جب بھی اللہ کا خوف پیدا ہو توبہ کر کے اللہ کے نزدیک بندوں میں شمولیت اختیار کی جا سکتی ہے گویا گناہوں سے توبہ کا یہ سلسلہ موت تک قابل قبول ہے، لیکن کیا معلوم زندگی کا چراغ کب بجھ جائے، اس لیے گنہگاروں اور خطاکاروں کو توبہ کرنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے،

البتہ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ وہ ندامت اور شرمندگی جس سے گناہ معاف ہوتا ہے، سچے دل سے ہونی چاہیئے جس کو قرآن مجید میں "توبۂ نصوح" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کی تفسیر کرتے ہوئے امام نووی لکھتے ہیں کہ

اگر گناہ اللہ اور بندے کے درمیان ہے، کسی آدمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تو

توبہ کی تین شرطیں ہیں

اول یہ کہ گناہ سے باز آئے، دوسرے یہ کہ سچے دل سے اپنے فعل پر نادم ہو، تیسرے یہ کہ وہ عزم کرے کہ گناہ کی طرف کبھی نہ پلٹیں گے اور اگر گناہ آدمی سے متعلق ہے تو اس کی چار شرطیں ہیں: تین تو وہی جو اوپر بیان کی گئیں اور چوتھی یہ ہے کہ جس کا جرم

کیاہو اس سے معاف کروائے، اگر مال لیاہو تو اس کو واپس کر دے، اگر تہمت وغیرہ کی کوئی سزا اس پر واجب ہوتی ہے تو اس کو موقع دے یا معاف کرائے یا غیبت کی ہے، تو اس سے معاملہ صاف کرلے، اگر ان شرائط میں سے کوئی فوت ہوگئی تو توبہ صحیح نہیں ہے۔

(ریاض الصالحین، ص:۱۱)

ایرانی طرز

کِی کَمینہ بَخُشِشَت مُلک جھان

من چہ گویم چون تو می دانی نَھان

پاکستانی طرز

کاے کَمینہ بَخُشِشَت مُلکِ جہاں

مَن چگویم چُون تو میدانی نِہاں

ک: بیانیہ۔۔۔اے: حرف ندا۔۔۔کمینہ: ادنٰی، گھٹیا۔۔۔من چگوئم: میں کیا کہہ سکتا ہوں

ترجمہ: بادشاہ کہنے لگا کہ اے ذات پاک جس کی ادنٰی بخشش یہ ہے کہ جہاں بھر کا ملک دے دے بارالہا! میں کیا عرض کروں جب کہ تو چھپی باتوں سے آگاہ ہے۔

الٰھی کمترین بخشش تو، تمام مُلکِ جھان است!

من چہ بگویم وقتی کہ تو درون مرا میدانی!

اے خدا تیری کم سے کم بخشش دنیا کی تمام دولت ہے!

جب تم مجھے اندر سے جانتے ہو تو میں کیا کہوں!

براہ کرم رب کے ساتھ دن میں چند منٹ گذاریں اور پیار کی گفتگو کریں. اور یوں بھی عرض کیا کریں

تضمین بر مناجات: خلیفۂ اوّل سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مالکِ ارض و سما ہے ذات تیری بے عدیل

حکمرانی میں تری ہر گز نہیں کوئی دَخیل

اپنی حالت عرض کرتا ہے یہ اِک بندہ ذلیل

ہو کرم اس پر کہ ہے تو بے نواؤں کا وکیل

خذ بلطفك یا الٰهی من لّهٗ زادٌ قلیلٌ

(مدد کر اپنی مہربانی سے اے خدا اس کی ہدایت کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے)

مُفلسٌ بالصِّدقِ یاتِی عِندَ بابِك یا جَلِیلٌ

(مفلس ہے سچے دل سے تیرے دروازے پر آیا ہے اے خدا)

مُلکِ علم و معرفت میں کچھ نہیں دَخل و عمل

کار گاہِ جہد میں بازو ہوئے ہیں میرے شل

نفس میرے ہر عمل میں ڈال دیتا ہے خلل

یا الٰہ العالمین اب میری حالت بھی بدل

کَیفَ حالِی یَا اِلٰهِیْ لَیسَ لِیْ خَیرُ العَمَلْ

(الٰہی میرا حال کیا ہے؟ میرے پاس حسنِ عمل نہیں ہے)

سُوءُ اعمالِ کَثِیرٌ زادُ طَاعَاتِی قلیل

(میری طاعتیں کم اور برے اعمال ہیں بہت)

ذات ہے بے مثل تیری ہے تری ہستی قدیم

رحم فرما مجھ پہ اے بے مثل و بے ہمتا رحیم

یا حَکِیمُ یا قدِیمُ یا عَظِیمُ یا کریم

بخشنے والا ہے تو اور میں خطاکار و اثیم

ذنبهٗ ذنبٌ عظیمٌ فاغفر الذّنب العظیم

(میرا گناہ بہت بڑا ہے اے خدا اس گناہِ عظیم کو بخش دے)

اِنَّہٗ شَخصٌ غَرِیبٌ مُذنبٌ عَبدٌ ذلیلٌ

(کیوں کہ میں ایک گنہگار، غریب اور ذلیل بندہ ہوں)

ہیں مرے اعمال شرّ نفس کی زد میں ابھی

پھنس چکی ہے آ کے کشتی بحرِ عصیّاں میں مری

یورشِ امراضِ روح و جسم ہے مجھ پر بڑی

میرے مالک ہے یہ میری ذات پر مشکل گھڑی

عَافِنِی مِنْ کُلِّ داءٍ وَاقْضِ عَنّی حَاجَتی

(مجھے ہر بیماری سے محفوظ رکھ اور میری ضرورتوں کو پورا کر)

اِنَّ لِیْ قلبًا سَقِیمًا اَنْتَ مَنْ یشفی العلیل

(میرا دل بیمار ہے اور تو شفا دینے والا ہے)

التجا مسکین کی ہے! خالقِ ارض و سما

عافیت اور امن کی صورت دکھا صبح و مسا

دردِ عصیاں کے لیے درکار ہے مجھ کو دوا

آگ سے ڈرتا ہوں میں اے مالکِ روزِ جزا

قُل لنارٍ اَبردی یا ربی فی حقی کما

(اے خدا آگ سے کہہ دے کہ وہ میرے حق میں ٹھنڈی ہو جائے)

قُلتَ قُلنا نارُ کونی بردًا فی حَقِّ الخلِیْلُ

(جس طرح تو نے آگ سے ٹھنڈی ہونے کے لیے کہا تھا خلیلؑ کے لیے)

تو ہے واحد تو صمد ہے اور ہے تو ہی اَحد

تیری رحمت کی مرے مالک نہیں ہے کوئی حد

چاہیے ہر لمحہ مجھ کو صرف تیری ہی مدد

بڑھ رہا ہے مجھ سے ہر لحظہ مرے عصیاں کا قد

طَالَ یَارَبی ذُنُوبِی مِثل رَمْلٍ لَا تعُدَ

(دراز ہو گئے ہیں میرے گناہ لاتعداد ذرّہ ہائے ریت کی طرح)

فاعف عنی کُلَّ ذنب واصفح الصفح الجمیل

(میرا ہر گناہ معاف کر دے اور در گزر کر دے)

ہے ہمارا ہر عمل یکسر شریعت کے خلاف

سخت مشکل ہے کہ ہو آئینہ کردار صاف

دل تو کرتا ہے سدا بازارِ عصیاں کا طواف

در گزر فرمانے والے اب خطائیں ہوں معاف

هَبْ لَنَا ملکًا کَبِیْرًا، نَجِّنَا مِمَّا نخاف

(بخش ہم کو ایک بڑا ملک اور نجات دے ہم کو ان چیزوں سے جن سے ڈرتے ہیں)

رَبَّنَا اِذْ اَنْتَ قَاضِیْ وَالْمُنَادِیْ جِبْرئیل

(اے مالک تو انصاف کرنے والا ہو گا اور جبریلؑ پکارنے والا)

میں مجسم معصیت ہوں میں ہوں سر تا پا قصور

ہیں بہت اعمال میرے صدق کی وادی سے دُور

عرض ہے اے مالکِ کون و مکاں تیرے حضور

کر مدد اس بندۂ عاصی کی تو یوم النشور

اَنْتَ کَافِیْ اَنْتَ وَافِیْ فِیْ مُھِمَّاتِ الْاُمُوْرِ

(تو کافی ہے تو پورا ہے، بڑی سے بڑی مشکلات کے لیے)

اَنْتَ حَسْبِیْ اَنْتَ رَبِّیْ اَنْتَ لِیْ نَعْمَ الوَکیل

(تو میرے لیے بہت ہے اور میرے لیے تو اچھا حافظ ہے)

آرزوئیں کیا بیاں تجھ سے کروں تو ہے علیم

وہ عطا ہوں وصف مجھ کو صاحبِ لطفِ عمیم

پھیل جائے ہر طرف کردار کی میرے شمیم

متقی مجھ کو بنا دے اے مرے مولا کریم

رَبِّ هَبْ لِیْ کَنْزَ فضلٍ اَنْتَ وَهَّابُ الرَّحِیْم

(اے خدا تو اپنے فضل کے خزانے بخش دے تو بہت بخشنے والا ہے)

اَعطنی مَا فِی ضَمیری دُلّنِی خَیرَ الدّلیلُ

(دے مجھ کو جو میرے دل میں ہے اور اچھے راستے کی طرف رہنمائی کر)

مُندمل یوں ہوں عزیزِ پُر معاصی کے قروح

یہ اگر توبہ کرے اب کے تو ہو توبہ نصوح

معرفت کے ملک میں حاصل ہوں کچھ ایسی فتوح

بادۂ عرفاں کو پی کر جھوم اُٹھیں قلب و روح

این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوحٍ

(کہاں ہیں موسیٰؑ کہاں ہیں عیسیٰؑ کہاں ہیں یحییٰؑ کہاں ہیں نوحؑ)

آنتَ یا صدیق عاصٍ تُب اِلیٰ المولیٰ الجلیل

(تو اے گنہگار صدیق توبہ کر بزرگ و برتر اللہ سے)

ڈاکٹر عزیز احسن

ایرانی طرز

ای ہمیشہ حاجَتِ ما را پَناہ

بارِ دیگر ما غَلَط کردیم راہ

پاکستانی طرز

اے ہمیشہ حاجَتِ ما را پَناہ

بارِ دیگر ما غَلَط کردیم راہ

اے ہمیشہ: اے خدا بزرگ و بر تر تو ہمیشہ۔۔۔ حاجت مر اپناہ: ہمیشہ سے ہماری حاجت پناہ ہے۔۔۔ بار دیگر: دوبارا۔۔۔ ماغلط: ہم نے غلط

پہلا مصرعہ آغاز حرف ندا۔ "اے" سے دوسرا مصرعہ جواب ندا

ترجمہ: اے خدائے بزرگ و بر تر تو ہی تو ہمیشہ سے ہماری حاجت پناہ ہے۔ ہم پھر سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ پہلی غلطی یہ ہوئی کہ طبیبوں پر بھروسہ کر لیا اور دوسری غلطی یہ کہ تو ہی اعلم الغیب ہے سب کچھ جانتا ہے تجھی کو حال سنانے لگ پڑے ہیں حالانکہ تو تو پہلے سے ہی آگاہ ہے۔ پر کیا کریں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں!

بادشاہ کہتا ہے، خدا، آپ ہمیشہ ہمارا کام شروع کرتے ہیں، لیکن ہم پھر بھی غلطیاں کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ دوسرے ہماری مدد کر سکتے ہیں! خدا کو نہ بھولیں کہ آپ جس حیثیت میں بھی ہیں...

اہم سبق یہ ہے کہ:

آپ زندگی میں ناکام ہوتے ہیں؛ لیکن جان لیجئے کہ یہ ساری ناکامیاں آپ کی استاد ہیں۔

اگر آپ چند سال پیچھے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ تمام ناکامیاں ایک مثبت موڑ پر ختم ہوئیں اور آپ سمجھیں گے کہ وہ آپ کی زندگی کا سبق تھے۔ ہم میں سے ہر ایک آخری فتح تک پہنچنے کے لیے لگاتار ناکامیوں کا تجربہ حاصل کرتا ہے...

براہِ کرم زندگی کی ناکامیوں کی فکر نہ کریں اور اپنی ناکامیوں کا جائزہ نہ لیں۔ بلکہ ہر ناکامی سے ضروری سبق لیں اور اسے اچھے احساس کے ساتھ پاس کریں اور زندگی کی راہ کو جاری رکھیں۔

حقیقتِ حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے

ربّ قدوس اِنسان کا اور اس کی فِطرت کا خالق ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ:

"کون سی چیز اِنسان کے لیے مُفید ہے اور کون سی چیز اس کے لیے مُضر ہے۔ اللہ تعالیٰ اِنسانوں کے نفع اور نقصان کو خود ان سے زیادہ جانتا ہے۔"

اسی حقیقت کا بیان ربّ حکیم و علیم نے اِن الفاظ میں فرمایا ہے:

وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ البقرة (216)

اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں ناپسند ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ بات مسلمان گھرانے میں بچپن میں ہی سکھا دی جاتی ہے کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ دعا قبول نہیں ہوئی؟ اس میں بہتری ہو گی۔ کوئی محبوب چیز نہیں ملی۔ اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔ جو چاہیے تھا وہ نہیں ہوا بلکہ کچھ برا ہو گیا- یہی آپ کے حق میں اچھا ہو گا بس رونا مت ڈالو اور صبر کر لو۔ کوئی شے جس سے آپ کو محبت ہو گی، اس میں اللہ نے آپ کے لیے شر رکھا ہو گا۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ کوئی شے اتنی دل کو بھا جائے کہ اس کی طرف انسان کھنچا چلا جائے۔ کوئی شے دل کو اتنی خوبصورت محسوس ہو کہ دل اس کے آگے بے بس ہو جائے۔ انسان جب کسی کی طرف کھنچتا ہے تو اس سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جو شے دل کو بھاتی ہے دل اسے مانگنے لگتا ہے اور انسان دعا کرتا ہے، وظیفے کرتا ہے، تڑپتا ہے لیکن وہ چیز نہیں ملتی اور سمجھایا جاتا ہے کہ اس میں ہی بہتری ہو گی، یہ آیت ہمیں اتنی دفعہ سمجھائی جاتی ہے، زندگی کے مشکل مرحلوں پہ نصیحت کی جاتی ہے کہ ہم اس کو سن سن کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب آپ کو آپکی محبوب چیز بھی نہیں ملتی اور آپ کا دل بھی اپنے اردگرد کے لوگوں کی باتوں سے دکھتا ہے، تنگ ہوتا ہے، سینہ گھٹتا ہے، بے سکونی ہوتی ہے، سانس بند ہوتا ہے، رونا آتا ہے لیکن آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ مجبور ہیں۔ آپ کے پاس ان باتوں کو خاموشی سے سننے اور اگنور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ مجبوری کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿ۙ۹۷﴾ (الحجر 97)

ترجمہ: اور بیشک ہم خوب جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔

حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پریشانی طاری ہوتی تو آپ نماز پڑھتے تھے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1319، مسند احمد ج5 ص388)

باقی رہا یہ کہ نماز پڑھنے سے انسان کی گبھراہٹ اور پریشانی کس طرح زائل ہو جاتی ہے اس کی حسب ذیل وجوہات ہیں

(1)جب انسان عبادت میں مستغرق ہو جاتا ہے تو اس کی توجہ دنیا کے معاملات سے بالکل زائل ہو جاتی ہے اور اس کا ذہن اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی تجلیات سے روشن ہو جاتا ہے اور جس پر یہ کیفیت طاری ہو اس کے دل سے گھبراہٹ اور پریشانی زائل ہو جاتی ہے

(2)جب انسان تسبیحات پڑھتا ہے اور اس کے دل میں یہ اعتقاد جاگزیں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عیوب اور قبائح سے منزہ ہے تو اس پر مشقت کا برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور اس کا دل خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے

(3)جب انسان پر پریشانی آئے تو وہ نماز میں پناہ لیتا ہے اور زبان حال سے یہ کہتا ہے خواہ میں کسی حال میں ہوں مجھ پر تیری عبادت واجب ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس پر کرم فرماتا ہے اور اس کی پریشانی زائل فرمادیتا ہے۔

اِسی لیے جو کچھ ہمارے پاس ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا ہو سکے شُکر ادا کرنا چاہیے اور جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے اُس کو خدائے لم یزل کی رضا اور بہتری سمجھنا چاہیے۔

تو مولانا رومؒ پھر بھرپور وجد سے گویا ہوتے ہیں

اے ہمیشہ حاجَتِ مارا پَناہ

بارِ دیگر ما غَلَط کردیم راہ

ایرانی طرز

لیک گفتی گرچہ می دانم سِرَت

زود ھم پیدا کُنَش بر ظاہِرَت

لیک گفتی گرچہ میدانِ سرَت
زود ہم پیدا کُنش بر ظاہرَت

- لیک: استدراک ہے (حصول معلومات، ایک چیز سے دوسری چیز دریافت کرنا یا پانا، ادراک کرنا)

علم بدیع میں کسی بات کی نفی مطلق یا اثبات صریح کے بعد کوئی ایسی شرط درمیان لانا جس سے وہ نفی یا اثبات مشروط ہو جائے۔یعنی شاعر اپنی مدح کے بعد حرف استثنالائے جس کو سن کر لوگ سمجھیں کہ بعد اس کے مذمت کرے گا اور اس کے بعد صفت مدح کی بیان کرے۔ماغلط کردیم یونی اظہار حال کی غلطی سے

گفتی: آپ نے کہا۔۔۔گرچہ: اگرچہ۔۔۔می دانم: میں جانتا ہوں۔۔۔سرت: سر سے ہے یعنی راز اور ت تیرا

زود ہم: جلد۔۔۔پیدا کنش: غلطی تلاش کرین۔۔۔بر ظاہرت: ظاہری شکل میں

ترجمہ: لیکن چونکہ تونے فرمایا ہے کہ میں تیرا بھید جانتا ہوں مگر تو بھی اسے ظاہری حالت کے مطابق بیان کردیا کر اس لئے بیان کردیتا ہوں۔

یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کریم سے اظہار خیال کرنا غلطی ہے کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے لیکن کیا کریں کہ اسی کے ارشاد گرامی کے مطابق:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (٦٠)

مؤمن 85

اور تمہارے رب نے فرمایا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا بیشک وہ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے، مولا اس لئے عرض کرتا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد دعا ہے یا اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں دعا سے مراد عبادت ہے ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے "**وقال ربکم ادعونی استجب لکم**" (المومن:60) کی تفسیر میں فرمایا: ہر عبادت دعا میں منحصر ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ:) "بیشک جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت سے دوزخ میں داخل ہوں گے"۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث:۲۹۶۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث:۱۴۷۹، سنن ابن ماجہ رقم الحیث:۳۸۲۸، مسند احمد ج ۴ ص ۲۶۷ طبع قدیم، مسند احمد ج ۳۰ ص ۲۹۸، رقم الحدیث:۱۸۳۵۲، مؤسستہ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۹ھ، المعجم الاوسط رقم الحدیث:۳۹۰۱، کتاب الدعا للطبرانی رقم الحدیث:۴، المعجم الصغیر رقم الحدیث:۱۰۴۱، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۱، حلیۃ الاولیاء ج ۸ ص ۱۲۰)

میں کہتا ہوں کہ اگر دعا سے اس کا معروف معنی مراد لیا جائے تو وہ بھی درست ہے اور اس حدیث کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی اس کی عبادت کرنا ہے۔

دعا کرنے کی ترغیب اور اس کی فضیلت میں حسب ذیل احادیث ہیں:

دعا کی ترغیب اور فضیلت میں احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک اللہ عزوجل نے فرمایا: میں اپنے بندے کے گمان کے موافق ہوتا ہوں اور جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۷۴۰۵، صحیح مسلم رقم الحدیث:۱۶۷۵، سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۶۰۳)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ کسی چیز کی فضیلت نہیں ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث:۳۳۷۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۳۸۲۹، صحیح ابن حبان رقم الحدیث:۱۸۶۷، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۰)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم پر کوئی مصیبت آئے یا نہ آئے، دعا ہر حال میں تمہیں نفع دیتی ہے سوا اے اللہ کے بندو! دعا کو لازم رکھو۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۴۸، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۸، جامع المسانید والسنن مسند ابن عمر رقم الحدیث: ۲۷۸۴)

حضرت سلمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک اللہ بہت حیاء فرمانے والا، بہت کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ ان ہاتھوں کو خالی اور ناکام لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے۔

(سنن ابو دائود رقم الحدیث: ۱۴۸۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۵۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۶۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۸۷۳، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۷)

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تقدیر صرف دعا سے ٹلتی ہے، عمر میں صرف نیکی سے اضافہ ہوتا ہے اور انسان گناہ کرنے کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ (صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۸۷۲، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۳)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دعا عبادت کا مغز ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۳۷۱، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۳۳۲۰، جامع المسانید والسنن مسند انس رقم الحدیث: ۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا، اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۳۷۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۲۷، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۲۰۰، مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۲، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۶۶۵۵، المستدرک ج ۱ ص ۴۹۱، شرح السنۃ رقم الحدیث: ۱۳۸۹)

حضرت جابر بن عبد اللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتائوں جو تمہیں تمہارے دشمنوں سے نجات دے اور تمہارے رزق کو زیادہ کرے: تم دن رات اللہ سے دعائیں کیا کرو کیونکہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ (مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۸۱۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بندہ اپنے رب عزوجل کے سب سے زیادہ قریب سجدہ میں ہوتا ہے، پس تم (سجدہ میں) بکثرت دعا کیا کرو۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۸۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۸۷۵)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہمارا رب ہر رات کو آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے، جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو فرماتا ہے: کون مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اس کو عطا کروں؟ کون مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے کہ میں اس کی مغفرت کردوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۴۹۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۵۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۴۹۸، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۶۱۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۹۶۵۳، مسند احمد ج ۲ ص ۲۶۴، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۴۸۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۱۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۶۶، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۶۱۵۵، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۹۱۹)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کس وقت کی دعا سب سے زیادہ مقبول ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۴۹۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۳۹۴۸)

پادشاہ مشغول عشق بازی باپروردگار شد و میگفت:

خدایا تو از سرّ درون من آگاھی و خواستہ مرا میدانی!

بادشاہ رب سے محبت کرنے لگا اور کہنے لگا:

خدایا! آپ میرے باطنی علم اور خواہش کو جانتے ہیں!

ایرانی طرز

چون بَر آوَرُد از میانِ جانُ خُروش

اَنْدَر آمد بَحْرِ بَخشایش بہ جوش

پاکستانی طرز

چوں بَر آوَرُد از میانِ جانُ خُروش

اَنْدَر آمد بَحْرِ بَخشایش بجوش

چوں بر آورد: آپ کو کیسے ملا؟۔۔۔ از میان: درمیان۔۔۔ بحر بخشایش: بخشش کا سمندر۔

ترجمہ: جب بادشاہ نے دل کی گہرائی سے آہ وزاری کی تو اللہ کریم کی بخشش کا سمندر جوش میں آگیا۔

میاں محمد بخشؒ کی زبان سے منظر کچھ یوں بنا:

رحمت دادریا الٰہی تے ہر دم وگدا تیرا

جے اک قطرہ بخشیں مینوں تے کم بن جاندا میرا

تے سارے کہندے تیرا تیرا تے میں وی آکھاں تیرا

تیرا تے مولا کج نہیں جاناں جو توں وی کہہ دے تیرا

تے خس خس جتنا قدر نی میرا میرے صاحب نوں وڈیائیاں

تے میں گلیاں دا روڑا کوڑا مینوں محل چڑھایا سایاں

فضل تیرے نل لوہے تر دے پھٹیاں دے سنگ رل کے

کتے وی جنت جان محمد چنگیا دے سنگ رل کے

لکھ واری میں توبہ بھنی تے میں ہاں بے اعتبارا

فیر وی فضل تیرے دیاں مولا آساں رکھن والا

عیب میرے پر پلہ دیندا ہنر کریندا ظاہر

جدوں اوہ کرم داواڑہ کر دا کوئی نہ رہندا باہر

(میاں محمد بخشؒ)

زنوش لعل تو خواہم دوائے من باشد

حریم کوئے تو دار الشفائے من باشد

میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہونٹوں سے مجھے دوا حاصل ہو (یعنی آپ کا مجھ سے بات کر لینا ہی میرا علاج ہے)۔ آپ کی مقدس گلی میرے لئے دار الشفا ہو جائے۔

مرا گناہ ترا بحر رحمتست بجوش

خوشا گناہ کہ رحمت جزائے من باشد

میرے گناہ کے مقابل آپ کی رحمت پُر جوش ہے۔ کیا ہی اچھا گناہ ہے کہ رحمت میرا بدلہ ہو جائے۔

پناہ جو بدرت آمدم بہ عجز و نیاز

کہ آستان تو حاجت روائے من باشد

میں آپ کے در پر عجز و نیاز کے ساتھ پناہ ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں تا کہ آپ کا آستانہ میرے لئے حاجت روا ہو جائے۔

مکن بناز طبیباں نیاز مند مرا

کہ خاک پائے تو خاک شفائے من باشد

طبیبوں کے ناز کا مجھ کو نیاز مند نہ بنائے کیونکہ آپ کی خاک پا میرے لئے خاک شفا ہے۔

امام بندۂ مسکیں کمینہ در گہ تست

بود کہ گوشۂ چشمے برائے من باشد

بندۂ مسکین امام آپ کے در کا غلام ہے، کاش کہ ایک نگاہ میری طرف بھی ہو جائے۔

(جنون پھلواری)

جب تک بچہ نہیں روتا ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں اترتا۔ ماں کی چھاتی میں خون بھرا ہوتا ہے۔ جب پیدا ہو کر بچہ نے رونا شروع کیا تو وہی خون فوراً دودھ سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش سے ایک سیکنڈ پہلے ساری چھاتی خون سے بھری ہوئی ہے اور جیسے ہی بچہ پیدا ہوا اور رویا اس کے رونے میں کیا کرامت اللہ نے رکھی ہے کہ اسی وقت ماں کا سارا خون جو چھاتیوں میں ہے دودھ سے مستحیل اور متبدل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہی شان ہے۔ ایک نافرمان، صفتِ غضب کے تحت ہے لیکن ذرا سا رویا کہ مالک مجھ کو معاف کر دیجیے، مجھ سے خطا ہوئی اسی وقت حق تعالیٰ کی صفتِ غضب صفتِ رحمت سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ ابھی تو سزا کا مستحق تھا اب عطا کا مستحق ہو گیا۔ مستحق سزا پر عطائیں اور رحمتیں نازل ہو رہی ہیں۔

جوش میں آئے جو دریا رحم کا

گبر صد سالہ ہو فخر اولیاء

جب اللہ کی رحمت کے دریا میں جوش آتا ہے تو سو برس کا کافر فخر اولیاء بن جاتا ہے۔

پیرانِ پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کا واقعہ

سیدی و مرشدی حضرت سیدنا الشیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ ہے، دو بجے رات کو حکم ہوا کہ بغداد سے موصل جاؤ۔ وہاں سے موصل پہنچے۔ ایک ابدال کا انتقال ہو رہا تھا، سارے ابدال جمع تھے۔ خواجہ خضر علیہ السلام نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اپنے زمانے کے غوث تھے۔ علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ غوث کو روزانہ اللہ تعالیٰ سے ایک وقت خاص قرب کا عطا ہوتا ہے کہ پوری دُنیا میں ایسا قرب کسی کو نہیں عطا ہوتا۔ جب شیخ سید عبد القادر جیلانیؒ کا وہ وقت آیا کہ جس وقت روئے زمین پر اتنا مقرب کوئی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ جو ابدال انتقال کر گیا اب دوسرا ابدال کہاں سے لاؤں، اب کس کو آپ اس کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں اور ابدال کون ہیں؟ اس پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ پیرانِ پیر الشیخ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو حکم ہوا کہ آپ جایئے ایک بستی ہے اور وہاں ایک عیسائی ایک گرجاگھر میں اپنے عیسائی مذہب پر ذوالنار پہنے ہوئے مشغول عبادت ہے آپ جایئے اور اس سے کہیے ذوالنار توڑ ذوالنور بن۔ ذوالنار توڑ دے اور کلمہ پڑھ اور اس کو ابدال کی کرسی پر بٹھا دیجیے۔ اس بڑے ولی اللہ کے درجہ پر اس کو بٹھادو جو ابھی حالتِ کفر میں ہے۔

جوش میں آئے جو دریا رحم کا

گبر صد سالہ ہو فخر اولیاء

اللہ کی رحمت کے دریا میں جب جوش آتا ہے تو سو برس کے کافر کو فخر اولیاء بنا رہے ہیں۔ بڑے پیر صاحب الشیخ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گرجاگھر میں جا کر پکڑا اور فرمایا جلدی توبہ کر عیسائی مذہب سے۔ اب اسلام کے سوا کوئی مذہب قبول نہیں۔ اللہ کے نزدیک اسلام ہی مقبول دین ہے:

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ36

اِسلام کے سوا اگر کوئی عیسائیت، یہودیت، ہندویت یا کوئی بھی مذہب اختیار کرے گا، اللہ کے یہاں اس کی قبولیت کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ وہ دین مردود ہے جو اسلام کے علاوہ ہو۔ جلد عیسائیت سے توبہ کر اور ذوالنار توڑ دے۔ اس نے فوراً توڑ دیا۔ یہ اس نے اتنی جلدی ہدایت کیوں قبول کر لی؟ اللہ میاں نے پہلے ہی اس کا کام بنا دیا تھا اور اس کے دل کو ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت عطا فرما دی

تھی۔ پھر اس نے کہا اب کیا پڑھوں؟ فرمایا پڑھ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا فرض ہے۔

امید کا تعلق رحمت کے قبیل سے ہے اور مایوسی شیطان کا ہتھیار۔ مایوس انسان اصل میں شعوری یا لاشعوری طور پر اس بات کا انکاری ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات کو بہتر کرنے پر قادر ہے جبکہ پُر امید شخص کی نظریں مسلسل عنایتِ رب تعالیٰ پر لگی رہتی ہیں۔ اس طرح بندے کا اللہ تعالیٰ سے امید کا یہ تعلق بھی عبادت ہی کہلاتا ہے جبکہ ترکِ عبادت ایک گناہ ہے۔

امید اور مایوسی اصل میں دن اور رات کی طرح ہیں ایک کا اُتار تو دوسرے کا چڑھاؤ۔ پُر امید انسان روشنی کا چمکتا ستارہ اور مایوس انسان اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ روشنی میں ہر راستہ دکھائی دیتا ہے جبکہ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا۔ پُر امید انسان کے پاس جینے کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہوتا ہے جبکہ مایوس انسان اپنی زندگی کے خاتمے کے طریقے سوچتا ہے اور پھر کر بھی گزرتا ہے۔ لیکن زندگی تو ختم ہوتی ہی نہیں۔ یہاں تک کہ موت کے بعد بھی نہیں۔ زندگی صرف اپنی حالت بدلتی ہے۔ اور موت۔ ۔۔ ایک نئی حالت کی ابتدا کا نام ہے۔ زندگی کی یہ نئی حالت اپنی پہلی حالت کے گزارنے پر جوابدہ ہوتی ہے۔ جس کی تمثیل بھی اسی دنیا میں موجود ہے۔ انسان کا آج ہی انسان کے کل کو سنوارتا یا بگاڑتا ہے۔ جوانی کی غلطیاں بڑھاپے میں آگے آجاتی ہیں اور اسی طرح جوانی کی نیکیاں بھی بڑھاپے کو سہارا دیتی ہیں۔ اب جیسے جوانی کے اچھے یا برے اعمال اس کے بڑھاپے کو اچھا یا برا بناتے ہیں۔ بالکل یہی صورتحال اس زندگی سے اگلی زندگی میں داخل ہونے کی ہے جہاں اس زندگی پر جوابدہ ہونا ہے۔

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی ریاست ہے اور اس ریاست میں وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے! انسان اللہ کا بندہ ہے اور بندے کا کام اپنے معبود کی بندگی کرنا ہے۔ مالک کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے بندے کو اچھے، برے یا جیسے چاہے حالات سے گزارے۔ وقت اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور ہر شئے اپنے اوقات میں اپنی حالت بدل رہی ہے۔ اوّل پہر میں طلوع ہونے والے سورج کی چمک دوسرے پہر سے ملتے وقت اپنے عروج پر ہوتی ہے پھر یہی سورج تیسرے سے چوتھے پہر میں داخل ہوتا ہوا آخر کار اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر اسی طرح رات کے پہر بھی بدلتے جاتے ہیں۔ جس کے بعد پھر اک نئی صبح اور پھر اک نئی شام۔ دن اور رات کی طرح انسان کی زندگی کے پہر بھی بدلتے ہیں، اوقات بدلتے ہیں جن میں بندے کی اپنی اوقات بھی بدلتی رہتی ہے۔

انسان اپنے حالات پر کتنا بھی پہرے دار بن جائے مگر پھر بھی پہر بدل ہی جاتے ہیں۔ اور ان پہروں کا بدلنا ہی انسان کو بتاتا ہے کہ انسان کا خود پر اور حالات پر کتنا اختیار ہے؟

دراصل یہ سب مالک کے کام ہیں۔ جن میں بندے کے پاس صرف اس کا خیال اور عمل ہے جسے وہ ان پہروں کے بدلنے میں اپنے اللہ کے حضور پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو اللہ دھوپ کو تپش عطا کرتا ہے وہی چھاؤں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔ اور پھر وہی خدا، انسان کو اس دھوپ اور چھاؤں کے درمیان دوڑاتا رہتا ہے۔ دھوپ چھاؤں کی یہ دوڑ زندگی کا حصہ ہے۔ جیسے اگر دل کی دھڑکنوں کو ماپنے والی ای۔سی۔جی مشین کو دیکھا جائے تو اس کی سکرین پر دکھائی دینے والی لکیر جو تسلسل کے ساتھ اوپر اٹھتی اور پھر نیچے گرتی نظر آتی ہے۔ اس اوپر اٹھتی اور نیچے گرتی لکیر کا مطلب ہی زندگی ہے کیونکہ اسی، ای۔سی۔جی مشین کی لکیر جب بالکل سیدھ اختیار کرلے تو اس سیدھ کا سیدھا مطلب بندے کی موت ہے۔ موت۔۔یعنی موجودہ زندگی کا اختتام۔ اونچ پنچ، اچھائی برائی، بلندی پستی سب ختم۔ اب اگلی حالت میں اس زندگی کے اعمال کا فیصلہ ہے۔ پل صراط کی سیدھی لکیر ہے اور بندے کے پاس کیا ہے؟ امید! ان اعمال کے اچھے نتیجے کی امید، رحمت کی امید، فضل کی امید، واللہ ذو لفضل العظیم۔

فضل کی اس امید کا سلسلہ ہمیشہ آج سے شروع ہوتا ہے۔۔ آنے والے ہر کل کے لیے! کیونکہ ہمیں کل کبھی نہیں ملتا۔ ہم ہر کل کو آج ہی کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ہم آج کا شکر ادا کرتے ہیں اور پھر مزید اچھے کل کی امید لگاتے ہیں۔ آج کا شکر اور اچھے کل کی امید! پھر یہی عمل ہمارے اعمال نامہ میں درج ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بندہ ایک روز اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔ مالکِ حقیقی سے فضل کی امید ہی تو انسان کا اثاثہ ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ کا قول ہے کہ "اپنی مرضی اور اللہ کی مرضی میں فرق کا نام غم ہے"۔

اللہ اور انسان کی مرضی کا یہ فرق غم بن کر اکثر انسانی زندگی میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کسی نے وقت کی سختی میں اپنے رب سے مایوس ہو کر امیدِ رحمت کو مایوسی کی بدگمانی سے بدل دیا تو اس سے مالک کی شان کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نہ ہی کائنات جو اللہ کی ریاست ہے اس میں کچھ تبدیلی آئے گی۔ مگر بندے کا وہ ردعمل جو اس نے خدا کے حضور ظاہر کیا اور پھر اس ردعمل کے ساتھ جس عمل کو اختیار کیا وہ دونوں نامہ اعمال کی تحریر میں ضرور آجائیں گے۔ یعنی مشکل وقت کی اس بندش میں بندے نے اللہ رب العزت کی جانب سے امتحان سمجھ کر صبر کیا، بہتر کل کی دعا مانگی اور اس سے رحمت کی امید رکھی یا حالات سے بدظن اور مایوس ہو کر اللہ اور بندگی کا اپنا یہ تعلق ہی خراب کر بیٹھا؟ یوں مایوسی انسان کو گمراہی کی جانب دھکیل دیتی ہے۔ جس سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔ اور امید کے دیے کو کبھی بجھنے نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس روشنی سے ہی زندگی روشن ہے۔

یہی کام بادشاہ نے کیا۔ وہ در مولا پر آیا اور اپنا دامن مراد پھیلا دیا۔

ایرانی طرز

درمیانِ گریہ خوابَش دَررُبود

دِید دَرخُواب اوکہ پیری رونِمود

پاکستانی طرز

درمیانِ گریہ خوابَش دَررُبود

دِید دَرخُواب اوکہ پیرے رُونِمود

درمیان: کے اندر۔۔۔ گریہ: رونا۔۔ خوابش: اس کی خواب۔۔۔ در: میں۔۔۔ پیری: بڑی عمر کے بزرگ۔۔۔ نمود: ظاہر ہوئے

ترجمہ: اس بادشاہ کو روتے روتے نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ ایک بڑی عمر کے بزرگ ظاہر ہوئے۔

پہلے مولانا رومؒ نے گریہ کرنے اور اللہ کی بارگاہ میں الحاہ وزاری کی اہمیت اور دعا کرنے کی طرف وضاحت فرمائی کہ کس طرح انسان حضوری میں چلا جاتا ہے۔ اور کس طرح اسے اللہ کی بارگاہ میں پذیرائی ہوتی ہے۔ رونا ایسا فعل ہے جو قرب لاتا ہے۔

کیونکہ رونا تجھے وجود میں لاتا ہے اور ہر حال میں رونے کی کیفیت میں رہ کر اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے، اے رب!، میں "میں" ہوں اور میری بے چینی کو دیکھو، "میں" تجھ تک پہنچ چکا ہوں۔ اس حالت میں وہ روحانی کیفیات سے ہمکنار ہو کر سو جاتا ہے، اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے، اور اس کی روح تموج میں آتی ہے، لیکن ایک سچا مومن اپنی ذات کا محتاج ہے، خواہشات کا محتاج نہیں۔ اور اسی لیے، بہت سی تمثیلوں میں، مولانا رومؒ پریشان شخص کو روتے ہوئے سلاتے ہیں، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اپنا وجود ختم کر چکا ہے اور بوڑھا، روشن خیال بوڑھا ہو گیا ہے، ہاتف غیب اس کی روح کو خوشخبری دیتا ہے،

یہاں مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ بادشاہ کی دعا کے جواب کی وجہ سے رونے اور گریہ کرنے کے بعد جب اس پر نیند طاری ہوئی تو وہ اپنے وجود سے خالی ہو گیا اور روح تنہائی کے سفر پر چلی گئی اور وہ عقلمند بزرگ اس پر ظاہر ہوئے

نیند ہی صوفیہ کے لیے مسائل کی کلید اور حل ہے

بدیع الزمان فروزانفر کہتے ہیں: "کیونکہ نیند ہی صوفیہ کے لیے مسائل کی کلید اور حل ہے، اس لیے انھوں نے خواب یا کسی واقعے میں اس کا حل تلاش کیا ہے۔" جبکہ نیند مسائل کی کلید اور حل نہیں ہے جس کی وہ تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن نیند مومن کے نزدیک عبادت ہے۔ کیونکہ خواب میں مومن کی روح مبشرات کی دنیا سے جڑی ہو سکتی ہے اور دوسری بات یہ کہ ہر وہ تمثیل جس میں مصیبت زدہ اپنے رونے کے بعد اپنی ہستی کو ختم کر چکا ہوتا ہے تو روح (مولاناؒ نے اشارہ کیا کہ دعا کے جواب میں سہولت فراہم کرنے والا عامل فراہم کیا جاتا ہے) نتیجتاً مصیبت زدہ کے سونے سے پہلے بخشش کا سمندر ابلتا ہے، لیکن نیند کی کیفیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب سویا ہوا شخص اپنے وجود سے خالی ہوتا ہے، وہ تنہا سفر پر نکل جاتا ہے یہاں تک کہ اسے سچے خواب کی صورت میں دعا کے جواب کی بشارت مل جاتی ہے، یاد رکھیں رونا بھی دعا کی شرطوں میں سے ہے۔

خواب چلتی پھرتی تصاویر، خیالات، جذبات اور احساسات کا ایک ایسا کرشمہ ہیں جو نیند کی کُچھ حالتوں کے درمیان ہماری مرضی کے بغیر ہمارے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ جدید سائنس ابھی تک ان کے پیدا ہونے کی وجوہات کو پُوری طرح نہیں سمجھ پائی مگر علم نفسیات، علم فلاسفی کے ماہر اور اسلام سمیت کئی مذاہب میں خوابوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ جذباتی اور شوخ تجربات سے بھرے ہوتے ہیں جن میں تھیمز، خدشات، خواب کے اعداد و شمار اور ایسی چیزیں شامل ہوتی ہیں جو بیدار زندگی سے بہت قریب ہوتی ہیں۔ یہ عناصر بظاہر کچھ بھی نہ ہونے سے ایک نئی "حقیقت" تخلیق کرتے ہیں، جس سے زندگی بھر کے ٹائم فریم اور رابطوں کے ساتھ ایک تجربہ پیدا ہوتا ہے۔ جسم کے لیے نیند کی اہمیت سے متعلق بہت سی تحقیق کی جا چکی ہے۔ نیند میٹابولزم خلیات کے بننے اور ٹوٹنے کا عمل، فشار خون، دماغی سرگرمی اور جسمانی صحت کے دیگر امور کے انتظام و بہتری سے جڑی ہیں۔ خوابوں سے متعلق اب تک انسانی معلومات خاصی محدود ہے۔

دنیا ہے خواب حاصل دنیا خیال ہے

انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ مطلقًا خواب کا انکار کر دینا کہ سرے سے خواب یا رویائے صالحہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا یا یہ گمان کرنا کہ خواب محض جھوٹ اور من گھڑت ہے، ایسا رویہ جہالت اور لاعلمی ہے، کیونکہ خواب کے وجود اور تصور کا صراحتًا انکار کر دینا کفر ہے۔ اس لئے کہ خواب کا وجود قرآن کریم سے ثابت ہے اور خود سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الَّذِينَ آمَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُونَ ○ لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَياةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ.

یونس، 10:63، 64

(وہ) ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (ہمیشہ) تقویٰ شعار رہے۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں (بھی عزت و مقبولیت کی) بشارت ہے اور آخرت میں (بھی مغفرت و شفاعت کی۔ یا دنیا میں بھی نیک خوابوں کی صورت میں پاکیزہ روحانی مشاہدات ہیں اور آخرت میں بھی حُسنِ مطلق کے جلوے اور دیدار)۔

قرآن مجید کی تمام تفاسیر میں ہے کہ بشارت سے مراد وہ نیک خواب ہیں جو اللہ رب العزت ایمان والوں کو عطا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت سے کمالات اور معجزات عطا فرمائے، ان میں خوابوں کی تعبیر کا علم اور فن بطور خاص عطا فرمایا۔ اس کا ذکر سورہ یوسف میں مذکور ہے۔ مثلاً بادشاہ مصر اور قیدیوں کے خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بیان ہوئے۔ آپؑ نے ان کی تعبیر بیان فرمائی اور اس تعبیر کے مطابق آئندہ واقعات رونما ہوئے۔ قرآن مجید دوٹوک انداز میں خوابوں کے وجود کی صداقت کا بیان کر رہا ہے کہ تعبیر کا فن اللہ پاک نے اپنے نبی علیہ السلام کو عطا کیا۔ خواب کے وجود کا انکار کہ یہ محض وہم ہے، یہ من گھڑت چیز ہے، یہ باطل ہے اور رویائے صالحہ کا کوئی وجود نہیں، خود قرآن مجید کی آیت کا انکار ہے۔ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، علامہ عبد الغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے تعبیر الرویا کے باب میں ایک حدیث پاک نقل کی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من لم یومن بالرویا الصالحہ لم یومن باﷲ ولا بالیوم الآخرۃ.

نابلسی، تعطیر الانام فی تعبیر المنام: 3

جو شخص نیک خوابوں پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ جو دنیائے اہل سنت کے امام ہیں۔ انہوں نے اپنے عقائد میں درج کیا ہے کہ خواب کا مطلقاً انکار کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

حدیث نبوی میں رویا صالحہ کا ذکر صراحتاً موجود ہے، بلکہ حدیث مبارکہ کی کتابوں میں خوابوں کے حوالے سے عنوانات، ابواب اور فصلیں قائم کی گئی ہیں۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ احادیث ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم جن کا دنیا میں کسی مسلک کا کوئی عالم انکار نہیں کر سکتا ان میں حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لم يبق من النبوة الا المبشرات

بخاري، الصحيح، كتاب التعبير، باب المبشرات، 6:2564، رقم: 6589

اب نبوت باقی نہیں رہی (ہاں اس کا فیض) مبشرات کی صورت میں باقی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا "وما المبشرات؟" یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبشرات سے کیا مراد ہے؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الرویا الصالحہ" (مبشرات سے مراد نیک خواب ہیں)۔ گویا اب قیامت تک کوئی نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا جو کرے گا وہ کافر و مرتد ہو گا۔ نبوت فیضان مبشرات کی صورت میں قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔

دوسرے مقام پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدى ولا نبى قال فشق ذلك على الناس فقال لكن المبشرات.

ترمذي، السنن، كتاب الرؤيا عن رسول الله صلي الله عليه وآله وسلم، باب ذهبت النبوة وبقيت المبشرات، 4:533، رقم: 2272

میرے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے، اب کوئی رسول آ سکتا ہے نہ کوئی نبی لیکن میرے بعد مبشرات اور بشارتیں ہوں گی۔

مبشرات کیا ہیں؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ نیک خواب جو اہل ایمان کو آتے ہیں۔"

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ایها الناس لم یبق من مبشرات النبوۃ الا الرویا الصالحه یراها المسلم او تری له.

اے لوگو! مبشرات نبوت میں ماسوائے نیک خوابوں کے جو کسی مومن کو دکھائی دیتے ہیں کچھ بھی باقی نہیں رہا، گویا اب نبوت من کل الوجود ختم کر دی گئی ہے۔ نبوت کے سارے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں لیکن ایک چیز جو اللہ نے میری امت کے لیے بطور نعمت باقی رکھی ہے وہ اہل ایمان کو دکھائے جانے والے نیک خواب و مبشرات ہیں۔

صحیح بخاری میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الرویا الصالحه من الله

بخاري، الصحيح، كتاب بدء الخلق، باب صفة ابليس وجنوده، 2:1198، رقم: 3118

نیک خواب اللہ رب العزت کی طرف سے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے نیک خواب و مبشرات کو مسلمانوں کی ہدایت کا ایک ذریعہ و سبب بنایا ہے، اللہ رب العزت نے اپنے نیک و مقرب بندوں پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیوں کی ہدایت کے لیے خوابوں اور بشارات کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ پہلے ہدایت انبیاءؑ پر وحی کی صورت میں فرشتے لاتے تھے، اللہ کا وہ کلام کامل و اکمل اور قطعی و حتمی ہدایت ہوتا تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحی کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اب خوابوں اور بشارات کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو سعید خدری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اصدق الرویا بالاسحار

ترمذي، السنن، کتاب الرویا عن رسول الله، باب قوله لهم البشري في الحیاة الدنیا، 534:4، رقم: 2274

وہ خواب جو سحری کے وقت رات کے پچھلے پہر آتے ہیں وہ دیگر خوابوں کے مقابلے میں زیادہ سچے ہوتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

فان رای رویا حسنة فلیبشر

مسلم، الصحیح، کتاب الرویا، 1772، رقم: 2261

جو کوئی اچھا، نیک خواب دیکھے تو اس پر خوش ہو۔

سنن ابن ماجہ میں تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تم میں سے کوئی اگر اچھا اور پسندیدہ خواب دیکھے تو جس سے مناسب سمجھے بیان کرے۔ ایک اور حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص کوئی برا خواب دیکھے وہ اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔

سنن ابی داؤد میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ثم لیتعوذ من شرہ

ابو داود، السنن، کتاب الادب، باب ماجاء في الرویا، 305:4، رقم: 5021

(جو کوئی برا خواب دیکھے) تو اس کے شر سے اللہ کے حضور پناہ مانگے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خواب دیکھتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں، کیا کروں؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کچھ کلمات بتائے کہ اگر برا خواب دیکھو اور ڈرو تو یہ کلمات پڑھ لیا کرو، اللہ پاک اس کے شر اور خوف سے تمہیں پناہ دے گا۔

اگر خواب کا کوئی وجود نہ ہوتا اور اس کے اچھے برے اثرات مرتب نہ ہوتے تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برے خواب کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین نہ فرماتے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب کے آداب بیان کیے اور خواب کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

الرویا ثلاث فالرویا الحسنة بشری من اللہ عزوجل والرویا یحدث بھا الرجل نفسه والرویا تحزین من الشیطن.

حاکم، المستدرک، 4:422، رقم: 8174

خواب تین طرح کے ہوتے ہیں

سچا ونیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوتا ہے، دوسری قسم آدمی اپنے نفس سے ہی گفتگو کرے، تیسری قسم شیطان کی طرف سے ڈرانا ہے۔

غرض یہ کہ نیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے لیے خوشخبری اور بشارت ہوتا ہے، برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، تیسرا تحدیث النفس، منتشر الخیالی جیسے آپ نے دیکھا کہ اچانک آپ عورت بن گئے یک لخت دیکھا کہ سر کٹ گیا ہے تھوڑی دیر کے بعد آپ شیر بن گئے ہیں، پھر دیکھا کہ پانی میں گر گئے ہیں ہوا میں اڑ رہے ہیں، اس قسم کے اوٹ پٹانگ خوابوں کو منتشر الخیالی کہتے ہیں، ان کی کوئی تاویل و تعبیر نہیں ہوتی۔

لیکن یاد رہے: جھوٹا خواب بیان کرنا بہت بڑی خرابی ہے چنانچہ حدیث پاک میں بیان ہوا

حدثنا علی بن مسلم، حدثنا عبد الصمد، حدثنا عبد الرحمن بن عبد اللہ بن دینار مولی ابن عمر، عن ابیه، عن ابن عمر، ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، قال: "إن من افری الفری ان یری عینیه ما لم تر."

ہم سے علی بن مسلم نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الصمد نے بیان کیا، کہا ہم سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن دینار نے بیان کیا، ان سے ان کے والد نے اور ان سے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا "سب سے بدترین جھوٹ یہ ہے کہ انسان خواب میں ایسی چیز کو دیکھنے کا دعویٰ کرے جو اس کی آنکھوں نے نہ دیکھی ہو۔"

بعض لوگ ہر دلعزیز بننے یا کسی اور غرضِ فاسد کیلئے جھوٹے خواب گھڑ کر سناتے ہیں، یاد رکھئے! یہ بھی ناجائز و گناہ ہے، احادیثِ مبارکہ میں اس کی سخت وعیدیں آئی ہیں، چنانچہ سردارِ دوجہان، محبوبِ رحمٰن صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا فرمانِ عبرت نشان ہے: سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے علاوہ کسی غیر کی طرف منسوب ہو یا خواب میں ایسی چیز دیکھنے کا دعویٰ کرے ، جو اس نے نہیں دیکھی یا مجھ سے وہ بات منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی۔) بخاری، کتاب المناقب، باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل، ۲/۴۷۶، حدیث :۳۵۰۹ (ایک اور حدیثِ پاک میں ہے: جو شخص جھوٹا خواب بیان کرے، قیامت کے دن اسے جَو کے دو دانوں کے درمیان گِرَہ) گانٹھ (لگانے کا عذاب دیا جائے گا اور وہ کبھی بھی گِرہ) گانٹھ (نہیں لگا سکے گا۔ (بخاری، کتاب التعبیر، باب من کذب فی حلمہ، ۴/۴۲۲، حدیث: ۷۰۴۲)

المختصر قرآن مجید کے علاوہ صحیح بخاری و مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل، موطا امام مالک اور احادیث کی دیگر کتب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے خواب بیان کیے گئے ہیں، خوابوں اور بشارتوں کے حوالے سے کتب احادیث میں ابواب و فصول قائم ہیں مثلاً کتاب الرویا، الرؤیا الحسنہ۔

تو مولانا رومؒ نے اس شعر میں گویا علم الخواب کو واضح کر دیا اور بادشاہ کو اس کے ذریعے درست سمت میسر آگئی۔

ایرانی طرز

گفت ای شَہ مُژدہ حاجاتَت رَواست

گر غریبی آیدَت فردا زِماست

گفت اے شَہِ مُژدہ! حاجاتَت رَواست
گر غریبے آیدَت فردِ زِماست

مژدہ: بشارت، خوش خبری۔۔۔ حاجتت: تیری حاجت،،،، غریبَ: بے چارہ، اجنبی۔۔۔۔۔، فرد زماست: ہمارا آدمی

ترجمہ: اس نے کہا اسے بادشاہ! تجھے خوش خبری ہو تیری حاجتیں پوری ہوئیں۔ اگر کل کو کوئی اجنبی مسافر ائے تو وہ سمجھنا ہماری طرف سے ہے۔

مولانا رومؒ نے اس شعر میں یہ واضح فرمایا کہ خواب دراصل مبشرات میں سے تھا۔ جس سے اسے ڈھارس ہوئی۔ اور اسے ایک نئ جہت میسر آئی۔ ایک بلکل جدید ٹول ہے جو دراصل مسلم علماء و حکماء اس وقت بھی استعمال کرتے تھے جب یورپ تاریکی میں تھا۔ عین ممکن ہے کہ ان اشعار میں۔ کوئی خاص پیغام ہو وہ دور بڑا نازک تھا دور تھا قونیہ تمام علوم و فنون کا گڑھ تھا اور یورپ علماء کے تصانیف پر ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ علماء اسلام اپنے تالیفات میں بڑے راز بیان کرتے تھے۔ ان اشعار مین بھی حیرت انگیز طریقے سے تکنیکس استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

آج، بہت سے ماہرین نے محسوس کیا ہے کہ مذہب، دماغی بیماریوں کے علاج میں موثر ہے۔

مذہب تھراپی

دماغی امراض کے علاج کی معروف شاخوں میں سے ایک ہے۔ دماغی مسائل سے نجات اور علاج میں مذہبی احکامات پر بھروسہ اور قرآن کریم پر بھروسہ ان طریقوں میں سے ایک ہے جس کی تاثیر طویل عرصے سے تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور مختلف تجرباتی ٹیسٹ بھی لوگوں کی زندگیوں میں مذہبی سوچ کے موئثر کردار کی تصدیق کرتے ہیں۔

عارف واصلی نے مولانا رومیؒ کی طرح اپنی مذہبی نفسیات اور مذہبی فکر کو مثنوی میں مختلف مقامات پر پیش کیا ہے اور اس طرح انسانی فطرت کو کمال کی طرف رہنمائی کی ہے۔

در حقیقت مذہبی بنیادیں مثنوی کا ایک لازمی حصہ ہیں اور اس طرح کی مہارت کے ساتھ جناب رومیؒ سامعین میں خالص مذہبی خیالات ڈالتے ہیں اور مذہبی افکار کو دل و جان کی گہرائیوں میں پیوست کرتے ہیں جس سے قاری اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ گہرے سکون و امن تک پہنچنے کی طرف ایک راہ منزل ہے۔

مذہبی علاج کے بہت سے طریقے ہیں، جیسے ذکر الٰہی کے ذریعے علاج، قرآن پڑھنے سے علاج، دعا کے ذریعے علاج، توبہ کے ذریعے علاج وغیرہ۔

صوفیانہ سائیکو تھراپی (محبت کی تھراپی)

تصوف کا بنیادی ہدف خود شناسی اور چھپی ہوئی قوتوں، صلاحیتوں اور وجود کی جہتوں کو تلاش کرنا ہے۔ خود شناسی اور "خود" کے ادراک کی معراج تک پہنچنے کے لیے جو کہ اصل نفس و روح کا مرکز ہے، وجود کی زبان سے وجود کی کتاب کھولنا ممکن ہے؛ تصوف کی زبان وجود کی زبان ہے۔

ایک ایسی زبان جو اشارے اور اسرار سے ملی ہوئی ہے، اور اس کے ذریعے سے کوئی اپنے خدا کو جاننے کے اسرار کو حاصل کر سکتا ہے۔ در حقیقت یہ تصور کچھ اور نہیں بلکہ ایک قول مبارکہ کی مثال ہے "مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَهُ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّهُ

ترجمہ جس نے اپنی ذات کو پہچانا اس نے یقیناً اپنے ربّ کو پہچانا

"اور رومیؒ تصوف کے اس فعل سے بخوبی واقف ہیں۔

هر که را جامه ز عشقی چاک شد / او ز حرص و جمله عیبی پاک شد

شاد باش ای عشق خوش سودای ما / ای طبیب جمله علّت های ما

ای دوای نخوت و ناموس ما / ای تو افلاطون و جالینوس ما

جس کا لباس محبت سے پھٹا جاتا ہے   وہ لالچ اور برے الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔

خوش رہو، ہماری خوش محبت   اے ہمارے اسباب کے ڈاکٹر

اوہ، ہماری خوشی اور عزت کی دوا   اوہ، ہمارا افلاطون اور جالینوس

3. سائیکو تھراپی میں نیند اور خوابوں کو استعمال کرنے کی تکنیک

خواب ذہنی اور جذباتی شکلیں ہیں جو ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے اور عام طور پر بغیر کسی تعلق اور منطقی ترتیب کے ایک دوسرے کی پیروی کرتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق، خواب انسانی لاشعور کا آئینہ ہوتے ہیں اور عام طور پر اضطراب کو کم کرنے اور دبی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جناب رومیؒ اس طریقہ سے ناواقف نہیں تھے، انہوں نے وہ طریقہ استعمال کیا جو سائیکو تھراپی کے طریقوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، اور انہوں نے اس کا تذکرہ بہت سے معاملات میں کیا ہے، جن میں "بادشاہ اور کنیز" کی کہانی بھی شامل ہے:

رئیلٹی تھیراپی

تھراپسٹ کی جدید ترین کوششوں میں سے ایک ہے جو انسانوں کو بیان کرتی ہے، رویے کے اصولوں کا تعین کرتی ہے اور اطمینان، خوشی اور کامیابی کیسے حاصل کرتی ہے۔

اس طریقہ علاج میں حقیقت کا سامنا کرنے، ذمہ داری قبول کرنے اور رویے کی درستگی اور غلط ہونے کے بارے میں اخلاقی فیصلہ اور اس کے نتیجے میں کامیابی کی شناخت حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اصلاحی، رسمی، تنظیمی اور تعلیمی حالات میں مناسب سماجی رویے اور انفرادی ذمہ داری پر زور دینے کے ساتھ ریئلٹی تھراپی کو طاقتور مشیروں کا نقطہ نظر سمجھا جاتا ہے۔ جناب رومیؒ ہمیشہ ایک ادبی اظہار کے ساتھ قاری کو حقیقی دنیا کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے حقیقت کے علاج کی کھڑکی کھول دیتے ہیں:

یہ استعاراتی تعلق شاعر اور سامعین دونوں کے لیے ایک قسم کا آلہ ہے۔ استعاراتی بات چیت کا استعمال کہانیوں، افسانوں، کہانیوں، پریوں کی کہانیوں اور مضحکہ خیز کہانیوں کی شکل میں کیا جاتا ہے اور کسی کی نامعلوم یا غیر استعمال شدہ صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے طریقے کے طور پر مشاورت اور سائیکو تھراپی میں استعمال ہوتا ہے۔

لوگو تھراپی

وہ سائیکو تھراپی جو نہ صرف انسانی روح کو پہچانتی ہے بلکہ اصل میں روح سے کام شروع کرتی ہے، اسے لوگو تھراپی کہتے ہیں۔ جب انسان اپنے مصائب میں معنی تلاش کرتا ہے اور سبب اور اثر کے رشتوں کو دیکھتا ہے تو اسے کردار ادا کرنے اور مصائب سے بچنے کے بہانے کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن اگر زندگی کا مطلب بے معنی ہو تو وہ مزید گمراہ ہو جاتا ہے اور ایک سینگ سے دوسرے سینگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ ڈوب جاتا ہے.

جناب رومیؒ کی تشریح میں، مصائب، فتح اور کھلنے کا دروازہ ہے، جو نہ صرف روح کو چمکاتا ہے، بلکہ انسان پر الہی فضل اور فضل الہیٰ بھی بھیجتا ہے:

تو جناب رومیؒ نے بادشاہ کو ایک ایسا وسیل عطا فرمایا کہ جس سے بادشاہ کی روح کو تشفی نصیب ہوئی۔ اس کی اندرونی کیفیات کے تموج سے جو باطنی آنکھ کھلی اس سے اس کو مستقبل کا راز میسر آ گیا۔ اب شعر کو دوبارہ پڑھیں

گفت اے شَہِ مُژدہ! حاجاتَت رَواست

گر غریبے آیَدَت فردزِماست

ایرانی طرز

چون کہ آید او حکیمی حاذِق ست

صادِقش دان کو اَمین و صادق است

پاکستانی طرز

چونکہ آید او حکیمِ حاذِق ست

صادِقش داں کو اَمین و صادق است

آید: آیا۔۔ حاذق: ہوشیار، سمجھ دار، تجربہ کار۔۔۔ او: وہ۔ امانت دار۔۔۔ صادق: سچا۔۔

اس شعر میں مولاناؒ نے تلمیح (تلمیح ایک صنعت ہے۔ شاعری میں اس کا استعمال کم سے کم لفظوں کے ذریعہ معنی کے ایک بڑے علاقے کو گرفت میں لینے کے لیے ہوتا ہے۔) کا ستعمال کیاہے۔ جو کہ نبی دوعالم حضرت محمد مصطفٰے ﷺ کے دو اسمائے مبارک صادق اور امین کی طرف ہے۔ یعنی اس حکیم کی تصدیق کے لئے امین و صادق ہونا حسن تعلیل (حسن تعلیل در حقیقت وہ صفت جس میں شاعر ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہے جو در حقیقت اس کی علت نہیں ہوتی) ہے۔

ترجمہ: جب وہ شخص آئے تو سمجھ لو کہ وہ حکیم حاذق ہے۔ لہذا اس کو سچا سمجھو کیونکہ وہ امین و صادق ہے۔

بادشاہ نے جو عقل مند بزرگ دیکھے تھے وہ کہتے ہیں کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ضروریات پوری کی جائیں گی اور اگر کل کوئی اجنبی آئے تو وہ ہماری طرف سے ہوگا اور ہم نے اسے علاج کے لیے بھیجا ہے جو ایک ماہر طبیب (بابا) ہے۔ اس لیے وہ بزرگ حکم دیتا ہے کہ وہ طبیب ایک ماہر، دیانت دار اور راست باز ہے اس کے کام میں کوئی شک نہ کرے اور اے بادشاہ، آپ اسے سچا سمجھیں

،

اگلے دن بادشاہ ڈاکٹر کی آمد کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا، تھوڑی دیر بعد حاضرین نے اس کی آمد کا اعلان کیا اور بادشاہ بستر نیند کھِلے چہرے کے ساتھ آیا اور اس کا استقبال کرنے چلا گیا۔ مہمان وہی تھا۔ وہ آدمی جسے بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا۔ بادشاہ نے اسے عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا اور کھانے کے بعد اس کی تھکاوٹ وغیرہ دور کر کے اسے اس جگہ لے گیا جہاں وہ لڑکی تھی ڈاکٹر نے لڑکی کا بغور معائنہ کیا اور کہا کہ ڈاکٹروں نے اس کی بیماری کی تشخیص نہیں کی اور اس کے لیے دوائیں لکھ دیں۔ وہ دراصل لڑکی کی بیماری کی وجہ سمجھ گیا تھا لیکن بادشاہ کو کچھ نہیں بتایا، ڈاکٹر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکی کی بیماری جسمانی نہیں بلکہ اس کے دل کی بیماری ہے۔

در عِلاجَش سِحرِ مُطلَق رابہیں

در مِزاجَش قُدرتِ حَق رابِہیں

شعر میں صنعت ترصیع ہے

(ایسی صنعت جس میں پہلے مصرعے کے تمام الفاظ دوسرے مصرعے کے تمام الفاظ کے ہم قافیہ ہوتے ہیں) مثلاً

باصر ہیں یہ بصیر ہیں اہل وفا ہیں یہ

قادر ہیں یہ قدیر ہیں اہل سخا ہیں یہ

علاجش: اس کا علاج۔۔۔ سحر مطلق: واضح جادو، جادو کا اثر۔۔۔ ببیں: دیکھ لینا۔۔۔ در مزاجس: اس کے مزاج میں

ترجمہ: اس کے علاج میں پورے جادو کے کرشمہ کو دیکھ لینا اور اس کے مزاج میں قدرتِ خدا کی اثرانگیزی دیکھ لینا۔

مطلق کا مطلب مکمل ہے، اور لفظ سحر کا حوالہ صرف قیاس اور اس کے اثر کی رفتار کے بارے میں ہے، ورنہ سحر کے جائز یا حرام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ واضح طور پر کفر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شفا دینے والے کے مزاج اور عمل میں حق کی طاقت آشکار ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں مریض اس غیر مرئی قوت کے ذریعے شفا پاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مولانا رومؒ نے سحر کا لفظ استعمال کیوں کیا؟

دراصل مولانا رومؒ عالم حقہ اور عالم اسرار ہیں، جہاں وہ مثبت طاقتوں کے بارے بتاتے ہیں وہاں وہ یہ بھی آشکار کرتے ہیں کہ منفی طاقتیں بھی اتنی ہی شد و مد کے ساتھ وقوع پذیر ہیں۔ ایک اصول یاد رکھیں کہ کرنٹ دو روؤں کے بہاؤ کا نام ہے یعنی مثبت اور منفی

جہاں مثبت رو چلے گی مخالفت میں منفی بھی پیدا بھی ہو گی اور ساتھ ریزسٹنس بھی پیدا کرے گی۔ رحمانی طاقتوں کی مخالفت میں شیطانی طاقتیں ضرور اپنا اثر استعمال کریں گی۔ ان کا اثر سریع ہو گا۔ لیکن ان سحر کی قوتوں کو ختم کرنے کے لئے خدائے مطلق نے موسیٰ علیہ السلام بھی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جو چشم زدن میں سحر کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

قرآن حکیم میں کم و بیش ۶۳ مرتبہ سحر یا اس کے اشتقاق بیان ہوئے ہیں۔ لہذا جناب رومیؒ نے یہ لفظ ایسے ہی بیان نہیں کیا؟

یہ دیکھنا ہو گا کہ آخر سحر ہے کیا؟

دنیا میں دو طرح کے علوم پائے جاتے ہیں: ایک وہ جو مادی قوانین پر غور کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو نفس سے متعلق ہیں۔ دنیا میں چیزیں بھی دو ہی پائی جاتی ہیں: مادہ اور نفس۔ ہمارے گردوپیش کی کائنات ایک مادی کائنات ہے۔ ایک شخص کا اپنا وجود بھی ایک مادی وجود ہے۔ جو مٹی سے بنا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک شخصیت ہے جس کو قرآن مجید اپنی تعبیر میں 'نفس' کہتا ہے۔ قدیم ترین زمانے میں جو علوم نفس سے متعلق ہوتے تھے، اُن کو بھی لوگ اپنی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ موجودہ زمانے میں لوگوں کا زیادہ اشتغال اُس طرف نہیں رہا۔ وہ زیادہ تر مادی علوم میں تحقیق کرتے ہیں۔
مادی علوم میں تحقیق کے نتائج آپ نے دیکھ لیے ہیں۔ یعنی پچھلے کم و بیش سوا سو سال میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔
اب اگر آپ کسی بھی ایجاد کا جائزہ لیں تو وہ ایجاد جو کچھ آپ کے سامنے ہے، محض وہ نہیں ہوتی، بلکہ اُس کے پیچھے کچھ قوانین ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اُس کو وجود پذیر کیا جاتا ہے۔

اِسی طرح نفس کے اندر بھی کچھ قوانین ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ اُنھیں اپنی دل چسپی کا موضوع بناتے تھے۔ وہ ریاضتیں کرتے تھے، چلّے کاٹتے تھے، اپنے ماہرین کے پاس بیٹھتے تھے اور پھر یہ سیکھتے تھے کہ نفس کی دنیا کو کیسے دریافت کیا جائے۔ یہ بھی ایک بڑی دنیا ہے۔ اگر آپ اِس دنیا کو دیکھنا چاہیں کہ یہ کیسی عجیب و غریب دنیا ہے تو خود بھی اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں جو خواب آتا ہے، یہ کیا چیز ہے؟ یہ درحقیقت ہمارے نفس کے اندر جو حقائق موجود ہوتے ہیں، خواب اُن کو ایک تمثیل کی صورت دینا شروع کر دیتا ہے۔ ہمارے جسم پر اگر کوئی واردات گزرے تو خواب وہی واردات ہمیں مفصل کر کے دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ خواب ایک ذریعہ ہے جس کو بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے پیغمبروں تک پیغام پہنچانے کے لیے اختیار کیا ہے، جیسے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا ذکر آیا ہے۔ لیکن عام حالات میں جو خواب ہمیں نظر آتے ہیں، وہ ہمارے نفس کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس پر بات پہلے اشعار میں ہو چکی ہے کہ خواب کی اسلام میں کیا اہمیت ہے۔

جادو یا سحر لغت میں ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب واضح نہ ہو۔ عرف عام میں جادو ان عوامل کو کہا جاتا ہے جن میں شیاطین کا دخل ہو، اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسا کام کہ جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، جادو کہلاتا ہے۔ جادو محض ایک وہم نہیں بلکہ حقیقت ہے، مگر اسے مؤثر حقیقی سمجھنا اور اور اس کے ذریعے کسی کو تکلیف دینا کفر ہے، جو اسلام میں اسی طرح حرام ہے جیسے قتل، چوری، شراب اور زنا وغیرہ۔

جادو یعنی سحر دین میں ہلاکت لانے والے کئی امور کا جامع ہے مثلاً جنّوں اور شیطانوں سے مدد طلب کرنا، غیر اللہ سے دل کا ڈرنا، اللہ پر توکل کو چھوڑ بیٹھنا اور لوگوں کے مفادات و ذرائع معاش کو تباہ کرنے کے درپے ہونا وغیرہ یہ جادو معاشرے کی جڑیں کاٹنے اور اس کی بنیادیں گرانے والا آلہ ہے اور یہ خاندانوں میں جھگڑے و فسادات پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔ یہ جادو کرنے والے نفسی ارتکاز سے حاصل کرتے تھے اور اب بھی ایسا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو کی دو بڑی اقسام ہیں. پہلی قسم نظر بندی یا نظر کا دھوکہ. دوسری قسم نفسی حملہ جسے عام الفاظ میں کالا جادو بھی کہہ دیا جاتا ہے.

نظر بندی یا نظر کا دھوکہ!

اس میں جادوگر ایسے حالات یا ماحول تخلیق کر دیتا ہے جس سے آپ کی نظر وہی دیکھتی ہے جو جادوگر آپ کو دکھانا چاہتا ہے. گویا یہ آپ کے خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں. اس طرح کے جادو معمولی کرتب دکھانے والوں سے لے کر سنجیدہ جادوگروں نے اپنا رکھے ہیں.

ہوا میں اڑنا ہو، پانی پر چلنا ہو، آری سے کسی کا سر کاٹ کر دوبارہ دھڑ سے جوڑ دینا ہو یا ایفل ٹاور کو ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں سے غائب کر دینا ہو. یہ سب آج کے نمائندہ جادوگر کر رہے ہیں جیسے ڈیوڈ کاپر، فیلڈ، کرس اینجل، ڈائنامو وغیرہ قران حکیم میں اس کا واضح ذکر ان جادوگروں کے حوالے سے ہوتا ہے جنہیں فرعون موسیٰ علیہ السلام کے مقابل لایا تھا اور جنھوں نے لوگوں پر نظر بندی یعنی نظر پر جادو کر دیا تھا.

"جب انہوں نے (جادوگروں نے) ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا (نظر بند کر دی) اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور بہت بڑا جادو کر دیا" الاعراف 116

ہپناسس یا ہپناٹزم کے بارے میں موجود معلومات کی بناء پر اس جادو کی قسم کو آج سب مان لیتے ہیں.

دوسری جادو کی وہ قسم ہے جس میں جادوگر اپنی نفسی طاقت سے دوسرے کے نفس پر حملہ آور ہوتا ہے اور نقصان پہنچانے کی سعی کرتا ہے. یہ نفسی قوت وہ مختلف مراقبوں، ریاضتوں، مجاہدوں اور ارتکاز کی مشقوں سے حاصل کرتا ہے. ہر انسان میں یہ مخفی نفسی

صلاحیتیں پنہاں ہوتی ہیں جنھیں تقویت دینا ممکن ہے. اسکی ایک مثال نظر لگنے کی ہے جو اسلامی تعلیمات اور تجربات دونوں سے ثابت ہے. "اور ضرور کافر تو ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اپنی بد نظر لگا کر تمھیں گرا دیں گے جب قرآن سنتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ضرور عقل سے دور ہیں" (سورہ القلم 51). رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: العین حق "نظر (کا لگنا) حق ہے۔" [صحیح مسلم: 2188، 5702]

ہمارے ارد گرد ایک غیبی دنیا ایک پیرالل ورلڈ آباد ہے. جس میں جہاں ملائکہ ہر پل مختلف امور کو سرانجام دے رہے ہیں اور مومنین پر نصرت و سکینت نازل کر رہے ہیں. وہاں دوسری جانب شیاطین جو جن و انس دونوں میں موجود ہیں، ابلیس کا مشن نبھانے میں مشغول ہیں. یہ جادو گر خود بھی شیاطین ہی ہیں اور اپنی نفسی قوت کے ساتھ ساتھ شیاطین جنات سے اسی سحر یعنی جادو کیلئے مدد لیتے ہیں. اسی حوالے سے سورہ الانعام کی ۱۲۸ آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾

. اور جس دن وہ ان سب کو جمع فرمائے گا (تو ارشاد ہو گا:) اے گروہِ جنّات (یعنی شیاطین!) بیشک تم نے بہت سے انسانوں کو (گمراہ) کر لیا، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ایک دوسرے سے (خوب) فائدے حاصل کئے اور (اسی غفلت اور مفاد پرستی کے عالم میں) ہم اپنی اس میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے مقرر فرمائی تھی (مگر ہم اس کے لئے کچھ تیاری نہ کر سکے)۔ اللہ فرمائے گا کہ (اب) دوزخ ہی تمہارا ٹھکانا ہے ہمیشہ اسی میں رہو گے مگر جو اللہ چاہے۔ بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا خوب جاننے والا ہے o

قرآن مجید کے مطابق جنات انسان سے قبل آگ سے تخلیق کیے گئے ہیں، وہ عام حالات میں انسانی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں، یہ بھی انسان کی طرح اس دارالامتحان میں ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ امتحان سے گزر رہے ہیں. کچھ جداگانہ صلاحیتیں جنات کے وجود میں ودیعت شدہ ہیں. اسی کا ایک مظاہرہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ بلقیس کے اس قصے میں ہوتا ہے جو سورہ النمل میں مذکور ہے ""۔ اب سلیمان نے (اپنے درباریوں سے) کہا: اے اہل دربار! تم میں سے کون ہے جو ان کے مطیع ہو کر آنے سے پہلے پہلے ملکہ کا تخت میرے پاس اٹھا لائے؟"۔ ایک دیو ہیکل جن نے کہا: "آپ کے دربار کو برخواست کرنے سے پہلے میں اسے لا سکتا ہوں۔ میں اس کام کی پوری قوت رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں..
"

ایک عجیب تحقیق

جادو گر شیاطین جنات کے ساتھ مل کر انسانی نفوس پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے ہیں. ان کا حملہ اکثر انسانی نفسیات پر ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ بغض، عداوت، رنجش، غصے جیسے تباہ کن جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں جادو کا گڑھ بلوچستان کی پہاڑیاں ہیں جہاں سے خاک لا کر دیگر شہروں میں جادو کی جگہ بنائی جاتی ہے. ان جادو گروں کے نزدیک 'کالی ماتا' جیسی شکتیاں حقیقت میں موجود ہیں جو ان سے خون اور قربانی مانگتی ہیں. آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ کسی پاگل عورت نے اپنی اولاد کو ذبح کر دیا یا فلاں خراب ذہنی توازن والا آدمی قبر میں مردہ سے زنا کرتا پکڑا گیا وغیرہ. اخبار آپ کو بتاتے ہیں کہ ان افراد کا ذہنی توازن ٹھیک نہ تھا مگر جب کچھ جرنلسٹ نے ماضی میں ان واقعات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب جادو کے درجات کے حصول کے واسطے تھا. پاکستان میں ایک تحقیق کے مطابق کوئی جادو گر ایسا نہیں ہے جو بارہ درجے سے بھی اوپر جا سکا ہو. البتہ ہندوستان، افریقہ اور بنگلہ دیش میں ایسے جادو گر گزرے ہیں جو پندرہ سولہ درجے تک جا پہنچے تھے. ان جادو گروں میں سب سے خبیث اور ماہر جادو گر ہندوستان کے 'اگھوری' سمجھے جاتے ہیں جو ننگ دھڑنگ جسم پر راکھ ملے غلیظ حالت میں گروہوں کی صورت میں گھومتے ہیں. ان کی انسانی مردے کھاتے ہوئے ویڈیوز آپ کو با آسانی یوٹیوب پر مل جائیں گی. یہاں یہ یاد رہے کہ ایک سچا مسلمان یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ کسی جادو، جادو گر یا جن کی مجال نہیں کہ وہ اذن ربی کے خلاف جا سکے. جادو گر بعض اوقات روحانیت کا جعلی چوغہ پہن کر بھی دھوکہ دیتے ہیں. جادو گر کو پہچاننے کے ویسے تو کئی طریق ہیں مگر ان میں کچھ یہ ہیں کہ وہ آپ سے اس شخص کا کپڑا مانگے گا، والدہ کا نام پوچھے گا، اس زبان میں کچھ پڑھے گا جو سمجھ نہ آئے، خود بھی گندہ ہو گا اور جگہ بھی اندھیرے و گندگی میں رکھے گا، کسی خاص جانور کی قربانی و خون مانگے گا. اس کا بھی امکان ہے کہ وہ آپ کو مرعوب کرنے کیلئے کچھ ایسی باتیں پہلے ہی بتا دے جو آپ نے اسے ابھی نہ بتائی ہوں جیسے آپ کے آنے کا مقصد وغیرہ. ہرگز متاثر نہ ہوں، یہ کرتب دکھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے.

مشاہدہ ہے کہ اکثر جادو و جنّات کا شکار خواتین یا کم سن بچے ہوتے ہیں. اس کی وجہ بعض لوگ غلط طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ جنّات حسن پرست ہیں اور اسی لئے وہ عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں. بات یہ نہیں ہے بلکہ سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے کہ بچے اور خواتین عمومی طور پر وہم کا شکار جلدی ہو جاتے ہیں. خوف کی کیفیت ان پر با آسانی طاری ہو جاتی ہے.... لہٰذا کسی جن یا جادو کا نفسیاتی حملہ ان پر کارگر ہونا زیادہ آسان ہوتا ہے. یہ نفسیاتی حملہ ایسی جگہ مزید آسان ہو جاتا ہے جہاں انسانی ذہن سستی یا خوف محسوس کرے، جیسے رات میں کوئی برگد کا پرانا درخت یا پھر کوئی بوسیدہ قبرستان. کیونکہ یہ خالص نفسیاتی معاملہ ہے، اس لیے اس کے توڑ کے لئے نفسی علوم اور ان کے ماہر موجود ہیں. یہ ماہرین ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور انکا طریقہ علاج دین سے زیادہ 'یقین' پر بنیاد رکھتا ہے..

اسلام نے بھی ایسی صورت میں جن آیات کی تلاوت کا حکم دیا ہے، وہ واضح طور پر پڑھنے والے کے یقین کو اپنے رب پر قوی کرتی ہیں.

جادو بھی اذن الٰہی کے تابع ہے

ہر جادو مسحور پر اثرانداز نہیں ہوتا کتنے ہی جادوگر ہیں کہ انھوں نے اپنی طرف سے کسی پر جادو کا بھرپور وار کیا مگر اس پر ان کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِۦ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ(البقرۃ:102)

وہ کسی کو اس (جادو) کے ذریعے نقصان نہیں دے سکتے سوائے اللہ کے حکم کے۔

جبکہ نفع و نقصان تو سارے کا سارا اللہ تعالٰی ہی کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ (حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں ہے) کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یہ بات جان لو کہ اگر ساری امت بھی تمھیں نقصان پہنچانے کے لئے اکٹھی ہو جائے تو وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی سوا اس کے جو اللہ تعالٰی نے تمھارے مقدر میں لکھ رکھا ہے۔

جادو کرنے والے کی خصلتیں

جادوگر تمام لوگوں سے زیادہ خبث النفس، طبعی طور پر سب سے بڑا فساد انگیز اور سب سے زیادہ تاریک دل والا ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ شیطان کے قریب ترین ہوتا ہے بلکہ وہ شیطان کا بچاری، خیر و بھلائی سے راہ فرار اختیار کرنے والا، معاشرے سے بلاوجہ انتقام لینے والا اور انتہائی بدترین خصلتوں کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے پاس آنے والوں کو جعلی و خود ساختہ خبریں دے دے کر کذب بیانی و دروغ گوئی کرتا رہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

شیطان اس جادوگر کاہن کی زبان پر وہ جھوٹ چڑھا دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ مزید سو جھوٹ ملا کر بکتا چلا جاتا ہے (متفق علیہ)

بچاؤ

عموماً شیطانی وساوس، انسانی نفسیات، نظر بد اور حسد کے اثرات وغیرہ اور بعض اوقات پیشہ ور حضرات لوگوں کو جادو کے وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان شیطانی حملوں سے بچاؤ کا وہی طریقہ ہے جس کی تعلیم ہمیں دین نے دی ہے:

1)سب سے بنیادی بات کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور ان کی صفات پر کامل ایمان اور یقین ہو، اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہو تو قوتِ ایمانی سے ہی ان شاء اللہ بہت سی شیطانی قوتیں اور نفسیاتی حملے پسپا ہو جاتے ہیں۔

2)پنج وقتہ نمازوں کی پابندی، ان کی شرائط واحکام کی رعایت رکھ کر ادا کرنے کا اہتمام، جو درحقیقت خالق ومالک سے تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے، اور جب بندے کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوتا ہے تو شیطان کا بس اس پر نہیں چلتا۔

3)ہر وقت پاکی کا اہتمام کرنا، باوضو رہنا، اور تلاوتِ قرآنِ کریم کی کثرت، نیز ذکر کی پابندی۔

4)صبح وشام کی حفاظت کی مسنون دعائیں پڑھنے کا اہتمام، (جو مختلف مستند علماءِ کرام نے جمع کرکے شائع کر دی ہیں، کسی بھی دینی کتب خانے سے حاصل کی جاسکتی ہیں) نیز درج ذیل اذکار صبح وشام سات سات مرتبہ پابندی سے یقین کے ساتھ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر پھونک کر سر سے پیر تک اپنے پورے جسم پر پھیر دیں ان شاء اللہ ہر قسم کے سحر، آسیب اور نظر بد کے اثراتِ بد سے حفاظت رہے گی:

درود شریف، سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، سورہ الم نشرح، سورہ کافرون، سورہ اخلاص، سورہ فلق، سورہ ناس اور درود شریف۔

مولانا رومؒ نے شعر کے دوسرے مصرعہ میں قدرت الٰہیہ کا ذکر کیا ہے۔

قدرت الٰہیہ پر ایک ہی آیت کافی وشافی ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(الحدید،57/1-3)

اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور وہی بڑی عزت والا بڑی حکمت والا ہے۔ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہی جِلاتا اور مارتا ہے، اور وہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے۔ وہی (سب سے) اوّل اور (سب سے) آخر ہے اور (اپنی قدرت کے اعتبار سے) ظاہر اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) پوشیدہ ہے، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

تو مولانا رومؒ اس شعر میں کئی باتیں بتا کر یہ کہتے ہیں کہ

اگر کوئی مریض ٹھیک ہو جائے تو یہ جادو کی طرح سریع الاثر ہو گا اگر وہ نشانے پر لگ جائے تو معجزانہ طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔

یاد رکھیں جو لوگ اعلیٰ روحانی مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں ان کا مزاج بدل جاتا ہے۔

ایک شخص جو حکم الٰہی سے بابا بن گیا ہے اس نے اپنے مزاج کے ساتھ سچائی کی طاقت کو دیکھا ہے جو کہ نور کا مزاج ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے روحانی علوم حاصل کر لیے ہیں۔

چون رَسید آن وَعدہ گاہ و روز شُد
آفتاب از شَرقُ اَختَر سوز شُد

وعدہ گاہ: وعدہ کا وقت۔۔۔ روز شد: دن آ گیا۔۔۔ آفتاب: سورج۔۔۔ شرق: نکلنے کی جگہ۔۔۔۔ اختر: صبح، طلوع۔۔ سوز شد: ماند کر دیا

ترجمہ: جب وعدہ کا وقت آن پہنچا اور دن چڑھ گیا۔ سورج نے مشرق سے نکل کر ستاروں کو ماند کر دیا۔

پہلا مصرعہ شرط ہے اور دوسرا شرط کی جزا ہے۔

اختر سوز ایک غیر فعال مرکب صفت ہے اور اس کا لفظی مطلب ستارہ جلانے والا ہے۔ لیکن یہاں اس کا مطلب ستاروں کا غائب ہونا ہے۔

کیونکہ یہ مرکب قدیم فلکیات میں ایک اصطلاح ہے جسے جلانا بھی کہا جاتا ہے۔ ابو ریحان البیرونی "اختر سوز" کے معنی میں کہتے ہیں: ستارے کا جلنا اس وقت ہوتا تھا جب وہ سورج کے ساتھ مل جاتا تھا، اور انہوں نے اسے یہ نام اس لیے دیا کہ وہ سورج کو آگ سے تشبیہ دیتے تھے، اور ستارے نظروں سے غائب ہو جاتے تھے۔

اس شعر میں (آفتاب: سورج) کے معنی روحانی شخصیت کے ہیں۔

مولانا رومؒ وہ عارف کامل ہیں کہ بحر العلوم ہونے کے ساتھ ساتھ علوم متداولہ میں بھی تبحر کے حامل ہیں۔ فلکیات کے ساتھ ساتھ علم اخلاقیات پر بھی کوزہ میں دریا بند کر گئے۔

ایفائے عہد

ایک دوسرے کی مدد کے بغیر دنیا میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہے، اس معاونت میں مضبوطی پیدا کرنے کے لئے قدم قدم پر یقین دہانی کی ضرورت پڑتی ہے، اس یقین دہانی کا ایک ذریعہ وعدہ ہے۔ مُستحکم تَعَلُّقات، لین دین میں آسانی، معاشرے میں امن اور باہمی اِعتماد کی فضا کا قائم ہونا وعدہ پورا کرنے سے ممکن ہے، اسی لئے اسلام نے اِیفائے عہد پر بہت زور دیا ہے۔ قراٰن و احادیث میں بہ کثرت یہ حکم ملتا ہے کہ وعدہ کرو تو پورا کرو۔ اللہ رب العزّت کا فرمان ہے) :وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِۚ-اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـٴُـوْلًا (۳۴) ((پ15، بنی اسرائیل:34 (تَرجَمۂ کنزُالایمان ":اور عہد پورا کرو بیشک عہد سے سوال ہونا ہے۔" یہاں وعدے کی پاسداری کا حکم ہے اور پورا نہ کرنے پر بازپرس کی خبر دے کر وعدے کی اہمیت کو مزید بڑھایا گیا ہے۔ فرمانِ مصطفٰے صلَّی اللہ تعالٰی علیہ واٰلہٖ وسلَّم :تمہارے بہترین لوگ وہ ہیں جو وعدہ پورا کرتے ہیں۔(مسند ابی یعلیٰ، ج1، ص 451، حدیث:1047)

قرآن نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں

مومنون، 8:23

خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا بارہا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعہ بھی ایفائے عہد کی اہمیت اور وعدہ خلافی کی برائی کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی وعدہ خلافی بتایا۔ ارشاد مبارکہ ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

صحیح مسلم، 1، رقم الحدیث:210

تو مولانا رومؒ وعدہ کا بیان کر کے فرماتے ہیں کہ وہ مرد حق وعدہ کا پابند تھا اور بری عجیب بات یہ ہوئی کہ ادھر وہ وقت وعدہ آیا ساتھ ہی لوگوں نے اس پیر کامل کی آمد کا مژدہ سنا دیا۔ جناب رومیؒ علم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی فرماتے جاتے ہیں یہ ایک ایسا لازوال کام ہے کہ جو عام تصانیف میں میسر نہیں آتا۔ اگر علم ہے تو بس علم لیکن جناب رومیؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تربیت ہی اصل مدعا ہے۔

سبحان اللہ!

ایرانی طرز

بود اَندَر مَنظَرہ شَہ مُنتَظِر

تابِبینَد آنچہ بِنُمودند سِر

پاکستانی طرز

بود اَندَر مَنظَرہ شَہ مُنتَظِر

تابہ بِینَد آنچہ بِنُمودند سِر

منظرہ: نظر کی جگہ یعنی کھڑکی۔۔ شہ: بادشاہ۔۔۔ منتظر: انتظار کرنے والا۔۔۔ تابہ بیند: تاکہ دیکھے۔۔ سر: راز

ترجمہ: بادشاہ محل کی کھڑکی میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ جو بھید اس پر ظاہر ہوا ہے اس کو خود دیکھ لے۔

بادشاہ نے چھپ کر کیا دیکھا؟

بادشاہ محل کے برآمدے میں انتظار کر رہا تھا کہ اس نے چھپ کر کیا دیکھا۔

بادشاہ نے افق کی طرف دیکھا اور وعدہ شدہ شخص کا انتظار کرنے لگا، خاکی لباس میں یہ شاہی مخلوق سورج کی طرح گھیرا ہوا تھا۔ سائے کی طرف سے۔

"منظرہ یعنی کھڑکی" استعارہ ہے اس روزن کا جو دونوں عالم کے درمیان ہے۔ کھڑکی کے اس پار، ایک ایسا مطالعہ ہے، جس کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ اس پہ روشنی ڈالتا ہے کہ فی زمانہ زندگی کیسی ہے اور کیسی ہونی چاہیے۔ دوسری جانب یہ درس بھی ملتا ہے کہ آج کل کی زندگی میں کیا کچھ کمی ہے اور کیا کچھ ہمیں اپنی زندگیوں سے نکال باہر کرنا چاہیے۔

کھڑکی کھلی کہ حیرتِ منظر کھلی سعید
اک پھول جو خلا میں کھلا تھا، زمین کا تھا

آسمانی کتابوں نے انسان کی تمام حسیات اور واردات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور انہیں آفاق و انفس کہا ہے۔ آفاق ان مادی مظاہرات کا نام ہے جو خارج میں نظر آتے ہیں جب کہ انفس ان خدوخال کا مجموعہ ہے جو کائنات کی داخلی زندگی ہے۔ انفس کے بارے میں انسانی علم ابھی تکمیل وترقی کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ چند سو سال پہلے علوم طبعی کے انکشافات و تجربات سحر و طلسم کی حیثیت رکھتے تھے اور ان پر بے یقینی اور پراسراریت کے پردے پڑے ہوئے تھے لیکن آج ہم ان علوم سے حقیقت ثابتہ کی طرح روشناس ہیں۔ فی زمانہ یہی حال روح یا انفس کے علوم و حقائق کا ہے۔

انسان کے اندر پانچ حواس

انسان کے اندر پانچ حواس بصارت، سماعت، گفتار، شامہ اور لمس کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر حس کی ایک تعریف اور ایک دائرہ عمل ہے۔ کوئی حس ایک حد سے باہر عمل نہیں کر سکتی۔ مثلاً ہم آنکھوں سے چند میل زیادہ دور نہیں دیکھ سکتے، کانوں سے ایک خاص طول موج سے کم یا زیادہ کی آوازیں نہیں سن سکتے۔ کسی چیز کے قریب جائے بغیر اسے چھو نہیں سکتے۔

انسان کے یہ پانچوں حواس مادی رخ میں محدود ہیں لیکن روحانی دائرے میں لامحدود ہیں۔ حواس کا روحانی دائرہ عام طور پر مخفی رہتا ہے۔ اس دائرہ میں بصارت، فاصلے کی پابندی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ کان ہر طول موج کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ قوت بیان الفاظ کی محتاج نہیں رہتی۔ انسان گفتگو کئے بغیر کسی کے خیالات جان سکتا ہے اور اپنے خیالات اس تک پہنچا سکتا ہے۔

انسانی صلاحیتوں کا اصل رخ اس وقت حرکت میں آتا ہے جب روحانی حواس متحرک ہو جاتے ہیں۔ یہ حواس ادراک و مشاہدات کے دروازے کھولتے ہیں جو عام طور سے بند رہتے ہیں۔ انہی حواس سے انسان آسمانوں اور کہکشانی نظاموں میں داخل ہوتا ہے۔ غیبی مخلوقات اور فرشتوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہ وہ روزن و منظرہ ہے جس سے آفاق و انفس کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ارشاد پاک ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ

(53) حم سجدہ

ابھی ہم انہیں آسمان وزمین کی وسعتوں میں اور خود ان کی ذاتوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کیلئے بالکل واضح ہو جائے گا کہ بیشک وہ ہی حق ہے اور کیا تمہارے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں؟

آفاقی اور انفسی نشانیاں

تفسیر میں آیا ہے کہ **آفاقی نشانیوں** کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد سورج، چاند، ستارے، نباتات اور حیوان ہیں کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلالت کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں کہ ان نشانیوں سے مراد گزری ہوئی اُمتوں کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہیں جن سے انبیاءِ کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو جھٹلانے والوں کا حال معلوم ہوتا ہے، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان نشانیوں سے مشرق و مغرب کی وہ فتوحات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور ان کے نیاز مندوں کو عنقریب عطا فرمانے والا ہے۔

انفسی نشانیوں سے مراد ہے کہ ان کی ہستیوں میں اللہ تعالیٰ کی صنعت اور حکمت کے لاکھوں لطائف اور بے شمار عجائبات موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ ان چیزوں پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی قادر نہیں۔

نفسِ انسانی مع اپنے ظاہر و باطن کے انفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ملاحظ و مطالعہ کو سیر انفسی کہتے ہیں۔ کائنات میں جو کچھ از قسم ظاہر و باطن ہے آفاق ہے اور اس سے بطریق کشف و شہود آگاہ ہونا سیر آفاقی ہے چونکہ عالم حقیقتِ انسانی ہی کا ظہورِ تفصیلی ہے آفاق میں جو کچھ ہے وہ سب اجمالی طور پر انفس میں بھی ہے۔ جو کچھ یہاں ہے وہی وہاں ہے اور جو کچھ وہاں ہے وہی یہاں ہے صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ سیر انفسی سیر اجمالی ہے اور سیر آفاقی سیر تفصیلی۔ انفس و آفاق اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے محل و منظر ہیں جن سے حق تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے ان نشانیوں کے دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرلی اور حق تعالیٰ کی ظاہری و باطنی قوتوں کو جو پہنچاننے لگا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کی اور انسان ہونے کا حق ادا کیا لیکن جو اس مرتبہ تک پہنچنے سے رہ گیا وہ انسانیت سے گر گیا اور جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِینَ لَا یَعْقِلُونَ۔

یعنی بلاشبہ جانوروں سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔ یہ وہ سر ہے جسے مولانا رومؒ نے استعارہ میں بیان کیا ہے۔

ایرانی طرز

دید شخصی فاضِلی پُرمایہ‌یی

آفتابی در میانِ سایہ‌یی

پاکستانی طرز

دِید شَخصے کاملے پُرمایۂ

آفتابے در میانِ سایۂ

دید: دیکھا۔۔کاملے: کامل شخص۔۔۔پرمایہ: جمع پونجی۔ یہاں مراد کمالات ومعرفت سے بھرپور کے ہیں۔۔۔ آفتابے: سورج کے نیچے یعنی انوار و کمالات سے بھرپور سایہ سے مراد تاریکی۔

آفتاب و سایہ میں صنعت مراعاۃ النظیر ہے۔(کلام میں شاعر جب ایک چیز کا ذکر کرے اور پھر اُس چیز کی مناسبت سے اور چیزوں کا ذکر کرے جن میں کوئی تضاد نہ ہو صنعتِ **مراعاۃ النظیر** کہلاتی ہے)۔

مثال:

شوق اگر نہ ہو تا میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

ترجمہ: اسی اثناء میں اس نے ایک شخصِ کامل جو صلاحیتوں سے مرصع تھا، دیکھا جو سایہ میں آفتاب تھا یا یوں کہہ لیں کہ آفتاب سایہ میں تھا۔

سائے میں سورج کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا اصل وجود روشنی ہے اور ہمارا جسم ایک پردہ اور سایہ ہے جو روشنی کو روکتا ہے۔

تو جسم تاریکی ہے اور ہمارے وجود کی سچائی روشنی ہے۔

یعنی بادشاہ کو اتنی بصیرت پہنچی تھی کہ اس نے دور سے حکیم کو جسم کے اندر سورج کی طرح دیکھا۔

جب آپ تھوڑی دیر کے لیے ہلکے مراقبہ کرتے ہیں تو آپ پہچان سکتے ہیں کہ اندھیرے میں کیا ہے، یا روشنی میں، جسے فرقان کہتے ہیں۔یعنی صحیح اور غلط کی تمیز کا معیار، براہ کرم روشنی کے ساتھ ایک معنی خیز تعلق قائم کریں۔ صحیح اور غلط کی تمیز کو بہتر بنانے کے لیے۔

بادشاہ نے دیکھا کہ سائے کے بیچ میں سورج کی طرح ایک عقلمند اور قیمتی شخص نمودار ہوا۔

"سورج" کے معنی اس کی روحانی شخصیت یعنی پیر ربانی ہے اور "سائے" کے معنی اس کا جسم وروپ ہے۔

اس شعر میں تین چیزیں قابل توجہ ہیں۔ کامل، آفتاب، سایہ ان کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

کامل سے مراد شیخ کامل ہے۔

دنیا کے ہر کام، ہر فن اور پیشہ کی طرح فن روحانیت یعنی سلوک الی اللہ طے کرنے اور حق تعالیٰ کا قرب و معرفت حاصل کرنے کے لیے استاد کی ضرورت ہے۔ علم تصوف کی اصطلاح میں ایسے روحانی استاد کو شیخ (مرشد) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
جس طرح خدا تک پہنچنے کے لیے پیغمبر کی ضرورت ہے اسی طرح رسول ﷺ تک پہنچنے کے لیے مرشد (شیخ طریقت) کی حاجت ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دنیا کسی وقت بھی اہل اللہ سے خالی نہیں ہوتی۔ آج بھی بندگان خدا ایسے ہیں جن کی ذات اور صفات سے ان مبارک سلسلوں (سلاسل تصوف) کی آبرو قائم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (سورۃ توبہ: آیت ۱۱۹)
"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو"
امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:
"جاننا چاہیے کہ شیخ بننے اور حق کی طرف خلق کو دعوت دینے کا مقام بہت عالی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا۔ "الشیخ فی قبیلۃ کالنبی فی امۃ"۔ شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسے نبی اپنی امت میں ہے۔ (مکتوبات شریف دفتر اول مکتوب ۲۲۴)
امام ربانی مجدد الف ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:
مخدوما مقصدِ اقصیٰ و مطلبِ اسنیٰ وصول بجنابِ قدسِ خداوند است جلّ سلطانہ لیکن چوں طالب در ابتدا بواسطہ تعلقاتِ شتیٰ در کمال تدنّس و تنزّل است وجنابِ قدسِ او تعالیٰ در نہایت تنزّہ و ترفّع و مناسبتے کہ سبب افاضہ و استفاضہ است در میانِ مطلوب و طالب مسلوب است لاجرم از پیرِ راہ دان، راہ بین چارہ نبود کہ برزخ بود و از ہر دو طرف حظّ وافر دارد تا واسطہ وصول طالب با مطلوب گردد۔

(مکتوب ۱۶۹ دفتر اول حصہ سوم)

ترجمہ:

اے محترم! انسانی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ، بارگاہ قدس میں ہی پہنچنا ہے، لیکن چونکہ مرید شروع میں بہت سے تعلقات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے انتہائی میلے پن اور پستی میں ہوتا ہے، جبکہ ذات باری تعالیٰ انتہائی پاکیزہ اور بہت بلند ہے۔ اس لیے فائدہ پہنچانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے طالب اور مطلوب کے درمیان جو مناسبت چاہیے وہ موجود نہیں، لہٰذا اسکے راستہ سے باخبر اور راستہ کو صحیح دیکھنے والے پیرِ کامل کے سوا کوئی چارہ نہیں جو درمیان میں واسطہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے قرب اور عام انسانوں سے رابطہ رکھتا ہو تاکہ وہ مطلوب کے ساتھ طالب کے وصول کا ذریعہ بنے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کیلیے وسیلہ تلاش کرو (آیت ۳۵ سورۃ المائدہ)

اِن احادیث مبارکہ میں بھی مرشد کی تلاش کا حکم ہے:

مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مَيْتَةً جَاهِلِيَّةً (مسلم۔4793)

ترجمہ: جو شخص اس حالت میں مرا کہ اسکی گردن میں امامِ وقت (مرشد کامل اکمل جامع نور الہدیٰ) کی بیعت نہیں وہ جہالت کی موت مرا۔

مَنْ مَاتَ بِغَيْرِ إِمَامٍ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً (مسند احمد۔12144)

ترجمہ: جو شخص امام (مرشد) کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

دراصل وجود کے تمام مراتب میں انسان اکمل ہے اور جملہ افراد انسانی میں محمد الرسول اللہ ﷺ سب سے اکمل اور ارفع ہیں اور حق تعالیٰ کے مظہرِ اتم ہیں بس آپ ﷺ ہی انسان کامل ہیں اور آپ ﷺ ہی اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ برحق ہیں۔ دوسروں کو یہ مرتبہ آپ ﷺ ہی کی برکت اور آپ ﷺ ہی کی پیروی و متابعت اور آپ ﷺ ہی کی محبت سے حاصل ہوتا ہے۔

انسانِ کامل صاحبِ مسمّٰی، مرشد کامل اکمل نور الہدیٰ، حاملِ امانتِ الٰہیہ اور خزانۂ فقر کا مالک اور نائبِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہوتا ہے۔

وہ پاکیزہ اور کامل اکمل لوگ جو سلسلہ در سلسلہ بیعت ہوتے آئے ہیں ان کا شجرۂ طریقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچ جاتا ہے۔

ایسے برگزیدہ صفات لوگوں کو 'شیخِ اتصال' کہتے ہیں اور اُن کے درمیان کسی جگہ انقطاع نہیں ہوتا۔ ایسے کامل حضرات جب کسی خوش بخت آدمی کو بیعت کرلیں تو اس کی روحانی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے اور طریقت کی رو سے یہی سمجھا جاتا ہے گویا اس نے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیعت کی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وسیلہ سے اللہ تک پہنچ گیا ہے۔

آج تک کسی ولی کامل کو ولایت، معرفتِ الٰہی اور مشاہدۂ حق تعالیٰ بغیر مرشد کامل اکمل کی بیعت اور تربیت کے حاصل نہیں ہوا۔

عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدون استاذ کے حاصل نہیں ہوتا۔ تو جب اس راہ طریقت میں آنے کی توفیق ہو تو استاذ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہیئے جس کے فیض تعلیم و برکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہونچے۔ ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　　دامن رہبر بگیر و پس بیا

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اے دل! اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کر پیچھے پیچھے آؤ، اس لئے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا۔ اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہو سکا۔

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن النبيَّ -صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّم- قَالَ: «الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ، فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُم مَنْ يُخَالِل.» (ابوداؤد و ترمذی)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہیئے کہ کس کے ساتھ دوستی کرے۔

جب معمولی دوستی کے اندر یہ اثر ہوتا ہے تو شیخ اور استاذ سے تو اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے، اس کا کیا کچھ اثر ہوگا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس کے ساتھ جس قدر محبت و عقیدت ہوتی ہے، اسی اعتبار سے اس کے اعمال و اخلاق کا اثر جلد اور محکم طور پر سرایت کرتا ہے۔ اگر خدانخواستہ پیر کا حال بہتر نہیں ہوا تو اس کے حال کی خرابی مرید میں بھی آئے گی۔

شیخ کامل و مکمل کی پہچان کیسے ہو کیونکہ آجکل ہر ایک ہی شیخ کامل و مکمل کا دعویدار ہے اور سادہ لوح ارواح بھی ان کو شیخ کامل و مکمل سمجھ کر اپنی استعداد ضائع کر رہی ہیں ہر ایک سالک کا حق ہے کہ وہ کسی کو اپنی ذات کی سپردگی سے پہلے اور بعد میں اس چیز کو اچھی

طرح سے جان لے آیا میں کسی شیخ کامل و مکمل کی پیروی میں ہوں یا پھر کسی ایسے کی صحبت میں آگیا ہوں جس نے صرف فقیری کا لبادہ ہی اوڑھ ہوا ہے،

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے بھی شیخ کامل و مکمل کی تلاش کے دوران بہت خوبصورت انداز میں ناقص شیوخ کے متعلق فرمایا

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مشکل کو بہت خوبصورتی سے آسان فرمایا ہے آپ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک شیخ کامل کی صحبت کبریت اِحمر یعنی سُرخ گندھک کی طرح اکسیر ہے. اُسکی نظر دوا ہے اسکا کلام شفاء ہے.

کبریت احمر (سرخ گندھگ۔ کیمیادانوں کے نزدیک اس سے عام دھات سے سونا بنایا جاسکتا ہے) بہت نایاب ہوتی ہے پوری دنیا میں سے آگر ڈھونڈا جائے تو شاید آدھا کلو سے کچھ زیادہ ملے ایسے ہی شیخ کامل کی صحبت بھی نایاب ہے۔ اسی صحبت ہی سے تو جناب رومیؒ مولانا رومؒ بنے جو سنگت شاہ شمس تبریزؒ سے حاصل ہوئی۔

دوسری چیز آفتاب ہے اس کے بارے علامہ اقبال بانگ درا میں ارشاد فرماتے ہیں

اے آفتاب روح و روان جہاں ہے تو

شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا

ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے

ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے

تیرا یے سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے

دل ہے خرد ہے روح رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے

چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

ہے محفل وجود کا ساماں طراز تو

یزدان ساکنان نشیب و فراز تو

تیرا کمال ہستی ہر جان دار میں

تیری نمود سلسلہ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو

زائید گان نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری

آزاد قید اول و آخر ضیا تری

اور تیسری بات سایہ کی ہوئی۔ جب کوئی وجود روشنی میں آئے تو اس کا سایہ بنتا ہے کیونکہ وجود کثیف جب وجود لطیف میں آئے تو روشنی کو روک لیتا ہے جو آگے گذر نہیں سکتی اس لئے اس وجود کثیف کا سایہ بنتا ہے۔ لیکن یہاں ایک خاص مطلب کے لئے استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد الہ ہے جسے انگلش میں اورا کہتے ہیں۔ انسانی وجود دو چیزوں کا مرکب ہے روح اور جسم۔ طویل عرصہ سائنس صرف انہی چیزوں کا اقرار کرتی رہی جن کی تحقیق ظاہری لحاظ سے ممکن تھی۔ ان کے مطابق صرف وہی چیزیں موجود ہیں جن کا مشاہدہ آنکھ کے ذریعہ ممکن ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی ترقی کرتی گئی اور سائنس اس نقطے پر پہنچی کہ

انسان مادی وجود رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک روحانی اور باطنی وجود بھی رکھتا ہے جس کا اثر اس کے ظاہری وجود پر بھی ہوتا ہے۔ سائنس آج یہ دریافت کر چکی ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام اشیا میں سے ایک خاص قسم کی روشنی نکلتی ہے جسے اورا (Aura) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اورا کے لیے مختلف ناموں کو استعمال کیا ہے مثلاً جسمِ مثالی، جسمِ نورانی، روح ہوائی وغیرہ۔

اس شعر میں مولانا رومؒ نے آنے والے مرد دانا کو دیکھا تو اس کے حالہ سے اس کے نور عقل کو جان گیا۔ گویا اس کے اندر سے جو معرفت پھوٹی تھی اس سے بادشاہ اس مرد خاص کو پہچان گیا کہ یہ وہی مرد حق ہے جس کے بارے بتایا گیا تھا۔

ایرانی طرز

می رَسید از دورُ مانندِ ھِلال

نیست بود و ھست بر شَکلِ خیال

پاکستانی طرز

میرَسید از دورُ مانندِ ہِلال

نیست و بُود ہَست بر شَکلِ خیال

مانندِ ہلال: پہلی رات کے چاند کی طرح،،، نیست وہست: فنا و بقا۔۔۔ صوفیاء کے مطابق فنا فی اللہ اور بقا با اللہ

ترجمہ: وہ دور سے ہلال کی طرح (یعنی باریک سا کمزور سا) چلا آتا تھا اور وہ خیال کی طرح کبھی نظر آتا تھا اور کبھی نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

اسے ہلال کے چاند کی طرح بتانا دو وجوہات کی بنا پر جائز ہو سکتا ہے:

الف-توقع اور آرزو کے معنی میں، کیونکہ لوگ ہلال کے چاند کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔

ب-انسان کا دبلا پن اور کمزوری، اس کی کثرت کوشش اور کفایت شعاری کی وجہ سے تھی جس طرح ہلال کا چاند تنگ اور باریک ہوتا ہے۔ دوسرے بند میں طبیب کو اس کی وجودی حقیقت کی بنیاد پر "وہ ہے" کہا گیا اور اس فانی انسان کے لیے "وہ نہیں" کا اظہار اس کی ضد اور کمزوری کا مبالغہ ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، جیسے یہ کوئی خیالی وجود ہے جو انتہائی پتلے پن کی وجہ سے معدوم نظر آتا ہے۔

حکیم کی بلندی ہلال کے چاند کی طرح دور سے جھکی ہوئی تھی

تصوف کی ترقی اس طرح ہے کہ ہر صوفی اس سے پہلے صوفی کا شاگرد بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ابن عربی اس مقام پر حسن بصریؒ کے مقابلے میں ہیں، اور جناب مولاناؒ شیخ عطار سے عقیدت رکھتے ہیں، اور جناب حافظؒ حضرت رومی سے عقیدت رکھتے ہیں، اور یہ راستہ جاری ہے...

یہ بیت اہم اور قدرے مشکل ہے۔ چونکہ اس حکیم حاذق کا بادشاہ سے فاصلہ بہت دور تھا اس لیے وہ دور سے دبلا پتلا اور ہلال نما دکھائی دیتا تھا۔ یہ بھی ایک خیالی جسم کی طرح لگتا تھا جو حقیقی نہیں تھا۔ ہلال چاند کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جس میں چاند ابھی نکلا ہی ہوتا ہے اور ابھی اس نے عروج کی طرف جانا ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس نے بدر کمال تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہاں بندہ خاص کی بادشاہ پر ابتدائی شکل نمودار ہوئی تھی اور وہ بادشاہ کو ہلال کی مانند دکھائی دیا تھا اور اس کے کمالات کا ہالا سورج کی روشنی میں بھی عیاں ہو گیا تھا۔ اس کی باطنی روشنی، پوشیدہ کمالات کی مظہر تھی۔

مدت میں جلوہ گر ہوئے بالائے بام وہ

اس چاند کو میں دیکھوں کہ دیکھوں قمر کو میں

اسے چاند سورج سے تشبیہ کیا دوں

جو ہے رشک شمس و قمر اللہ اللہ

چونکہ مولانا رومؒ عشق رسالت مآب ﷺ سے مرصع ہیں ہو سکتا ہے ان کا ذہن بھی اعلیٰ حضرت احمد رضا خانؒ کی طرح ان کیفیات سے معمور ہو ۔

تمہاری شرم سے شان جلال حق ٹپکتی ہے

خم گردن ہلال آسمان ذوالجلالی ہے

حضور ﷺ کا شرم وحیاء جس کی قرآن نے شہادت دی "فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ "میرا محبوب تم سے حیاء فرماتا ہے۔(الاحزاب)اعلیٰ حضرت قدس سرہ اس کی بلندیوں کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ اے میرے آقا ﷺ! آپ کے شرم وحیاء سے جلال خدا کی شان ٹپک رہی ہے اور آپ کی گردن معلیٰ کے (شرم وحیاء اور عزت وو قار مگر عاجزی اور انکساری کے ساتھ) جھکاؤ سے یوں لگتا ہے کہ جلال والے رب کے آسمان ہر پہلی رات کا چاند چمک رہا ہے(جو کہ باریک اور خمدار ہوتا ہے) سرکار ﷺ کی ذات بابرکات سے محبت کرنے کے ڈھنگ سیکھنے ہوں تو اعلیٰ حضرت قدس سرہ جیسے عاشق رسول ﷺ سے ہی سیکھے جاسکتے ہیں۔

ایرانی طرز

نیست وَشْ باشد خیالُ اَنْدَر رَوان

تو جھانی بر خیالی بین رَوان

پاکستانی طرز

نیست وَش باشد خیالُ اَندَر جہاں

تو جہانے بر خیالے بیں رَواں

نیست وش: ایسا نہیں۔۔۔ باشد: ہونا۔۔۔ خیال: سوچ۔۔۔ رواں: جاری۔۔۔ جہان: دنیا۔۔۔ بر خیال: خیال کی طرح۔۔

رواں: جاری

ترجمہ: دنیا میں خیال، معدوم کی طرح ہوتا ہے۔ تُو، دنیا کو خیال کی طرح چلتی پھرتی چیز سمجھ

یعنی دنیا میں خیال بھی ایک نہ ہونے والی چیز کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

تخیل کی طاقت،

تخیل کی طاقت، اسے بظاہر دیکھا نہیں جا سکتا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی دنیا، اپنی تمام وسعت کے ساتھ تخیل کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی تخیل کی طاقت تمام لوگوں پر غالب ہے اور ہر ایک پر غلبہ رکھتی ہے کیونکہ اس کا محرک تخیل کی امیدیں اور خوف ہیں۔

تخیل کائنات کا ایک امر ہے جو مادے اور اس کی پیچیدگیوں سے الگ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے صوفیاء،
«عالم مثال»، «عالم اَشباہ»، «برزخ»، «خیال منفصل» کہتے ہیں۔

یہ دنیا، عقل کی دنیا اور فطرت کی دنیا کے درمیان ہے۔ کیونکہ عقل کی دنیا خالصتاً تجریدی ہے اور فطرت کی دنیا خالص مادی ہے۔ خیالی دنیا ظاہری دنیا سے ملتی جلتی ہے لیکن باطنی دنیا کے لحاظ سے عقل کی طرح تجریدی ہے۔ خواب میں جو تصویر نظر آتی ہے وہ اسی قسم کی ہے۔ لیکن مثنوی میں تخیل کو اکثر شکوک و شبہات اور باطل خیالات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تخیل کی تعریف

مثنوی میں خیال کے عام معنی میں سے ایک خواب اور وہ چیزیں ہیں جو خواب میں دیکھی جاتی ہیں۔ خیال کے دیگر استعمالات کے علاوہ یہ لفظ شبہ اور جھوٹے تخیل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ جن کا حوالہ دیا گیا ہے وہ لفظ تصور

، کردار اور تصویر ہیں۔ پانی، آئینے وغیرہ اشیاء کا کردار مثنوی میں تخیل کا ایک اور اہم ترین استعمال، جو کہ دیگر ادبی اور صوفیانہ تحریروں میں کم ملتا ہے، لفظ میں تخیل کا مطلب ہے: "1-خیال، وہم۔ 2-ایسی تصویر جو خواب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ 3-کوئی بھی شکل جو واحد مواد سے بنی ہو وہ آئینے میں کسی چیز کی طرح ہے۔

خیال تخیل کا مترادف ہے۔

خیال " تخیل "کا مترادف ہے جو ہر لمحہ شعور کے پردے پر ایک روشن سایہ ڈالتا ہے۔ اور جب ایک سوچ ختم ہو جاتی ہے تو دوسری سوچ اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

سوچ زندگی کے عمل کا پہلا قدم ہے، جو تصور اور مثبت امیج کی اہمیت کو سمجھنے میں مددگار ہے۔ ہمارے طرز عمل ہمارے احساسات کی وجہ سے ہوتے ہیں، اور ہمارے احساسات بدلے میں مثبت خیالات کی وجہ سے ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں جس چیز کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے۔ خیالات۔

سائنسی طور پر، تخیل کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو مریض اپنے جسم کے لیے چاہتا ہے ہائپو تھیلمس کی طرف سے ہدایت اور منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ یہ تقریباً فوری طور پر کیا جاتا ہے. یعنی دماغ سے بہاؤ اور اعصابی نظام کے ذریعے ہائپو تھیلمس اور پیچوٹری غدود کے محور سے ہوتے ہوئے ایڈرینل غدود، اینڈوکرائن غدود کے نظام تک پہنچتا ہے اور پھر یہ دماغ کے دسویں جوڑے والے اعصاب کے ذریعے نفسیاتی اور جسمانی طور پر جسم کو ڈھال لیتا ہے۔ دماغ میں ان احکامات کی فائل بھی جسم میں ریکارڈ ہوتی ہے۔ دماغ اور جسم کے تعلق کے ماہرین میں سے ایک ڈاکٹر دیپک چوپک خدا کو جاننے کے لیے کتاب میں کہتے ہیں: "ذہن جسم کے ہر خلیے میں موجود ہے۔ ہر خیال جو ہم سوچتے ہیں وہ نیوروپیپٹائڈس نامی مادوں کے اخراج کا سبب بنتا ہے، اور یہ مادے تمام خلیات میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ جسم منتقل ہوتا ہے۔" مثال کے طور پر، جو پیغامات آپ تخیل کے ذریعے اپنے جسم کو بھیجتے ہیں وہ فوری طور پر پیرا سیمپیتھٹک اعصابی نظام کے ذریعے نیوروٹرانسمیٹر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر، جو شخص صحیح سوچتا ہے وہ لاشعوری طور پر اپنے اندر امن، صحت اور جاندار پن پیدا کرتا ہے، جب تک خوف، حسد، نفرت اور دشمنی کو ختم کرنے جیسی ذہنی اور جذباتی تطہیر نہیں ہوتی، منفی رجحانات مسائل کا باعث بنتے رہتے ہیں۔

مولاناؒ کہتے ہیں: تم دماغ کے درمیان ایک خیالی دنیا ہو۔

یعنی عالم انسانیت اور انسان کے وجود کی اصل، اس کے افعال و الفاظ، اس کے اوصاف و اخلاق کی بر آمد سے لے کر سب کچھ وہم و تخیل کے محور پر ہے۔ غصہ اور مہر، امن و جنگ، دوستی اور دشمنی۔ اچھائی اور برائی، آراء میں فرق، مسائل، آراء، مزاج، جذبات اور جو کچھ انسانی فطرت سے نکلتا ہے، ان سب کا اصل سرمایہ وہم ہے۔

یہ بیان کرتے ہوئے کہ انسانوں کی دوستی اور دشمنی، رجائیت اور مایوسی یہ سب تخیل کے سائے ہیں اور اس کے اپنے اختلاف سے پیدا ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں:

ایرانی طرز

بر خیالی صُلحَ شان و جنگ َشان

وَزُ خیالی فَخُرَ شان و ننگ شان

پاکستانی طرز

بر خیالے صُلحِ شان و جنگِ شاں

وَزُ خیالے فَخُرِ شان و ننگِ شاں

بر خیالے: سوچ پر۔ تخیل کے مطابق۔۔۔ صلح: آشتی۔۔۔ جنگ: لڑائی۔۔۔ ز خیالے: فرضی

اس میں صنعت ترصیع ہے۔ (یعنی ہم قافیہ و سجع الفاظ کا استعمال)

ترجمہ: لوگوں کی باہمی صلح وجنگ کسی نہ کسی خیال پر ہی ہوتی ہے۔ اور کیال ہی سے ان کو فکر یا ندامت ہوتی ہے۔

مولانا رومؒ وادیٔ نفسیات میں داخل ہوگئے ہیں اور انسان کی اس کیفیت پر گرفت فرمائے ہوئے ہیں کہ اگر اسے کنٹرول کر لیا جائے تو انسان، روشنی حتیٰ کہ روح کی رفتار جو کئی روشنیوں کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے، تخیل وخیال اس سے بھی زیادہ رفتار کا حامل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی مثبت گرفت کر لی جائے تو پھر آفاقی قوتیں کہیں اور نہیں بلکہ انسان کے اپنے اندر ہیں۔

تخیل بلند پروازی کا دوسرا نام ہے۔

یہ تخیل ہی ہے جو مستقبل کو حال میں کھینچ لاتا ہے اور پیش گوئی کے انداز میں مخصوص حالات وواقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، کبھی وہ عمرِ رفتہ کو آواز دے کر حال کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی کبھی ماضی و مستقبل دونوں کو حال میں یکجا کر کے ہمیں متحیر بھی کرتا ہے۔ بعض اوقات تو کسی انوکھی دنیا کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جسے خوابوں کی دنیا بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کاروباری کامیابی، اچھے اور خوب صورت رشتے، جنسی تعلقات، تفریح، کھیل تماشا، دوسروں کی بھلائی کرنا شامل ہے۔

مشاہدے، تجربے اور سائنسی علوم جو انسانی تخیل کے عمل سے گزر کر حقیقی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اس دنیا کو انسانوں کے لیے سہل بنا رہے ہیں۔ وہ کیا ہیں قوت خیال کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔

لڑائی جھگڑے، جنگ و جدل سب خیال کی قوت سے ہی ہوتے ہیں۔ اگر فکر یکساں ہو تو ان بکھیڑوں کی ضرورت نہیں۔

شاعر فطرت ہوں جب بھی فکر فرماتا ہوں میں

روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

ایرانی طرز

آن خیالاتی کہ دامِ اَولیاست

عکسِ مہ رویانِ بُستانِ خداست

آن خیالاتے کہ دامِ اَوْلیاست
عکسِ مَہ رُویانِ بُستانِ خداست

آں خیالات: وہ تخیل، وہ سوچیں۔۔۔ دام: جال۔۔۔ عکس: سایہ۔۔۔ مہ رویان: چاند کے مکھڑے والے۔۔۔ بستان: باغ یعنی علوم کثیرہ والے

ترجمہ: مگر ولیوں کے وہ خیالات جو ان کے لئے جال کی مانند ہیں۔ اللہ جل شانہ کے علوم متکثرہ کا پرتو ہیں۔

انسان جب ذات کے سحر سے باہر نکلتا ہے تو یہ زندگی اور کائنات کے تمام تر اسرار اس پر آشکار ہونے لگتے ہیں۔ سوجھ بوجھ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ''انا'' ہے۔ ذات کی الجھنوں سے دور آگہی کا روشن راستہ ہے۔ جو معرفت کی منزلوں تک لے جاتا ہے، لیکن پہلا زینہ ذات کی سمجھ ہے۔

صاف خواہی چشم و عقل و سمع را

بر دران تو پردہ ہائی طمع را (رومی)

اگر نگاہ، عقل اور سماعتوں کو شفاف رکھنا چاہتے ہو تو حرص و طمع کے پردے جلا کر راکھ کر ڈالو۔

یہ میٹامارفوسس کا عمل ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو ذہن سے غفلت کے پردے ہٹا دیتی ہے۔ خیال سے ارادہ جنم لیتا ہے اور ارادے سے عمل کی پختگی (قوت ارادی) بالکل اسی طرح عقل، کل کا جز ہے۔ کیونکہ خیال میں پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔ ذہن میں خیال کی اڑان طے شدہ امر ہے۔ اونچائی، تکمیل کے ہنر کی دَین۔ جس طرح غیر محسوس ہوا، پروں کو تحرک عطا کرتی ہے۔ عرفان بھی جذب کے سلیقے کی دین ہے۔ پرکھ، سمجھ اور محسوس کرنے کا ہنر ہی عناصر میں ترتیب کا جوہر ڈھونڈ نکالتا ہے۔

سوچ روز ازل سے اپنے محور سے جڑی ہوئی ہے۔ رابطے کے کئی بہانے مل جاتے ہیں۔ دل میں پوری دنیا آباد ہے۔ اسے تحفظ ملنا چاہیے نہ کہ بے یقینی۔ در حقیقت تیر انداز کو اپنے اندر کی طاقت کا علم نہیں ہے۔ جو ہتھیار سے زیادہ پر اثر ہے۔ یہ محبت کا جوہر ہے، مگر ذات کے غرور میں مبتلا غافل مارنے پر تلا ہوا ہے۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی اس کیفیت کو خوبصورتی سے اس شعر میں سمو دیتے ہیں:

تیر چڑھا چلّے پر' ساجن مار نہ موہے

تیر لگے گا تو ہے' مجھ میں تو ہے ساجن

شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے مطابق

میں نے روز ازل ہی' پڑھا تھا عشق کا اکھر

تب ہی جان لیا تھا' اپنے نفس کا جوہر

اس جا سب روحوں کو' تھا عرفان میسر

بدلا سارا منظر' ہستی ہو گئی حاصل

(شاہ عبد اللطیف)

روح کی پرواز سے زیادہ طاقت پرواز رکھنے والی چیز۔ ایسی طاقت جس کی مرہون منت ہی ساری کائنات اور اس کا تموج ہے۔ ایک سپر انرجی جو انسان کو دی گئی ہے۔ اب اس سے کیا کام لینا ہے۔ اگر تو مولاناؒ کے فرمان کے مطابق ہستی سے نکل گیا تو سب کچھ پا لیا۔

ایرانی طرز

آن خیالی کہ شَہ اَندَر خواب دید

در رُخِ مِھْمان ھَمی آمد پَدید

آں خیالے را کہ شَہ در خواب دید
در رُخِ مَہمان ہَمے آمد پَدید

آں خیالے: وہ خیالات و تصورات۔۔۔ در خواب دید: خواب میں دیکھے تھے۔۔۔ رخ: چہرہ۔۔۔ ہمی آمد پدید: نمایاں تھے، ظاہر تھے

ترجمہ: چنانچہ بادشاہ نے جو خیالات خواب میں دیکھے تھے وہ مہمان کے چہرے سے بخوبی عیاں تھے۔

جناب رومیؒ کے مطابق

کائنات میں کوئی بھی خیال کوئی بھی واہمہ اور کوئی بھی تصوّر بے معنی نہیں ہے۔ ہر خیال کے دو قسم کے معنی نکلتے ہیں۔ اس خیال میں رحمانی قدروں سے متعلق معنی ہوتے ہیں، یا خیالات شیطانی قدروں سے متعلق ہوتے ہیں۔ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ شیطانی علوم، اور رحمانی علوم۔

جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے، حضور ﷺ تک انہوں نے ایک ہی بات کہی ہے کہ رحمانی علوم سیکھنے کے بعد ان پر عمل کرو تاکہ تم رحمان سے قریب ہو جاؤ۔ شیطانی علوم نہ سیکھو اور شیطانی علوم پر عمل بھی نہ کرو اس لئے کہ اگر تم نے شیطانی علوم پر عمل کیا تو شیطان سے قریب ہو جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ جو بندہ شیطان سے قریب ہو جائے گا وہ رحمان سے دور ہو جائے گا اور جو بندہ رحمان سے قریب ہو جائے گا وہ شیطان سے دور ہو گا۔

خواب و خیال کی حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان کے ذہن میں ۲۴ گھنٹے ایک ہی خیال رہتا ہے "پیسہ، پیسہ، پیسہ" اس کو پیسہ کی ہوس ہے تو خواب میں وہ دولت ہی دیکھے گا اور ایک آدمی کے ذہن میں اللہ کی محبت پیغمبروں کی تعلیمات، اولیاء اللہ کی محبت ہو گی تو وہ

ہر وقت اسی خیال میں رہتا ہے کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت مل جائے۔ حضور ﷺ کا قرب نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ کی زیارت ہو جائے تو اس کے خواب بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پیغمبروںؑ نے شیطینت کو رد کیا ہے اور شیطانی خیال سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کیلئے اور رحمانی علوم سیکھنے کیلئے پوری نوعِ انسانی کو دعوت دی ہے۔ خواب کی دو طرزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو خیالات ہر وقت ذہن میں گشت کرتے رہتے ہیں وہ مسخ صورت ہو کر نظر آجائیں۔ دوسری یہ کہ عالم بالا میں جو پاکیزہ خیالات گشت کر رہے ہیں وہ نظر آجائیں۔ مسخ صورت خواب رویاءِ کاذبہ اور حقیقی خوابوں کو رویاءِ صادقہ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے جو خواب دیکھا وہ اس آنے والے مرد دانا کے چہرے سے عیاں تھا دراصل خواب کے بارے ارشاد فرمایا:

عن أبي سعيد الخُدْرِيِّ رضي الله عنه: أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: «إذا رأى أحدُكم رُؤيا يُحِبُّها، فإنما هي من الله تعالى، فليَحْمَد الله عليها، وَلْيُحَدِّثْ بها -وفي رواية: فلا يُحَدِّثْ بها إلا من يُحَبُّ- وإذا رأى غير ذلك مِمَّا يَكْرَه، فإنما هي من الشيطان، فَلْيَسْتَعِذْ من شَرِّهَا، ولا يَذْكُرْهَا لأحد، فإنها لا تضره».

[صحیح]-[متفق علیہ]

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جب تم میں سے کوئی شخص پسندیدہ خواب دیکھے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، پس وہ اس پر اللہ کی حمد ادا کرے اور اسے بیان کرے“۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: ”اس کا ذکر صرف ایسے لوگوں سے کرے جو اس سے محبت رکھتے ہوں، اور جب اس کے برعکس ناپسندیدہ بات خواب میں دیکھے تو وہ شیطان کی طرف سے ہے لہٰذا اس کے شر سے پناہ مانگے، اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرے کیوں کہ وہ اسے نقصان نہیں دے گا“۔

صحیح - متفق علیہ

شرح

جب کوئی مسلمان خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو اسے اچھی لگے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے خوش خبری ہے، اس بشارت پر اسے اللہ کی حمد ادا کرنی چاہیے، اور اس کو اپنے اہل و عیال، پڑوسیوں اور نیک ساتھیوں میں سے صرف انہیں کو بتائے جن سے وہ محبت کرتا ہو، اور جب کوئی برا خواب دیکھے جس کا دیکھنا یا جس کی تاویل اسے ناپسند ہو تو وہ شیطانی خیالات ہیں جسے شیطان

بحالت نیند سونے والے کے سامنے اس کے خواب میں پیش کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اسے ڈرائے اور کبیدہ خاطر کرے، جب ایسا خواب دیکھے تو اللہ تعالی سے اس کے شر سے پناہ مانگے۔

بادشاہ کا خواب رؤیا صادقہ تھا۔

ایرانی طرز

شَہ بہ جایِ حاجِبانُ فا پیش رَفت

پیشِ آن مِہُمانِ غَیُبِ خویش رَفت

پاکستانی طرز

شَہ بجائے حاجِبانُ در پیش رَفت

پیشِ آں مِہُمانِ غَیُبِ خویش رَفت

بجائے:بطور۔۔۔حاجب:دربان۔۔۔ درپیش رفت:استقبال کے لئے گیا۔۔۔پیش آن:اس کے سامنے۔۔۔مہمان غیب:خواب والا مہمان جس کے بارے بتایا گیا تھا

ترجمہ:بادشاہ دربانوں کی طرح خود استقبال کے لئے اپنے اس غیبی مہمان کے سامنے گیا۔

کیسا سین ہو گا؟ کہ ایک بادشاہ کی بادشاہی ایک مرد درویش یعنی فقیر (فقر) کے سامنے جھکتی ہے۔

باعاشقان شیدا، سلطان کجا بر آید؟

در پیش آشنایان بیگانہ اے چہ سنجد؟

کہاں جائے گا سلطان دیوانے عاشقوں کے ساتھ

بیگانہ جاننے والوں کے سامنے کیا کروگے ؟

چون عشق در دل آمد، آنجا خرد نیامد

چون شاہ رخ نماید فرزانہ اے چہ سنجد؟

جب دل میں محبت آئی تو عقل نہ آئی

جب بادشاہ ظاہر ہو گا تو ایک عقلمند کیا پیمائش کرے گا؟

پادشاہ غرورش رازیر پاگذاشت و بہ استقبال مھمانش رفت!

احترام گذاشتن عمل فوق العادہ حسنہ ای در درگاہ خدا است...

بادشاہ اپنا غرور توڑ کر اپنے مہمان کا استقبال کرنے چلا گیا!

تعظیم خدا کے نزدیک بہت بڑی نیکی ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد بزرگوار سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سامنے توقیر نہ کی۔ کہ درست بات اپنے والد مکرم کو نہ بتائی تو نبوت ان سے یا تو موئخر کر دی گئی یا انہیں نبوت سے ماورا کر دیا گیا۔

وجہ والد کی ایک طرح کی توقیر نہ کی۔ جب آپ کسی آقا یا بزرگ یا ولی کی خدمت میں پہنچتے ہیں تو آپ کو احترام اور شائستگی سے پیش آنا چاہیے۔

شائستگی آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اس شخص کا علم اپنے اندر اچھی طرح لے سکیں۔

حاجبان یا دربان یا چوکیدار وہ شخص ہے جو دروازے کے سامنے کھڑا ہو۔

یہاں وہ کہتا ہے کہ بادشاہ حاجیبن کے بجائے دروازے پر گیا اور خدائی بابا کا خود استقبال کیا۔

کھڑے ہو کر استقبال کرنا خلاف سنت نہیں ہے، بلکہ یہ عین سنت ہے، لیکن دونوں چیزوں میں توازن ہونا چاہیے، آنے والے سے فرمایا کہ تو اس بات کی توقع اور خواہش نہ کر کہ جب تو مجلس میں آئے تو لوگ تمہارے لئے کھڑے ہوں۔ تمہارے لئے نعرے لگائیں تمہاری تعریفیں شروع کر دیں، اور اگر کھڑے ہو کر استقبال نہ کریں تو تمہیں برا لگے تو ناراضگی کا اظہار کرے۔ کیونکہ یہ تکبر اور غرور کی علامت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کھڑے ہو کر استقبال کرنے کا حکم دیا۔

عن ابی سعید الخذری قال، لمانزلت بنو قریظۃ علی حکم سعد ھوابن معاذ بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وکان قریبامنہ فجاء علی حمار فلمادنا قال رسول اللہ قومواالی سید کم

(متفق علیہ)

بخاری ومسلم کتاب المغازی

حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر یہود بن قریظہ (قلعہ سے) نیچے اتر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لئے ان کی طرف ایک آدمی بھیجا اور وہ قریب ہی موجود تھے سو وہ گدھے پر سوار ہو کر آئے نزدیک پہنچے تو رسول اللہ نے لوگوں سے فرمایا اپنے سردار کے لئے (تعظیما) کھڑے ہو جاؤ۔

اس حدیث کی شرح میں امام العسقلانی نے فتح الباری میں بہت اچھی شرح کی ہے جس سے مسئلہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ذکر العسقلانی فی فتح الباری 11/ 5049-51

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ لعیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بوڑھے مسلمان کی تعظیم کرنا اللہ تعالی کی تعظیم کا ایک حصہ ہے اور اسی طرح قرآن مجید کے عالم کی جو اس میں تجاوز نہ کرتا ہو اس بادشاہ کی تعظیم جو انصاف کرتا ہو، ان تینوں کی تعظیم کرنا اللہ تعالی کی تعظیم ہی کا ایک حصہ ہے۔

سنن ابی داؤد کتاب الادب

ابن ابی شیبہ

المعجم الاوسط الطبرانی

درج ذیل احادیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ علماء کے استقبال کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے۔ اسی طرح، مکرم اور معظم، بوڑھے، اور اہل مناصب لوگوں کے احترام کے لئے کھڑے ہونا سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ البتہ اگر کوئی اس کی خواہش کرتا ہے،

اور توقع کرتا ہے تو وہ خود گنہگار ہو گا۔ کھڑے ہونے والے نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کو ناپسند کیا وہ یہی ہے کہ تکبر وغرور کی وجہ نہ ہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ:

یارسول اللہ: آپ نے مجھے مارادرانحالیکہ میرا پیٹ ننگا تھا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹادیا، یہ دیکھ کر تمام مسلمان چیخ وبکا کرنے لگے اور کہنے لگے: ہائے عجب! عکاشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضرب لگانے والا ہے۔ پس جب حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بطن مبارک کی سفیدی دیکھی گویا وہ مصر کی بنی ہوئی عمدہ پارلین ہے، تو ان سے رہانہ گیا اور بطن اقدس سے لپٹ گئے اور وہ کہہ رہے تھے: (یارسول اللہ) میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ۔کس شخص کا نفس یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آپ سے قصاص لے، پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: یا تو مارے گا یا معاف کرے گا۔ تو انہوں نے عرض کیا: میں نے معاف کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ اللہ تعالی روز قیامت مجھے معاف فرمائے گا، پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ جنت میں میرے ساتھی کو دیکھے تو وہ اس شخص کو دیکھ لے، پس لوگ کھڑے ہوئے اور عکاشہ کی آنکھوں کے درمیان بوسے دینے لگے اور کہنے لگے: تمہیں مبارک تمہیں مبارک ہو بے شک تم نے بلند درجات پالئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت بھی۔۔۔۔ الحدیث

اس کو امام طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔

فصل فی آدب مجلس شیخ

امام عسقلانی نے فتح الباری میں کہا ہے ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے بڑوں کا احترام کرنے، اور اپنی مجلس میں اہل فضیلت کے احترام کی مشروعیت، اور اسی مجلس میں اپنے علاوہ اپنے اصحاب کے لئے کھڑے ہونے، اور تمام لوگوں کو بڑوں کے لئے احتراما اٹھنے کو لازم پکڑنے کا حکم دیا، اور بعض لوگوں نے اس سے منع کیا اور انہوں نے ابوامامہ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے، جس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف عصی مبارک پر ٹیک لگائے ہوئے آئے تو ہم سارے کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا: ایسے کھڑے نہ ہوا کرو جیسے عجمی لوگوں میں سے بعض بعض کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔

طبری نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کی سند میں اضطراب ہے اس میں ایسا راوی بھی ہے جو غیر معروف ہے، اور (عدم قیام والوں نے) عبد اللہ بن بریدہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ ان کے والد حضرت معاویہ کے پاس گئے اور

انہیں بتلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے بتوں کی طرح کھڑے ہوں تو اس پر دوزخ کی آگ واجب ہے، اور امام طبری نے اس حدیث کا جواب یوں دیا، ہے کہ اس حدیث میں اس شخص جو جس کے لئے قیام کیا جاتا ہے اس قیام سے خوش ہونے سے منع کیا گیا نہ کہ اس شخص کو منع کیا گیا ہے جو اس کے لئے احتراما کھڑا ہوتا ہے۔ اور ابن قتیبہ نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ منع اس شخص کو کیا گیا ہے جو چاہتا ہے کہ لوگ آ کے اس کے سر پر یوں کھڑے ہوں جیسے عجمیوں کے بادشاہوں کے سر پر کھڑے ہوتے ہیں، اور اس میں ایک شخص کو اپنے بھائی کے لئے اس وقت قیام کرنے سے منع نہیں کیا گیا جب وہ اس کو سلام کرے۔ اور ابن بطال نے جواز قیام کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو امام نسائی نے عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھتے تو ان کا استقبال کرتے اور کھڑے ہو کر ان کو بوسہ دیتے پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے جگہ پر بٹھائے۔

اور امام عسقلانی نے ہی "فتح الباری" میں کہا ہے کہ قیام چار طرح کا ہوتا ہے:

پہلا ممنوع ہے اور وہ ایسا قیام ہے جو ایسے شخص کے لئے ہو جو چاہتا ہے کہ اس کے لئے قیام کیا جائے اور قیام کرنے والے پر تکبر اور بڑا پن بھی جتلائے۔

دوسرا قیام مکروہ ہے اور یہ وہ قیام ہے جو اس شخص کے لئے ہو جو اپنے لئے کھڑے ہونے والوں پر تکبر اور بڑا پن ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کو خدشہ ہے کہ اس وجہ سے اس کے نفس میں وہ کچھ داخل ہو جائے گا جس کا اسے ڈر ہے، اور اس لئے بھی کہ ایسا کرنے میں جبابرہ (جابر لوگوں) کے ساتھ مشابہت ہے،

تیسرا قیام وہ جائز ہے، اور یہ وہ قیام ہے جو بطور نیکی اور احترام کے ہو، اور اس شخص کے لئے ہو جو اس قیام کے باوجود جبابرہ کے ساتھ مشابہت سے محفوظ رہے،

چوتھا قیام مندوب ہے، اور یہ وہ قیام جو سفر سے آنے والے کے لئے اس کے آنے کی خوشی میں اور اسے سلام کرنے کی غرض سے کیا جائے یا اس شخص کے لئے کیا جائے جو کو کوئی نعمت حاصل ہوئی ہو تو اسے حصول نعمت کی مبارکباد دینے کے لئے قیام کیا جائے یا کسی شخص کو کوئی مصیبت پہنچی ہو تو اس کے ساتھ تعزیت کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔

حماد بن زید سے روایت ہے کہ ہم حضرت ایوب کے پاس تھے تو حضرت یونس آئے تو حضرت حماد نے کہا اپنے سردار یا کہا ہمارے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

حضرت ایوب محمد کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبد الرحمن بن ابو لیلی اور ان کے اصحاب کو ان کی تعظیم بجالاتے اور ان کو سردار بناتے اور کسی امیر کی طرح ان کی عزت بجالاتے ہوئے دیکھا۔

اس شعر میں مولانا رومؒ دراصل اسلامی اقدار میں استقبال کا طریقہ اور سلیقہ سکھا گئے اور ادب جو تصوف میں زینہ اول ہے کی تعلیم دے گئے۔ سبحان اللہ

ایرانی طرز

هر دو بَحُری آشُنا آموختہ

هر دو جانُ بی دو ختن بُر دوختہ

پاکستانی طرز

ہر دو بَحُری آشُنا آموختہ

ہر دو جانُ بیدو ختن بُر دوختہ

مشکل الفاظ:

ہر دو: دونوں افراد۔۔۔ بحرے: دریا۔۔۔ آشنا: جان پہچان والے، جاننے والے۔۔۔ آموختہ: سیکھا۔۔۔ بے دو ختن: بغیر سلائی کے۔۔۔ بر دوختہ: سلی ہوئی

ترجمہ: دونوں دریائے معرفت کا تیرنا سیکھے ہوئے تھے۔ دونوں جانیں (محبت وپیار سے یوںؐ باہم ملیں) کے گویا آپس میں سلی ہوئی تھی۔

بادشاہ یہ خواب دیکھتے ہی چونک اٹھا۔ غفلت کے پردے اٹھ گئے۔ کنیز کی محبت نے غلام بنار کھا تھا۔ اب گویا از سرِ نو آزادی اور بادشاہی پائی۔ جب دن نکلا اور آفتاب مشرق سے بر آمد ہوا تو بادشاہ بالاخانے کے بر آمدے میں آبیٹھا۔ راستے پر نگاہ لگی ہوئی تھی کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ مردِ بزرگ صاحب کمال سایے میں دھوپ کی طرح چلے آتے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو دیکھا سر سے پیر تک نور چمک رہا ہے۔ بادشاہ خود پیشوائی کو آگے بڑھا۔ اس غیبی مہمان سے بادشاہ اس طرح ملا جس طرح کہ شکر گلاب کی پتیوں میں پیوست ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ جیسے دو جانیں باہم بخیہ ہو کر ایک ہو رہی تھیں۔ ان کی ایسی مثال تھی جیسے ایک پیاسا اور دوسرا پانی یا ایک مئے پرست اور دوسرا شراب،

بہری کا مطلب ہے تیراک۔ اس کا مطلب ہے وہ شخص جو تیراکی کا فن رکھتا ہو۔

مثال کے طور پر، اصفہان کے آس پاس کے دیہاتوں میں، وہ کہتے ہیں کہ چلو تیراکی کرتے ہیں، اور یہ سچ ہے...

اس شعر میں مولاناؒ کہتے ہیں کہ وہ دونوں، حکیم اور بادشاہ، سمندر میں تیرنا جانتے تھے...

یہاں، جناب رومیؒ ایک بہت خوبصورت راز بتاتے ہیں

ایک وہ پیر کامل جو ہمیشہ عبادت کرتا اور خود کو سنوارتا رہا ہے اور دوسرا وہ بادشاہ جس نے عشق کے لیے راتوں رات عطار کی سات وادیوں کا سفر کیا، غربت اور تباہی کے مرحلے سے لے کر ان دونوں کو ایک ساتھ ملایا گیا اور ان کے روحیں ایک دوسرے کے قریب کر دی گئیں! تو گویا ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کھیل میں دیر سے جانتے ہیں.

ارشاد ہوتا ہے: عن عائشة رضی اللہ عنہا، قالت: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یقول: "الارواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وما تناکر منها اختلف"

(بخاری حدیث نمبر: ۳۳۳٦)

ترجمہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے:

"روحوں کے ہجوم کے ہجوم الگ الگ تھے، پھر وہاں جن روحوں میں آپس میں پہچان ہوئی تھی، ان میں یہاں بھی محبت ہوتی ہے اور جو وہاں غیر تھیں، یہاں بھی وہ خلاف رہتی ہیں"۔

حادثاتی ملاقاتیں، جنہیں آج ڈیجاوو (انگریزی زبان میں مستعمل اصطلاح 'ڈیجاوُو' بنیادی طور پر ایک افرانسیسی اصطلاح کا ترجمہ ہے، جس کا مفہوم ہے 'پہلے دیکھا ہوا'

'ڈیجاوُو' ایک ایسی کیفیت ہے، جب ہمیں لگتا ہے کہ ہم یہ کام پہلے بھی کر چکے ہیں، یہ چیز پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، لیکن آپ کا شعور بتاتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہے

کسی نئی جگہ جا کر لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں، کوئی واقعہ پہلی بار دیکھ کر بھی لگتا ہے ایسا ہمارے ساتھ پہلے بھی ہو چکا ہے حالانکہ حقیقت میں ہم پہلے کبھی اس جگہ نہیں گئے اور پہلے کبھی اس طرح کا واقعہ ہمارے ساتھ نہیں پیش آیا ہوا ہوتا

یا شاید آپ پہلی بار کسی نئے شہر میں پہنچے ہیں اور ایک ہی وقت میں آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ اس سے پہلے بھی درختوں سے بنے فٹ پاتھ پر چل چکے ہوں۔)

اس کیفیت کو ڈیجاؤ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اس شخص سے ملے ہیں جسے ہم نے آج کسی اور جگہ دیکھا ہے۔ یہ دراصل روحوں کا ملاپ ہے...

مانوس ہونے یا تیرنے کا کیا مطلب ہے؟

ایک مرد کامل تھا جو برسوں ریاضت کے بعد موت کے مقام پر پہنچ گیا تھا اور دوسرا وہ بادشاہ تھا جو شدید خواہش اور جوش کی وجہ سے راتوں رات اس مقام تک پہنچ گیا تھا، دونوں پانی میں ڈوب گئے!

تصوف کے راستے پر، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ جائیں اور اس کا تھوڑا سا تجربہ کریں ایسا ممکن نہیں۔ آپ کو اس گہرے سمندر میں مکمل طور پر تیرنا چاہیے اور اس کا مکمل تجربہ کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو اس سمندر میں ڈوبنے کی نیت سے پھینکنا پڑے گا!

یہاں تک کہ پانی کے پاس چلنا بھی آپ کو الٰہی سمندر میں دھکیلنے کا سبب بنتا ہے:

راستے کو کچھ نہ کہنا، سڑک خود آپ کو بتائے گی کہ آپ کو کدھر جانا ہے۔

چنانچہ بادشاہ اور پیر دونوں ایک ساتھ سمندر میں ڈوب گئے تھے، وہ پانی سے واقف تھے۔

صوفیانہ تیراکی میں پہلے ڈوبنا ہوتا ہے اور پھر وہ تیرنا سیکھتے ہیں اور دونوں نے بحر الہیٰ میں ڈوب کر تیرنا سیکھا۔

وہ تمام لوگ جن کا ایک ہی افق ہے اور ایک ہی روحانی راہ پر گامزن ہیں، ایک ہی سمندر میں ڈوب چکے ہیں!

fantasy اور خوابوں کی دنیا میں، جسے مثالی دنیا کہا جاتا ہے، وہ جڑے ہوئے، متعلقہ اور مانوس رہے ہیں۔ اسی لیے وہ ایک دوسرے اور ایک دوسرے کی باتوں سے واقف ہیں...

وہ دونوں سمندری راستوں سے اچھی طرح واقف تھے اور تیرنا بھی جانتے تھے۔ یعنی دونوں سچ کے سمندر کے متلاشی تھے۔ اور یہ دونوں روحیں جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا تھیں، معنویت کی دنیا میں ایک ساتھ سلی ہوئی تھیں۔ یعنی وہ متحد تھے۔

شعر کو معانی ذہن میں رکھ کر ذوق سے پڑھیں

ایرانی طرز

گفت مَعشوقَم تو بوده سُتی نه آن

لیک کارُ از کار خیزد در جهان

پاکستانی طرز

گفت مَعشوقَم تو بوده سُتی نہ آں

لیک کارُ از کار خِیزُد دَر جہاں

مشکل الفاظ

گفت: کہا، بولا۔۔۔ معشوقم: میرا محبوب۔۔۔۔ بودہ ستی: تو ہی تھا۔۔۔ لیک: نہ کہ۔۔۔ کار از کار خیزد: کام سے اٹھو۔۔۔ در جہاں: دنیا میں۔

ترجمہ: بادشاہ بولا میرا معشوق تو ہی تو تھا، نہ کہ وہ کنیز لیکن دنیا میں ایک کام سے دوسرا کام نکلتا ہے۔

مطلب یہ کہ کام سے مراد غیبی مہمان کی زیارت یعنی اللہ نے، عشقِ کنیز، کو آپ کی زیارت کا سبب بنا دیا۔

الغرض اسے دیکھ کر بادشاہ نے، اپنے جی میں کہا (کہ اے مردِ خدا میرا معشوق تو دراصل تو تھا لیکن جہاں میں ایک کام دوسرے کام کے ذریعے سے پیدا ہوا کرتا ہے، سو اس عشق کا ذریعہ کنیز کا عشق ہوا۔

یہاں مولانا رومؒ بادشاہ کی زبانی دراصل یہ فرمارہے ہیں کہ عاشقی میں پتا نہیں ہوتا کہ اصل عشق کا حامل کون ہے، کون ذریعہ ہے، اور اس تک کیسے ہنچنا ہے؟ کیونکہ یہاں بادشاہ سمجھتا ہے کہ اس کا عاشق درحقیقت ہلال نما مرد درویش ہے جو اس کے پاس آیا تھا، در حالانکہ وہ کنیز نہیں تھی؟

بادشاہ کا کنیز سے پیار، کنیز کے بیمار ہونے اور ڈاکٹروں کا علاج نہ کرنے کی کہانی، بادشاہ کا رونا اور ماتم کرنا اور موت کے قریب پہنچنا اور بوڑھے سے ملنا، یہ سب عقلمندوں کے لئے رازوں سے بھرپور معاملہ تھا۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ چیزیں ہمیشہ گھونسلے سے ہوتی ہیں۔

آپ کچھ ایسا کرنے جارہے ہیں جس کا نتیجہ آخر میں ایک جیسا نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر، آپ روٹی خریدنے جاتے ہیں، لیکن آپ الجھ جاتے ہیں! ہم مستقبل کو نہیں دیکھتے اور صرف ارادے کرتے ہیں، واقعات اپنے آپ کو مربوط کرتے ہیں اور آخر کار لوگ سمجھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے تمام منصوبے بنائے ہیں۔

بادشاہ نے شائستگی سے اپنے ان دیکھے مہمان سے کہا: تم میرے سچے معشوق ہو، وہ لونڈی نہیں۔ لیکن اس دنیا میں ایک کام دوسرے کام کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

دوسرے مصرعہ کی وضاحت میں نکلسن کہتا ہے: اللہ تعالیٰ عام طور پر اس دنیا میں ممکنہ اسباب کے ذریعے کام کرتا ہے۔ نوکرانی کے لیے بادشاہ کی شدید محبت اس کے مصائب کا سبب تھی، جو اس کے نتیجے میں اس کی سچائی سے مدد کی التجا کا سبب بنی جب تک کہ مردِ الٰہی اس پر ظاہر نہ ہوئے۔ لہذا، بادشاہ کی مجازی محبت کو حقیقی محبت میں اپ گریڈ کیا گیا تھا.

تصوف کا راستہ عام شاہراہ سے اس قدر الگ ہے کہ نیا شخص اس عالم میں آتا ہے تو ہر طرف سے اس کے کان میں یہ صدائیں آتی ہیں کہ اس نے آج تک جو کچھ دیکھا تھا، سنا تھا، سمجھا تھا، سب غلط ہے، لیکن ایک مدت کا تجربہ، علم اور یقین دفعتاً بدل نہیں سکتا، اس لئے انسان کو خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ عالم، وہمیات کا عالم ہے، جہاں بداہت، مشاہدے، تجربے کی کچھ قدر نہیں۔ حضرات صوفیہ بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ سمجھانا چاہتے ہیں، آسانی سے سمجھ میں آنے کی بات نہیں۔ اس لئے تلقین وہدایت سے پہلے ان کو عام طرح پر اس مسئلے کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا پڑتا ہے کہ حقائق اشیا کیا ہیں؟ وہ پہلے یہ تلقین کرتے ہیں کہ ہر چیز کی حقیقت کا پتا لگاؤ کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ پھر نہایت کثرت سے مثالوں کے ذریعے سے سمجھاتے ہیں کہ جس چیز کو تم ایک چیز کی حقیقت سمجھتے ہو، یہ اس کی حقیقت نہیں۔ خواجہ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں،

اگر اشیا چنین بودی کہ پیداست

سوال مصطفےٰ کی آمدی راست

باحق، مہتر دین گفت، الٰہی!

بمن بنمای اشیا را کماہی

(یعنی رسول اللہ صلعم)

خداوند کہ این اشیا چگونہ است

کہ در چشم تو اکنون باژ گونہ است

یعنی اگر تمام چیزیں درحقیقت ایسی ہی ہیں جیسی ظاہر میں نظر آتی ہیں، تو رسول اللہ صلعم یہ کیوں فرماتے کہ "اے خدا! مجھ کو اشیا کو اس طرح دکھا جس طرح وہ واقع میں ہیں۔"

سحابی کہتا ہے،

ہر چیز کہ پیدا است، نمود ست نہ بود

بعدست کبودیکہ بنی، نہ سما

جو کچھ دکھائی دیتا ہے یہ نمود ہے، حقیقت نہیں۔ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے، آسمان نہیں، بلکہ بعد نظر ہے۔

حسن وجمال ایسی چیز ہے جو تمام عالم کو مرغوب ہے، لیکن لوگ یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ جمال اصلی کیا چیز ہے؟ لوگ جن چیزوں کے حسن کو پسند کرتے ہیں، وہ عارضی حسن ہے، اصلی نہیں۔ دیوار اگر آفتاب کے عکس پڑنے سے روشن ہو جائے تو دیوار کو روشن نہیں کہنا چاہئے، بلکہ حقیقت میں آفتاب روشن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں میں عارضی اوصاف ہیں، وہ حقیقت میں صاحب اوصاف نہیں۔ سلطان العارفین سلطان باھوؒ ارشاد فرماتے ہیں:

می نترسند عارفان دائم

لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ

عاشقانِ الٰہی ہرگز نہیں ڈرتے اور نہ ہی وہ کسی کی ملامت سے خوفزدہ ہوتے ہیں"۔(محک الفقر کلاں)

حقیقی عاشق وہی ہے جو اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر اپنے تمام اُمور اپنے مالکِ حقیقی کے سپرد کر دیتے ہیں۔جیسا کہ سُلطان العارفین حضرت سخی سلطان باھوؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر تو عاشقِ حق ہے تو دم نہ مار اور اپنا سر پیش کر دے، اِس راہ میں اگر سر گردن سے جدا ہو جائے تو بہت اچھا ہے"۔ (امیر الکونین)

مزید ارشاد فرمایا

"واصل باللہ عاشقانِ الٰہی اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہ زندہ دم وثابت قدم ہو کر خود کو وحدتِ حق میں غرق رکھتے ہیں"۔(محک الفقر کلاں)

الغرض اس شعر میں عاشق حقیقی کی مہارت اور معشوق حقیقی کے علاوہ کسی دوسرے کی جانب متوجہ نہ ہونے کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔

ایرانی طرز

ای مرا تو مُصطَفی من چون عُمَر

از برای خِدمَتَت بَندَم کَمَر

پاکستانی طرز

اے مرا تو مُصطَفےٰ من چون عُمَر

از برائے خِدمَتَت بَندَم کَمَر

اے: حرف ندا۔۔مرا: میں، میرے لئے۔۔۔من: میں۔۔۔چوں: کیونکہ۔۔۔برائے خدمتت: تیری خدمت کے لئے۔۔۔بندم کمر: کمربستہ، تیار

ترجمہ: اے وہ کہ میرے لئے تو گویا مانند مصطفیٰ ﷺ ہے۔میں تیرے لئے مثل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں، تیری خدمت کے لئے میں کمربستہ ہوں۔

یعنی اے قائد! آپ مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر رضی اللہ عنہ عزیز تھے۔ میں آپ کی خدمت میں مصروف عمل ہوں۔

اے فرستادۂ خدا! تو میرے حق میں مصطفیٰ کا درجہ رکھتا ہے۔ اب میں عمرؓ کی طرح تیری خدمت واطاعت پر کمربستہ رہوں گا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کی مولانا رومؒ نے مرد درویش کو سید دوعالم رسول مجتبی محمد مصطفیٰ ﷺ سے تشبیہ کیوں دی؟

صوفیاء کے ہاں محبت کے درجات ہیں ہر درجہ میں حامل محبت اپنی غایت کو پہنچ کر اس میں ڈوب جاتا ہے۔ اور اپنی ہستی کو ختم کر کے اس کیفیت میں فنا ہو جاتا ہے۔ پہلے درجے پر فنافی الشیخ ہے پھر فنافی الرسول اور آخر میں فنافی اللہ۔ اس لیئے بادشاہ چونکہ سالک تھا تو پہلے اپنے آپ کو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تشبیہ دی جو کہ فنافی الرسول ﷺ کے درجہ میں تھے۔ پھر فنافی الرسول کے درجے پر قیام کیا۔

فنافی الرسول کے معنی ہیں کامل محبت اور اتباع رسول یہاں تک کہ اپنی کوئی امنگ خلاف سنت نہ ہو۔ جیسا حدیث شریف میں ہے۔ لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئیت بہ (یعنی کوئی شخص مومن نہ ہو گا۔ جب تک اسکی دلی خواہش اور امنگ میری تعلیم کے ماتحت نہ ہو۔) یہی مضمون مولانا رومؒ کی مثنوی کے اس شعر میں ہے۔

تاہوای تازاست ایمان تازہ نیست

کایں ہوایٰ جز قفل آں دروازہ نیست

یعنی جب تک انسان کی اپنی خواہش زندہ ہے۔ ایمان مردہ ہے۔ کیونکہ یہ خواہش ایمان کے لئے بمنزلہ قفل کے ہے۔"

پس محبت شیخ اور محبت رسول در حقیقت اصل مقصود تعلق باللہ اور تبتل الی اللہ کے لئے تمہید ہے تعلق بالالوہیت ہی کا نام ہے۔

عاشق رسول ﷺ آپ ﷺ کی اتباع کی بدولت اپنے آپ کو ذات رسالت مآب ﷺ میں فنا کر دیتا ہے تو وہ فنافی الرسول ﷺ کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ، رسول ﷺ کے وسیلے سے اس مرد مومن کو اپنے کرم خاص سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ اس کو اقبال مثنوی اسرار خودی میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہست معشوقے نہاں اندر دلت

چشم اگر داری بیا، بنمائیت

عاشقانِ اوز خوباں خوب تر

دل ز عشق او توانا می شود

خاک ہم دوش ثریا می شود

خاک بخد اازفیض او چالاک شد

آمد اندر وجد وبر افلاک شد

در دلِ مسلم مقام مصطفی است

آبروئے ما زنام مصطفے است

مسلمان کے دل میں ہی ایک معشوق پوشیدہ ہے۔ اگر چشم بینا ہو تو اس کے جمال کا مشاہدہ ہو سکتا ہے اور وہ معشوق کیسا ہے ؟ دنیا کے تمام حسینوں سے حسین تر اور محبوب تر۔ اس کے عشق سے دل (بجائے کمزور ہونے کے) توانا ہوتے ہیں اور خاک بھی بلند ہو کر ہم دوش ثریا ہو جاتی ہے۔ اس کے فیض سے خاک عرب پستی ذلت سے اٹھ کر رفعت عزت واقبال کی انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ معشوق "مقام مصطفی ﷺ" ہے جو ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ ہر مسلمان حضور ﷺ کا اتباع کر کے صفات نبوی ﷺ کو اپنے دل میں جذب کرلے تو پھر اس کے حسن وجمال اور قوت ورفعت کا کیا ٹھکانہ ہے۔

محبت رسالت مآب ﷺ میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ انوکھا تھا۔ جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔

ایک یہودی اور ایک منافق کے درمیان جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا کرتا تھا تنازعہ ہو گیا۔ یہودی حق پر تھا۔ اس نے اس بظاہر مسلمان کو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے کہا۔ اس منافق کے دل میں چور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں تو نہ سفارش چلے گی اور نہ رشوت سے کام بنے گا۔ اس لیے اس نے کہا کہ تمہارے عالم کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ یہودی اس بات پر رضامند نہ ہوا۔ چنانچہ چاروناچار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہودی حق پر تھا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہوا۔ منافق کو پسند نہ آیا تو وہ یہودی کو لے کر حضرت صدیق (رض) کے پاس گیا۔ وہاں سے

بھی وہی حکم ملا۔ لیکن اس کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر دل میں سوچا کہ میں بظاہر تو مسلمان ہوں اور یہ یہودی ہے عمر (رض) کے پاس چلیں وہ یقیناً میرے اسلام کا پاس کرتے ہوئے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔ چنانچہ اس نے یہودی کو بھی اس پر رضامند کر لیا۔ جب وہاں پہنچے تو یہودی نے عرض کی کہ پہلے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابو بکر (رض) اس مقدمہ کا فیصلہ میرے حق میں کر چکے ہیں اب یہ مجھے آپ کے پاس لایا ہے۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا۔ رویدکما حتی اخرج الیکما میرے واپس آنے تک ٹھہرو۔ چنانچہ آپ گھر تشریف لے گئے۔ تلوار بے نیام کئے واپس آئے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا ھکذا اقضی علی من لم یرض بقضاء اللہ وقضاء رسول ونزلت الایۃ وقال رسول اللہ انت الفاروق (قرطبی) یعنی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا میں اس کا یوں فیصلہ کیا کرتا ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس دن حضرت عمر (رض) کو الفاروق (حق و باطل میں فرق کرنے والا) کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ (ضیاء القرآن۔ سورۃ النساء آیت: 60)

یعنی جو مصطفیٰ ﷺ کا نہیں وہ ہمارا نہیں۔ انو کھی غایت محبت۔ اللہ! اللہ!

اس شعر میں تلمیح استعمال کی گئی ہے۔

چند اہم نکات؛

1- اگر آپ کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں تو بالکل پریشان نہ ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا ہے اور اسے آسمانی حساب کے مطابق آپ کے لیے آگے بڑھائے گا۔ اگر آپ اچھی طرح آگے بڑھیں گے اور علم تک پہنچیں گے تو کہانی کے آخر میں آپ کو احساس ہو گا کہ آپ کی زندگی کی تمام کہانیوں کے پیچھے ایک بہت بڑی الہامی ذہانت کار فرما تھی!

2- محبت کے سات شہروں سے ایک رات میں سفر کرنا ممکن ہے (یقینا بادشاہ پر دباؤ بہت زیادہ تھا)

3- لوگ اپنی تقدیر اپنے تخیل میں بناتے ہیں۔

اس لیے اپنے خیالات کا خیال رکھیں اور فضول اور جھوٹے خیالات کو اپنے دماغ میں نہ آنے دیں...

4- لوگوں کی روحیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور جو لوگ مشترک فریکوئنسی یا سرکٹ میں ہوں گے ان سے روح یا خیالی یا خوابوں کی دنیا میں رشتہ اور دوستی ہو گی..

مثنوی مولانا—دفتر اوّل—بخش ۴

دَر خواستنِ توفیقِ رِعایَتِ اَدَبْ و خامتِ بے اَدَبی

رعایتِ ادب کی توفیق کی خواہش اور بے ادبی کی مذمت

ادب انسان کی زینت ہے، اس کی وجہ سے آدمی لوگوں میں امتیازی مقام حاصل کرتا ہے، وہ ہر ایک کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے اور سب پر فوقیت لے جاتا ہے، تمام عبادتوں میں ادب کا حکم دیا گیا، ساری عبادتوں میں اگر ادب کو ملحوظ رکھا جائے تو وہ محمود و مقبول ہو جاتی ہیں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد میں ادب کی بڑی اہمیت ہے۔ انسان کی تخلیق کے بعد سب سے پہلا حکم اسے ادب ہی کا ملا، اولادِ آدم کو سب سے پہلا درس ایک دوسرے کیلئے سلامتی طلب کرنے کا دیا گیا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ طُولُهُ سِتُّونَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهُ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلَى أُولَئِكَ النَّفَرِ ... الی آخرہ (بخاری و مسلم) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، آپ ساٹھ گز لمبے تھے، جب انہیں پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ جو فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی ہے انہیں سلام کرو پھر ان کے کلمات کو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

پھر وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا تو آپؑ تشریف لے گئے اور 'السلام علیکم' کہا تو فرشتوں نے جواب میں کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپؑ نے فرمایا انہوں نے 'رحمۃ اللہ' کا اضافہ کیا پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا جو بھی جنت میں جائیگا وہ حضرت آدمؑ کی صورت پر ہوگا اور وہ ساٹھ گز لمبا ہوگا اور اس وقت سے اب تک بنی آدم کی لمبائی میں کمی ہوتی رہی۔ اس حدیث شریف سے واضح ہے کہ ابن آدم کو جو سب سے پہلا حکم ملا وہ ایک دوسرے کی تعظیم و سلامتی کا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سلام کرنا ادب ہی کا ایک حصہ ہے، اسی سے دشمنی کی آگ بجھ جاتی ہے اور آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے، رب تبارک تعالیٰ نے اپنی اہم عبادت نماز کے آخر میں

ایک دوسرے مسلمان پر سلام بھیجنالازم قرار دیا، نماز کی تکمیل سلام پر ہوتی ہے، سلام کرنا گویا ایک دوسرے کا ادب کرنا ہے اور یہ سب سے بہتر عمل ہے،

توفیق: موافقت کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف بلانا، اور وہ چیز جو آخرت میں سعادت کا باعث بنتی ہے، اور رواج میں، یہ اسباب و ساز و سامان کی خواہش اور خواہش کے ساتھ مطابقت ہے۔

آداب: وہ عادات اور عادات جو کسی شخص یا گروہ کے لیے خوشنما ہوں، یا ایسی چیز جو کسی کی عزت و تکریم کے لیے موزوں ہو، اور اس چیز کا مشاہدہ اس لیے کرنا کہ وہ مناسب اور مناسب ہے، لیکن واجب نہیں، اور اچھی صفات جمع کرنا۔

احسان: نرمی اور مہربانی، خدا کی طرف سے ایک ایسا عمل جو بندے کو اطاعت کے قریب رکھتا ہے اور گناہ سے دور رکھتا ہے، لیکن اس طریقے سے جو اسے مجبور نہیں کرتا یا اسے مجبور نہیں کرتا، چاہے وہ کچھ بھی ہو، یہ بندے کو خدا کی اطاعت کا انتخاب کرنے پر مجبور کرتا ہے اور گناہ سے بچو، کامیابی۔

ایرانی طرز

از خدا جوییم توفیقِ اَدَب

بی اَدَبْ مَحْرُوم گشت از لُطفِ رَب

پاکستانی طرز

از خُدا جُو یَم توفیقِ اَدَب

بے اَدَبْ مَحْرُوم ماند از فضلِ رَب

خدا جوئم: اللہ سے خواہاں ہیں۔۔۔ توفیق ادب: ادب کی توفیق۔۔۔۔ گشت از: سے دور۔۔

لطف رب: اللہ رب العزت کے فضل سے

ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں (با ادب بانصیب، بے ادب بے نصیب)، بے ادب خدا کے فضل سے محروم رہا (بے ادب، گنہگار، عالم کی تباہی کا سبب ہوتا ہے)۔ یعنی ہم خدا سے ادب کے لئے دعا گو ہیں کیونکہ بے ادب خدا کے فضل سے محروم رہتا ہے۔

اہل اللہ کی اصطلاح میں ادب کی چار قسمیں ہیں۔" ادب شریعت - ادب خدمت - ادب حق - ادب حقیقت"

جناب رومیؒ نے پچھلے شعر میں بیان کیا ہے کہ وہ بادشاہ ولی اللہ کا بہت احترام کرتا تھا، جیسا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ دوئم جناب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال، یہ شعر کہتا ہے کہ ایک ابتدائی طالب کو اپنی عقل اور عمر کے لحاظ سے با ادب ہونا چاہیے۔

ہم اللہ کریم سے ادب مانگتے ہیں، یہ ادب و شائستگی بہت ضروری ہے! معاشرے کا پڑھایا جانے والا ادب نہیں بلکہ جناب رومیؒ کا ذکر کردہ یہ ادب ایک طرح کی عاجزی اور باطنی اطمینان ہے۔ لیکن معاشرے نے، ہمیں جو شائستگی سکھائی ہے، وہ کیا؟ اور نہ کرنے کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھیں، ہیلو کہیں، پارٹی میں جائیں، میزبان بنیں، تعریفیں پیش کریں، یہ معاشرے کی شائستگی ہے۔ لیکن جناب رومیؒ جس ادب کے بارے میں بات کرتے ہیں وہ عاجزی اور اطمینان کی اندرونی کیفیت ہے، اسی لیے رومیؒ کہتے ہیں:

بد تمیزی صرف بری نہیں ہے۔ بلکہ گویا یوں کہ آگ ہر طرف پھیل گئی ہے۔

جاہل انسان حق کے سامنے جو تکبر کرتا ہے وہ خدا کی بہت سی نعمتوں اور رحمتوں کو منقطع کر دیتا ہے۔

تکبر کا رویہ اختیار کرنا گناہِ کبیرہ ہے، قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر تکبر کی مذمت فرمائی ہے اور تکبر کرنے کو ابلیس لعین، فرعون، قارون، ہامان، ابو لہب اور اس قماش کے دیگر افراد و اقوام کا رویہ قرار دیا ہے۔ اس لیے متکبرین سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ.

(النّحل، 23:16)

بیشک وہ سرکشوں متکبّروں کو پسند نہیں کرتا۔

متکبرین کے انجام کے متعلق فرمایا ہے

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ.

(النّحل، 29:16)

پس تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ، تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو، سو تکبّر کرنے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

اسی طرح تکبر کی مذمت میں رسول اللہ ﷺ کے بھی متعدد ارشادات موجود ہیں جن میں آپ ﷺ نے تکبر کی مذمت فرمائی ہے اور رائی کے دانے کے برابر بھی دل میں تکبر رکھنے والے کو جنت سے محروم قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے متکبرین کا اخروی ٹھکانہ دوزخ کو قرار دیتے ہوئے فرمایا:

عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ الْخُزَاعِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَاعِفٍ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ. أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ، جَوَّاظٍ، مُسْتَكْبِرٍ.

بخاری، الصحیح، کِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ الكِبْرِ، رقم الحدیث: 6071

حضرت حارثہ بن وہب خزاعیؓ نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں جنت والوں کی خبر نہ دوں؟ (تو جنت والے یہ ہیں:) ہر کمزور (اور) تواضع اختیار کرنے والا۔ اگر یہ لوگ (اللہ کا نام لے کر) قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پوری کرتا ہے۔ کیا میں تمہیں دوزخ والوں کی خبر نہ دوں؟ (تو دوزخ والے یہ ہیں:) ہر تند خو، اکڑ کر چلنے والا اور متکبر۔

درج بالا آیات و روایت سے واضح ہوا کہ تکبر کرنا اسلامی تعلیمات کی رو سے گناہِ کبیرہ، مذموم اور لائقِ عتاب فعل ہے۔ تکبر کرنا کسی بھی صورتحال میں جائز نہیں ہے۔

اس شعر کا سابقہ ابیات سے تعلق بالکل واضح ہے۔ مولانا رومؒ نے پچھلے شعر میں کہا تھا کہ بادشاہ حکیم الٰہی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا۔ درحقیقت، جناب رومیؒ نے پچھلے شعر میں ادب و شائستگی کے فوائد کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب تم کسی کامل شخص کی خدمت میں قدم رکھو تو اس کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آؤ اور کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کرو۔ رب العالمین نے سورۃ الحجرات میں اس موضوع کو تفصیل سے سکھایا ہے۔

ادب کے لغوی معنی شائستگی، پسندیدہ طریقۂ اظہار، تہذیب، تمیز اور ہر کام کو صحیح اور دلچسپ انداز سے کرنے کے ہیں۔ اردو و فارسی لغات میں اور بھی کئی معنی اس کے لکھے ہیں۔ لیکن علماء نے اس کی جامع تعریف حسنِ کلام اور تاثیر کلام بتائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بات تہذیب و شائستگی اور موقع و محل کی مناسبت سے کی جائے گی، اس میں حسن بھی ہو گا اور تاثیر بھی ہو گی۔ ہم بچپن میں اساتذہ سے اکثر یہ شعر سنا کرتے تھے:

خموش اے دل بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

یہ شعر تو آج کہاوت کی شکل اختیار کر گیا ہے اور آئے دن سننے میں آتا رہتا ہے:

ادب ہی سے انسان، انسان ہے

ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے

یہ ایک ایسی حقیقت ہے اور آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ کسی بھی اہم کام کو انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ

اپنے اندر وہ صفات پیدا کی جائیں، جن کا ادب کے معنی و مفہوم کے ذیل میں مذکور ہوا ہے۔ تہذیب، شائستگی، تمیز یا حسنِ بیان و تاثیر کلام کے بغیر کسی بڑے کام کو نہیں انجام دیا جا سکتا۔

رسولِ کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سراپا، رشد و تربیت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک ایک ادا میں ہمارے لیے تعلیم و تربیت کے گراں قدر پہلو ہیں اور ان میں ہماری ہدایت و رہنمائی کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ آپؐ کے کسی بھی قول و فعل کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آپؐ نے جو بات کہی یا سنی، یا جس بات سے روکا یا اس کے کرنے کا حکم دیا، یا جس کام کو کرتے دیکھا اور اس کے سلسلے میں خاموشی اختیار کی، یہ سب کی سب باتیں حدیث کے ذیل میں آتی ہیں اور ان میں ادب کی جملہ شرائط اور صفات و خصوصیات بہ درجۂ اتم موجود ہونے کی وجہ سے انہیں ہم ادبِ نبوی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں تمام انسانوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص تعلیم و تربیت کے روشن و تابندہ پہلو موجود ہیں۔ آپؐ کا یہ مقام و مرتبہ ہمارا، آپ کا یا دنیا کے کسی بھی انسان کا دیا ہوا نہیں، بلکہ ساری دنیا کے خالق و مالک اور بادشاہِ حقیقی کا عطا کردہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

(ترجمہ) "اور وہ (محمدؐ) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔" (النجم:4,3)

اس ارشادِ الٰہی سے یہ بات صاف اور واضح ہے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا یا کیا، وہ عین حکم خداوندی یا وحی الٰہی کے مطابق کہا یا کیا۔ (مسند احمد)

صحیح مسلم کی مشہور حدیث ہے:

سعد بن ہشام فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عرض کیا کہ مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کے بارے میں بتایئے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: آپؐ اخلاق و کردار کے لحاظ سے سراپا قرآن تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ زوجۂ رسول تھیں۔ شب و روز کا ساتھ تھا۔ کسی بھی بیوی کے سامنے شوہر کی پوری زندگی آئینے کی طرح صاف، عیاں اور واضح ہوتی ہے۔ شوہر باہر کچھ بھی ہو، لیکن بیوی کے سامنے وہی ہوتا ہے، جو واقعی وہ ہے۔ اس لیے کہ وہاں کسی قسم کی آمیزش نہیں چلتی۔ ایسی صورت میں حضرت عائشہؓ کی یہ گواہی کہ "آپؐ اخلاق و کردار کے اعتبار سے سراپا قرآن تھے" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اس قول کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔" (القلم:4)

ہم جس عہد میں رہ اور بس رہے ہیں، یہ فتنوں کا عہد ہے۔ آئے دن ایسے ایسے نئے نئے فتنے سر ابھارتے رہتے ہیں، جن کا مقصد

صرف اور صرف مسلمانوں کے اندر سے دینی و روحانی قدروں کو نیست و نابود کر کے انہیں ماڈرن یا دوسرے لفظوں میں مغربی دنیا سے آشنا کرانا ہوتا ہے۔ ان تمام فتنوں کے سرے بالعموم مغرب ہی سے ملتے ہیں۔

رسولِ کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی، آپؐ کا ہر قول و عمل اور آپؐ کی زندگی کی ایک ایک ادا شرافت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی اور عظمت و وقار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ ادب و اخلاق میں تو پوری انسانی دنیا میں آپؐ کا کوئی ثانی و ہمسر نہیں مل سکے گا۔ اس لیے کہ آپؐ کو براہِ راست خالقِ کائنات سے تربیت ملی تھی۔ کسی موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔" [جامع الصغیر، جلد: 1، ص 127]

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"مجھے میرے رب نے اس لیے بھیجا ہے کہ میں اخلاقی اچھائیوں کو تمام و کمال تک پہنچاؤں۔" [مؤطا امام مالک، جلد: 2، صفحہ 211]

عام ادب اور نبوی ادب میں بنیادی اور نمایاں فرق یہ ہے کہ عام ادب کو کلی طور پر تعمیری و تربیتی نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں روشن اور تاریک دونوں پہلو کار فرما رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے وہ شعرا جنہیں ہم شاعرِ اسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے ہاں بھی متعدد چیزیں واضح طور پر ایسی ملتی ہیں جنہیں نہ ایمان و اخلاق کے لیے مفید کہا جاسکتا ہے اور نہ عام ذہن و فکر کے انسان کے لیے۔ علامہ اقبال کا نام بیسویں صدی کا ایک نمایاں نام ہے۔ انہیں اسلامی فکر کا علَم بردار تصور کیا جاتا ہے اور اسلامی شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہاں بھی ایسے کچھ اشعار ملتے ہیں جنہیں علما نے کتاب و سنت سے تجاوز قرار دیا ہے۔ جب کہ ادبِ نبوی پورا کا پورا انسانیت کی فلاح و تربیت اور اس کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر فلاح و تربیت اور ہدایت و رہنمائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ آپؐ نے جو کچھ کہا یا کیا، وہی کہا یا کیا' جو اللہ نے آپؐ سے کہلوایا، یا کرایا۔ اللہ کی مرضی و منشا کے بغیر آپؐ نے نہ ایک قدم آگے بڑھایا اور نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیا کہا ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

در حقیقت، رومی نے پچھلے شعر میں شائستگی کے فوائد کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب تم کسی کامل انسان کی خدمت میں قدم رکھو تو اس کے ساتھ نہایت شائستگی سے پیش آؤ اور کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کرو۔

جناب رومیؒ بھی دوسرے صوفیاء کی طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر مقام کے اپنے آداب ہوتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اہل بدن میں جو معیار ہے وہ ظاہری آداب ہے کیونکہ اہل بدن کو پوشیدہ باتوں کا علم نہیں ہوتا۔

ایرانی

بی اَدَب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ھمہ آفاق زَد

پاکستانی

بے اَدَب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ہمہ آفاق زَد

داشت: تھا۔۔۔بد: برا۔۔۔آتش: آگ۔۔۔ہمہ: تمام۔۔۔آفاق: تمام دنیا، تمام عالم

اس شعر میں استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ آتش یعنی آگ و فتنہ فساد پیدا کرنے کا

ترجمہ: بے ادب نے نہ صرف اپنے آپ کو خراب کیا بلکہ ہر طرف گویا فتنہ و فساد کی آگ لگا دی

یقیناً ایک بے ادب شخص نہ صرف خود کو بد صورت بناتا ہے بلکہ پوری دنیا میں آگ لگا دیتا ہے اور اس کی بد تمیزی دوسروں کو ضرر و نقصان پہنچاتی ہے۔ در حقیقت دوسروں کو دو نقصان پہنچیں گے، ایک نقصان چاپلوس لوگوں کو پہنچے گا جو کسی شخص کی بد تمیزی کو دیکھتے ہیں اور نہ صرف اس کی بد تمیزی سے باز نہیں آتے بلکہ اس کے ساتھ مسکراہٹ اور کھلے دل سے پیش آتے ہیں اور اس کے ساتھ بیٹھنا بھی۔

ایسے لوگ حقیقت میں بھی گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ نافرمان اور بے ادب کا گناہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے، اس آیت کے مطابق: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰىۙ(۳۸)

۔(وہ بات یہ ہے) کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے وہ مضمون بیان فرمایا ہے جو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی کتاب اور حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے صحیفوں میں ذکر فرمایا گیا تھا، چنانچہ ارشاد فرمایا: وہ بات یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور کوئی دوسرے کے گناہ پر پکڑا نہیں جائے گا۔ اس میں اس شخص کے قول کو باطل کر دیا گیا ہے جو ولید بن مغیرہ کے عذاب کا ذمہ دار بنا تھا اور اس کے گناہ اپنے ذمے لینے کو کہتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے زمانے سے پہلے لوگ آدمی کو دوسرے کے گناہ پر بھی پکڑ لیتے تھے، اگر کسی نے کسی کو قتل کیا ہوتا تو اس قاتل کی بجائے اس کے بیٹے یا بھائی یا بیوی یا غلام کو قتل کر دیتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کا زمانہ آیا تو آپ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ان تک اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پہنچایا کہ کوئی کسی کے گناہوں کے بوجھ کی وجہ سے پکڑا نہیں جائے گا۔(خازن، النجم، تحت الآیۃ: ۳۸، ۴ / ۱۹۹)

دوسرا نقصان عام لوگوں پر ہوگا اور بے ادب کیسے ادبی اور تکبر بھی ان پر برے اثرات مرتب کرے گا جس طرح قحط اور ہیضے سے اچھے اور برے لوگوں کو پہنچنے والے نقصانات ہوتے ہیں۔ بلاشبہ بدکاروں کے لیے آفتیں اور آفات وہی ہیں جو عذاب ہیں اور نیک لوگوں کے لیے وہی رحمت اور برکت ہیں۔

"اپنے آپ کو آفت سے دور رکھو، کیونکہ اس میں صرف ظالم ہی نہیں مبتلا ہوتے، (اگر ظالموں کو نہ روکا گیا تو خشک اور گیلی مخلوق اپنے گناہوں کی سزا کے طور پر جل جائے گی) اور جان لو کہ خدا کے پاس سخت عذاب اور سخت عذاب ہے۔"

چنانچہ ارشاد فرمایا:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ, فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ, فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ, وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ۔ (صحيح مسلم رقم الحديث(49))

(جو تم میں سے برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ بدل دے۔ پس اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان کے ساتھ پھر اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنے دل کے ساتھ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے) کا مطلب میری سمجھ میں اس سے بہتر اور کوئی نہیں آتا کہ اس حدیث میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔

1۔ مسلمانوں کی باعتبار قوت وضعف کے کتنی قسمیں ہیں۔

2۔ یہ کہ ان قسموں میں سے ہر ایک کا فرض کیا ہے؟

پس فرمایا کہ مسلمانوں کی باعتبار قوت وضعف کے تین قسمیں ہیں ایک اقوی جیسے با اختیار حکام جو اپنے پورے اختیار سے منکر کو مٹا سکتے ہیں ان کا فرض یہ ہے کہ وہ منکر کو اپنے ہاتھ سے مٹا چھوڑیں۔ دوم اوسط جیسے وہ علماء جو منکر کو اپنے ہاتھ سے تو نہیں مٹا سکتے مگر صرف زبان سے منع کر سکتے ہیں پس ان کا فرض یہ ہے کہ صرف زبان سے مناسب طریقے سے منع کر دیں۔

ادعُ إِلىٰ سَبيلِ رَبِّكَ بِالحِكمَةِ وَالمَوعِظَةِ الحَسَنَةِ ...﴿١٢٥﴾... سورة النحل

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا)

سوم اضعف جیسے وہ لوگ جو ہاتھ سے مٹانا تو درکنار زبان سے بھی منع نہیں کر سکتے ان کا فرض یہ ہے کہ صرف دل سے اس منکر کو برا جانیں وبس۔

لا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفسًا إِلّا وُسعَها ...﴿٢٨٦﴾... سورة البقرة

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ اس حدیث میں قوت اور ضعف سے ایمانی قوت اور ضعف مراد نہیں ہے بلکہ تغیر منکر کے متعلق قوت اور ضعف مراد ہے حتی کہ اگر کوئی شخص جو ایک درجے کا ایمان رکھتا ہو۔ جب تک وہ قسم سوم کے افراد سے ہے اس کا فرض وہی ہے جو قسم دوم سے قسم اول کی طرف ترقی کر جائے تو اس کا فرض ہو جائے گا اگرچہ ایمانی حالت اس کی بدستور ہو۔

ایک اور جگہ حدیث مبارکہ میں یوں بیان ہوا

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا أَبُو الْأَحْوَصِ، حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، أَظُنُّهُ عَنِ ابْنِ جَرِيرٍ، عَنْ جَرِيرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: "مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُونُ فِي قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي يَقْدِرُونَ عَلَى أَنْ يُغَيِّرُوا عَلَيْهِ فَلَا يُغَيِّرُوا إِلَّا أَصَابَهُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَمُوتُوا

جریر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ”: جو آدمی کسی ایسی قوم میں ہو جس میں گناہ کے کام کئے جاتے ہوں اور وہ اسے روکنے پر قدرت رکھتا ہو اور نہ روکے تو اللہ اسے مرنے سے پہلے ضرور کسی نہ کسی عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے“۔

تخريج الحديث : تفرد به أبو داود، (تحفة الأشراف: 3242)، وقد أخرجه: سنن ابن ماجه/الفتن 20 (4009) (حسن)

ابن عربی کہتے ہیں: "ادب مطلوبہ خصلتوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے۔" عزالدین کاشانی کہتے ہیں: "ادب، قول و فعل کا پہلا اخلاق اور تزکیہ ہے، اور اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں: دلوں کے افعال، جنہیں نیت کہتے ہیں، اور صورت کے افعال، جنہیں اعمال، اخلاق اور ارادے کہتے ہیں۔ باطن ان سے ہوتے ہیں اور قول و فعل کا تعلق صورت سے ہوتا ہے، اس لیے کامل وہ ہے جس کا ظاہر و باطن سجا ہوا ہو۔"

مولاناؒ ادب کو ہر حال میں نعمت الٰہی سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

بی ادب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ھمہ آفاق زد

بے ادبی نہ صرف بری ہے۔

بلکہ تمام افقوں میں آگ بھڑک اٹھی۔

اللہ آپ کو اچھے اخلاق سے نوازے۔

اور بے ادبی سے ہونے والے نقصانات سے، رب کریم جل شانہ کے فضل کی محرومی سے بچائے۔ آمین!

ایرانی

مایِدہ از آسمان دَر می رَسید
بی شِری وبَیع وبی گفت وشنید

پاکستانی

مائِدہ از آسمان دَر میرَسید
بی شِرا و بَیع وبے گفت وشنِید

مائدہ: خوان۔۔۔ از آسماں: آسمان سے۔۔۔۔ میر سید: آتا ہے۔۔۔بی شرا: خریداری کے ساتھ۔۔۔ بیع: فروخت۔۔۔بے گفت: بغیر کہے۔۔۔شنید: سنا

ترجمہ: (من وسلویٰ) کاخوان آسمان سے بلاخرید وفروخت اور بغیر کہے سننے کے آیا کرتا تھا۔

اس شعر میں میں جناب مولانا رومؒ فرماتے ہیں: انسان کی خدا کی طرف توجہ اور بندگی اور ادب کے فرض کو نبھانے کی استطاعت اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے۔ بندگی کے آداب کی پابندی نہ کرنے والا خدا کے فضل سے محروم رہے گا لیکن اگر فضل میسر ہو تو یہی فضل بندے کو اطاعت کے قریب اور گناہ سے دور کردے گا۔

جب فرعون دریائے نیل میں غَرق ہوگیاتو اللہ عَزّوجَلّ نے بنی اِسرائیل کو حکم فرمایا کہ "قومِ عَمالِقہ" سے جنگ کرکے "ملکِ شام" کو آزاد کروائیں، چونکہ یہ قوم نہایت ظالم اور جنگ کی ماہِر تھی، اس لئے اُن چھ لاکھ بنی اِسرائیلیوں نے جنگ سے اِنکار کردیا۔ اِس نافرمانی کی یہ سزا ملی کہ وہ 40 سال تک 27 میل (Miles) کے رقبے پر مشتمل ایک میدان میں بھٹکتے رہے، یہ لوگ سامان اُٹھا کر سارا دن چلنے کے بعد رات میں کسی جگہ ٹھہر جاتے اور جب صبح ہوتی تو وہیں موجود ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ اِس جگہ کو "میدانِ تِیہ" (یعنی بھٹکتے پھرنے کی جگہ) کہا جاتا ہے۔ حضرتِ سیّدُنا موسیٰ عَلَیْہِ السّلام بھی اِسی میدان میں تشریف

فرماتھے۔ میدانِ تِیہ میں ہونے والی عطائیں ☆حضرتِ سیّدُنا موسیٰ عَلَیْہِ السّلام کی دُعا سے بنی اِسرائیل کے کھانے کے لئے ہفتہ کے دن کے علاوہ روزانہ آسمان سے دو کھانے یعنی" مَنّ "اور "سَلْوٰی "نازل ہوتے۔ ☆"کوہِ طُور" کا ایک سفید پتّھر اُن کے پاس تھا، جب پانی کی حاجت ہوتی تو آپ عَلَیْہِ السّلام اُس پر اپنی "جنتی لاٹھی "مارتے اور بنی اسرائیل کے 12 قبیلوں کے لئے 12 چشمے جاری ہو جاتے۔ ☆دُھوپ سے بچاؤ کے لئے ایک بہت بڑا سفید پتلا بادَل سارا دن اُن پر سایہ کرتا۔ ☆اندھیری رات میں میدان کے بیچ میں ایک نورانی سُتون اُترتا جس کی روشنی میں کام کاج کرتے۔ ☆اُن کے بال (Hairs) اور ناخن (Nails) بڑے نہیں ہوتے تھے۔

اس شعر میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ ان کو اللہ کے فضل و کرم سے آسمان سے دو چیزیں بلا محنت و مشقت اترتی تھیں۔

"مَنّ" و "سَلْوٰی" کیا تھا؟

"مَنّ" ایک میٹھی چیز تھی جو فَجْر کے وَقْت سے سورج نکلنے تک ہر شخص کے لئے تقریباً 4 کلو اُترتی تھی، جب بنی اِسرائیل یہ میٹھی چیز کھا کھا کر اُکتا گئے تو اُنہوں نے آپ عَلَیْہِ السّلام کی بارگاہ میں شِکایت کی، جس کے بعد اُن کے لئے "سَلْوٰی" اُتارا گیا، جو ایک بُھنا ہوا چھوٹا پرندہ تھا۔ **"مَنّ" و "سَلْوٰی"** قبض کرتا تھا نہ دَسْت لاتا تھا، رنگ، خوشبو اور ذائقے میں بے مثال تھا، ہر طبیعت و مِزاج کو مُوافِق آتا تھا۔ نافرمانی کی سزا آپ عَلَیْہِ السّلام کا حکم تھا کہ کھانا روز کا روز کھالیا جائے، سِوائے جُمُعَہ کے کل کے لئے بچا کر نہ رکھا جائے کہ ہفتہ کو **"مَنّ" و "سَلْوٰی"** نازِل نہیں ہوتا تھا، لیکن اُن لوگوں نے کھانا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا، جس کی نُحُوست یہ ہوئی کہ ذخیرہ کیا ہوا کھانا سڑ گیا اور **"مَنّ" و "سَلْوٰی"** اُترنا بھی بند ہو گیا۔ (ماخوذ از عجائب القراٰن، ص24۔31۔33، صراط الجنان، ج1، ص128-

2، ص414، تفسیر بغوی، ج1، ص43، تفسیر قرطبی، ج1، ص331، تفسیر نعیمی، ج1، ص348۔352-ج9، ص273۔277)

فرمانِ مصطفٰے صلَّی اللہ تعالٰی علیہ واٰلہٖ وسلَّم

اگر بنی اِسرائیل نہ ہوتے تو کبھی کھانا خراب ہوتا نہ گوشت سڑتا۔ (مسلم، ص596، حدیث:3651)

لیکن موسیٰ علیہ السلام کی قوم آسمانی کھانے سے مطمئن نہ ہوئی اور خدا سے بے ادبی سے لہسن اور مسور کی دال مانگی اور خدا نے ان سے وہ نعمت چھین لی۔ جناب رومیؒ نے قوم موسیٰؑ کی طرف سے تمام ناشکرے لوگوں کی طرف توجہ دلائی اور کہا: ادب اور لالچ کو ترک نہ کرنے کی وجہ سے ہم نے آسمانی خوراک کھو دی اور ہمیں کھیتی باڑی اور بیلچہ اور کیچ کے استعمال کی تکلیف کو قبول کرنا پڑا۔ یعنی خدا کی طرف توجہ اور ادب کو ترک کر کے ہمیں مادی اور حیوانی زندگی کی خدمت پر مجبور کر دیا گیا۔

پتا چلا کہ بے ادبی سے نعمتیں چھن جایا کرتی ہیں۔ اللہ کریم ہمیں ادب کی توفیق عنایت فرمائے آمین!

ایرانی

در میانِ قومِ موسی چند کَس

بی اَدَب گفتند کو سیر و عَدَس؟

پاکستانی

در میانِ قومِ موسی چند کَس

بے اَدَب گفتند کو سیر و عَدَس؟

چند کس: کتنے لوگ، چند اں۔۔۔ سیر: لہسن۔۔۔ عدس: مسور

ترجمہ: (لیکن) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے چند اشخاص بے ادبانہ بول پڑے کہ (اس کو ان نعمت میں) لہسن اور مسور کہاں ہیں؟

مطلب یہ کہ وہ لوگ اللہ جل شانہ کی عطا کردہ آسمانی نعمت پر شکر گذار ہونے کی بجائے بے ادبی کے ساتھ لہسن اور مسور کی خواہش کرنے لگے۔ یہ بات ان کی فطرت کی پستی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے کچھ بے ادب لوگوں نے کہا

تو دال اور مسور کہاں ہیں؟۔یعنی انہوں نے بے ادبی سے کہا۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر 61 میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَاؕ-قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌؕ-اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْؕ-وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُۗ-وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّؕ-ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۠(۶۱)

ترجمہ:

اور جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو گا تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا

{لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ: ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے۔} بعض لوگوں کی طبیعت میں کم ہمتی، نالائقی اور بیچ پن ہوتا ہے۔ آپ انہیں پکڑ کر بھی اوپر کرنا چاہیں تو وہ کم تر اور نیچے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً زندگی کی لذتوں اور نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ بلند ہمت اور بہتر سے بہتر کے طالب ہی خالق و مخلوق کے ہاں پسندیدہ ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل پر نعمتوں کے ذکر کے بعد یہاں سے ان کی کم ہمتی اور نالائقی و نافرمانی کے کچھ واقعات بیان فرمائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک **واقعہ یہ ہے:** بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے مطالبہ کیا کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، آپ دعا کریں کہ ہمیں زمین کی ترکاریاں اور دالیں وغیرہ ملیں۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے انہیں سمجھایا کہ تمہیں اتنا اچھا کھانا بغیر محنت کے مل رہا ہے، کیا اس کی جگہ ادنیٰ قسم کا کھانا لینا چاہتے ہو؟ لیکن جب وہ نہ مانے تو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ اِس پر حکم ہوا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا یہی مطالبہ ہے تو پھر مصر جاؤ وہاں تمہیں وہ چیزیں ملیں گی جن کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔ مصر سے مراد یا تو ملکِ مصر یا مطلقاً کوئی بھی شہر ہے۔

بڑوں سے نسبت رکھنے والے کو کیا کرنا چاہئے

یہاں اس بات کا خیال رکھیں کہ ساگ ککڑی وغیرہ جو چیزیں بنی اسرائیل نے مانگیں ان کا مطالبہ گناہ نہ تھا لیکن ’’مَن وسلوٰی‘‘ جیسی نعمت بے محنت چھوڑ کر ان کی طرف مائل ہونا پست خیالی ہے۔ ہمیشہ ان لوگوں کا میلانِ طبع پستی ہی کی طرف رہا اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَیۡہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ایسے جلیل القدر، بلند ہمت انبیاء علیہم السلام کے بعد تو بنی اسرائیل کے بچپن اور کم حوصلگی کا پورا ظہور ہوا۔ جب بڑوں سے نسبت ہو تو دل و دماغ اور سوچ بھی بڑی بنانی چاہئے اور مسلمانوں کو تو بنی اسرائیل سے زیادہ اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ان کی نسبت سب سے بڑی ہے۔ اور سب سے بڑی چیز ادب ہے۔ بڑی نسبت بڑا ادب مانگتی ہے۔ پھر اگر ادب نہ ہو تو:

{ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ: ان پر ذلت وغربت مسلط کردی گئی۔} یعنی یہودیوں پر ان کے گھٹیا کردار کی وجہ سے ذلت و غربت مسلط کر دی گئی۔ ان پر غضبِ الٰہی کی صورت یہ ہوئی کہ انبیاء عَلَیۡہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور صلحاء کی بدولت جو رتبے انہیں حاصل ہوئے تھے وہ ان سے محروم ہو گئے، اس غضب کا باعث صرف یہی نہیں تھا کہ انہوں نے آسمانی غذاؤں کے بدلے زمینی پیداوار کی خواہش کی یا حضرت موسیٰ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے زمانے میں اُسی طرح کی اور خطائیں کیں بلکہ عہدِ نبوت سے دور ہونے اور زمانہ دراز گزرنے سے ان کی دینی صلاحیتیں باطل ہو گئیں، اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے حضرت زکریا، حضرت یحیٰ اور حضرت شعیا عَلَیۡہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو شہید کیا اور ایسا ناحق قتل کیا کہ اس کی وجہ خود یہ قاتل بھی نہیں بتا سکتے، انہوں نے نافرمانی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ الغرض ان کے عظیم جرائم اور قبیح ترین افعال کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی، ان پر ذلت و غربت مسلط کی گئی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہوئے۔

بنی اسرائیل کی ذلت و غربت سے مسلمان بھی نصیحت حاصل کریں

بنی اسرائیل بلند مراتب پر فائز ہونے کے بعد جن وجوہات کی بنا پر ذلت و غربت کی گہری کھائی میں گرے، کاش ان وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے عبرت اور نصیحت کے لئے ایک مرتبہ مسلمان بھی اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیں اور اپنے ماضی و حال کا مشاہدہ کریں کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے احکامات کی پیروی کو اپنا سب سے اہم مقصد بنائے رکھا اور اس راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو جڑ سے اکھاڑ کر چھوڑا تب تک دنیا کے کونے کونے میں ان

کے نام کا ڈنکا بجتا رہا اور جب سے انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے احکامات سے نافرمانی اور سرکشی والا راستہ اختیار کیا، بے ادبی پر اتر آئے تب سے دنیا بھر میں جو ذلت ورسوائی مسلمانوں کی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

ایرانی

مُنقَطِع شد خوان ونان از آسمان

ماند رَنجِ زَرُع و بیل و داس َمان

پاکستانی

مُنقَطِع شد خوان ونان از آسمان

ماند رَنجِ زَرُع و بیل و داسمان

منقطع: بند۔۔۔ترک: بند، مسدود۔۔۔زرع: کھیتی باڑی، کاشتکاری۔۔۔ بیل: پھاوڑا۔ داسماں: درانتی

ترجمہ: اس بے باکانہ سوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوان اور کھانا آسمان سے آنا بند ہو گیا آخر میں کاشتکاری، پھاوڑے اور درانتی کے ذریعے کی مشقت باقی رہ گئی۔

وہ آسمانی روٹی اور دستر خوان کاٹ دیا گیا، اور ہمارے پاس کھیتی باڑی، ہل چلانے اور کاٹنے کی محنت باقی رہ گئی۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ آسمان سے ان پر رحمتوں کی بارش ہوئی لیکن نعمتوں کی بے ادبی اور گستاخی کی وجہ سے وہ کھیتی باڑی، بیلچوں اور کانٹوں کی تکالیف برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے جب پیاز، دال، لہسن اور دیگر سبزیاں مانگیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت کی کہ گاؤں میں داخل ہو کر جو چیزیں چاہیں کاشت کریں۔

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ان لالچی وبے ادب لوگوں کی وجہ سے ان لوگوں پر رحمت کے دروازے بند ہو گئے اور آسمان سے کوئی

خوان نہ اترا۔

نان اور خواں سے مراد من، سلویٰ اور مائدہ ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ مائدہ رک گیا اور اس کے بعد کسی پر نازل نہیں ہوا۔
آخری آیت کا موضوع بھی پچھلے موضوعات کی تصدیق کرتا ہے:

اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ‌ؕ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡکَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ

کسی شہر میں جابسو، تو وہ چیز تمہیں مل جائے گی جو تم نے طلب کی ہے، اور ذلت اور پست ہمتی ان پر مسلط کر دی گئی۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔

انھیں آزادی اور فراغت حاصل تھی، جس میں وہ علم حاصل کر سکتے تھے اور جہاد کی تیاری کر کے عزت واقتدار حاصل کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور ان چیزوں کا تقاضا کرنے لگے جن کے وہ زمانۂ غلامی میں عادی تھے اور جو آزاد فضا میں ملنے والے من وسلویٰ کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھیں۔ پھر اس کے لیے کھیتی باڑی میں مشغول ہونا پڑتا تھا، جو ہمیشہ فاتح قومیں مفتوح قوموں سے کرواتی ہیں اور جس میں مکمل مشغولیت کا نتیجہ ذلت ومسکنت ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]"اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو۔'

ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے۔

حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ خَالِدٍ الدِّمَشْقِيُّ ,حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَبُو أَيُّوب ,عَنْ ابْنِ أَبِي مَالِكٍ ,عَنْ أَبِيهِ , عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ ,عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ ,قَالَ: أَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ,فَقَالَ:"يَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِينَ ,خَمْسٌ إِذَا ابْتُلِيتُمْ بِهِنَّ ,وَأَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ تُدْرِكُوهُنَّ ,لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِي قَوْمٍ قَطُّ ,حَتَّى يُعْلِنُوا بِهَا إِلَّا فَشَا فِيهِمُ الطَّاعُونُ وَالْأَوْجَاعُ ,الَّتِي لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِي أَسْلَافِهِمُ الَّذِينَ مَضَوْا ,وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ,إِلَّا أُخِذُوا بِالسِّنِينَ ,وَشِدَّةِ الْمَئُونَةِ ,وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ ,وَلَمْ يَمْنَعُوا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ

إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ, وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوا وَلَمْ يَنْقُضُوا عَهْدَ اللَّهِ, وَعَهْدَ رَسُولِهِ إِلَّا سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ , فَأَخَذُوا بَعْضَ مَا فِي أَيْدِيهِمْ وَمَا لَمْ تَحْكُمْ أَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ, وَيَتَخَيَّرُوا مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَّا جَعَلَ اللَّهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ ."

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا" :مہاجرین کی جماعت! پانچ باتیں ہیں جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ تم اس میں مبتلا ہو،)وہ پانچ باتیں یہ ہیں (پہلی یہ کہ جب کسی قوم میں علانیہ فحش)فسق و فجور اور زناکاری (ہونے لگ جائے، تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں جو ان سے پہلے کے لوگوں میں نہ تھیں، دوسری یہ کہ جب لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگ جاتے ہیں تو وہ قحط، معاشی تنگی اور اپنے حکمرانوں کی زیادتی کا شکار ہو جاتے ہیں، تیسری یہ کہ جب لوگ اپنے مالوں کی زکاۃ ادا نہیں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش کو روک دیتا ہے، اور اگر زمین پر چوپائے نہ ہوتے تو آسمان سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ گرتا، چوتھی یہ کہ جب لوگ اللہ اور اس کے رسول کے عہد و پیمان کو توڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ان کے علاوہ لوگوں میں سے کسی دشمن کو مسلط کر دیتا ہے، وہ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے چھین لیتا ہے، پانچویں یہ کہ جب ان کے حکمراں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، اور اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کو اختیار نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ ان میں پھوٹ اور اختلاف ڈال دیتا ہے"۔

تخریج الحدیث» : تفرد بہ ابن ماجہ، (تحفۃ الأشراف: 7332، ومصباح الزجاجۃ: 1414) (حسن)

ماضی کی امتوں پر بھی معاصی اور گناہوں اور رب کی نافرمانیوں اور بے ادبیوں کی نتیجے میں بارش روک دی گی تھی ارشاد باری عزوجل ہے:"اور ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کی کمی میں پکڑ لیا تاکہ وہ نصیحت مانیں"

(الأعراف:130)

بن محنت کے روزی روٹی اللہ جل شانہ کی طرف سے خاص فضل و رحمت تھی جو بنی اسرائیل پر کی جا رہی تھی لیکن ان کی بے ادبی کی وجہ سے موقوف ہو گئی۔ اللہ کی بارگاہ کے آداب ہیں۔ اور یہی اصول اس کے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء۔ اگر ان کو ملحوظ رکھا جائے تو

رحمتِ حق "بہا" نمی جوید

رحمتِ حق "بہانہ" می جوید

مولانا رومؒ اس سے انسانی نفسیات کا ایک بین اصول بیان کرتے ہیں کہ

با ادب اور با محبت، باعقیدت، بانصیب

عشق اِن کے بعد ہے اے دِل! ذرا لے دَم ابھی

ہجر کے قدموں میں جھکتا جارہا ہے یہ وصال

یار نہ جائے مرا، ساون! ذرا چھم چھم ابھی (علی سرمد)

ایرانی

باز، عیسی چون شَفاعَت کرد حَق

خوان فرستاد و غَنیمَت بَر طَبَق

پاکستانی

باز، عیسیٰؑ چون شَفاعَت کرد حَق

خواں فِرستاد و غَنِیمَت بَر طَبَق

باز: حرف عطف، کھلا۔۔۔شفاعت: سفارش۔۔۔۔ کرد: کی۔۔۔ حق: اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے۔۔۔ خواں: کھانا۔۔۔ فرستاد: بھیجا گیا۔۔۔ طبق: مطابقت

ترجمہ: پھر عیسیٰؑ نے شفاعت کی تو اس کے مطابق اللہ جل شانہ نے خوان بھیجا اور مفت ادا کیا گیا۔

جب عیسیٰ نے شفاعت کی ایک طویل مدت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت اور دعا سے مائدہ نازل ہوا، یہاں خوان اور مائدہ کا استعمال صحیح ہے، کیونکہ کھانا اکثر خوان پر رکھا جاتا تھا۔

تمام انبیاء علیہم السلام ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے الگ کرنے اور آسمانی دستر خوان پر بٹھانے اور ہم سے غربت کا خوف دور کرنے کے لیے آتے ہیں۔ حدیث مبارکہ میں بیان ہوا

حضرت عمار بن یاسر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آسمان سے جو خوان نازل کیا گیا تھا' اس میں روٹیاں اور گوشت تھا' ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس میں نہ خیانت کریں اور نہ اس کو کل کے لیے بچا کر رکھیں۔ انہوں نے خیانت بھی کی اور کل کے لیے بچا کر بھی رکھا' سو ان کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ (سنن ترمذی' ج ٥' رقم الحدیث: ٣٠٧٦)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ٣١٠ ھ روایت کرتے ہیں:

بنو عجل کے ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عمار بن یاسر (رض) کے پہلو میں نماز پڑھی۔ انہوں نے نماز سے فارغ ہو کر مجھ سے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ بنو اسرائیل کے خوان کا کیا معاملہ ہوا تھا؟ میں نے نہیں۔ انہوں نے کہا بنو اسرائیل نے حضرت عیسیٰ ابن مریم سے سوال کیا کہ ان کے اوپر کھانے کا ایسا خوان نازل کیا جائے جس سے وہ کھانا کھاتے رہیں اور وہ کبھی ختم نہ ہو' ان سے کہا گیا کہ وہ خوان تمہارے پاس رہے گا بشرطیکہ تم اس میں سے کچھ چھپا کر نہ رکھو اور خیانت نہ کرو اور اس میں سے کوئی چیز نہ اٹھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم نے ایسا کیا تم نے ایسا کیا تو میں تم کو ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہو گا۔ پھر ایک دن بھی نہیں گذرا حتیٰ کہ انہوں نے اس میں سے چھپایا اور اٹھالیا اور خیانت کی' سو ان کو ایسا عذاب دیا گیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا تھا اور اے عرب والو! تم لوگ اونٹوں اور بکریوں کو چراتے تھے' پھر اللہ نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا' جس کے حسب اور نسب کو تم جانتے اور پہچانتے تھے' تمہارے نبی کی زبان سے تم کو اطلاع دی کہ عنقریب تم پورے عرب پر غلبہ پاؤ گے' اور تم کو سونے اور چاندی کے جمع کرنے سے منع کیا اور بخدا تم اب دن رات سونا اور چاندی جمع کر رہے ہو' اور دردناک عذاب کے مستحق ہو رہے ہو۔

انبیاء علیہم السلام ہر طریقہ سے دکھاتے ہیں کہ آپ کا دن آسمان سے آئے گا اور آپ کو مستقبل کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔

اگر آپ ابھی اس خوف سے خریدتے ہیں کہ شاید یہ مہنگا ہو جائے تو آپ شیطان کے راستے پر چل رہے ہیں...

مستقبل کے خوف اور اضطراب کی منصوبہ بندی اانبیاء علیہم السلام کے راستے پر مبنی نہیں ہے...

سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے جو طریقہ آپ کو مستقبل سے ڈراتا ہے وہ شیطان کا طریقہ ہے!

اور جان لیں کہ کائنات برسوں سے زندہ ہے اور ہم اس دنیا کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہیں اور ماحولیاتی نظام اتنا سمارٹ ہے کہ یہ جانتا ہے کہ ہمیں کیسے بچانا ہے یا ہمیں کیسے تباہ کرنا ہے یا ہمیں کیسے ترقی دینا ہے!

تمام تاریخ میں موجود ماحولیاتی نظام نے، ہماری طرح، بہت زیادہ کاشت کی ہے یا اسے زمین پر رکھا ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ انسانی انواع کو کیسے بچانا ہے...

خدا پرست انسانوں کا پورا بھروسہ خدا پر ہے اور وہ جانتے ہیں کہ الٰہی راستہ حقیقی سلامتی کا راستہ ہے...

ایرانی

مائدہ از آسمان شد عائدہ

چونکہ گفت اَنزِل عَلَینَا مَائِدہ

پاکستانی

مائدہ از آسمان شد عائدہ

چونکہ گفت اَنزِل عَلَینَا مَائِدہ

مائدہ: خوان۔۔۔ عائدہ: دوبارہ آنے والی چیز۔۔۔ چونکہ: چونکہ۔۔۔ گفت: فرمایا۔۔۔ انزل علینا مائدہ: ہم پر مائدہ نازل فرما

اس میں تجنیس لاحق ہے۔ مائدہ اور عائدہ میں

(دو متجانس الفاظ میں سے ایک ایسے حرف کا مختلف ہونا جو قریب المخرج یا متحد المخرج نہ ہو. مثلاً نور اور نار , رام اور روم وغیرہ).

ترجمہ: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ بار الہا! ہم پر خوان نازل فرما تو آسمان سے مائدہ آنے لگا۔

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے مائدہ ایک بار پھر آسمان سے لوٹ آیا۔ عربی محاورہ کا مفہوم ہے کہ اے رب ہم پر مائدہ نازل فرما۔ ارشاد فرمایا

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۱۱۴ مائدہ)

عیسیٰ بن مریمؑ نے عرض کی: اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان اُتار دے جو ہمارے لئے اور ہمارے بعد میں آنے والوں کے لئے عید اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو جائے اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

حواریوں نے جب خوان کی درخواست کی تھی تو کہا تھا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ نے سچ کہا تھا' انہوں نے اس خوان سے دنیاوی غرض 'یعنی کھانے کو پہلے ذکر کیا اور اخروی غرض 'یعنی ایمان کی پختگی کو بعد میں ذکر کیا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب دعا کی تو اخروی غرض کو پہلے ذکر کیا اور وہ ہے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہونا اور اللہ کی طرف سے نشانی ہونا اور دنیاوی غرض کا بعد میں ذکر کیا اور وہ ہے کہ میں رزق عطا فرما اور اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی کہ تو سب سے بہتر رزق عطا فرمانے والا ہے' یہ فرق ہے نبی کی نظر میں اور عام آدمی کی نظر میں۔

عید کے دن اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے عبادت کی جاتی ہے' حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نظر پہلے اللہ کی عبادت کی طرف تھی' پھر فرمایا کہ وہ تیری طرف سے نشانی ہو جائے' یعنی لوگ نزول مائدہ میں غور و فکر کر کے اس کے نازل کرنے والے کی طرف رسائی حاصل کریں اور نظر اور استدلال سے خدا کو پہچانیں' یوں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی نظر ایک بلند مقام سے' اس سے بھی بلند تر ک مقام پر پہنچی۔ پھر جب فرمایا ہمیں رزق عطا فرما تو نفس کے حصہ کی طرف نظر کی اور خالق سے مخلوق کی طرف نزول کیا اور جب کہا تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے تو نزول کے بعد پھر خالق کی طرف رجوع کیا' اور یوں اس آیت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے دو مرتبہ خلق سے خالق اور غیر اللہ سے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ اس دعا کے اول میں بھی ان کی نظر اللہ کی طرف تھی

اور آخر میں بھی ان کی نظر اللہ کی طرف تھی اور اہل اللہ کا یہی حال ہوتا ہے وہ ہر حال میں اللہ کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں بھی اس بلند مقام سے حظ وافر عطا فرما! (آمین)

ایرانی

بازگُستاخانُ ادب بُگذاشتند

چون گدایانُ زَلّہ ھابَر داشتند

پاکستانی

بازگُستاخاں ادب بُگذاشتند

چون گدایاں زَلّہابَر داشتند

بازگستاخاں: دوبارہ گستاخی۔۔ بگذاشتند: عرض کرنے لگے۔۔۔ گدایاں: بھکاری۔۔۔ زلہ: بچا کھچا کھانا۔۔۔ برداشتند: وہ لے گئے۔

ترجمہ: لیکن گستاخوں نے پھر ادب ترک کیا اور بھکاریوں کی طرح بچا کھچا کھانا اٹھا کر لے گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کے لیے آسمانی خوراک آسمان سے آئی، لیکن وہ بھکاریوں کی طرح بھیک مانگ رہے تھے!

ہمارے ہاں کچھ جگہیں جو لوگوں کو مفت کھانا دیتی ہیں وہ لوگوں میں احساس کمتری کا اظہار کرنے کے لیے ایسا کرتی ہیں، اور احساس کمتری سے لوگوں کو آسانی کھانا نہیں ملتا...

درحقیقت وہ ان جگہوں پر لوگوں کو کھانا نہیں دیتے بلکہ ان کی تذلیل کرتے ہیں۔

براہ کرم، اگر آپ کہیں سے کچھ لینے جارہے ہیں، تو عزت کے ساتھ وصول کریں...

تو جناب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات پر ناراض ہوئے کہ میں تمہارے لیے اتنا اچھا کھانا لایا ہوں، تو تم کیوں بھوکوں کی طرح اپنے تھیلوں میں دستر خوان کے نیچے چھپا رہے ہو؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم کھانا کیوں ذخیرہ کرتے ہیں؟

کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ختم ہو جائے گا اور ہم تک کچھ نہیں پہنچے گا، اور یہ سوچ اور طرز عمل غربت کا سبب بنتا ہے۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نعمت ہمیشہ موجود ہے اور دوبارہ آئے گی، اور اگر ہم جنون والوں کی طرح برتاؤ نہ کریں تو یہ دن ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس شعر میں مولانا رومؒ ایک معاشرتی اصول و قانون بیان فرمارہے ہیں جو ایک نظریاتی تعلیم بھی ہے۔

انسان کا مقصد حیات آخرت کی کامیابی ہے، اسی کے لیے محنت اور جدوجہد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، جو شخص ایمان اور عمل صالح کے ساتھ دینا سے رخصت ہوا وہ کامیاب ہے؛ اس لیے کہ اسے جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی راحتیں میسر ہوں گی، جن سے بڑھ کر راحت اور سعادت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ آخرت کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے اور اس کی ساری سرگرمیاں عذاب قبر سے نجات اور رضائے الٰہی کے لیے ہوں، جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے، قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے خوفناک عذاب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں الجھ کر رہ جائیں اور دنیوی عیش و عشرت میں ڈوب کر آخرت فراموش کر دی جائے، جو بھی ایسا کرتا ہے یقیناوہ خسارے میں ہے، دنیا پر اعتماد اور للچائی ہوئی نظر رکھنے والوں کو خدا نے خبردار کیا ہے:

{يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللهِ الْغَرُوْرُ} (فاطر:۵)

ترجمہ: ”لوگو! اللہ کا وعدہ یقینا برحق ہے؛ لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے“

مرنے کے بعد خدا کے سامنے پیشی اور جواب دہی کا ہمیشہ استحضار رہنا چاہیے، اس سے دنیا کی محبت کم ہوگی اور شیاطین کی گرفت سے محفوظ رہنا آسان ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی آسائشوں اور یہاں کے وسائل کو اپنی حیات کا مقصد اور ساری

سرگرمیوں کا مرکز بنالیا جائے، جب کوئی انسان دنیوی عہدوں اور دنیوی مال و دولت کو اپنی توجہ و دلچسپی کا مرکز بنالیتا ہے اور اسے ایک مشن کے طور پر حاصل کرنا شروع کرتا ہے تو خدا اور اس کے رسول ﷺ سے خود بخود اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑجاتی ہے، پھر وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے؛ اس لیے کہ اس کی رگوں میں دنیا کی لذت بیٹھنے کی وجہ سے خدا کا خوف ختم ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی کو خدا کا خوف اور کسی گرفت کا احساس نہ ہو تو اسے گناہوں اور بے حیائیوں سے کوئی طاقت نہیں بچاسکتی، آج جتنے جرائم اور بدکاریاں ہورہی ہیں، تمام کے پیچھے یہی دنیا کی محبت کارفرما نظر آئے گی، قتل و قتال، لڑائی جھگڑے، گالی گلوج، چوری اور ڈاکہ زنی، قطع رحمی، عداوت اور دشمنی وغیرہ کی بنیاد کو کریدا جائے اور ان کی تہوں کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کی اساس دنیا کی محبت ہی نظر آئے گی، اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" حُبُّ الدنیا رأسُ کلِّ خطیئۃٍ "(کنز العمال، حدیث نمبر: ۶۱۱۴)

"دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے"

بہرحال قرآن کی مختلف آیات اور متعدد ارشادات رسول ﷺ میں دنیا کی مذمت اور اس کے طلب گار کی قباحت بیان کی گئی ہے؛ مگر سوال یہ ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے دنیوی اسباب اور مال و دولت کے بغیر گذارہ بھی نہیں ہوسکتا، ہر انسان کے ساتھ کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے اور دیگر ضرویات زندگی لگی ہوی ہیں، پھر ان کی تکمیل کس طرح ہوگی؟ کس معاش اور دنیوی محنت و جدوجہد کے بغیر انسانی حاجتوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا؛ اس لیے کہ شریعت اسلامی نے دوسروں کے سہارے زندگی گذارنے اور دوسروں پر بوجھ بننے سے منع کیا ہے، مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اپنے گذر بسر کے لیے خود اپنے ہاتھ سے کمائیں اور محنت کریں، کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں؛ چنانچہ حدیث میں ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

" ایک بار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ آئے اور انھوں نے آپ ﷺ سے کچھ سوال کیا، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: تمہارے گھر میں کچھ سامان بھی ہے؟ صحابی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! صرف دو چیزیں ہیں، ایک ٹاٹ کا بچھونا ہے، جس کو ہم اوڑھتے بھی ہیں اور بچھاتے بھی ہیں اور ایک پانی کا پیالہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آو، وہ انصاری صحابی رضی اللہ عنہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوگئے، آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں دو درہم میں نیلام کردیا اور دونوں درہم ان کے حوالے کرتے ہوے فرمایا: جاؤ ایک درہم سے تو کچھ کھانے پینے کا سامان خرید کر گھر والوں کو دے آؤ اور ایک درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ، وہ کلہاڑی لے کر آئے تو آپ ﷺ نے کلہاڑی میں اپنے مبارک ہاتھوں سے دستہ لگایا اور فرمایا: جاؤ، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاؤ اور بازار میں بیچو، پندرہ دن کے بعد ہمارے پاس آکر روداد سنانا

وپندرہ دن کے بعد صحابی رضی اللہ عنہ جب حاضر ہوئے تو انہوں نے دس درہم جمع کر لیے تھے، آپ ﷺ خوش ہوئے اور فرمایا یہ محنت کی کمائی تمہارے لیے اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم لوگوں سے مانگتے پھرو اور قیامت کے روز تمہارے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو"(صحیح البخاری)

بھیک مانگنا اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا باعث ذلت ہے، اس سے حد درجہ احتیاط کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کے پاس ٹاٹ اور ایک پیالہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا؛ لیکن کمانے کی قوت تھی؛ اس لیے آپ ﷺ ایسی ترکیب نکالی وہ اپنے ہاتھوں خود اپنی ضروریات کی تکمیل کر لے اور آئندہ اس طرح طاقت رکھنے والے افراد کسی کے سامنے بھیک مانگنے کی جرأت نہ کریں، خواہ ان کے پاس ظاہری اسباب کچھ بھی نہ ہو، پھر بھی اپنے ہاتھوں سے کمانے اور محنت کرنے کی عادت ڈالیں اور خود اپنے کسب معاش سے گذر بسر کریں، اس طرح یہ دنیا میں ذلت وخواری سے محفوظ رہیں گے اور قیامت کے دن بھی رسوائی سے انھیں نجات ملے گی؛ اس لیے کہ قیامت کے دن بھیک مانگنے والوں کے چہروں پر گوشت نہیں ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بغیر انسان کا جینا مشکل ہے؛ بلکہ دنیوی تنگی کے سبب موجودہ دور میں ایمانی تقاضوں کی تکمیل بھی مشکل ہو گئی ہے، مشہور بزرگ اور معروف محدث حضرت سفیان ثوریؒ نے اپنے تجربات کی روشنی میں بہت ہی معقول اور صحیح بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

" اب سے پہلے دور نبوت وخلافت میں مال ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا؛ لیکن ہمارے اس زمانہ میں مال مؤمن کی ڈھال ہے اور فرمایا کہ اگر ہمارے پاس آج یہ درہم ودینار نہ ہوتے تو بادشاہ وامراء ہم کو اپنا رومال بنا لیتے (یعنی باطل اغراض میں استعمال کرتے) آج جس شخص کے پاس یہ درہم ودینار ہوں تو انھیں اچھی حالت میں رکھے؛ کیوں کہ یہ ایسا زمانہ کہ اگر آدمی محتاج وتنگدست ہو جائے تو سب سے پہلے وہ اپنا دین بیچ دے گا"(طبرانی)

مال ودولت ایسی چیز ہے جس کے لالچ میں انسان اپنے ایمان کو بیچ ڈالتا ہے، اپنے مسلک کو تبدیل کر لیتا ہے، دلوں میں نفاق اور ذہنوں میں کدورت بیٹھ جاتی ہے، ایک شخص مالی محتاج ہونے کی وجہ سے ارباب دولت وثروت کو اسلام کے پیغام حق سے واقف نہیں کرا سکتا، ان کی ناراضگی اور ہدایا وتحائف کے بند کر دینے کے اندیشے ہوتے ہیں، عہدے داروں سے وہ آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کر سکتا کہ بہت سے خطرات دل میں پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک شخص کے دل میں دوسروں کے مال ودولت کا حرص پیدا ہو اور دنیوی عہدوں سے مرعوب ہوتا ہو تو وہ دعوت وتبلیغ کا کام کیا انجام دے سکتا ہے؛ بلکہ ایسے افراد کا دین پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، آج کل قادیانیت وعیسائیت کی تبلیغ دیہات اور دور افتادہ گاؤں میں صرف پیسوں کی بنیاد پر کامیاب ہے، وہ کمزور اور ضرورت مند مسلمانوں کو مختلف چیزوں کا لالچ دیتے ہیں، بلاسودی قرضے فراہم کرتے ہیں، راحتوں کے سامان مہیا کیے

جاتے ہیں؛اس لیے بہت سے کمزور عقائد رکھنے والے مسلمان اپنا ایمان تبدیل کر لیتے ہیں اور وہ ایمان کی دولت عظمی سے محروم ہو کر کفر اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؛اس لیے شریعت اسلامی نے اپنے پیروکاروں کو حلال پیسے حاصل کرنے اور اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کی نہ صرف اجازت؛بلکہ بعض جگہوں میں اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے،سورہ جمعہ میں ارشاد باری ہے:

{فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ} (الجمعۃ:۱۰)

ترجمہ:"پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو،شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

{وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللهُ الدَّارَ الآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللهُ إِلَيْكَ} (القصص:۷۷)

ترجمہ:"جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر،احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے"

مذکورہ دونوں آیات میں دنیا کے حصول اور رزق کی تلاش کرنے کی صاف طور پر ہدایت دی گئی ہے؛البتہ خدا کے حقوق یاد رکھنے اور اس کے ذکر کی بھی تلقین کی گئی؛تاکہ لوگ دنیا کمانے میں کہیں اپنے رب اور حقیقی وابدی دولت وسعادت سے محروم نہ ہو جائیں،قرآن نے مسلمانوں کو جو دعائیں سکھائی ہیں۔

ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کے بارے حدیث مبارک میں یوں بیان آیا ہے۔

حَدَّثَنَا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ، وَزُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ، وَعَبْدُ بْنُ حُمَيْدٍ، قَالُوا: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ يُونُسَ، حَدَّثَنَا عِكْرِمَةُ بْنُ عَمَّارٍ، حَدَّثَنَا شَدَّادٌ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا أُمَامَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ أَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَيْرٌ لَكَ، وَأَنْ تُمْسِكَهُ شَرٌّ لَكَ، وَلَا تُلَامُ عَلَى كَفَافٍ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى." (صحیح مسلم :2388)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :اے آدم کے بیٹے!تو جو چیز ضرورت سے زیادہ ہو اس کو خرچ کرتا رہ یہ بہتر ہے تیرے لیے اور اگر اس کو بھی روک رکھے جیسے ضرورت کے موافق کو روکتا ہے تو برائی ہے تیرے حق میں اور تجھ پر ملامت نہیں ضروری خرچ کے موافق رکھنے میں اور صدقہ پہلے اس کو دے جس کا خرچہ تیرے ذمہ ہو اور اوپر کا ہاتھ بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے۔"

مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ نے تمہیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اس سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت و حاجت کا خیال رکھو اور ضرورت سے زائد مال حاجتمندوں اور مستحقین کے درمیان تقسیم کردو کیونکہ جمع خوری کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ صحیح نہیں،

جمع خوری سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں،

اور آخرت میں بخل کا جو انجام ہے وہ بالکل واضح ہے۔

ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :ابن آدم! اگر تو اپنی حاجت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا تو یہ تیرے لیے بہتر ہو گا، اور اگر تو اسے روک رکھے گا تو یہ تیرے لیے برا ہو گا، اور بقدر کفاف خرچ کرنے میں تیری ملامت نہیں کی جائے گی اور صدقہ و خیرات دیتے وقت ان لوگوں سے شروع کر جن کی کفالت تیرے ذمہ ہے، اور اوپر والا (دینے والا) (ہاتھ نیچے والے ہاتھ) مانگنے والے (سے بہتر ہے "۔ (سنن ترمذي/كتاب الزهد/حديث: 2343)

تو مولانا رومؒ اس شعر میں قوم بنی اسرائیل کی خرابی اور امت مسلمہ کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی

لابِہ کردہ عیسی ایشان راکہ این

دایم است وکَم نگردد از زمین

پاکستانی

کرد عیسیٰؑ لابہ ایشاں راکہ ایں

دائم ست وکم نگردد از زمیں

لابہ: نرمی سے کچھ کہنا۔۔۔ ایشاں: وہ۔۔۔ دائم: ہمیشہ۔۔۔ کم نگردد: کم نہیں ہو گا

ترجمہ: حضرت عیسیٰؑ نے ان کو نرمی سے کہا کہ یہ خوان ہمیشہ آنے والا ہے اور زمین سے کم نہ ہوگا۔

کیونکہ رزق عطا کرنا اللہ جل شانہ نے اپنے لطف کرم کے ذمہ لیا ہوا ہے۔ جیسا قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶ ہود)

اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو اور وہ ہر ایک کے ٹھکانے اور سپرد کئے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف بیان کرنے والی کتاب میں موجود ہے۔

" دَآبَّةٍ " کا معنی ہے ہر وہ جانور جو زمین پر رینگ کر چلتا ہو، عُرف میں چوپائے کو " دَآبَّةٍ " کہتے ہیں جبکہ آیت میں اس سے مُطلَقاً جاندار مراد ہے لہٰذا انسان اور تمام حیوانات اس میں داخل ہیں۔ (خازن، ہود، تحت الآیۃ: ۶، ۲ / ۳۴۰)

کسی جاندار کو رزق دینا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں

علامہ احمد صاوی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں "اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ جانداروں کو رزق دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس پر کوئی چیز واجب ہو بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ جانداروں کو رزق دینا اور ان کی کفالت کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لازم فرمالیا ہے اور (یہ اس کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ) وہ اس کے خلاف نہیں فرماتا۔ رزق کی ذمہ داری لینے کو "عَلَی" کے ساتھ اس لئے بیان فرمایا تاکہ بندے کا اپنے رب عَزَّوَجَلَّ پر توکل مضبوط ہو اور اگر وہ (رزق حاصل کرنے کے) اَسباب اختیار کرے تو ان پر بھروسہ نہ کر بیٹھے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی پر اپنا اعتماد اور بھروسہ رکھے، اسباب صرف اس لئے اختیار کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فارغ رہنے والے بندے کو پسند نہیں فرماتا۔ زمین کے جانداروں کا بطورِ خاص اس لئے ذکر فرمایا کہ یہی غذاؤں کے محتاج ہیں جبکہ آسمانی جاندار جیسے فرشتے اور حورِعین، یہ اس رزق کے محتاج نہیں بلکہ ان کی غذا تسبیح و تہلیل ہے۔ (صاوی، ہود، تحت الآیۃ: ۶، ۳ / ۹۰۰، ۹۰۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں "مُسْتَقَرُّ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بندہ دن یا رات گزارتا ہے اور مُسْتَوْدَعُ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد دفن کیا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے

ہیں "مُسْتَقَرّ" سے مراد ماؤں کے رحم اور مُسْتَوْدَع سے مراد وہ جگہ ہے جہاں موت آئے گی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ مُسْتَقَرّ سے مراد جنت یا دوزخ ہے اور مُسْتَوْدَع سے مراد قبر ہے۔ (خازن، ہود، تحت الآیۃ: ۶، ۲ / ۳۴۱-۳۴۰)

{كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ: سب کچھ ایک صاف بیان کرنے والی کتاب میں موجود ہے۔} یعنی اس آیت میں جو جانداروں، ان کے رزق، ان کے ٹھہرنے اور سپرد کئے جانے کی جگہ کا ذکر ہوا یہ سب بیان کرنے والی کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ لوحِ محفوظ میں سب جانداروں کے رزق، ان کی جگہوں، ان کے زمانے اور اَحوال کی تفصیل مذکور ہے۔ (صاوی، ہود، تحت الآیۃ: ۶، ۳ / ۹۰۱)

ہر چیز کو لوحِ محفوظ میں لکھنے کی حکمت

خیال رہے کہ ہر چیز کا لوحِ محفوظ میں لکھا جانا اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بھول جانے کا خطرہ تھا لہٰذا لکھ لیا، کیونکہ بھول جانا اللہ تعالیٰ کیلئے محال ہے، بلکہ اس لئے لکھا ہے تاکہ لوحِ محفوظ دیکھنے والے بندے اس پر اطلاع پائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوحِ محفوظ پر نظر رکھتے ہیں انہیں بھی ہر ایک کے مُسْتَقَرّ اور مُسْتَوْدَع کی خبر ہے کیونکہ یہ سب لوحِ محفوظ میں تحریر ہے اور لوحِ محفوظ ان کے علم میں ہے۔ لوحِ محفوظ کو **مُبِیْن** اس لئے فرمایا گیا کہ وہ خاص بندوں پر عُلومِ غَیْبِیَّہ بیان کر دیتی ہے۔

بد قسمتی سے ہم اس معاشی صورتحال کو منظم اور منصوبہ بند طریقے سے پہنچ چکے ہیں، اور ہم غربت میں گر چکے ہیں، اور یہ سب کچھ خدا سے ہماری دوری، الٰہی اور روحانی اعتقادات کی کمی اور اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں کو ان کے ہاتھوں پر رکھا ہوا ہے جو دوسرے ہیں۔

ہمیں نعمتوں کا علم نہ تھا اور ہم ناشکری کرتے رہے جس کے نتیجے میں ہم لالچی اور غریب تر ہوتے چلے گئے۔

عیسیٰؑ کی کہانی اور موسیٰؑ کی کہانی تاریخ میں ہمیشہ دہرائی جاتی ہے اور پوری تاریخ میں کافر لوگ ہمیشہ رہے ہیں اور رہے ہیں...

تو جناب رومیؒ نے یہاں رزق کی حقیقت اور اس کی بار یابی کا معاشی حل بتا دیا۔

ایرانی

بَد گُمانی کردن و حرِص آوَری

کُفر باشد پیشِ خوانِ مِهتَری

پاکستانی

بَد گُمانی کردن و حرِص آوَری

کُفر باشد پیشِ خوانِ مِہتَری

بد گمانی: برا خیال، سوء ظن۔۔۔ کردن: کرنا۔۔۔ حرص: لالچ۔۔۔ کفر باشد: ناشکری ہے۔۔۔ خوان مہتری: اللہ کے خوان یا رزق

ترجمہ: اللہ کے خوان پر بدنیتی اور خیانت کرنا اور حرص سے پیش آنا ناشکری ہے۔

اس شعر میں دراصل مولانا رومؒ نے ایک علم Anthropology (علم الانسان) کو زیر بحث لائے ہیں۔ اور انسان کے کردار کے تین پہلوؤں کو عیاں کیا ہے۔

بد گمانی

بد گمانی عربی کے لفظ 'الظن' کا ترجمہ ہے۔ عربی کا 'ظن' اچھے اور برے، دونوں معنی میں آتا ہے۔ جس طرح اردو میں گمان دونوں معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بد گمانی سے روکا گیا ہے، وہاں 'سوء الظن' کے بجائے صرف 'ظن' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ. (الحجرات ۴۹:۱۲)

"اے ایمان والو، کثرت گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔"

اصل حکم

اوپر مذکور آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن مجید نے محض بدگمانی سے نہیں روکا، بلکہ اس نے کثرت گمان سے روکا ہے۔ یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بات سے روکا ہے کہ ہم خواہ مخواہ دوسروں کے بارے میں ظنون تراشتے رہیں۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات بالکل متعین ہے کہ یہاں جن گمانوں کی بات ہو رہی ہے، وہ لوگوں ہی سے متعلق ہیں۔ یعنی اخلاقی دائرے میں آنے والے گمان۔ انھی کی کثرت بری چیز ہے۔ چونکہ یہ اخلاقیات سے متعلق ہے۔ اس لیے اخلاقیات میں ہر خرابی اسلام کے نزدیک برائی ہے، اور وہ ایک قابل مواخذہ جرم ہے۔

گویا لوگوں کے بارے میں ہمیں اصل میں ان ہی کے عمل و نظریہ کی بنیاد پر رائے بنانی چاہیے۔ ان کے بارے میں ہماری رائے نہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہونی چاہیے اور نہ ہمارے بے بنیاد خیالات پر، جو بلا دلیل ہمارے دل میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ہمارے وہ خیالات جن کی بنیاد محض ہمارا گمان ہو، درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔

گمانوں کی کثرت سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں خطا کا امکان ہے۔ اگر ہمارا گمان صحیح بھی ہے تب بھی اس میں یہ خرابی ضرور موجود ہے کہ وہ ہمارا گمان ہے، کسی ٹھوس شاہد و دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ بندۂ مومن کو اپنی آرا کو حتی الامکان ٹھوس چیزوں پر مبنی کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

"اور جس چیز کا تمھیں علم نہیں، اس کے درپے نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز سے پرسش ہونی ہے۔"

قرآن مجید کی رو سے اس ضمن میں اصلاً مطلوب یہی ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں کسی قسم کی ایسی آرا نہ بنائیں، جن کی ہمارے پاس ٹھوس بنیاد (علم) موجود نہ ہو۔

حرص و ہوس کا مفہوم ہے دوسرے کے مال و جائداد کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا اور اس کو کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہنا۔ قرآن نے اس حرص و ہوس کے لیے شُح کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ قرآن وضاحت کرتا ہے:

وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿الحشر: ۹﴾

"جو بخل و حرص سے بچالیا جائے وہی لوگ کامیاب ہیں"

حرص اور شح دونوں مترادف لفظ ہیں۔ لغت کے اندر دونوں معنی لیے گئے ہیں بخل کرنا، حرص کرنا۔ اس سے پہلے آیت کے اندر اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو یہ تاکیداً کہہ رہا ہے:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿التغابن:۱۵﴾

"اور جان لو کہ تمھاری دولت اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہے اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے"

پھر آگے کہا:

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ 'تم سے جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو'

پھر کہا:

وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿التغابن:۱۶﴾

"سنو اور اطاعت کرو اور اپنی بھلائی کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل و حرص سے بچالیا جائے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

ان دونوں آیتوں کے اندر اللہ نے مومنوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ مال و اولاد کے فتنے میں نہ پڑیں، بلکہ ان کی محبت پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اس کی اطاعت کو ترجیح دیں اللہ نے جو مال تمھیں دے رکھا ہے اس میں اس کی راہ میں خرچ کرو، اسی میں تمھارے لیے خیر و فلاح ہے۔

اسی طرح حدیث کے اندر شح کا لفظ استعمال کرکے اس کی قباحتوں اور شناعتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے:

وعن جابرٍ أن رسول الله قال اتقوا الشح فان الشح اهلك هن كان قبلكم حملهم على أن سفكوا دماءهم واستحلوا محارمهم ﴿مسلم كتاب البر والصلة﴾

"حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بخل و حرص سے بچو اس لیے کہ اس شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا ہے اسی شح نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپس میں خوں ریزی کریں اور انھوں نے حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھ لیا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حرص ایک ہلاکت خیز بیماری ہے جو تمام نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے کہ انسان جب اس جیسی مہلک بیماری سے بچ جائے گا تو زیادہ سے زیادہ اسے نیکیاں کرنے کا موقع ملے گا۔ آخرت کی زندگی کو سنوارنے کا موقع ملے گا۔ چونکہ حریص آدمی ہمیشہ مال و جائیداد کو جمع کرنے کی دوڑ میں لگا رہتا ہے، اسی میں اپنا وقت ضائع و برباد کرتا ہے تو ایسا شخص ضرور بضرور اللہ کی یاد سے غافل ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العالمین نے سورہ تکاثر کے اندر کیا ہی عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ تمہیں کثرت مال کی خواہش نے اللہ کی یاد سے اس کی عبادت و ریاضت سے اس کی تسبیح و تحلیل سے غافل کر دیا پوری سورت کے اندر ایسے حریص و لالچی شخص کی مذمت کی گئی ہے اور اسے جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا ہے کہ اگر تم اسی دنیوی عیش و عشرت کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں لگے رہے اور اللہ کی یاد سے غافل رہے تو یقیناً تمہیں آگ کا مزہ چکھنا پڑے گا کیونکہ تم سے ان کثیر نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

خیانت

دماغ میں دہری سوچ رکھنے یا دل میں دوڑخا پن رکھنے کا نام ہے۔ بدنیتی میں تصنع اور دھوکے جیسے عناصر شامل ہو سکتے ہیں۔ اس میں دوسروں کا بالارادہ دھوکا یا خود سے دھوکا جیسی قباحتیں شامل ہو سکتی ہیں۔

ایک بدنیت شخص لازماً کسی طرح کے برے عمل کا اپنے دل میں ارادہ کرتا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن عموماً ایک دوسرے کی ضد ہوا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص کسی طرح کے دھوکے اور تلبیس شخصی کا ہمیشہ اپنے دل میں ارادہ کرکے رکھتا ہے۔ بدنیت لوگوں میں خوف خدا یا تقوے کا عنصر یا تو ایک سرے سے ہوتا ہی نہیں یا پھر اس کی حیثیت محض اوپری دکھاوے سے زیادہ کچھ اور نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں اخلاص قلب بھی مفقود ہوتا ہے۔ ظاہری کام کے پیچھے دنیوی نام و نمود کی طلب ہوتی ہے۔

اور خیانت کرنا خود ایک لعنت ہے 'اجازتِ شرعیہ کے بغیر کسی کی امانت میں تصرف کرنا خیانت کہلاتا ہے۔"

آیت مبارکہ:

اللہ عَزَّوَجَلَّ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے: (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ(۲۷))(پ۹، الانفال: ۲۷) ترجمۂ کنزالایمان:"اے ایمان والو اللہ و رسول سے دغا نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں دانستہ خیانت۔"

حدیث مبارکہ، خیانت منافقت کی علامت ہے

نور کے پیکر، تمام نبیوں کے سرور صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم کا ارشادِ حقیقت بنیاد ہے: "تین باتیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ منافق ہو گا اگرچہ نماز، روزہ کا پابند ہی کیوں نہ ہو: (۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (۳) جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔" حدیث مبارکہ میں آیا

حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، وَقُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ، وَاللَّفْظُ لِيَحْيَى، قَالَا: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُو سُهَيْلٍ نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي عَامِرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ." **(صحيح مسلم: 211)**

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :منافق کی نشانیاں تین ہیں، جب بات کرے تو جھوٹی، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، جب امانت لے تو اس میں خیانت کرے۔

خیانت کا حکم

ہر مسلمان پر امانت داری واجب اور خیانت کرنا حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے۔

خیانت کے چھ اسباب و علاج

(1)... خیانت کا پہلا سبب بدنیتی ہے۔ جس طرح اچھی نیت اخلاق و کردار کے لیے شفاء اور اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اسی طرح بدنیتی کا زہر بندے کے اعمال کو بے ثمر بلکہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنی نیت کو درست رکھے اور اپنا یہ ذہن بنائے کہ "اللہ عَزَّوَجَلَّ میری حسن نیت اور ایمان داری کی بدولت دنیا و میں کامیابی عطا فرمانے پر قادر ہے لہٰذا خیانت کرکے دنیوی و اُخروی نقصان کرنے کا کیا فائدہ؟"

(2)... خیانت کا دوسرا سبب دھوکہ دینے کی عادت ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنے ذہن میں دھوکہ دہی کے نقصانات کو پیش نظر رکھے کہ دھوکہ دینا ایک نہایت ہی قبیح اور برا عمل ہے، دھوکہ دینے والے سے رسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے براءت کا اظہار فرمایاہے، دھوکہ دینا مومن کی صفت نہیں ہے، دھوکے سے جہاں وقار مجروح ہوتا ہے وہیں لوگوں کا اعتماد بھی ختم ہوجاتا ہے لہٰذا احترامِ مسلم کا ہر دم خیال رکھے اور یہ مدنی ذہن بنائے کہ وقتی نفع حاصل کرنے کے لیے دائمی نقصان مول لینا یقیناً عقل مندی نہیں ہے؟"

(3)... خیانت کا تیسرا سبب تَوَکُّلْ عَلَی اللہ کی کمی ہے۔ کیوں کہ بندہ اپنے کمزور اعتقاد کی بناء پر یہ سمجھتا ہے کہ خیانت کا راستہ اختیار کرنے میں ہی میری کامیابی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اللہ عَزَّوَجَلَّ پر کامل بھروسہ رکھے اور یہ مدنی ذہن بنائے کہ "دنیا میں جو بھی راستہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نافرمانی کا سبب بنتا ہو اس پر چل کر مجھے کبھی بھی کامیابی نہیں مل سکتی، لہٰذا میں اس خیانت والے راستے کو چھوڑ کر دیانت والے راستے کو اپناؤں گا۔"

(4)... خیانت کا چوتھا سبب نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اس کے مکر و فریب سے آگاہی حاصل کرے، اس کی ناجائز خواہشات کو ترک کرنے کا ذہن بنائے اور اس کے لیے کوشش بھی کرے تاکہ خیانت جیسے کبیرہ گناہ سے بچ سکے۔

(5)... خیانت کا پانچواں سبب مسلمانوں کو نقصان کا دینے کی عادت ہے، یہ سبب جن دیگر باطنی امراض کا باعث بنتا ہے ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرے اور مسلمانوں کی بدخواہی کے عذابات کو پیش نظر رکھے۔

(6)... خیانت کا چھٹا سبب بری صحبت ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے ارد گرد کے ماحول کی ہر خامی وخوبی کو قبول کرلیتا ہے جس کا اثر اس کے ذاتی اخلاق و کردار پر ہوتا ہے خاص طور پر بداطوار افراد کی بددیانتی سے انسان بہت جلد متاثر ہوجاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ نیک ،دیانت دار اور خوفِ خدا رکھنے والوں کی صحبت اختیار کرے تاکہ اس مہلک مرض کے ساتھ ساتھ دیگر اخلاقی برائیوں سے بھی اپنے آپ کو بچا سکے۔

خدائے احکم الحاکمین جل جلالہ کی بے شمار نعمتیں ساری کائنات کے ذرے ذرے پر بارش کے قطروں سے زیادہ درختوں کے پتوں سے زیادہ، دنیا بھر کے پانی کے قطروں سے زیادہ، ریت کے ذروں سے بڑھ کر ہر لحہ ہر گھڑی بن مانگے طوفانی بارشوں سے تیز برس رہی ہیں۔

جن کو شمار کرنا انسان کے بس کی بات نہیں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۸)

اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔(پ ۱۴، النحل ۱۸)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۠ (۱۵۲)

میرا حق مانو (شکر ادا کرو) اور میری ناشکری نہ کرو۔(پ ۲۔ البقرہ ۱۵۲)

اور ایک مقام پر اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: لَىٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (۷)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے سنا دیا کہ اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو تو میرا عذاب سخت ہے (پ۱۳، ابراہیم ۰۷)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنا واجب ہے۔(تفسیر خزائن العرفان)

بد نیتی حسن نیت کی طرح افراد پر ہی نہیں بلکہ اس کا اطلاق حکومتوں اور ادارہ جات پر بھی ہوتا ہے، اگرچہ کہ یہ ادارے بذات خود غیر جان دار ہیں اور ان کی کار فرمائی افراد کی محرکات پر مبنی ہوتی ہے۔

تو مولانا رومؒ یہ فرمارہے کہ کہ مندرجہ بالا ایسی بیماریاں ہیں کہ جن کی وجہ سے رحمت خداوندی رک جاتی ہے۔

ایرانی

زان گدارویانِ نادیدہ زِ آز

آن دَرِ رَحمَت بَر ایشان شُد فَراز

زاں گدا رُویانِ نادیدہ زِ آز
آن دَرِ رَحمَت بَر ایشان شُد فَراز

زاں: ز تعلیل کے لئے۔۔ اں: وہ۔۔۔ نادیدہ: لالچ، بغیر دیکھے۔۔۔ آن: وہ۔۔ درِ رحمت: رحمت کا دروازہ۔۔۔ بر: پر۔۔۔ ایشاں: وہ، ان پر۔۔۔ فراز: یہ اسمائے اضداد میں سے ہے اسے بمعنی کھلنا اور بند ہونا دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عام معنی، بلندی۔ یہاں اٹھالیا گیا۔

درِ رحمت۔۔۔ * استعارہ * ہے اور اس سے مراد خوان ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

ترجمہ: ان کے لالچ اور ہٹ دھرمی کے نتیجے میں خدا کی رحمت کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

معنی بر مطلب: (آخر) ان فقیر صورت حرص کے بھوکوں کی وجہ سے وہ رحمت کا دروازہ ان پر بند ہو گیا۔

اس شعر میں مولانا رومؒ نے استعارہ استعمال کیا ہے کہ خوان جو کہ بنی اسرائیل کو وہبی طور پر عطا کیا گیا تھا پر ان کی حرص و لالچ کی وجہ سے اس کا آنا بند ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ لالچ کیا ہے؟

کسی چیز میں حد درجہ دلچسپی کی وجہ سے نفس کا اس کی جانب راغب ہونا طمع یعنی لالچ کہلاتا ہے۔

اللہ عَزَّوَجَلَّ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے) :وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)١٦) ((پ۲۸،الحشر:۹)" اور جو اپنے نفس کے لالچ سے بچایا گیا تو وہی کامیاب ہیں۔

حضرت سیِّدُنا عبداللہ بن عَمرو رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہ سے روایت ہے کہ سرکارِ مدینہ، راحت قلب وسینہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”لالچ سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی قومیں لالچ کی وجہ سے ہلاک ہوئیں ، لالچ نے انہیں بُخل پر آمادہ کیا تو وہ بُخل کرنے لگے اور جب قطع رحمی کا خیال دلایا تو انہوں نے قطع رحمی کی اور جب گناہ کا حکم دیا تو وہ گناہ میں پڑ گئے۔

مال و دولت کی ایسی طمع)لالچ (جس کا کوئی دینی فائدہ نہ ہو ، یا ایسی اچھی نیت نہ ہو جو لالچ ختم کر دے، نہایت ہی قبیح ، گناہوں کی طرف رغبت دلانے والی اور ہلاکت میں ڈالنے والی بیماری ہے، مال و دولت کے لالچ میں پھنسنے والا شخص ناکام ونامراد اور جو اِن کے مکروہ جال سے بچ گیا وہی کامیاب وکامران ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ اگر آدمی کے پاس دو میدان بھر سونا ہو جائے تو پھر بھی وہ تیسرے میدان کو طلب کرے گا کہ وہ بھی سونے سے بھر جائے اور ابن آدم کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی اور جو شخص اس سے توبہ کرے اللہ تعالٰی اس کی توبہ کو قبول فرمالے گا۔(مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں مال کی حرص اور عمر کی حرص۔(بخاری شریف)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرتبے کے لحاظ سے قیامت کے روز سب انسانوں سے بدتر وہ بندہ ہو گا جس نے دوسرے کی دنیا کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرلی۔(ابن ماجہ)

لالچ کا علاج

اس قلبی مرض کا علاج صبر و قناعت کی معجون سے کرنا چاہئے یعنی جو کچھ خدا کی طرف سے بندے کو مل جائے اس پر راضی ہو کر خدا کا شکر بجالائے اور اس عقیدہ پر جم جائے کہ انسان جب ماں کے پیٹ میں رہتا ہے اس وقت فرشتہ خدا کے حکم سے انسان کی چار چیزیں لکھ دیتا ہے انسان کی عمر، انسان کی روزی، انسان کی خوش نصیبی، انسان کی بد نصیبی یہی انسان کا نوشتۂ تقدیر ہے۔لاکھ سرمایہ ہو مگر وہی ملے گا جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اس کے بعد یہ سمجھ کر کہ خدا کی رضا اور اس کی عطا پر راضی ہو جاؤ اور یہ کہہ کر لالچ کے قلعے کو گرادو کہ جو میری تقدیر میں تھا وہ مجھے ملا اور جو میری تقدیر میں ہو گا وہ آئندہ ملے گا اور اگر کچھ کمی کی وجہ سے قلب میں تکلیف ہو اور نفس ادھر ادھر لپکے تو صبر کر کے کھینچ لو اس طرح رفتہ رفتہ قلب میں قناعت کا نور چمک اٹھے گا اور حرص ولالچ کا اندھیرا دل

چھوٹ جائے گا۔

لالچ کا یہ علاج مزید پانچ چیزوں پر مشتمل ہے۔ پہلی چیز تو عمل ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی اخراجات کو گھٹا کر کم سے کم حد تک لے آئے پر تکلف اور ہمیشہ مرغن کھانوں کی بجائے سادہ غذا کو ترجیح دینی چاہئے اور بہت زیادہ عمدہ اور بھڑکیلے لباس کی بجائے سادہ لباس زیب تن کریں کیونکہ اس طرح کی چیزیں بغیر لالچ اور حرص کے بھی میسر آسکتی ہیں سرکار دوعالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے کہ آدمی کی نجات تین چیزوں میں ہے اول یہ کہ ظاہر اور باطن میں اللہ عزوجل سے ڈرتا رہے دوسرا امیر ہو یا فقیر خرچ میں میانہ روی اختیار کرے اور تیسرے غم ہو یا خوشی ہر حال میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ مزید فرمایا جو شخص میانہ روی اختیار کرتا ہے اللہ تعالٰی اسے دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جو بے دریغ خرچ کرتا ہے اسے دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے اور فرمایا خرچ کرتے وقت تدبیر و آہستگی سے کام لو کہ یہ اقدام بجائے آدھی روزی کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا لالچ کا علاج یہ ہے کہ جب ایک دن کیلئے مال بقدر کفایت میسر آجائے تو اگلے روز کیلئے تشویش میں پڑے رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ شیطان کی طرف سے ہے جو مستقبل کیلئے پریشان رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور آدمی کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ اگر زندگی طویل ہوئی تو پھر کیا کروگے اور کل کو کچھ ہاتھ نہ آیا تو کھاؤگے کہاں سے پس کل کیلئے آج ہی کوشش کرلو، بہرحال شیطان ہمیں کل کی مفلسی کا خوف دلا کر آج پریشانی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے پھر وہ اپنے دل میں بندے کی حماقت پر ہنستا ہے کہ دیکھو کل کا دن اسے دیکھنا بھی نصیب ہوگا یا نہیں لیکن یہ کس قدر اس میں گھائل ہوتا جارہا ہے۔

بہرکیف آدمی اس حقیقت سے خوب آگاہ رہے کہ روزی کا میسر آنا حرص و طمع پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ پہلے سے ہی مقدر ہو چکی ہے جو ہر حال میں مل کر رہے گی۔

تاجدار رسالت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ کو ایک مرتبہ مغموم اور اداس پایا تو فرمایا دل پر غم کا اس قدر کیوں بوجھ ڈالتے ہو تمہارے لئے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ تمہیں ہر حال میں ملے گا۔ (کیمیائے سعادت)

ابو سفیان رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں کہ پرہیز گاری اختیار کرو کیونکہ آج تک کسی پرہیز گار کو بھوکے مرتے نہیں دیکھا خود اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ پرہیز گاروں کو روزی وہاں سے پہنچائی جاتی ہے جہاں پر ان کا گمان تک نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ ذہن میں راسخ کریں کہ اگر آدمی طمع نہ کرے گا اور صبر نہ کرے گا اس پر اسے گراں تو شاید گزرے گا لیکن ذلیل و رسوا نہ ہوگا لیکن اگر طمع کرے گا اور صبر نہ کرے گا تو یہ پریشانی اٹھانے کے علاوہ ذلیل و خوار بھی ہوگا اور لالچ کے باعث لوگوں کی ملامت کا نشانہ بھی بنے گا اور پھر عذاب آخرت میں بھی مبتلا رہنے کا اندیشہ رہے گا برخلاف اس کے کہ اگر صبر کا مظاہرہ کرے گا تو

اس کی بدولت اجر وثواب کا مستحق ٹھہرے گا اور لوگوں میں بھی تحسین اور احترام حاصل ہو گا۔

چوتھا لالچ کا علاج یہ ہے کہ آدمی ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ اس کی حرص اور طمع آخر ہے کس لئے ؟اگر کھانے پینے کی خاطر ہے تو گدھے اور بیل وغیرہ اس سے کہیں زیادہ پیٹ بھر کر کھانے کے عادی ہوتے ہیں اگر شان وشوکت پوشی مطلوب ہے تو کتنی غیر قومیں اس ضمن میں آگے بڑھی ہوئی ہیں غرض ہر برائی کیلیئے متبادل مثال کسی بری شے میں دکھائی دے گی۔ہاں اگر طمع سے ہاتھ اٹھالے اور تھوڑے پر صبر کرنا سیکھ لے تو اسے اپنی مثال انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام میں دکھائی دے سکتی ہے۔

پانچواں علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ زیادہ مال کتنی بڑی مصیبت اور جنجال ہے کہ اس کی زیادتی اور فروانی جہاں دنیا میں پریشانی کا موجب ہوتی ہے وہاں آخرت میں بھی اس کا حساب دینا پڑے گا کیونکہ غریب پانچ سو سال پہلے جنت میں چلا جائے گا بہر حال ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہمیں کم سے کم لوگوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ طبیعت شکر ادا کرنے کی طرف سے مائل رہے۔

امیروں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگوں کو دیکھا کرو جو تم سے دولت کے مرتبے میں کمتر درجے کے ہوں کیونکہ شیطان اکسانے کی کوشش میں رہتا ہے کہ دیکھ فلاں فلاں لوگ تجھ سے زیادہ دولت مند ہیں ان میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے آخر قناعت کیلیئے تو ہی رہ گیا ہے ؟اور جب آدمی پرہیز گاری کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اسے بہکاتا ہے کہ آیا تو بڑا پرہیز گار وہ دیکھ فلاں عالم تو اتنا پرہیز گار نہیں ہے۔اس میں تو فلاں فلاں خامیاں پائی جاتی ہیں اگر یہ بھی بخشا گیا تو تم بھی بخشے جاؤ گے لٰہذا اب پرہیز گاری کی کیا پڑی ہے۔

یہ خام خیالی سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔تو مولانا رومؒ نے اس بیت کے ذریعے آگاہ کیا ہے کہ طمع سے بچیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بنی اسرائیل کی طرح اس کی رحمت چھوٹ جائے۔استغفر اللہ العظیم!

ایرانی

ابرِ بَرنایَدپِیِ مَنعِ زَکات
وَزُزِنا اُفتَد وَبا اَندَر جِہات

پاکستانی

ابرُ نایَد از پےِ مَنعِ زَکات
وَزُزِنا اُفتَد وَبا اَندَر جِہات

ابر برنایَد: بادل چھٹ گئے۔۔۔ منع: روک رکھنا، نہ دینا۔۔۔ زنا افتد: زنا ہو گا۔۔۔ جہات: اطراف، طرفیں

ترجمہ: زکوۃ روک رکھنے سے بادل نہیں آتے یعنی قحط پڑ جاتا ہے اور زنا کی شامت سے ہر طرف وبا پھیل جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ جب لوگ زکوۃ نہیں دیں گے تو آسمان پر رحمت کے بادل نہیں برسیں گے اور نہ دھن برسے گا، اور زنا کے فعل سے پورے معاشرے میں تباہی پھیل جائے گی۔

معاشرہ میں بعض لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے عوام کے مصیبت میں گرفتار ہونا

معاشرہ میں بعض لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے عوام کے مصیبت میں گرفتار ہونے کے دو اسباب مولانا رومؒ نے اس بیت میں واضح کئے ہیں۔ یہاں جناب رومیؒ Ethics بیان کر رہے ہیں۔ یاد رہے یہ مسلم معاشرہ میں جو عیوب در کر آسکتے ہیں انہیں اقوام عالم کی مثالوں سے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ تمام معائب جو روحانی سفر میں کوئی بھی رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔ ان کی وضاحت بہت عمدہ طریق سے بیان کی ہے تاکہ ان کے قریب بھی نہ جایا جائے۔

ایک حدیث رسول مقبول ﷺ میں اس بات کی وضاحت بڑے ہی شاندار طریقے سے کی گئی ہے۔

وعن بريدة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما منع قوم الزكاة إلا ابتلاهم الله بالسنين رواه الطبراني في الأوسط ورواته ثقات (الترغيب والترهيب ۳۰۹/۱)

ترجمہ: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو قوم بھی زکوٰۃ نہیں نکالتی، اللہ تعالیٰ اس کو قحط سالی میں مبتلا فرمادیتے ہیں۔

تشریح

اس روایت سے معلوم ہوا کہ قحط سالی کا عذاب بھی زکوٰۃ ادانہ کرنے کی وجہ سے آتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے ملنے میں تنگی ہو جاتی ہے۔ آج ہم میں اکثر مسلمان ضروریاتِ زندگی کی کمی اور مہنگائی کے وبال کا شکار ہیں، لیکن شاید ہی یہ خیال کبھی ذہن میں آتا ہو کہ درحقیقت اس تنگی اور پریشانی کی ایک وجہ زکوٰۃ ادانہ کرنا ہے، اگر زکوٰۃ کی چوری معاشرہ سے ختم ہو جائے اور تمام صاحبِ نصاب مسلمان زکوٰۃ کے فریضہ کو خوشدلی کے ساتھ انجام دیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی فراوانی ہو جائے اور ہر شخص کو بآسانی ضروریاتِ زندگی حاصل ہوں اور ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ حقیقت سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

قال عمر قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تلف مال في بر ولا بحر إلا بحبس الزكاة (الترغيب والترهيب ۳۰۸/۱)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خشکی ہو یا سمندر، جہاں بھی مال ضائع ہوتا ہے وہ زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیا میں بھیجا اور ان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے اصول وضوابط بھی دیے ہیں تاکہ خوش وخرم زندگی گزاری جاسکے چنانچہ جہاں ایک طرف ان اصولوں کی بجاآوری اور ان پر عمل پیرا ہونے والوں کے لیے **ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کانت لهم جنت الفردوس نزلا** کا مژدہ سنایا ہے۔

تو وہیں دوسری طرف مامورات سے روگردانی اور منہیات پر عمل کرنے کی وجہ سے جہنم کا بھی خوف بھی دلایا ہے.

من جملہ ان مامورات میں سے ایک اہم فریضہ زکات کی ادائیگی ہے جس سے آج کل تکاھل و تکاسل بہت زیادہ برتا جارہا ہے.

اور حقیقت یہی ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے سے مال میں غیر شعوری طریقے پر نقصان کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے اس سے راہ فرار کسی کو نہیں مل سکتی کیونکہ اس پر جہاں ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شاہد وعادل ہیں وہیں پر تجربات وشواہد سے اذعان وایقان کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور پھر زکوۃ ادا کرنے سے بظاہر مال کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن حقیقتا وہ ہمارے مال کی بڑھوتری کا بہت بڑا ذریعہ ہے بلکہ مال میں کمی ہو ہی نہیں سکتی جیسا کہ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **مانقصت صدقه من مال**۔(رواہ مسلم)

زکوۃ وصدقات سے مال کے اندر کمی نہیں ہوتی ہے اللہ ہمیں اس پر یقین کی توفیق عطا فرمائے اور زکوۃ کی ادائیگی کی توفیق کے ساتھ ساتھ اس کی عدم ادائیگی کے نقصان سے بال بال محفوظ رکھے۔

چنانچہ اس کے تعلق سے قرآن کریم کے اندر بہت صراحت کے ساتھ وعید نازل ہوئی جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ**(۳۵) (سورہ توبہ)

ترجمہ:

اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے مثلاً زکوۃ ادا نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اسی مال سے ان سے ان کی پیشانی پہلو اور کمر وغیرہ کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہی مال ہے جس کو جمع کر کے خوب رکھا کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو.

اسی طرح سے سور ہمزہ کے اندر تفصیلا اس وعید کو بیان کیا گیا ہے ارشاد باری ہے :**ویل لکل همزة لمزة الذی جمع مالا وعددہ یحسب ان ماله اخلدہ کلا لینبذن فی الحطمه وما ادراك ما الحطمه؟ نار الله الموقدة التی تطلع علی الافئدة**۔

ہلاکت وبربادی ہو عیب جوئی اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے والے پر جو مال جمع کر کے رکھتا ہے اور اس کو خوب گنتا ہے یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو پائیداری دے گا ہر گز نہیں ہر گز نہیں اس کے مال کو حُطَمَہ میں ڈالا جائے گا حُطَمَہ کیا ہے؟ یہ اللہ کی دہکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو چھو جائے گی۔

اسی طرح سے جب جہنمی لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ کیوں جہنم میں داخل کئے گئے؟ تو کہیں گے **ولم نك نطعم المسكين**

.(سورہ مدثر آیت نمبر 44)

ترجمہ

ہم غریبوں و محتاجوں کو نہیں کھلایا کرتے تھے۔

اور دوسری طرف دوسری بیماری کے بارے حدیث مبارکہ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «مَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيهِمُ الزِّنَا إِلَّا أُخِذُوا بِالسَّنَةِ وَمَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيهِمُ الرِّشَا إِلَّا أخذُوا بِالرُّعْبِ». رَوَاهُ أَحْمد3582

عمرو بن عاص ؓ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جس قوم میں زنا عام ہو جاتا ہے وہ قحط سالی کا شکار ہو جاتی ہے، اور جس قوم میں رشوت عام ہو جائے اس پر خوف مسلط کر دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں اسی بات کو کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۔(اسراء۳۲)

اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی بُری راہ ہے۔

اِس آیت میں دوسرے گناہ کی حرمت وخباثت کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے، **”زنا“** اسلام بلکہ تمام آسمانی مذاہب میں زنا کو بدترین گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ پرلے درجے کی بے حیائی اور فتنہ وفساد کی جڑ ہے بلکہ اب تو ایڈز کے خوفناک مرض کی شکل میں اس کے دوسرے نقصانات بھی سامنے آرہے ہیں، جس ملک میں زنا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے وہیں ایڈز پھیلتا جارہا ہے۔ یہ گویا دنیا میں عذاب اِلٰہی کی ایک صورت ہے۔

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں

”حدثنا محمود بن خالد الدمشقي، حدثنا سليمان بن عبد الرحمن أبو أيوب، عن إبن إبي مالك، عن أبيه عن عطاء بن ابي رباح، عن عبد الله بن عمر ؓ قال: أقبل علينا رسول الله ﷺ فقال: يا معشر المهاجرين خمس إذا بتليتم بهنّ وأعوذ بالله ان تدركهنّ۔“

ترجمہ: ”عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا ”اے مہاجروں کی جماعت! پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جب تم ان میں مبتلا ہو گئے (تو ان کی سزا ضرور ملے گی) اور میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ وہ (بری چیزیں) تم تک پہنچیں: لم (تظهر) الفاحشة فی قوم قطّ، حتی يعلنوا بها، الا فشا فيهم الطاعون والاوجاع التی لم تكن مضت فی اسلافهم الذين مضوا۔

”جب بھی کسی قوم میں بے حیائی (بدکاری وغیرہ) علانیہ ہونے لگتی ہے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گزرے ہوئے لوگوں میں نہیں ہوتی تھیں۔“

ولم ينقصوا المكيال والميزان، الّا اخذوا بالسنين وشدّة المؤونة وجور السلطان عليهم۔

”جب بھی وہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں ان کو قحط سالی، روزگار کی تنگی اور بادشاہ کے ظلم کے ذریعے سے سزا دی جاتی ہے۔“

ولم يمنعوا ذكاة اموالهم، الّا منعوا القطر من السماء ولولا البهائم لم يمطروا۔

”جب وہ اپنے مالوں کی زکوۃ دینا بند کرتے ہیں تو ان سے آسمان کی بارش روک لی جاتی ہے۔ اگر جانور نہ ہوں تو انہیں کبھی بارش نہ ملے۔“۔۔۔۔

رواہ ابن ماجة فی الفتن، رقم الحديث: ۴۰۹۱، أبو نعيم فی الحلية، ج۳، صفحہ ۳۲۰، رواہ الطبرانی فی معجم الاوسط، ج۱، صفحہ ۲۸۷، مسند الشامين، ج۲، رقم الحديث: ۱۵۵۸، الصحيحة للألبانی، رقم: ۱۰۶، قال البوصيری: رواہ الحاكم أبو عبدالله الحافظ فی كتابہ المستدرک فی آخر كتاب الفتن مطولا من طريق عطاء بن ابی رباح، وصححہ البوصيری، ولہ شواهد كثيرة۔۔۔)

حدیث سے نکلنے والے فوائد و مسائل

نبی کریم ﷺ کی پہلی پیشن گوئی پر غور کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تھا کہ جب کسی قوم میں بے حیائی (بدکاری وغیرہ) علانیہ ہونے لگتی ہے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے گزرے ہوئے لوگوں میں نہیں تھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے واضح کر دیا کہ اگر عریانی اور فحاشی کو فروغ دیا جائے گا تو ایسی بیماریاں پیدا ہوں گیں جن کا نام و نشان کہیں نہ ہو گا اور وہ امت میں اس تیزی سے پھیلیں گی کہ جس طرح رات کی تاریکی۔ آج کے معاشرے میں نکاح سے گریز کیا جا رہا ہے جس کی پاداش میں آج عریانی، فحاشی، علاقہ علاقہ، شہر شہر میں بے حیائی کے اڈے، شراب اور جوئے خانے اپنی جنسی تسکین کے لیے ناجائز آلات کا استعمال، ناجائز تعلقات، ہم جنس پرستی، اغلام بازی، زنا، شراب نوشی، یہ سارے ام الخبائث والے جرائم سرِ فہرست ہیں۔ گھر گھر ٹیلی وژن اور عریانی سے لبریز ٹی وی ڈرامے جو نوجوانوں کے کچے ذہن میں شرافت، دینداری بھرنے کی جگہ بے حیائی اور بے دینی کو اس قدر ڈال دی گئی کہ آج کے معاشرے میں اس گندے خیالات کو روشن خیالی کا نام دے دیا گیا ہے۔

عورتوں کو چار دیواری سے باہر نکال کر دفاتر، فیکٹریوں اور کارخانوں میں لاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ جدید مغربی سوچ اور فکر نے عورت کو یہاں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ہوٹلوں، ریستورانوں، کلبوں، ناچ گھروں، مارکیٹوں، بازاروں سے لے کر سیاست گاہوں، سیر گاہوں، تفریح کے پارکوں اور مردوں اور عورتوں کا اختلاط تک پہنچ گیا۔ اب بے حیائی زناکاری، موبائل فون کے ذریعے سے نکل کر تفریح گاہوں اور زناکاریوں تک پہنچ چکا ہے، جس کی وجہ سے ایسی ایسی بیماریاں وجود میں آچکی ہیں جن کی روک تھام صرف اور صرف شرعی تعلیم میں ہی موجود ہے۔ ان زناکاریوں کی وجہ سے آج کا جو سب سے بڑا مرض ہے وہ ایڈز ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ایک سال کے اندر اندر تقریباً ۲۶ لاکھ افراد ایڈز کا شکار ہو چکے ہیں۔ W.H.O (World Health Organization) کے مطابق ۱۹۹۹ء تک ایڈز کے مریضوں کی تعداد ایک کروڑ ۱۲ لاکھ تک پہنچی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے The Muslim Observer, Dec 10-16 Pg:21 ۔ سائنسی انکشافات قرآن وسنت کی روشنی میں صفحہ ۱۸۹۔

مولانا رومؒ اس شعر میں ان معائب کا تذکرہ کر کے یہ بتا رہے ہیں کہ یہ بیماریاں جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں اور جس سے معاشرتی زندگی برباد ہوئی ان سے بچیں۔ کیونکہ یہ انسان کو بہامیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور وہ انسانیت سے گر جاتا ہے۔

ایرانی

ھرچہ بر تو آید از ظُلمات و غَم

آن زِبی باکیّ وگُستاخی ست ھم

پاکستانی

ہرچہ آید بر تو از ظُلماتِ غَم
آن زِ بیباکیؔ وگُستاخی ہم

ظلمات: ظلمت کی جمع اندھیرا۔۔۔ غم: اندوہ۔ افسردگی۔۔۔ بے باکی: بے خوفی

اس شعر میں تشبیہ دی گئی ہے۔ جو غم کے بارے ہے

ترجمہ: تجھ پر جو غم کی تاریکی چھائی ہے وہ تیری ہی کسی نہ کسی بے ادبی، بے باکی اور گستاخی کی وجہ سے ہے۔ جس طرح ایک ماہر ڈاکٹر اور طبیب کا سب سے بہترین اور کامیاب عمل تشخیص مرض ہے۔ جب وہ عمل مکمل سرانجام دے لے تو پھر شافی علاج کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ مولانا رومؒ نہ صرف معالج بھی تھے بلکہ وہ ایک زبردست روحانی معالج تھے۔ اس لئے ایک روحانی مریض کی مکمل تشخیص فرماتے ہیں اور پھر اس کا علاج کرتے ہیں یہاں اس شعر میں بھی ایک بیماری کہ ہم ہی پر مصیبیتیں کیوں نازل ہوتی ہیں، ہم، ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہے؟ کی وجہ بتا رہے ہیں۔۔۔۔ دراصل اس آیۃ کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍؕ‏ (۳۰)

اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو معاف فرما دیتا ہے

اس آیت میں ان مُکلَّف مومنین سے خطاب ہے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں مومنین کو پہنچتی ہیں اکثر اُن کا سبب ان کے گناہ ہوتے ہیں، اُن تکلیفوں کو اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے اور کبھی مومن کی تکلیف اس کے درجات کی بلندی کے لئے ہوتی ہے۔

مصیبتیں آنے کا ایک سبب

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر آنے والی مصیبتوں کا ایک سبب ان کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کرنا ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہیں تو مصیبتوں سے بچ سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے ، رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے " (اے لوگو!) تمہارا رب عَزَّوَجَلَّ ارشاد فرماتا ہے "اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں انہیں رات میں بارش سے سیراب کروں گا، دن میں ان پر سورج کو طلوع کروں گا اور انہیں کڑک کی آواز تک نہ سناؤں گا۔(مسند امام احمد، مسند ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ، ۳ / ۲۸۱، الحدیث: ۸۷۱۶)

نیز انہیں چاہئے کہ ان پر اپنے ہی اعمال کی وجہ سے جو مصیبتیں آتی ہیں ان میں بے صبری اور شکوہ شکایت کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ انہیں اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہوئے صبر و شکر سے کام لیں ،ترغیب کے لئے یہاں گناہوں کی وجہ سے آنے والی مصیبتوں سے متعلق اور ان مصیبتوں کے گناہوں کا کفارہ ہونے کے بارے میں 5 اَحادیث ملاحظہ ہوں،

(1)...حضرت ابو موسیٰ اشعری رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور پُر نور صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "بندے کو جو چھوٹی یا بڑی مصیبت پہنچتی ہے وہ کسی گناہ کی وجہ سے پہنچتی ہے اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ"۔(ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ الشوری۔۔۔الخ، ۵ / ۱۶۹، الحدیث: ۳۲۶۳)

(2)...حضرت ثوبان رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضورِ اَقدس صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "نیک کاموں سے عمر بڑھتی ہے، دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے اور بے شک آدمی اپنے کسی گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب العقوبات، ۴ / ۳۶۹، الحدیث: ۴۰۲۲)

(3)...حضرت حسن بصری رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے، رسولِ کریم صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "لکڑی کی خراش لگنا، قدم کا ٹھوکر کھانا اور رگ کا پھڑکنا کسی گناہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر آپ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ آیت تلاوت فرمائی " وَمَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا

كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ "۔(کنز العمال، کتاب الاخلاق، قسم الافعال، الصبر علی البلایا مطلقاً، ۲ / ۳۰۴، الجزء الثالث، الحدیث: ۸۶۶۶)

(4)... حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے روایت ہے، تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا "مومن کو کانٹا چبھنے یا اس سے بڑی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالٰی اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے یا اس کی ایک خطا مٹا دیتا ہے۔(مسلم، کتاب البرّ والصلۃ والآداب، باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ۔۔۔ الخ، ص۱۳۹۱، الحدیث: ۴۷(۲۵۷۲))

(5)... حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "مومن کی بیماری اس کے گناہوں کے لئے کفارہ ہوتی ہے۔(شعب الایمان، السبعون من شعب الایمان۔۔۔ الخ، فصل فی ذکر ما فی الاوجاع والامراض۔۔۔ الخ، ۷ / ۱۵۸ ،الحدیث: ۹۸۳۵)

اللہ تعالٰی ہمیں اپنی اطاعت میں مصروف رہنے اور گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، مشکلات اور مَصائب سے ہماری حفاظت فرمائے اور آنے والی مشکلات پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اٰمین۔ یہاں ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو جانا چاہیئے کہ کچھ مذاہب جیسے ہندو وغیرہ تناسخ کے قائل ہیں اور ان سے متاثر کچھ مسلمان بھی اس مصیبت کا شکار نظر آتے ہیں۔

ان کے مطابق زندگی کا تسلسل یوں ہے کہ ایک فرد پہلے اپنی کسی اور جنم میں تھا اور اب کسی اور جنم میں ہے۔

یاد رہے کہ انبیاءِ کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام جو کہ گناہوں سے پاک ہیں اور چھوٹے بچے جو کہ مُکَلَّف نہیں ہیں، ان سے اس آیت میں خطاب نہیں کیا گیا، اور بعض گمراہ فرقے جو تناسُخ یعنی روح کے ایک بدن سے دوسرے بدن میں جانے کے قائل ہیں وہ اس آیت سے اِستدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ ان کے گناہوں کا نتیجہ ہو اور ابھی تک چونکہ اُن سے کوئی گناہ ہوا نہیں تو لازم آیا کہ اس زندگی سے پہلے کوئی اور زندگی ہو گی جس میں گناہ ہوئے ہوں گے۔ ان کا اس آیت سے اپنے باطل مذہب پر اِستدلال باطل ہے کیونکہ بچے اس کلام کے مُخاطَب ہی نہیں جیسا کہ عام طور پر تمام خطابات عقلمند اور بالغ حضرات کو ہی ہوتے ہیں۔(خزائن العرفان، الشوریٰ، تحت الآیۃ: ۳۰، ص۸۹۵، ملخصاً)

نیز بالفرض اگر ان لوگوں کی بات کو ایک لمحے کے لئے تسلیم کر لیں تو ان سے سوال ہے کہ بچوں کو تکالیف تو یقینی طور پر آتی ہی ہیں خواہ وہ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ساتواں جنم ہو یا پہلا، تو سوال یہ ہے کہ بچوں کے پہلے جنم میں جو

تکلیفیں آتی ہیں وہ کون سے گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہیں ؟ کیونکہ اس سے پہلے تو کوئی جنم ان کے عقیدے کے مطابق بھی نہیں گزرا ہوتا۔

دراصل آپ پر آنے والی ہر آفت اور غم آپ کی اپنی لاپرواہی اور تکبر کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ سورہ النساں کی آیت نمبر 79 کے ایک حصے میں کہا گیا ہے: (اور جو بھی برائی تم پر پہنچتی ہے وہ تمہاری طرف سے ہے...) جناب رومیؒ کا خیال ہے کہ ہر عمل اور نیت کا اپنا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ عمل جیسا ہی ہو۔

ایرانی

ھر کِہ بی باکی کُند در راہِ دوست

رہ زَنِ مَردان شُد و نامَردْ اوست

پاکستانی

ہر کہ بیباکی کُند در راہِ دوست

رَہزَنِ مرداں شُد و نامَردْ اوست

بے باکی: بے خوفی، بادبی۔۔۔ کند: وہ کرے۔۔۔ در راہ: راستے میں۔۔۔ رہزن: ڈاکو، راستہ میں لوٹنے والا۔۔۔ نامرد: ہیجڑا۔۔۔

اوست: وہ ہے

ترجمہ: جو کوئی دوست کی راہ میں بے باکی کرتا ہے وہ دراصل مردوں کا رہزن ہے اور خود نامرد ہے۔

اس بنیاد پر مردوں کے راہزن ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ شخص حقیقی مردوں کو نقصان پہنچانے کا سبب ہے، دوست کی راہ کا مقصد بھی احکام الٰہی ہے۔ اس طرح بے خوفی کا مطلب یہ ہے کہ اہلیت اور استعداد کے بغیر کوئی شخص شیخ اور مرشد بن جاتا ہے اور لوگوں

کو اس کی بیعت کی دعوت دیتا ہے۔ در حقیقت ایسا شخص خدا کے بندوں اور طالبان حق کو یرغمال بنانے والا ہے اور اس سے یقیناً کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور لگتا ہے کہ اس نے صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے اور اپنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔

ھر کس در راہ دوست گستاخی کند راھزن مردان الھی است

یعنی ھم گمراہ است وھم گمراہ کنندہ والبتہ چنین کسی نامرد است.

جو دوست کی راہ میں تکبر کرتا ہے وہ خدا کے بندوں میں گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے تو وہ کسی نہ کسی طریقہ سے نامرد ہے۔

عام طور پر انسان پر آنے والی ہر آفت اور غم انسان کی اپنی بے خوفی اور تکبر کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص جو سچا ہے وہ حضرت حق کے سامنے تکبر اور بدتمیزی کا شکار ہو جائے تو وہ اب سچا نہیں بلکہ بزدل سمجھا جاتا ہے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔

مولانا رومؒ کے نزدیک مردانگی اور بلوغت کا معیار شہوت کو نافذ کرنے اور اس کے اسباب رکھنے کی طاقت نہیں ہے، ان کے نزدیک انسان وہ ہے جو ہوس اور حرص سے چھٹکارا پا کر انسانی کمالات کو پہنچ گیا ہو، اور بالغ وہ ہے جو حق کے نشے میں ہو اور شہوت کے نشے میں نہ ہو، لہٰذا جو شخص خدمت کے آداب یا پیغمبر کے آداب کی پابندی نہیں کرتا جو طالب اور حق کے درمیان حد کو محفوظ نہیں رکھتا ہے، اس کی طریقت اور خدا کی طرف چلنا، وہ نامکمل ہے اور جناب رومیؒ کے فرمان کے مطابق وہ شاگردوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور کسی ایسی چیز پر قبضہ کر لیتا ہے جو اس کے حق میں نہ ہو، اس لیے وہ چور ہے، جو دوسرے لوگوں کے مال پر قبضہ کرتا ہے، اور گمراہ کن ہے۔ گویا وہ اللہ کے راستے کا راہزن ہے اور اللہ کی راہ پر چلنے والوں کو لوٹتا ہے۔ چنانچہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (مائدہ 85 - 86:)

ترجمہ:

اور ہر راستہ پر اس لیے نہ بیٹھو کہ ایمان والوں کو ڈراؤ اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکو اور اس (سیدھے) راستہ کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرو، اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا، اور غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔

تفسیر:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اور ہر راستہ پر اس لیے نہ بیٹھو کہ ایمان والوں کو ڈراؤ اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکو اور اس (سیدھے) راستہ کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرو، اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا، اور غور سے دیکھو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تمہاری ایک جماعت اس (دین) پر ایمان لائی جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی، تو صبر کرو حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے“

ڈرا دھمکا کر ناجائز رقم بٹورنے والے

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے مدین کو راستہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ راستہ پر بیٹھ کر ایمان والوں کو ڈراتے تھے اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے لوگوں کو روکتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ اور مجاہدؒ نے بیان کیا ہے کہ وہ ان راستوں پر بیٹھ جاتے تھے جو حضرت شعیب (علیہ السلام) کی طرف جاتے تھے اور جو لوگ حضرت شعیب (علیہ السلام) کی طرف جانا چاہتے تھے ان کو روکتے تھے اور کہتے تھے ان کے پاس نہ جاؤ وہ کذاب ہیں، جیسا کہ قریش نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کرتے اور یہ اس آیت کا ظاہری معنی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا: اس سے مراد ڈاکہ ڈالنا ہے جو لوگ راستہ پر چلنے والے مسافروں کو ڈرا دھمکا کر لوٹ لیتے ہیں۔

بعض علماء نے کہا: اس زمانہ میں اس سے مراد ناجائز ٹیکس وصول کرنے والے ہیں جو لوگوں سے جبراً وہ وصول کرتے ہیں جو شرعاً ان پر لازم نہیں ہیں۔ ہمارے زمانہ میں حکمرانوں نے ہر چیز پر انواع واقسام کے ٹیکس عائد کیے ہوئے ہیں اور عوام کے ٹیکسوں سے صدر، وزیر اعظم، وفاقی وزراء، گورنر اور صوبائی وزراء کی رہائش کے لیے عالی شان محل نما بنگلے اور کوٹھیاں ہیں۔ ان کے سفر کرنے کے لیے خصوصی طیارے ہیں۔ یہ سال میں ان گنت مرتبہ بیرونی دوروں پر جاتے ہیں اور اپنے ساتھ خوشامدیوں کے ٹولے کو لے جاتے ہیں اور ان کو شاپنگ کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ ان کے اللوں تللوں پر مشتمل اخراجات لاکھوں روپیہ سے متجاوز ہیں۔ غریب عوام کے کھانے کے لیے روٹی بمشکل میسر ہوتی ہے، سر چھپانے کے لیے چھت کا سایہ حاصل کرنا بہت کٹھن ہے اور یہ عوام کے خون پسینے سے کمائی ہوئی رقم سے جبراً ٹیکس وصول کرکے بے دردی سے اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ قومی منصوبوں کے نام پر عالمی بینک سے قرض لیتے ہیں اور اس رقم کو اپنی عیاشیوں میں خرچ کر دیتے ہیں اور قوم کو قرض میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں غنڈے، مسٹنڈے اور دہشت گرد دکانوں اور گھروں سے زبردستی بھتہ وصول کرتے ہیں۔ فطرانہ، زکوۃ اور چرم ہائے قربانی بھی جبراً وصول کرتے ہیں اور اس رقم کو اسلحہ خریدنے اور اپنی رنگ رلیوں اور عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ گاڑیاں چھین کر ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل وغارت گری کی وارداتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہیں۔

قوم شعیب کو ترغیب اور ترہیب:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کا یہ قول نقل فرمایا: اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ ان کو اللہ کی اطاعت پر برانگیختہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ان کو دور رہنے کی ترغیب دی جائے۔ اس آیت کے تین محمل ہیں۔ ایک یہ کہ تم عدد میں کم تھے تو تم کو تعداد میں زیادہ کر دیا۔ دوسرا یہ ہے تمہارے پاس مال کم تھا تو تم کو زیادہ مال عطا کیا اور تیسرا یہ کہ تم جسمانی طور پر کمزور تھے تو تم کو طاقتور کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا: غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ پہلی آیت میں ان کو ایمان لانے کی ترغیب دی تھی اور اس آیت میں ان کو ترہیب کی ہے اور ایمان نہ لانے پر ڈرایا ہے۔

(تبیان القرآن–سورۃ نمبر 7 الأعراف آیت نمبر 86)

حضرت شعیب علیہ السلام راہ حق کا استعارہ ہے اور ان کے قوم کے لوگ مسافروں کو لوٹنے والے راہزن تو گویا اللہ کی راہ میں ڈکیتی ہے۔ جو اللہ کی بارگاہ تک جانے نہیں دیتی۔ یہ وہ غلط اور ڈھونگی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ والوں کے روپ میں انسان کو بھٹکا دیتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ان سے بچو۔

ایرانی

از اَدَب پُر نور گشتہ ست این فلَک

وَزْ اَدَب مَعْصوم و پاک آمد مَلَک

پاکستانی

از اَدَب پُر نور گشت است این فلَک

وَزْ اَدَب مَعْصوم و پاک آمد مَلک

از ادب: ادب سے۔۔۔ پر نور: نور سے پر۔۔۔ گشت: ہو گیا۔۔۔ فلک: آسمان۔۔۔ معصوم: بے گناہ۔۔۔ ملک: فرشتہ

ترجمہ: یہ آسمان ادب ہی کی بدولت نور ہی نور ہو گیا ہے۔ اور فرشتے ادب کی وجہ ہی سے معصوم اور پاک ہیں۔

سبحان اللہ مولانا رومؒ نے کیا کمال کا نکتہ بیان کیا ہے۔ ''کہ ادب ہی کی بدولت فرشتوں کو مقام معصومیت ملا'' گویا آسمان بالا ادب کا مرہون منت ہے۔

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ ادب صرف انسانوں کے لیے نہیں ہے بلکہ اگر دیکھیں کہ یہ آسمان نور سے بھرا ہوا ہے تو یہ ادب کی وجہ سے ہے اور ادب و شائستگی ہی کی بدولت فرشتے معصوم اور پاکیزہ ہو گئے ہیں اور ہمیشہ خدا کے فرمانبردار ہیں۔ اگر غور کریں تو آسمان جھکا ہوا ہی دکھائی دیتا ہے اور بلکل اس شخص کی طرح لگتا ہے جو سجدہ اور تعظیم کی نیت سے اپنے قد کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی جھکنا اور سجدہ ریز ہونا اس لیے مولانا رومؒ نے آسمان کو ادب کے ساتھ شمار کیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ:

قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۳۲(بقرہ)

(فرشتوں نے) عرض کی: (اے اللہ!) تو پاک ہے۔ ہمیں تو صرف اتنا علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا، بے شک تو ہی علم والا، حکمت والا ہے۔

حضرت آدم عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے علمی فضل و کمال کو دیکھ کر فرشتوں نے بارگاہِ الٰہی میں اپنے عجز کا اعتراف کیا اور اس بات کا اظہار کیا کہ ان کا سوال اعتراض کرنے کیلئے نہ تھا بلکہ حکمت معلوم کرنے کیلئے تھا اور اب انہیں اِنسان کی فضیلت اور اس کی پیدائش کی حکمت معلوم ہو گئی جس کو وہ پہلے نہ جانتے تھے۔ اس آیت سے انسان کی شرافت اور علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف تعلیم کی نسبت کرنا صحیح ہے اگرچہ اس کو معلم نہ کہا جائے گا کیونکہ معلم پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں۔

اس کی یہی تعبیر بہتر معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کائناتی حکومت میں ملائکہ کی حیثیت در حقیقت اس کے کارندوں (یا civil servants) کی ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو صرف اس کے شعبے کے مطابق علم دیا گیا ہے، ان کا علم جامع نہیں ہے اور ان کے پاس تمام چیزوں کا مجموعی علم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی فرشتہ بارش کے انتظام پر مامورُ ہے، کوئی پہاڑوں پر مامور ہے، جس کا ذکر سیرت میں آتا ہے کہ جب طائف میں رسول اللہ پر پتھراؤ ہوا تو اس کے بعد ایک فرشتہ حاضر ہوا کہ میں مَلَکُ الجبال ہوں، اللہ نے مجھے پہاڑوں پر مامور کیا ہوا ہے، اگر آپ فرمائیں تو میں اِن دو پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے درمیان طائف کی یہ وادی واقع ہے اور اس طرح اہلِ طائف پِس کر سُرمہ بن جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔ تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف خدمات پر مامور ہیں اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ صرف اُن کے اپنے

فرائضِ منصبی اور اُن کے اپنے اپنے شعبے سے متعلق دیا گیا ہے، جبکہ حضرت آدمؑ کو علم کی جامعیت بالقوۃ (potentially) دے دی گئی، جو بڑھتے بڑھتے اب ایک بہت تناور درخت بن چکا ہے۔

اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ: یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے کامل حکمت والے ہیں۔

آپ ہی کی ذات ہے جو کلُ کے کل علم کی مالک ہے اور جس کی حکمت بھی کامل ہے۔ باقی تو مخلوق میں سے ہر ایک کا علم ناقص ہے۔ تو گویا وہ پیکر ادب بن گئے۔ اور اس کے سامنے گردن ادب سے جھکا دی۔ اور عالم بالا پر فائز ہو گئے۔

لا يعْصُونَ اللَّهَ ما أَمَرَهُمْ وَيفْعَلُونَ ما يؤْمَرُونَ. (التحریم، آیہ ی٦)

وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جیسا کہ ہم ان کو حکم دیتے ہیں اور وہ وہی کرتے ہیں جیسا کہ ہم انہیں حکم دیتے ہیں۔ (التحریم، آیت نمبر 6)۔

حالانکہ تمام اشیاء طوعاو کرھا اللہ کے سامنے جھکنے والی ہی ہیں۔ جیسے ارشاد ہوا

وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ۩ ۱۵ (رعد)

اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خوشی سے، خواہ مجبور ہو کر اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے ہر صبح و شام۔

یعنی آسمانوں میں جتنے فرشتے ہیں اور زمین میں جتنے اہلِ ایمان ہیں سب خوشی سے جبکہ کافر و منافق شدت اور تنگی کی حالت میں مجبور ہو کر اللّٰہ تعالٰی ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ (مدارک، الرعد، تحت الآیۃ: ۱۵، ص ۵۵۳) اور سجدے کرنے کا ایک معنی یہاں یہ ہے کہ وہ حکمِ الٰہی کے سامنے بے بس ہیں اور اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ جیسے چاہے ان میں تَصَرُّف فرماتا ہے اور سب اللّٰہ تعالٰی کے قانونِ فطرت کے پابند ہیں ۔ لیکن کمال ادب سے فرشتوں نے اپنے آپ کو جھکالیا۔ اور نور علی نور ہو گئے۔

خدا نے علم بخشا ہے ادب احباب کرتے ہیں

یہی دولت ہے میری اور یہی جاہ و حشم میرا

ایرانی

بُدز ِگُستاخی کُسوفِ آفتاب
شُد عَزازیلی زِجُرأت رَدِّباب

پاکستانی

بُدز ِگُستاخی کُسوفِ آفتاب
شُد عَزازیلے زِجُرأت رَدِّباب

بد: مخفف ہے بود کا بمعنی 'تھا'۔۔۔ کسوف: سورج گرہن۔۔۔ عزازیل: شیطان۔۔۔۔ جرأت: گستاخی۔۔۔ رد: مردود

ترجمہ: سورج گرہن جب ہوا تو وہ لوگوں کی گستاخی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور شیطان بھی اپنی گستاخی کے سبب ہی راندہ دَرگاہ ہوا۔

جس طرح ادب انسانوں کے لیے منفرد نہیں ہے، اسی طرح غیر انسان بھی بے ادبی کا شکار ہو سکتے ہیں، جو ان پر الٹا اثر کرے گی۔ مثال کے طور پر، جب سورج بے قدر ہو جاتا ہے اور اپنے معمول کے راستے سے ہٹ جاتا ہے، تو اندھیرا ہو جاتا ہے اور گرہن لگ جاتا ہے (قدیم کاسمالوجی کے مطابق)۔

عزازیل: ابلیس، چونکہ یہ الفاظ صوفیہ کے لیے ایک طرح کے معنی رکھتے ہیں، رد باب: حق کے دروازے سے ٹھکرا ہوا اور رد کیا گیا، ملعون۔

مولانا رومؒ ایک ایسی شخصیت ہیں جن کو معارف الہ کہا جا سکتا ہے۔ علوم دینیہ کے ساتھ باقی مروجہ علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس شعر میں انہوں نے قدیم و جدید کو یوں بیان کر دیا ہے کہ اشاراتی زبان میں گویا Cosmology کو پرو دیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان اعتقادات کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔ جو، ان سے وابستہ ہیں۔ اولیاء اللہ کی فکر و انداز اپنا ہوتا ہے۔ اس شعر میں مولانا رومؒ سورج گرہن کو شامت اعمال کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔ جو بے ادبی کا نتیجہ ہے۔

کیا سورج گرہن اس کی بے ادبی کی وجہ سے ہے؟

سورج گرہن اس کی بے ادبی کی وجہ سے ہے۔ اور شیطان (ابلیس) کو بھی اپنے تکبر کی وجہ سے راندہ درگاہ کیا گیا ہے۔ [نکلسن کہتے ہیں: شاعر (مولاناؒ) کا خیال ہے کہ سورج جب بھی اپنے مخصوص راستے سے ہٹنے کی جرات کرتا ہے تو سورج گرہن جو ایک نظم وضبط کا ذریعہ ہے خدائے بزرگ وبرتر اس کو نظم وضبط کرنے کے لیے مسلط کرتا ہے۔ فرمایا: پہلا پہلو یہ ہے کہ گستاخوں کے اعمال کی گستاخی سورج کو بھی متاثر کرتی ہے اور اسے بدصورت بنا دیتی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ سورج چونکہ چوتھے گھر میں ہے، اکیلا اور تنہا ہے، اس لیے کبھی کبھی غرور کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورج کو سزا دینے کے لیے اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو چند لمحوں کے لیے غائب کر دیتا ہے۔

حکیم سبزواری کہتے ہیں: یہ چاند کا غرور ہے جو سورج کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس وجہ سے گرہن ہوتا ہے۔

دراصل میرے خیال میں یہ ایک تمثیل ہے جو بے ادبی کو سمجھانے کے لئے ہے۔ کہ بے ادبی ایسا فعل ہے جو ایک انسان کو یوں گہنا دیتی ہے جیسے سورج گہنا جاتا ہے۔ اور اچھی بھلی روشنی ونور تاریکی واندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ایسا ہی یہ عمل ہے یعنی بے ادبی، اتنا برا فعل ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے منور وروشن باکمال انسان بداعمالیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ بلکل اسی طرح جس طرح شیطان راندہ درگاہ الٰہی ہوا۔ استغفر اللہ العظیم!

اسلامی نقطہ سے کسوف کے بارے میں بتانا بھ از بس ضروری ہو گیا ہے۔ لہذا

کائناتِ ہست وبود میں اللہ ربّ العزت کی تخلیق کے مظاہر ناقابلِ شمار ہیں۔ اَجرامِ سماوِی اور ان مجموعہ ہائے نجوم کی ریل پیل کائنات کے حسن کو دوبالا کرتے ہوئے اُسے ایک خاص انداز میں متوازن رکھے ہوئے ہے۔ یہی توازن اِس کائنات کا حقیقی حسن ہے، جس کے باعث مادّہ (matter) اور ضدِ مادّہ (antimatter) پر مشتمل کروڑوں اربوں کہکشاؤں کے مجموعے (clusters) بغیر کسی حادثہ کے کائنات کے مرکز کے گرد محوِ گردش ہیں۔ ہماری کہکشاں ملکی وے (Milky Way) دراصل ایک چکردار کہکشاں ہے۔ اُس کے چار بازو ہیں جن میں واقع کروڑوں ستارے کہکشاں کے مرکز کے گرد گردِش کر رہے ہیں۔ سورج بھی اپنے ساتھی ستاروں کی طرح کہکشاں کے مرکز سے 30,000 نوری سال کے فاصلے پر ”اورِین آرم“ (Orion Arm) میں واقع ہے اور کہکشاں کے مرکز کے گرد 22,00,00,000 سال میں اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے۔ سورج کی اِس گردِش کو اللہ ربّ العزت نے قرآنِ مجید میں یوں بیان کیا ہے، فرمایا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ O

اور سورج اپنے لئے مقرر کردہ راستے پر چلتا ہے، یہ (راستہ) غالب علم والے (اللہ) کا مقرر کردہ ہے۔

یٰسین، 38:36

اَحوالِ قیامت کے ضمن میں سورج کے بُجھ کر بے نور ہو جانے اور اس کی حرکت رک جانے کے بارے میں اللہ ربّ العزت نے قرآنِ مجید میں فرمایا:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْO

جب سورج لپیٹ کر بے نور کر دیا جائے گا۔

التکویر، 1:81

سورج کی طرح چاند بھی اپنے متعین راستے پر مصروفِ سفر ہے۔ اِس سلسلے میں اِرشادِ ایزدی ہے:

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍO

سورج اور چاند معلوم اور مقررّہ (فلکیاتی) حسابات کے مطابق (محوِ حرکت) ہیں۔

الرحمٰن، 5:55

چاند کی روشنی سورج کا مرہونِ منت ہے۔ جس طرح زمین سورج کی دُھوپ سے تمازت پاتی اور روشن ہوتی ہے اُسی طرح چاند بھی سورج ہی کی دُھوپ سے منوّر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و عرفان سے عاری دَور کے متداول نظریات کے خلاف قرآنِ مجید میں سورج کے لئے ”روشنی دینے والا“ اور چاند کے لئے ”روشن کیا جانے والا“ کے الفاظ فرمائے۔ سورۂ یونس میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا.

وُہی ہے جس نے سورج کو روشنی (کا منبع) بنایا اور چاند کو (اُس سے) روشن (کیا)۔

یونس، 5:10

ارشاد ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ.

ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں اَطراف عالم میں اور خود اُن کی ذاتوں میں دِکھا دیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی حق ہے۔ کیا آپ کا رب (آپ کی حقانیت کی تصدیق کے لئے) کافی نہیں ہے کہ وہی ہر چیز پر گواہ (بھی) ہے۔

حٰم السَّجدۃ، 53:41

جن نشانیوں کے اظہار کا اللہ تعالیٰ عندیہ دیا ہے سورج گرہن اور چاند گرہن بھی انہی میں سے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں جب سورج گرہن لگا تو اتفاق سے اُن ہی دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔

سورج گرہن کے وقت آپ کے صاحبزادے کے انتقال کی خبر سن کر کچھ لوگ یہ کہنے لگے کہ آج اللہ کے رسول ﷺ کے صاحبزادے کا انتقال ہوا ہے، اِسی لیے سورج کو گرہن لگ گیا ہے۔

یہ سُن کر اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کے اِس باطل عقیدے کا رد کرتے ہوئے فرمایا: کسی کی موت یا زندگی سے چاند یا سورج گرہن نہیں لگتا، یہ تو اللہ تعالی کی دو نشانیاں ہیں، جب تم اُن کو دیکھو تو نماز پڑھو، دعا کرو، صدقہ کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو۔

جیسا کہ مسلم شریف کی روایت ہے۔

إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ مِنْ آيَاتِ اللهِ، وَإِنَّهُمَا لَا يَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ، وَلَا لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَكَبِّرُوا، وَادْعُوا اللهَ وَصَلُّوا وَتَصَدَّقُوا۔

(صحیح مسلم:901)

ترجمہ: بے شک سورج اور چاند یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، اِن دونوں میں کسی کی موت یا کسی کے زندگی کی وجہ سے گرہن لگتا جب تم اُن کو دیکھا تو اللہ اکبر کہو، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، نماز پڑھو اور صدقہ و خیرات کرو۔

اور حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ وَلَكِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَصَلُّوا.

سورج اور چاند کو کسی کی موت کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ جب ایسا دیکھو تو نماز پڑھا کرو۔

بخاري، الصحيح، 1:359، رقم:1008

اِن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند گرہن اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرانے کے لئے ظاہر فرماتا ہے۔ تاکہ بندے گناہ کرنا چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی کریں۔ چاند یا سورج گرہن کے وقت اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کریں، نماز پڑھیں، دعا کریں اور صدقہ و خیرات کریں۔

اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گرہن کے وقت خود بھی نماز ادا فرمائی جیسا کہ درج ذیل ہے:

عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: خَسَفَتِ الشَّمْسُ فَقَامَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وآله وسلم فَزِعًا يَخْشَى أَنْ تَكُونَ السَّاعَةُ فَأَتَى الْمَسْجِدَ فَصَلَّى بِأَطْوَلِ قِيَامٍ وَرُكُوعٍ وَسُجُودٍ رَأَيْتُهُ قَطُّ يَفْعَلُهُ وَقَالَ هَذِهِ الْآيَاتُ الَّتِي يُرْسِلُ اللهُ لَا تَكُونُ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ وَلَكِنْ {يُخَوِّفُ اللهُ بِهِ عِبَادَهُ} فَإِذَا رَأَيْتُمْ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ فَافْزَعُوا إِلَى ذِكْرِهِ وَدُعَائِهِ وَاسْتِغْفَارِهِ.

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سورج کو گرہن لگا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے قیامت آگئی ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہوئے اور نماز پڑھی، بہت ہی لمبے قیام، رکوع اور سجود کے ساتھ۔ میں نے آپ کو ایسا کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اور فرمایا کہ یہ نشانیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے۔ یہ کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ جب تم ایسی کوئی بات دیکھو تو اللہ کے ذکر، دعا اور استغفار کی طرف دوڑا کرو۔

1. بخاري، الصحيح، 1:360، رقم: 1010
2. مسلم، الصحيح، 2:628، رقم: 912

زمین پر سورج گرہن اُس وقت ہوتا ہے جب چاند گردش کے دوران سورج اور زمین کے درمیان میں آجاتا ہے، جس کے بعد زمین سے سورج کا کچھ یا پھر پورا حصہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح زمین کا وہ سایہ جو گردش کے دوران کرہ زمین کے چاند اور سورج کے درمیان آجانے سے چاند کی سطح پر پڑتا ہے اور چاند تاریک نظر آنے لگتا ہے' اس کیفیت کو چاند گرہن کہتے ہیں۔ قدیم مذاہب میں سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور تھے' جبکہ قرآنِ مجید نے اسے اللہ کی نشانی قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ کسوف و خسوف ادا کر کے بتادیا کہ اس کیفیت میں سورج و چاند کی حرکت معمول سے ہٹ کر ہے جو اللہ کی نشانی ہے اور قیامت کا منظر ہے۔ اس سے پناہ مانگنے کے لیے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤ۔

بے باکی بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس سے بڑے سے بڑے مرتبہ تک پہنچا ہوا بھی نیچے گر جاتا ہے جیسے شیطان۔

یہاں یہ بات واضح کرنا بھی مقصود تھی کہ بے باکی سب سے پہلے سب سے بڑی ہستی کے خلاف کرتی ہے اور بعد ازاں سلسلہ چل پڑتا ہے اور کبھی یہ عمل معکوسی (الٹ) بھی ہوتا ہے۔ پہلے چھوٹے کی بے ادبی بعد ازاں بڑوں تک چلی جاتی ہے۔ بس ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔

ابلیس کا ذاتی نام۔ عبرانی لفظ ہے مگر اہل عرب اسے بلس سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی ناامید ہونے کے ہیں۔ چونکہ ابلیس کو اللہ سے کوئی امید نہیں رہی اس لیے ابلیس کہلایا۔ اسے شیطان اور عدو اللہ ''خدا کا دشمن'' بھی کہتے ہیں۔ قرآن اس کا ظہور ابتدائے عالم سے بتاتا ہے۔ اس نے آدم اور حوا کو بہکایا اور شجر ممنوعہ کے کھانے کی اس لیے ترغیب دی کہ وہ کہیں ہمیشہ جنت میں ہی نہ

رہیں۔ جب اللہ نے آدم میں روح پھونکی تو حکم دیا کہ تمام فرشتے اُسے سجدہ کریں۔ سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں آگ سے بنا ہوں اور آدم خاک سے۔ اس پر راندہ درگاہ کر دیا گیا۔ اس نے اللہ سے قیامت کے دن تک کی مہلت طلب کی جو دے دی گئی اور لوگوں کو بہکانے کی طاقت بھی دے دی گئی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴البقرہ)

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔

{اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: آدم کو سجدہ کرو۔} اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو تمام موجودات کا نمونہ اور عالَم روحانی و جسمانی کا مجموعہ بنایا اور فرشتوں کے لیے حصولِ کمالات کا وسیلہ بنایا تو انہیں حکم فرمایا کہ حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو سجدہ کریں کیونکہ اس میں حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی فضیلت کا اعتراف اور اپنے مقولہ ”اَتَجْعَلُ فِیْهَا“ کی معذرت بھی ہے۔ بہر حال تمام فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا اور ملائکہ مقربین سمیت تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور تکبر کے طور پر یہ سمجھتا رہا کہ وہ حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے افضل ہے اور اس جیسے انتہائی عبادت گزار، فرشتوں کے استاد اور مقربِ بارگاہِ الٰہی کو سجدہ کا حکم دینا حکمت کے خلاف ہے۔ اپنے اس باطل عقیدے، حکمِ الٰہی سے انکار اور تعظیم نبی سے تکبر کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا۔

دوسرے مقام پر اس کی بے باکی یوں ظاہر ہوتی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۱۲الاعراف)

فرمایا کس چیز نے تجھے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اُسے مٹی سے بنایا۔

اللہ کریم جل شانہ کے سامنے مدتوں سرنگوں رہا۔ عبادتیں بھی کرتا رہا۔ لیکن بے باکانہ گفتگو کی۔ جو شان الوہیت کے خلاف اور اس کی صنعت آدم کے خلاف تھی تو حکم ہوا:

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (۳۴) وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (۳۵) قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۶) قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۳۷) اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (۳۸الحجر)

اللہ نے فرمایا: تو جنت سے نکل جا کیونکہ تو مردود ہے۔ اور بیشک قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔ اس نے کہا: اے میرے رب! تو مجھے اس دن تک مہلت دیدے جب لوگ اٹھائے جائیں۔ اللہ نے فرمایا: پس بیشک تو ان میں سے ہے جن کو معین وقت کے دن تک مہلت دی گئی ہے۔

یعنی قیامت تک آسمان وزمین والے تجھ پر لعنت کریں گے اور جب قیامت کا دن آئے گا تو اس لعنت کے ساتھ ہمیشگی کے عذاب میں گرفتار کیا جائے گا جس سے کبھی رہائی نہ ہوگی۔(خازن، الحجر، تحت الآیۃ: ۳۵، ۳/ ۱۰۲)

اپنے مردود اور لعنتی ہونے کے بارے میں سن کر شیطان نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے۔ قیامت کے دن تک مہلت مانگنے سے شیطان کا مطلب یہ تھا کہ وہ کبھی نہ مرے کیونکہ قیامت کے بعد کوئی نہ مرے گا اور قیامت تک کی اُس نے مہلت مانگ ہی لی لیکن اس کی اس دعا کو اللہ تعالی نے اس طرح قبول کیا کہ اس سے فرمایا: بیشک تو ان میں سے ہے جن کو اس معین وقت کے دن تک مہلت دی گئی ہے جس میں تمام مخلوق مر جائے گی اور وہ وقت پہلے نَفخہ کا ہے تو شیطان کے مردہ رہنے کی مدت پہلے نَفخہ سے دوسرے نَفخہ تک چالیس برس ہے اور اس کو اس قدر مہلت دینا اس کے اکرام کے لئے نہیں بلکہ اس کی بلا، شَقاوت اور عذاب کی زیادتی کے لئے ہے۔(خازن، الحجر، تحت الآیۃ: ۳۷-۳۶، ۳/ ۱۰۲، ملخصًا)

اس دن سے وہ انسانیت کے لئے دشمن ازلی بنا۔

شیطان کو انسانوں پر کتنا اختیار ہے؟

اس سلسلے میں قرآن وحدیث کے مطالعہ سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ شیطان کو ایسا اختیار بالکل نہیں ہے کہ انسان اس کے سامنے مجبور وبے بس ہو گیا ہو بلکہ اس کو صرف اتنا اختیار ہے کہ وہ انسانوں کو برائی کی دعوت دے اور طرح طرح کے برے وسوسے دل میں ڈالے پھر انسان کے بس میں ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اس برائی کو سرانجام دے، لہٰذا انسان سے آخرت میں جو باز پرس اور جزاوسزا ہوگی وہ اس کے اسی اختیار کو استعمال کرنے پر ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن شیطان اپنے پیروکاروں سے صاف الفاظ میں کہے گا، جس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح وارد ہوا ہے:

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم ۖ مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنتُم بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ ۗ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ابراہیم 22)

اور جب فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہے گا بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پھر میں نے وعدہ خلافی کی، اور میرا تم پر اس کے سوا کوئی زور نہ تھا کہ میں نے تمہیں بلایا پھر تم نے میری بات کو مان لیا، پھر مجھے الزام نہ دو اور اپنے آپ کو الزام دو، نہ میں تمہارا فریادرس ہوں اور نہ تم میرے فریادرس ہو، میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ تم اس سے پہلے مجھے شریک بناتے تھے، بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شیطان نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری کر لیا کہ میں نے تو تمہیں صرف دعوت دی تھی، باقی کام تو تم نے خود سرانجام دیئے، البتہ اس کے وسوسوں کا زیادہ اثر ان لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے جو شیطان کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔

اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (النحل100)

اس کا زور تو انہیں پر ہے جو اسے دوست بناتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہیں۔

جو لوگ ایمان والے ہیں اور اللہ تعالٰی پر توکل کرتے ہیں، وہ ہر وقت اللہ تعالی کی پناہ مانگتے ہیں شیطان مردود سے تو ان پر شیطان کی دعوت کا زور نہیں چلتا، جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال واعمال میں اپنی قوت ارادی کے بجائے اللہ تعالی پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچانے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراض نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اللہ تعالی کے ساتھ غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا اور ہر برائی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

ذیل کی آیات میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (النحل98)

شیطان سے پناہ مانگنا صرف تلاوت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر نیک کام کے وقت پناہ مانگ لی جائے، تو ان شاء اللہ شیطانی اثرات سے حفاظت رہے گی

سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ لے۔

گناہ کی خواہش نفس اور شیطان کے اثرات سے بڑے بڑے پرہیزگاروں کو بھی ہوتی ہے لیکن وہ اس کا علاج اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ تعالی کا ذکر کرتے ہیں، اس سے مدد مانگتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں حاضری کا دھیان کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، یعنی ان کو گناہ کی حقیقت نظر آجاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ گناہ سے بچ جاتے ہیں اور اگر کبھی غلطی ہو بھی جائے تو توبہ کی توفیق ہو جاتی ہے۔

عزازیل ابلیس کا سابقہ نام تھا۔ بغاوت اور گناہ میں پڑنے سے پہلے اسے اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ پس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ بے ادبی و بے حیائی، غصے اور نقصان کا باعث بنتی ہے۔

مثنوی مولانا۔دفتر اوّل۔بخش ۵

ملاقات پادشاہ با طبیبِ الٰہی کہ در خوابش دیدہ بود و بشارت بقدومِ او دادہ شد

بادشاہ کی ملاقات اس طبیب سے جس کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی آمد کی بشارت اس کو دی گئی تھی

ہیلو پیارے دوستو!

پچھلے ابواب میں ہم نے دیکھا کہ ایک بادشاہ کو ایک لونڈی سے پیار ہو گیا اور اسے محل میں لانے کے بعد لونڈی بیمار ہو گئی اور کسی دوا نے اسے ٹھیک نہ کیا یہاں تک کہ بادشاہ نے خدا کی طرف رجوع کیا اور خواب میں ایک بوڑھے کو دیکھا جس نے اسے خوشخبری دی کہ کل رب العالمین کی طرف سے ایک ڈاکٹر آئے گا، جو اس کی نوکرانی کے درد کا علاج کر دے گا... اور کل ڈاکٹر آئے گا۔

بادشاہ کی ملاقات اس طبیب سے جس کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی آمد کی بشارت اس کو دی گئی تھی۔

شہ چو پیشِ میہمانِ خویش رفت

شاہ بود و لیک بس درویش رفت

یہ شعر ایرانی شائع شدہ مثنوی میں نہیں۔

شہ: بادشاہ۔۔۔ پیش مہمان: مہمان کے سامنے۔۔۔ رفت: گیا۔۔۔ بود و لیک: لیکن، مگر اس کے سامنے تھا۔

اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ شاہ اور درویش مے درمیان

ترجمہ: بادشاہ جب اپنے مہمان کے پاس گیا اگرچہ کہ وہ بادشاہ تھا لیکن اس کے سامنے عجز وانکسار سے بالکل ایک درویش بن گیا۔

عجز وانکساری: قلب وجان سے خود کو کمتر وحقیر سمجھتے ہوئے اپنے قول وفعل سے اس عاجزی وانکساری کا اظہار کرنا۔ فیض القدیر میں ہے: لوگوں کے لئے ان کی طبیعتوں اور مقام ومرتبے کے اعتبار سے نرمی کا پہلو اختیار کرنا اور خود کو حقیر وچھوٹا خیال کرنا عاجزی و اِنکساری کہلاتا ہے۔ (فیض القدیر، ج1، ص599، تحت الحدیث:925)

عجز وانکساری کے حصول کا طریقہ

اپنی تخلیق پر غور وفکر کرنے والا ہر ذی شعور عاجزی وانکساری کا پیکر ہو گا۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (الدھر:2) بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے۔

اب اس تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والا اور اس کا شعور رکھنے وال شخص بھلا کیونکر تکبر کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ وہ شخص قلب وجان سے خود کو کمتر وحقیر سمجھتے ہوئے اپنے قول وفعل سے اس امر کا ضرور اظہار کرے گا۔ اگر وہ دوسروں پر نیکی وتقویٰ، علم وعمل، مال ودولت، جاہ ومنصب اور عزت وشہرت میں فضیلت وبرتری رکھتا ہو تو اپنی برتری کے اظہار کے بجائے اپنی حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے خود کو کمتر سمجھے۔ (اعمال کی قبولیت سے ناواقفیت رکھنے کی بنا پر کوئی بھی شخص نیکی اور تقویٰ کا دعویٰ تو کر بھی نہیں سکتا)۔ لہذا بھلائی اسی میں ہے کہ افضل ہو کر بھی خود کو معمولی ظاہر کیا جائے، اعلیٰ ہو کر بھی خود کو ادنیٰ ظاہر کیا جائے، عالم ہو کر بھی خود کو طالبعلم سمجھا جائے، نیک وپارسا اور متقی وپرہیز گار بننے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی خود کو گنہگار سمجھا جائے۔

نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی تواضع عجز وانکساری کا واضح اور بے مثل نمونہ تھی۔ آپ نے عوامی معیارِ زندگی سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی خاص اور امتیازی شکل اپنانے کے روادار نہ ہوئے۔ حضرت ابو امامہ بیان کرتے ہیں:

قال خرج علینا رسول اللہ ﷺ متولئا علی عصا فقمنا لہ فقال لا تقوموا کما تقوم الاعاجم بعظھم بعضھم بعضا وقال انما انا عبد آکل کما یاکل العبد واجلس کما یجلس العبد. سنن ابی داؤد، 5/398) (سنن ابن ماجہ، 2/1661)

رسول اللہ ﷺ عصا مبارک کا سہارا لئے ہوئے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم سب آپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا عجمیوں کی طرح اس طرح نہ کھڑے ہوا کرو اس لئے وہ یونہی ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس منع کرنے کی وجہ یہ بیان کی میں تو ایک بندہ ہوں میں اسی طرح کھاتا ہوں جیسے کوئی عام آدمی کھاتا ہے اور اسی طرح بیٹھتا ہوں جیسے کوئی عام آدمی بیٹھتا ہے۔

ایک اور مقام پر آپ ﷺ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللہَ اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْ تَوَاضَعُوا حَتّٰی لَا یَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ ۔ اللہ پاک نے میری طرف وحی فرمائی کہ تم لوگ عاجزی اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی بھی دوسرے پر فَخْر نہ کرے۔ (مسلم، ص1174، حدیث:7210)

عجز و انکساری پر چند احادیث طیبہ

1. عاجزی اختیار کرو اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھا کرو اللہ کریم کی بارگاہ میں بڑے مرتبے کے حامل بندے بن جاؤ گے اور تکبّر سے بھی بَری ہو جاؤ گے۔ (کنز العمال، جزء3، ج2، ص49، حدیث:5722)
2. علم سیکھو، علم کے لئے سکینہ (اطمینان) اور وَقار سیکھو اور جس سے علم سیکھو اس کے لئے تواضُع اور عاجزی بھی کرو۔ (معجمِ اوسط، ج4، ص342، حدیث:6184)

درویش دو لفظوں سے مل کر بنا ہے "دُر" جس کا معنی ہے موتی اور "ویش" جس کا معنی ہے بکھیرنا۔ ایسی بات لکھنے والا، بتانے والا جس سے معرفت کے سُچے موتی بکھر جائیں اور جہاں بکھریں، وہاں صرف وہ معرفت ہی نہیں، معرفت کا گلستان آباد ہو جائے۔ اسے درویش کہتے ہیں۔

بقول سلطان باہو،

"دُرویش بن، دَر پیش نہ بَن۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ درویش کا کام ہے کہ معرفت کے موتی کو یعنی جو اس نے بکھیرنا ہے، طالب کے دل میں مانندِ گلزار نچھاور کر دے۔ درویشی، فقیری یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان دونوں لفظوں میں سارے جہاں پوشیدہ ہیں۔ یعنی جو درویش ہوتا ہے،

درویشی حاصل کرنے کے بعد اس کی منزل فقیری ہوتی ہے۔ اور آگے فقراء کے بہت سارے مقامات ہیں۔ جو صوفیائے کرام میں درجہ بندی ہے۔

"فضلنا بعضهم علىٰ بعض"

کے مطابق بعض فقیر ان مقامات سے بری ہوتے ہیں۔ یعنی عاشق فقیر کا مرتبہ سب سے اونچا ہے۔

بقول سلطان باھو:

"غوث قطب رہن اُریرے، عاشق جان اگیرے۔۔۔ ھُو۔"

فقیر کا کلام واقعی مافوق الفطرت ہوتا ہے۔ اور فقیر کو فقیر ہی سمجھتا اور جانتا ہے۔ سمجھنا آسان، جاننا مشکل ہے۔ سمجھنا فقط ذہن کی حد تک اور جاننا دل سے نہیں بلکہ نفس، قلب، روح، سِرّ، خفی، اور اخفیٰ روح اور سِرّ، نفس، خفی اور اخفیٰ تک ہوتا ہے۔

تو فقیر کو فقیر اس لئے سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ فقیر نفس، قلب، روح، سِرّ، خفی، اور اخفیٰ روح اور سِرّ، نفس، خفی اور اخفیٰ سے جب تک واقف نہ ہو جائے، تب تک وہ فقیر نہیں ہوتا۔ اور وہی بات کہ درویش نہیں ہوتا، دَر پیش ہوتا ہے جو در در کتّے کی مانند سر گرداں رہتا ہے۔ بس فقراء کو پہلے مجاہدہ اس کے بعد مشاہدہ، پھر حضوری نصیب ہوتی ہے جو کسی شیخِ کامل کی نظرِ خاص اور توجۂ خاص کے بغیر مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

با عاشقان شیدا، سلطان کجا بر آید؟

در پیش آشنایان بیگانہ ای چہ سنجد؟

دیوانے عاشقوں کے ساتھ سلطان کہاں جائے گا؟

بے گانوں کے جاننے والوں کے سامنے کیا کروگے؟

ایرانی

دَست بُگشاد وکِنارانَش گرفت

پاکستانی

دَست بُکشاد و کِنارانَش گرفت
ہَمچو عِشقُ اَنْدَر دِل و جانَش گرفت

کنار: بغل۔۔۔ دست بگشاد: کھلے ہاتھ۔۔۔ کنار انش گرفت: یعنی کئی بار بغل گیر ہوا۔ اس میں الف نون زائد ہے۔ ہمچو عشق: محبت کی طرح۔۔۔ دل و جانش گرفت: اس نے اپنے دل و جان کے ساتھ پکڑا۔۔۔ مہمان کی دل نشینی کو عشق سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ترجمہ: ہاتھ پھیلا کر اس سے بار بار ہمکنار ہوا (معانقہ کیا)۔ عشق کی طرح اس کو اپنے دل و جان میں جگہ دی۔

جب خدا کا ولی اور طبیب بادشاہ کے پاس آیا تو بادشاہ نے بازو کھول کر اسے گلے لگا لیا۔ دوسرے بند میں وہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ گلے ملنا محض ایک خارجی معاملہ اور روایت نہیں تھی بلکہ بادشاہ کو اس سے محبت ہو گئی۔ اس کا دل اور روح اور یہ گلے اس محبت کا ظاہری اور جسمانی مظہر تھا۔

لفظ درویش جملے کی ساخت میں موجودہ دور کا کردار دیکھنا ہے۔ یعنی بادشاہ ہونے کے باوجود بظاہر غربت اور بے بسی میں مہمان کے پاس گیا۔ (غریب اس لئے کہ گویا اس کی متاع ہی لٹ گئی تھی)۔ دوسرا مصرعہ تشبیہ ہے۔ یعنی جس طرح محبت روح و قلب میں رکھی جاتی ہے بادشاہ نے مہمان کو گلے لگایا اور جس طرح محبت روح و قلب میں ڈالی جاتی ہے اسی طرح بادشاہ نے مہمان کو روح و قلب میں رکھا یعنی اس کی محبت اور عزت کو دل اور روح میں رکھا۔ اور

پادشاہ دستانش را باز کرد و طبیب الھی را بہ آغوش گرفت...

بادشاہ نے بازو کھولے اور طبیب کو گلے لگالیا۔

اب معاشرے میں رائج غلط کلچر کی وجہ سے ہم ملنے والے لوگ نہیں رہے، اور جب ہم ملتے ہیں تو صرف ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اگرچہ انسانوں کے درمیان سب سے زیادہ موثر اور صاف کرنے والا رشتہ چھونے اور گلے ملنے والا ہے؛ دراصل لمس پورے ذہن کی یاد میں موجود ہوتا ہے اور جب لوگ ایک دوسرے کو گلے ملتے ہیں تو ان کے درمیان محبت اور پیار پیدا ہوتا ہے۔ جو اب ناپید ہوتا جارہا ہے۔

تصوف کی ثقافت میں بوسہ لینے، چھونے اور پیار کرنے کے رواج ہیں جن کی وضاحت میں یہاں کروں گا۔ اگر آپ یہ طریقے اور آداب استعمال کریں گے تو آپ کے تعلقات بہت بہتر ہوں گے...

بعض اوقات میاں بیوی آپس میں جھگڑتے ہیں اور چونکہ مرد عقلی اور عورت جذباتی برتاؤ کرتی ہے اس لیے یہ گفتگو کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی۔ لیکن یہی کافی ہے کہ یہ دونوں لوگ دو دلائل کے بیچ میں ایک دوسرے کو گلے لگا کر چھولیں۔ چند منٹوں کے بعد، پوری کہانی ہی ختم ہو جائے گی۔ تو رشتوں میں مصفی ہونے کا ایک بہت اچھا طریقہ ہاتھ ملانا، گلے ملنا ہے۔ جب آپ کا کسی سے شدید اختلاف ہو، تو آپ اسے گلے لگائیں گے تو اختلافات دور ہو جائیں گے.

چھونے، ہاتھ پکڑنے اور چومنے کے کچھ آداب یہ ہیں

انسانوں کے ہاتھ میں شفا، برکت اور اہم توانائی جیسی بہت سی توانائی ہوتی ہے اور یہ توانائیاں ہتھیلیوں کے چکروں کے ذریعے خارج ہوتی ہیں۔ جب آپ کسی کا ہاتھ ہلاتے ہیں تو آپ کسی نہ کسی طرح اس کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں اور اسے توانائی دیتے ہیں۔ یہ توانائی ہر طرف شامل ہوتی ہے اور ان کے درمیان توانائی کا ایک بہت اچھا چکر پیدا ہوتا ہے. محبت، الفت اور یگانگت ہیدا ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں مصافحہ کرنے کے کئی انداز ہیں۔ مصافحہ کرنے کا پہلا طریقہ وہ ہے جس طرح سے دو افراد مصافحہ کرنا چاہتے ہیں، جس کا تعلق برابر کے لوگوں سے ہے۔

ایک اور طریقہ اور رسم ہے جسے ہاتھ چومنا کہا جاتا ہے،

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب دو افراد مصافحہ کرتے ہیں تو وہ اپنے سروں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں، ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اور پھر ایک دوسرے کے ہاتھ چومتے ہیں۔

یہ طریقہ ہاتھ چومنے کا صحیح طریقہ ہے اور یہ رشتہ و تعلق کی خوبصورتی کا شاندار احساس دیتا ہے۔

براہِ کرم کسی کا ہاتھ اس طرح مت چومیں کہ وہ آپ سے اونچا ہو کیونکہ تمام ہاتھوں پر صرف اللہ کا ہاتھ ہے۔

جب آپ کسی سے مصافحہ کریں تو اپنا ہاتھ دوسری طرف سے اونچا نہ رکھیں۔ کیونکہ آپ غربت اور عاجزی سے باہر نکلتے ہیں۔ اپنا ہاتھ نیچے یا متوازی رکھیں تاکہ فخر اور غلبہ کا احساس نہ ہو اور آپ میں عاجزی کا جذبہ پیدا ہو.

کسی بوڑھے عالم یا استاذ یا شیخ کی خدمت میں ہاتھ چومنا جو بوڑھا ہو یا بڑا ہو۔ تاہم، جب آپ استاد کے ہاتھ کو چومتے ہیں، تو استاد آپ کی پیشانی کو چومتا ہے اور یہ روحانی روشنی کے بہاؤ میں بہت مؤثر ہے. لیکن شرط یہ ہے کہ شہوت نہ ہو بلکہ الفت ہو۔

پیشانی کو چومنا ان چیزوں میں سے ایک ہے جو آپ کے چہرے کی روشنی کو بہت زیادہ بڑھا سکتی ہے، اور جو لوگ روشنی کی سائنس سے واقف ہیں، وہ ایک دوسرے کے ماتھے کو چوم کر اپنی بینائی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

دو بھنوؤں کے درمیان، جو آج تیسری آنکھ کے نام سے مشہور ہے، بوسہ لینے کے لیے موزوں جگہ ہے. جو لوگ نمازی ہیں ان کی پیشانی کے اس حصے میں روشنی ہوتی ہے، اور بوسہ لینے سے اس حصے کی روشنی زیادہ متحرک ہوتی ہے.

ان روایات کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے بھی روایتیں ہیں کہ پیشانی کو چومنے سے آپ کے وجود کا نور تقویت پاتا ہے ۔ آئیں دیکھیں کہ اسلام میں گلے ملنا جسے معانقہ کہتے ہیں کے بارے کیا عمل ہے۔

معانقہ

معانقہ کا مفہوم عربی زبان میں صرف یہ ہے کہ 'جَعَلَ یَدَیۡهِ عَلٰی عُنُقِهٖ وَ ضَمَّهٗ اِلٰی صَدۡرِهٖ۔' (المنجمد) اپنے دونوں ہاتھوں کو دوسرے کی گردن پر کر کے اسے سینہ سے ملا لینا۔ دراصل کچھ لوگ اسلام کے نام پر اسلامی تعلیمات کو ہی بدعت اور شرک کا نام دے کر مسلمانوں کو اصل اسلام سے دور لے جانے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں جبکہ یہ ان کی شیطانی سوچ ہے۔ شاید وہ چند لوگوں

کو تو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اللہ تعالی اپنے محبوب ﷺ کی سنتوں کو امت کے سواد اعظم کے ذریعے قیامت تک زندہ رکھے گا۔

آیئے اب معانقہ (گلے ملنا) کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ بدعت ہے یا سنت مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے؟

احادیث درج ذیل ہیں:

1۔حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيل، حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ يَحْيَى بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبَّادٍ الْمَدَنِيُّ، حَدَّثَنِي أَبِي يَحْيَى بْنُ مُحَمَّدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاق، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُسْلِمٍ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: " قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِينَةَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِي، فَأَتَاهُ فَقَرَعَ الْبَابَ، فَقَامَ إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرْيَانًا يَجُرُّ ثَوْبَهُ، وَاللَّهِ مَا رَأَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ فَاعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ "، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ، لَا نَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ الزُّهْرِيِّ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ.(امام ترمذی، السنن، 72:5، باب: ماجاء فی المعانقہ والقبلہ، رقم: 2732، دار الفکر، بیروت)

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ زید بن حارثہ مدینہ آئے)اس وقت (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے، وہ آپ کے پاس آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، تو آپ ان کی طرف ننگے بدن اپنے کپڑے سمیٹتے ہوئے لپکے اور قسم اللہ کی میں نے آپ کو ننگے بدن نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد دیکھا ۱(یعنی کسی کے استقبال میں آپ ﷺ کو اس حالت و کیفیت میں نہیں دیکھا جو حالت و کیفیت زید بن حارثہ سے ملاقات کے وقت تھی کہ آپ ﷺ کی چادر آپ ﷺ کے کندھے سے گر گئی تھی اور آپ ﷺ نے اسی حالت میں ان سے معانقہ کیا۔)، آپ ﷺ نے)بڑھ کر (انہیں گلے لگالیا اور ان کا بوسہ لیا۔ یعنی فاعتنقہ وقبلہ. پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں گلے لگایا اور ان کا بوسہ لیا۔

2۔وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِينَةَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِي فَأَتَاهُ فَقَرَعَ الباب فقامَ إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرْيَانًا يَجُرُّ ثَوْبَهُ وَاللَّهِ مَا رَأَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ فَاعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ وہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرطِ محبت سے (اپنا کپڑا گھسیٹتے ہوئے، قمیص پہنے بغیر، اس کی طرف چلے، اللہ کی قسم! میں نے اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد آپ کو قمیص کے بغیر دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے گلے لگایا اور اس کا بوسہ لیا۔

3۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيل, حَدَّثَنَا حَمَّادٌ, أَخْبَرَنَا أَبُو الْحُسَيْنِ يَعْنِي خَالِدَ بْنَ ذَكْوَانَ, عَنْ أَيُّوبَ بْنِ بُشَيْرِ بْنِ كَعْبٍ الْعَدَوِيِّ, عَنْ رَجُلٍ مِنْ عَنَزَةَ, أَنَّهُ قَالَ لِأَبِي ذَرٍّ: حَيْثُ سُيِّرَ مِنَ الشَّامِ: إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَسْأَلَكَ عَنْ حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ, قَالَ: إِذًا أُخْبِرُكَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ سِرًّا, قُلْتُ: إِنَّهُ لَيْسَ بِسِرٍّ, هَلْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَافِحُكُمْ إِذَا لَقِيتُمُوهُ؟ قَالَ: مَا لَقِيتُهُ قَطُّ إِلَّا صَافَحَنِي, وَبَعَثَ إِلَيَّ ذَاتَ يَوْمٍ وَلَمْ أَكُنْ فِي أَهْلِي, فَلَمَّا جِئْتُ, أُخْبِرْتُ أَنَّهُ أَرْسَلَ لِي, فَأَتَيْتُهُ وَهُوَ عَلَى سَرِيرِهِ, فَالْتَزَمَنِي, فَكَانَتْ تِلْكَ أَجْوَدَ وَأَجْوَدَ."

قبیلہ عنزہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ اس نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے جب وہ شام سے واپس لائے گئے کہا: میں آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پوچھنا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا: اگر راز کی بات نہ ہوئی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا، میں نے کہا: وہ راز کی بات نہیں ہے) پوچھنا یہ ہے (کہ جب آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تھے تو کیا وہ آپ سے مصافحہ کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: میری تو جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی آپ نے مجھ سے مصافحہ ہی فرمایا، اور ایک دن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا، میں گھر پر موجود نہ تھا، پھر جب میں آیا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا تھا تو میں آپ کے پاس آیا اس وقت آپ اپنی چارپائی پر تشریف فرما تھے، تو آپ نے مجھے چمٹا لیا، یہ بہت اچھا اور بہت عمدہ طریقہ ہے۔ یعنی

فالتزمنی، فکانت تلک اجود واجود

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے گلے لگالیا۔ یہ منظر نہایت عمدہ تھا، نہایت عمدہ تھا۔

ابو داؤد، السنن، 4:395، باب فی المعانقۃ، رقم: 5214، دار الفکر بیروت.

4۔حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ ,حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ ,عَنْ أَجْلَحَ ,عَنِ الشَّعْبِيِّ "أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَقَّى جَعْفَرَ بْنَ أَبِي طَالِبٍ ,فَالْتَزَمَهُ وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ."

شعبی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملے تو انہیں چمٹالیا یعنی معانقہ کیا اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔

ابوداوٗد، السنن، 4:397، باب فی قبلۃ مابین العینین، رقم: 5220.

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا مصافحہ اور معانقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔ جو اس کو بدعت کہے وہ لوگوں کو سنت مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور کررہاہے۔ اگر معانقہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے تو پھر عید کے دن یا عام دنوں میں اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

محبت رنگ دے جاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے

مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

ایرانی

دست و پیشانیش بُوسیدن گرفت

وَزْ مُقام وراہُ پُرسیدن گرفت

دست وپیشانیش بُو سِیدن گرفت

وَزْ مُقام ورَاہ پُرسیدن گرفت

دست وپیشانش:اس کے ہاتھ اور ماتھا۔۔۔بوسیدن:چامنا۔۔۔مقام وراہ:جگہ اور راستہ۔۔۔پرسیدن:پوچھنا

ترجمہ:اس کا ہاتھ اور ماتھا چومنے لگا اور مقام اور راستے کا حال پوچھنا شروع کیا۔

بادشاہ نے طبیب سے راستہ اور رہائش کے بارے میں پوچھا، اور اس طرح اس نے طبیب الٰہی سے گفتگو کا آغاز کیا تا کہ دونوں ایک دوسرے کا قرب محسوس کریں۔

اور یہ آداب کا حصہ ہے؛ اگر کوئی شخص اچھے اخلاق کا حامل ہو تو وہ جلدی سے جو علم اور روحانیت رکھتا ہے اسے لے سکتا ہے!

ایک بدتمیز اور مغرور شخص، اگر اس نے عمر رسیدہ شخص کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تو وہ بزرگ کے علم سے محروم ہو جائے گا!

بادشاہ نے حکیم الٰہی کا استقبال کیا، بازو کھول کر گلے لگایا اور اپنے دل وجان میں محبت کی طرح بٹھا دیا۔

شعر نمبر 69 میں جناب رومیؒ نے بزرگ کو غیر موجود کہا تھا اور اوپر والے شعر میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بادشاہ اسے اپنی بانہوں میں پکڑ کر اپنے دل وجان میں جگہ دیتا ہے اور حقیقت میں وہ مادے اور معنی کو ملا دیتے ہیں۔

مولانا رومؒ علم الاخلاقیات نہایت ہی احسن انداز سے بیان فرما رہے ہیں۔ مقصود تربیت کرنا ہے۔ کہانی کو اس نہج پر لے آئے ہیں کہ

بڑوں کے ادب کا ایک روشن پہلو بیان فرما رہے ہیں۔

اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور اللہ تعالی نے اس دین کو قیامت تک کے آنے والے تمام انسان اور جنوں کیلئے روشن شاہراہ اور دنیا وآخرت میں نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسلام نے جہاں عبادات پر جمے رہنے کی تاکید کی ہے وہیں اخلاقیات ومعاملات پر بھی

انسانوں کی رہنمائی کی ہے، اور عبادات کے بعد سب سے زیادہ اخلاقیات و آداب پر زور دیا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے آداب سکھلاتے ہوئے کم عمر اور چھوٹے بچوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے سے بڑوں کا احترام کریں ان کی توقیر کریں، اور ان سے زبان درازی نہ کریں، اور ایسے ہی بڑوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے سے کم عمروں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کریں۔

بزرگوں کے ادب واحترام کی بیشمار صورتیں کتاب و سنت نے بیان کی ہیں ان ہی میں سے ایک صورت یہ ہیکہ انسان ادباو احتراما اپنے والدین، بڑے بھائی، بہن، چچا، ماموں، عادل حکمراں، عابد و زاہد علما کرام اور اساتذہ کے سر و پیشانی اور ہاتھ کا بوسہ دے سکتا ہے، جیسا کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَآهَا [أي: ابنته فاطمة رضي الله عنها] قَدْ أَقْبَلَتْ رَحَّبَ بِهَا، ثُمَّ قَامَ إِلَيْهَا فَقَبَّلَهَا، ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِهَا فَجَاءَ بِهَا حَتَّى يُجْلِسَهَا فِي مَكَانِهِ، وَكَانَتْ إِذَا أَتَاهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحَّبَتْ بِهِ، ثُمَّ قَامَتْ إِلَيْهِ فَقَبَّلَتْهُ، وَأَنَّهَا دَخَلَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ الَّذِي قُبِضَ فِيهِ، فَرَحَّبَ وَقَبَّلَهَا

ترجمہ: اللہ کے نبی ﷺ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے ہوئے دیکھتے تو کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھتے ان کا استقبال کرتے اور ان کا ہاتھ تھام لیتے اور ان کو بوسہ دیتے اور اپنی بیٹھنے کی جگہ پر ان کو بٹھاتے، اور رسول اللہ ﷺ جب ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے پاس لپک کر پہنچتیں، آپ ﷺ کا ہاتھ تھام لیتیں، آپ کو بوسہ دیتیں، اور اپنی جگہ پر بیٹھاتیں، اور آپ ﷺ کے مرض الموت میں آپ کے پاس آئیں تو آپ نے انکا استقبال کیا اور بوسہ دیا (بخاری الادب المفرد / 947، ابو داود / 5217، ترمذی / 3827، علامہ البانی نے ادب المفرد کی تخریج میں صحیح کہا ہے / 947، 729)۔ ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ))

لَمَّا قَدِمَ جَعْفَرٌ مِنْ هِجْرَةِ الْحَبَشَةِ، تَلَقَّاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَانَقَهُ، وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ۔

ترجمہ: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ کی ہجرت سے لوٹے اور نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی آپ ﷺ نے انہیں چمٹالیا (معانقہ کیا) اور ان کے دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ (ابو داود / 5220، السلسلہ الصحیحہ / 2657)۔ اس تعلق سے ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ **فَأَخَذَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِبْرَاهِيمَ، فَقَبَّلَهُ وَشَمَّهُ**

ترجمہ: اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر بوسہ دیا اور سونگھا۔(صحیح بخاری/1303)

ایسے ہی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں : أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رضی الله عنه لَمَّا تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صلَّى الله عليه وسلَّم كَشَفَ عَنْ وَجْهِهِ، ثُمَّ أَكَبَّ عَلَيْهِ فَقَبَّلَهُ

ترجمہ: جب اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوئی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرے مبارک سے چادر ہٹایا اور جھک کر کے آپ کے چہرے مبارک کا بوسہ لیا۔(صحیح بخاری/1241)۔ سلف صالحین سے بھی سر اور ہاتھ کا بوسہ دینا ثابت ہے جیسا کہ حضرت عبد الرحمن بن رزین فرماتے ہیں کہ ہم (ربذہ) نامی مقام سے گزر رہے تھے، ہمیں خبر دی گئی کہ یہاں حضرت سلمہ بن اکواع رضی اللہ عنہ موجود ہیں، ہم ان کے پاس آئے اور سلام کیا، انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکالے اور فرمایا کہ انہیں ہاتھوں سے میں نے اللہ کے رسول ﷺ کی بیعت کی ہے، انہوں نے اپنی ہتھیلی نکالی ان کی ہتھیلی بہت بھاری تھی ہم کھڑے ہوئے اور ان کی ہتھیلی کا بوسہ دیا۔(بخاری الادب المفرد/973 وحسنہ الالبانی)۔

دور حاضر کے کچھ معروف مشہور علما کرام کے آراء پیش کرتے ہیں جس سے مسئلہ مزید واضح ہو جائے گا، شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کہتے ہیں:" قابل احترام شخصیت کے ہاتھ عزت افزائی کرتے ہوئے چومنے میں کوئی حرج نہیں، جیسے کہ والد، عمر رسیدہ بزرگ، اور استاد وغیرہ، ہاں اگر کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو پھر جائز نہیں، مثال کے طور پر جس کہ آپ ہاتھ چوم رہے ہو وہ خود پسندی کا شکار ہو جائے، اور یہ سمجھنے لگے کہ وہ بلند مرتبے پر فائز ہے، تو اس خرابی کی وجہ سے ہم اسکو منع سمجھیں گے "ماخوذ از:"لقاء الباب المفتوح"

ابن جبرین رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ہاتھ کو چومنے کا کیا حکم ہے؟ اور قابل قدر شخصیت کے ہاتھ چومنے کا کیا حکم ہے جیسے استاد وغیرہ؟ اسی طرح چچا، اور ماموں اور دیگر عمر رسیدہ افراد کے ہاتھ پر بوسہ لینے کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:" اگر احترام اور عزت افزائی کیلئے ہو تو ہم والدین، علماء، قابل قدر شخصیات، اور رشتہ داروں میں سے عمر رسیدہ افراد کیلئے اسے جائز سمجھتے ہیں، ابن الاعرابی نے ہاتھ وغیرہ کا بوسہ لینے کے بارے میں ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے۔

اس میں راز کی بات یہ ہے کہ پیشانی میں انسان کے لطائف میں سے ایک لطیفہ کا مقام ہے۔ جب کوئی اس جگہ پر بوسہ دیتا ہے تو اس سے دو فوائد میسر آتے ہیں اگر شیخ پیشانی کو بوسہ دے رہا ہے تو اسکی انرجی مرید کے لطیفہ کو بیدار کرتی ہے۔ اور اگر مردی یہ کام

کرے تو اس سے اسے محبت شیخ میسر آتی ہے۔ جس سے اس کے اندر جذبہ محبت بیدار ہوتا ہے جس کی وجہ سے توجہ شیخ نصیب ہوتی ہے۔

ایرانی

پُرسْ پُرسانْ می کَشیدَش تا بہ صَدْر
گفت گنجی یافتم آخِر بہ صَبر

پاکستانی

پُرسْ پُرسانْ مے کَشیدَش تا بہ صَدْر
گفت گنجے یافتم آخِر بہ صَبر

پرس: پوچھا۔۔ کشیدش: اسے کھینچ لیا۔۔ تابہ صدر: صدر کی جگہ کی جانب۔۔۔۔ گفت: کہتا تھا۔۔ گنجی: مجھے خزانہ۔۔۔
یافتم: میں نے ڈھونڈا۔۔ آخر بہ صبر: صبر کے ساتھ

اس شعر میں گنج استعارہ ہے مہمان کی تشریف آوری سے۔

ترجمہ: پوچھتا پوچھتا اس کو صدر کی جگہ تک لے جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ مجھ کو گویا خزانہ مل گیا ہے آخر بڑے صبر کے ساتھ۔

حال احوال پوچھنے کے امتزاج کا اب ایک کردار ہے۔ صدر کا مطلب مجلس کی سب سے اوپر کی جگہ ہے۔ جب وہ اس سے باتیں کر رہا تھا تو بادشاہ اسے مجلس کے اوپر لے گیا اور یہ کہہ کر شکریہ ادا کیا کہ مجھے صبر کی بدولت ایک خزانہ مل گیا ہے۔

مہمان کے بارے میں ایک قانون ہے کہ ایک دن جو مہمان اپنے ساتھ لاتا ہے تو وہ گویا آپ کے گھر سے اداسی لے جاتا ہے۔ یعنی اداسی دور کر دیتا ہے۔

تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ جو لوگ مہمان نواز نہیں ہیں اور اکیلے رہتے ہیں ان کی زندگی کم ہوتی ہے اور وہ دل کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن جن کے ہاں مہمان زیادہ آتے ہیں ان میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر مہمان کی خدمت اللہ کی رضا کے لئے کی جائے تو اس میں برکت ڈال دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں اور ایک نئی راہ میسر آتی ہے۔ لیکن اگر کوئی مجبوری میں مہمان نوازی کرتا ہے تو اس کی مجبوری بڑھا دی جاتی ہے۔

اس شعر میں مولانا رومؒ مہمان نوازی کا طریقہ بتا رہے ہیں۔ سبحان اللہ کیا انداز تربیت ہے۔ آئیں اس بات کو بھی سیرت طیبہ کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔

رسولِ کائنات ﷺ کو اللہ رب العزت نے نسل انسانی کے لیے ایک کامل نمونہ اور اسوہ حسنہ بنا کر دنیا میں بھیجا۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی کو قیامت کی صبح تک کے لیے معیار بنا دیا۔ سیرت طیبہ ﷺ کا ہر گوشہ تابناک اور ہر پہلو روشن ہے۔ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت سے لے کر رحلت تک کا ہر ہر لمحہ اللہ تعالی کی منشاء سے آپ ﷺ کے جانشینوں نے محفوظ کیا۔
ہم اگر عہدِ رسالت کی بات کریں تو آپ ﷺ کے تمام حالات زندگی، معمولات زندگی، طرز حکومت، طرز تعلیم، طرز تبلیغ، انداز واطوار، مزاج ورجحان، حرکات وسکنات، نشست وبرخاست اور عادات وخیالات غرض ہر چیز اس میں شامل ہوگی۔ تاہم ہم کوشش کریں گے کہ اختصار کیساتھ دینی تعلیمات اور محمد مدنی العربی ﷺ کی سیرت کی روشنی میں مہمان نوازی اور اکرام مسلم کے حوالے سے چند اہم نکات آپ کی خدمت میں پیش کریں۔

دنیا کی تمام مہذب قوموں کا شعار ہے کہ وہ مہمانوں کی آمد پر ان کا پر تپاک استقبال کرتی ہیں۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اور ان کی خاطر مدارت کی جاتی ہے۔ ہر ملک اور قوم کے مہمان نوازی کے انداز و اطوار اور طریقے الگ الگ ہیں۔ تاہم یہ بات ایک جیسی ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قومیں مہمان کی عزت اپنی عزت اور مہمان کی توہین اپنی توہین سمجھتی ہیں۔

مہمان نوازی انبیاء علیہم السلام کا شیوہ ہے،

اسلام میں مہمان نوازی کو اخلاقِ حسنہ میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مہمان کا اکرام کرنے کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

۱: قد قال النبی ﷺ: (من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه) رواہ البخاری: ۶۰۱۸، و مسلم: ۴۸۱

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے مہمان کی تکریم کرنی چاہئے۔

۲: و قال: (من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، جائزته. قال: وما جائزته؟ قال: يومه وليلته، والضيافة ثلاثة ايام، فما كان وراء ذلك فهو صدقة عليه.) رواہ البخاری: ۵۳۶۱، مسلم: ۱۶۴۰۔

اور آپؐ نے فرمایا: "جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے، اسے مہمان کی تکریم کرنی چاہئے اور اس کا حق ادا کرنا چاہئے۔ پوچھا گیا: اور اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا: ایک دن اور ایک رات، اور ضیافت تین دن کے لئے ہے، اس کے بعد صدقہ و خیرات ہے"۔ (متفق علیہ) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے:

"لا يحلّ لمسلمٍ أن يقيم عند اخيه حتى يؤثمه. قالوا: يارسول الله! كيف يؤثمه؟ قال: يقيم عنده ولا شيء له يقريه به"۔

کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کے پاس (اتنا زیادہ) ٹھہرے حتی کہ اسے گنہگار کر دے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! اس کو گنہگار کیسے کرے گا؟ آپ نے فرمایا: اس کے پاس ٹھہرا رہے اور اس کے پاس کوئی چیز نہ رہے جس کے ساتھ وہ اس کی مہمان نوازی کرے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روز مہمان کو پر تکلف کھانا کھلایا جائے، میزبان اپنے معمول کے کھانے سے زیادہ اچھا کھانا پیش کرے، اسکے بعد دو دن تک اسے اپنے جیسا کھانا کھلائے، اور اگر مہمان اس سے زیادہ قیام کرے گا تو وہ خرچ اس کے حق میں صدقہ شمار ہو گا۔

ابن قیمؒ زاد المعاد میں اس کی درجہ بندی یوں کرتے ہیں: مہمان کا حق تین مرتب پر ہے، ا۔ واجب (ایک دن اور ایک رات)،

۲۔ مستحب (دوسرا اور تیسرا دن)، ۳۔ صدقہ (اگر مہمان اس کے بعد مزید رکے)۔

المغنی اللبیب (۱۹۔۱۱) میں ہے کہ یہ حقوق اس مہمان کے ہیں جو مسافر ہو، اور دوسرے شہر سے آیا ہو، رہا اپنے علاقے کا مہمان تو اسکی مہمانی کرنا میزبان کا اختیار ہے، چاہے تو اسے کھلائے اور چاہے تو میزبانی قبول نہ کرے

ضیافت کا اصل مقصد پیٹ بھرنا نہیں بلکہ ایک دوسرے سے انسیت پیدا کرنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے شریعت میں نماز باجماعت کو اکیلے شخص کی نماز پر فضیلت دی گئی ہے۔ ضیافت کا دوسرا فائدہ اسلامی آداب سیکھنے کا نادر موقع ہے، جو میزبان اور مہمان دونوں سے متعلق ہیں۔

ضیافت کے آداب کا خیال رکھا جائے تو وہ میزبان پر بوجھل نہیں ہوتی، سورہ الاحزاب میں بھی کچھ آداب سکھائے گئے، ارشاد ہے:

(یاَیّہا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوت النبیّ الّا ان یّوذن لکم الی طعام غیر ناظرین اناہ،ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستانسین لحدیثط) (الاحزاب، ۳۵)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آوٴ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاوٴ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔)

اس بات میں کسی قوم کا بھی اختلاف نہیں کہ آنے والے مہمان کے اعزاز و اکرام میں اس کا پر تپاک استقبال کرنا، اسے خوش آمدید کہنا اور اس کی اپنی حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر ہر ممکنہ خدمت سر انجام دینا اس کا بنیادی حق ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر مہذب قوم کے نزدیک مہمان کی عزت و توقیر خود اپنی عزت و توقیر اور مہمان کی ذلت و توہین خود اپنی ذلت و توہین کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں (مرزا غالب)

یہ کس زہرہ جبیں کی انجمن میں آمد آمد ہے

بچھایا ہے قمر نے چاندنی کا فرش محفل میں

(سید یوسف علی خاں ناظم)

ایرانی

گفت ای نورِ حق و دَفْعِ حَرَج
مَعنِی اَلصَّبْرُ مِفْتاحُ اَلْفَرَج

پاکستانی

گفت اے نورِ حق و دَفْعِ حَرَج
مَعنِی اَلصَّبْرُ مِفْتاحُ اَلْفَرَج

گفت: کہا۔۔ای نور حق: اللہ کے نور۔۔۔دفع: ختم کرنے والا۔۔حرج: تنگی۔۔۔مفتاح: چابی۔۔۔فرج: فراخی، کشائش

ایک حدیث پاک سے اقتباس لیا ہے۔

ترجمہ: بادشاہ نے کہا اے اللہ کے نور، تنگی دور کرنے والے (حدیث پاک میں جو آیا ہے) صبر کشائش کی چابی ہے کا مصداق تو آپ ہی ہو

اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اپنے مہمان سے مخاطب ہے اور اسے یوں کہہ رہا ہے کہ میں نے مصیبت پر بڑا صبر کیا تو اللہ کریم نے اس کے اجر کے طور پر آپ کو میرے پاس بھیج دیا۔ جس کی وجہ سے میری مراد پوری ہو گی۔

ہرج کا مطلب ہے پریشانی اور غم کو دور کرنے والا۔ مہمان کو ایک قول کے مطابق "الصبر مفتاح الفرج" کی مثال دی گئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "صبر تالا کھولنے کی کنجی ہے"۔

شعر کا مفہوم ہے کہ اے عطیہ حق جو خدا تعالیٰ نے تجھے مجھے دیا ہے اور اے تنگی کو دور کرنے والے خدا نے تجھے سختی اور تنگی کو دور کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

آئیں دیکھیں کہ

صبر کیا ہے؟

صبر ایک ایسی اخلاقی قدر اور قوت ہے جو انسان کی منفی قوتوں پر کنٹرول اور مثبت صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ان صلاحیتوں میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ قرآن مجید نے صبر کا یہی معنی متعین فرمایا ہے۔ جناب موسیٰ (علیہ السلام) کی حضرت خضر (علیہ السلام) کے ساتھ گفتگو کے ضمن میں کئی بار یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت خضر (علیہ السلام) کے ساتھ کچھ معاملات کی حکمت جاننے کے لیے ان کے ہمسفر ہوئے تو انہوں نے کئی بار فرمایا کہ جناب موسیٰ! آپ میرے معاملات پر حوصلہ نہیں کر پائیں گے۔ کلیم اللہ نے کہا کہ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ میرے صبر کے بندھن ٹوٹنے نہ پائیں۔ گویا کہ صبر کا معنٰی ہے اپنے آپ پر قابو رکھنا اور مشکل کے وقت استقامت اختیار کرنا۔ تو اس طرح صبر اور استقامت کا تعلق آپس میں چولی دامن کا تعلق بنتا ہے۔ غریب آدمی صبر کا دامن چھوڑ دے تو وہ خودکشی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جو ان کے اندر صبر کی قوت کمزور ہو جائے تو اس سے بے حیائی کی ایسی حرکات ثابت ہوتی ہیں کہ ساری زندگی اسے پچھتاوا رہتا ہے۔ صاحب اقتدار آدمی صبر سے تہی دامن ہو تو وہ اپنے وقت کا فرعون ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہی لوگ صبر و حوصلہ کا مظاہرہ کریں تو زندگی ان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ بہادر اور با اختیار شخص حوصلہ سے کام لے تو کمزوروں کے لیے اللہ کی رحمت ثابت ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے زندگی کے ہر موڑ پر صبر و حوصلے کا حکم دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی دستگیری کی خوشخبری دی ہے۔ صبر کے لیے آپ ﷺ کو یوں مخاطب کیا گیا: (وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا)[المزمل:10] "لوگوں کی دل آزار باتوں پر صبر کرتے ہوئے انہیں اچھے انداز سے چھوڑ دیجیے۔" (وَلَـئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ)[النحل:126] "صبر کا رویّہ اختیار کرو یہ بہترین انجام کی ضمانت ہے۔" (اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ)[الزمر:10] "صبر کرنے والوں کو ہی بغیر حساب کے پورا پورا اجر دیا جائے گا۔"

اہل علم صبر کی تین قسمیں شمار کرتے ہیں

۔1۔ صبر علی الطاعات، 2۔ صبر عن المعصیات، 3۔ صبر علی المصائب 1۔ صبر علی الطاعات کا مطلب ہے اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند کر دینا، نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنا دینا، نفس کو اس قابل بنا دینا کہ خواہشات اسے اپنے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔ امیدیں اور آرزوئیں نفس کو مجبور نہ کر سکیں کہ وہ شریعت کے حکم کو چھوڑ کر امیدوں اور آرزوئوں کی پیروی کرنے لگے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت دل و دماغ اور نفس کے لیے مرغوب ہو جائے اور گناہ اور نافرمانی ان کے لیے مکروہ بن جائے۔ 2۔ صبر عن المعصیات اس کا معنی ہے معصیتوں اور نافرمانیوں سے صبر۔ یعنی آدمی اپنے آپ کو اس طرح مضبوط بنا دے کہ کوئی نافرمانی اس سے سرزد نہ ہونے پائے۔ نافرمانی کے مقابلے میں وہ اڑ جائے۔ اس کے لیے اسے کیسی ہی قربانی دینی پڑے اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ 3۔ صبر علی المصائب مصیبتوں پر صبر۔ نیکی کے راستے میں مصیبتوں کا آنا ایک ایسی اٹل سنت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جو آدمی حق کی علمبرداری کرتا ہے، باطل قوتیں اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور جو شخص نیکی کو اپنا رویہ بنا لیتا ہے، برائی کی قوتیں اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتی یا اسے بہکانے کی کوشش کرتی ہیں۔ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے جو شخص رزق حلال پر اصرار کرتا ہے گھر سے لے کر اس کے دفتر تک کتنے لوگ ہیں جو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ دوست احباب کی مجلس میں جو دوست اپنے دوستوں کے برے ارادوں کا ساتھ نہیں دیتا ان کی بری مجالس کی رونق نہیں بنتا ان کی خواہشات کی تائید نہیں کرتا، ایسے دوست کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ ایسی ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنا اور پیش آمدہ مشکلات کو برداشت کرنا صبر علی المصائب ہے۔ یہ صبر کی مختلف قسمیں ہیں، جس میں قدر مشترک صرف ایک ہے۔ وہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت اور اللہ کی رضا کا حصول یہ وہ عملی وابستگی ہے جو نظریاتی وابستگی سے مل کر انسانی عزم کو مضبوط بناتی ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں باطل سے مقابلہ کرنے کی ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو حق و باطل کے معرکے میں اصل مطلوب ہے۔ جو آدمی بھی یہ چاہتا ہے کہ میں حق و باطل کی آویزش میں اپنی ذمہ داریاں ادا کروں تو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی قوت پیدا کرنی چاہیے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جو نظریاتی پختگی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور عملی طہارت اور پاکیزگی کا بھی۔ اس کے بغیر کبھی آدمی باطل کے مقابلے میں کھڑا نہیں رہ سکتا۔ ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ.

"(اے حبیب!) پس آپ صبر کیے جائیں جس طرح (دوسرے) عالی ہمّت پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور آپ ان (منکروں) کے لیے (طلبِ عذاب میں) جلدی نہ فرمائیں"۔

(الاحقاف، 35:46)

اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ.

"اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے" (لقمان، 17:31)

اسی مضمون کو سورہ النور میں یوں اجاگر کیا۔

وَلۡيَعۡفُوۡا وَلۡيَصۡفَحُوۡا.

"اور ان کا قصور معاف کر دیں اور ان کی غلطی سے درگذر کریں" (النور، 22:24)

قرآن اور تحمل و برداشت

اہل ایمان کو صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی تعلیم دیتے ہوئے سورہ الشوریٰ میں ارشاد فرمایا:

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ.

"اور یقیناً جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ بلند ہمت کاموں میں سے ہے" (الشوریٰ، 43:42)

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ.

"اور صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد چاہو" (البقرۃ، 45:2)

سورہ آل عمران میں ارشاد فرمایا:

اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا.

”صبر رکھو اور آپس میں صبر کی تعلیم دو“(آل عمران،3:200)

وہ لوگ جو صبر، برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کو باری تعالیٰ صابرین کا تکریمی لقب دے کر یوں مخاطب کرتا ہے:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ.

”اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے“(آل عمران،3:146)

صبر اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اس کی توفیق سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ.

”اور (اے حبیبِ مکرّم!) صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا اللہ ہی کے ساتھ ہے“

حدیث رسول صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تحمل و صبر

رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر وبرداشت کے حوالے سے ارشاد فرمایا: امام بخاری نے اسے کتاب المفرد میں روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الصبر مفتاح الفرج۔ (ومنها كتاب "الفرج بعد الشدة" لابن أبي الدنيا المتوفى سنة 281هـ حيث أورد في هذه العبارة شعر لأحمد بن يحيى:

مفتاح باب الفرج الصبر

وكل عسر بعده يسر

وورد بمعناه عدة آثار عن الصحابة كابن عباس -رضي الله عنهما-: (انتظار الفرج بالصبر عبادة)، وابن عمر -رضي الله عنهما-: (انتظار الفرج عبادة)، وجمهور علماء الحديث يضعفون نسبة هذه الأقوال للنبي صلى الله عليه وسلم.)

(ان میں سے ابن ابی الدنیا کی کتاب "فراج بعد از مصیبت" ہے، جن کا انتقال 281 ہجری میں ہوا، جہاں انہوں نے احمد بن یحییٰ کے اس فقرے کا ذکر کیا:

راحت کے دروازے کی کنجی صبر ہے۔

اور ہر مشکل اس کے بعد آسانی ہے۔

اس کے معنی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعدد آثار منقول ہیں، جیسے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما: (صبر کے ساتھ راحت کا انتظار کرنا عبادت ہے)، اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے: (حاجت کا انتظار کرنا عبادت ہے)، اور جمہور محدثین ان اقوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کو ضعیف کہتے ہیں)۔

صبر کشائش و فراخی کا ذریعہ ہے۔ الصبر والسماحۃ صبر کشائش کی چابی ہے۔

النصر مع الصبر فتح و کامیابی صبر کے ساتھ ہے۔

صبر فتح کی کنجی ہے۔

جب بھی ہمیں غصہ آتا ہے، ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم جانتے ہیں کہ فتح کی کنجی صبر ہے تو ہم کبھی کسی سے نہیں لڑیں گے...

آرٹ آف وار کے نام سے ایک کتاب ہے جسے سن زو نے ہزاروں سال پہلے لکھا تھا۔

سن زو ایک فوجی کمانڈر ہے جو کنفیوشس کے دور کا تھا۔

یہ کتاب اب ملٹری سکولوں اور آفیسر کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

اگر آپ اپنے طالب علموں کے لیے کوئی ایسی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں جو آپ کو دوسروں کے ساتھ بہت واضح اور خوبصورتی سے نمٹنے کا طریقہ دکھائے، آرٹ آف وار کتاب بہترین مثال ہے۔

یہ کتاب آپ کو کم لڑنے کا طریقہ سکھاتی ہے...

کتاب آرٹ آف وار کا حصہ

"سو جنگوں میں سو بار جیتنا کوئی بڑا فن نہیں ہے؛ بغیر جنگ کے دشمن کو زیر کرنا ایک فن ہے!"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کمانڈر نے فن کیا ہے اگر وہ بغیر لڑے اپنا کام انجام دے سکتا ہے، ورنہ وہ لڑائی جس میں کوئی ملک اپنے تمام وسائل اور املاک سے محروم ہو جائے وہ فن نہیں ہے۔

سمجھدار لیڈر خود کو جنگ میں شامل نہیں کرتے اور جنگ سے بچنے کے لیے ہزاروں حربے استعمال کرتے ہیں۔

بعض اوقات کچھ ممالک جنگی مشقیں کرتے ہیں اور اپنے میزائل دکھاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس سے پریشان ہیں۔ لیکن یہ شو جنگ کو روکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بہت طاقت ہے، کوئی مجھ سے رجوع نہ کرے!

فطرت میں بھی یہی مسئلہ موجود ہے، مثلاً جانور اپنے دانت دکھاتے ہیں یا پر پھیلا کر کہتے ہیں کہ میں مضبوط ہوں، مجھ سے مت لڑو! جنگ کا فن آپ کو سکھاتا ہے کہ کہاں لڑنا ہے اور کہاں آرام کرنا ہے۔ کبھی کبھی، اگر آپ خاموش رہتے ہیں، تو آپ حالات کو خراب کر دیتے ہیں! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنگ کا وقت کہاں ہے۔ کبھی کبھی جنگ امن کی شروعات ہوتی ہے...

کتاب آرٹ آف وار کا ایک اور جملہ: ایک ناراض جنرل جنگ ہار جاتا ہے۔ جب آپ کو غصہ آتا ہے تو آپ کی ذہانت ایک تہائی رہ جاتی ہے!

میری خواہش ہے کہ اسکولوں میں جنگ کے فن پر کتاب پڑھائی جائے تاکہ بچے یہ سمجھ سکیں کہ دشمن یا دوست کا سامنا کرنے پر کیسے برتاؤ کرنا چاہیے۔ کئی ہزار سال بعد آفیسر کالج میں جو کتاب پڑھائی جاتی ہے وہ یقیناً ایک قیمتی کتاب ہے۔

براہ کرم اس کتاب کو پڑھیں اور اپنی زندگی میں اس کا تجربہ کریں۔

دوسری چیز جس سے حق و باطل کے معرکے میں مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز ہے۔ صبر کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حق و باطل کے معرکے میں پامردی، استقلال، اور استقامت شرط اول ہے۔ اور دوسری یہ چیز کہ صبر کا تعلق جس طرح ثابت قدمی سے ہے اسی طرح نفس کو معصیت سے بچانے اور

نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنانے سے بھی ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں صرف غنیم اور فریقِ مخالف پر بالا دستی اور برتری مقصود نہیں ہوتی بلکہ باطل کی سرکوبی اور حق کی سربلندی بھی مقصود ہوتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس معرکے کا ہر سپاہی اس حق کا پیکر، اطاعت گزار اور علمبردار ہو جس کے لیے وہ اس معرکے میں اترا ہے اور اس کی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس باطل کی پرچھائیں بھی نہ پڑے جس کو وہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ ایسے معرکے میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی جس حق کے لیے معرکہ آرا ہے اس حق کے ساتھ وابستگی بلکہ غائیت درجہ والہانہ تعلق میں کمی نہ آنے پائے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے اور دوسری یہ بات کہ چونکہ باطل کا ایک رنگ نہیں وہ ہزار رنگوں میں زندگی کے بیشتر شعبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سرکوبی کرنا یا اس کا مقابلہ کرنا آدمی کے اپنے وسائل سے ممکن نہیں کیونکہ ہر باطل کے پیچھے شیطانی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے کے لیے ایسے بڑے سہارے اور پشت پناہ کی ضرورت ہے، جس کی مدد میسر آجائے تو شیطانی قوتیں اس کا سامنا نہ کر سکیں۔

ایرانی

ای لِقایِ تو جوابِ ھر سوآل
مُشکل از تو حَل شود بی قیل و قال

پاکستانی

اے لِقائے تو جوابِ ہر سُوال
مُشکِل از تو حَل شَوَد بے قیل و قال

لقائے تو: تجھ سے ملاقات، ملنا۔۔۔ جوابِ ہر سوال: ہر سوال کا جواب۔۔۔۔ قیل و قال: گفتگو، کلام۔۔۔ بے قیل و قال: بغیر گفتگو کے۔

اس شعر میں مبالغہ ہے جو مدح کے لحاظ سے ہے۔

ترجمہ: اے وہ بزرگ کہ جس سے ملاقات ہر سوال کا جواب ہے۔ آپ سے بغیر کسے کلام کے مشکل حل ہو جاتی ہے۔

دراصل مولانا رومؒ مہمان کے بارے یہ فرمانا چاہ رہے ہیں کہ بادشاہ اس بزرگ سے کہہ رہا ہے کہ آپ کے دیدار میں ایک ایسی غائبانہ روشنی ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی دل کے تمام شکوک و شبہات کی تاریکی دور ہو جاتی ہے اور سوال کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آتی۔

اِنسانی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے کہ جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی خدمت کی توفیق حاصل ہو جائے تو اس کی شخصیت اور کردار سے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا پیار و محبت اور عقیدت و اِحترام شخصیت پرستی کے زُمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ ایسے انسان سے عقیدت و محبت در حقیقت اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اُنہی کے پیغام ہی کی برکت ہے کہ جس نے ایک عاجز اِنسان کو اِس قابل بناڈالا کہ دنیا کے لاکھوں لوگ اس سے محبت و عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ جماعتی و تحریکی محبتوں اور اِن جذبوں کے پیچھے در حقیقت اِسلام سے محبت ہی چھپی ہے۔

یہ سُنتِ نبوی پر عمل کی برکت ہوتی ہے کہ لوگ ایک عاجز کو قابلِ احترام سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر اللہ اِس لیے یاد آتا ہے کیونکہ اُس کے چہرے کی نورانیت کے پیچھے نورِ محمدی ہی کا فیض موجود ہوتا ہے۔ حضرت عمرو بن جموحؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَحِبَّائِي وَأَوْلِيَائِي الَّذِيْنَ يُذْكَرُوْنَ بِذِكْرِي، وَأُذْكَرُ بِذِكْرِهِمْ.

(أحمد بن حنبل، المسند، 3:430، رقم: 15588)

”بے شک میرے احباب اور اولیاء وہ لوگ ہیں کہ میرا ذکر کرنے سے وہ یاد آجاتے ہیں اور ان کا ذکر کرنے سے میں یاد آجاتا ہوں (یعنی میرا ذکر ان کی یاد دلاتا ہے اور ان کا ذکر میری یاد دلاتا ہے)“۔

اِسی مضمون کو ’مسند احمد‘ اور ’سنن ابن ماجہ‘ میں یوں روایت کیا گیا ہے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رضی الله عنها، قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی الله علیه وآله وسلم يَقُوْلُ: أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى، يَارَسُوْلَ اللهِ، قَالَ: خِيَارُكُمُ الَّذِيْنَ إِذَا رُؤُوْا، ذُكِرَ الله عزوجل.

(ابن ماجة، السنن، کتاب الزهد، باب من لا يؤبه له، 2:1379، رقم: 4119)

”حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: کیا میں تمہیں تم میں سے بہترین لوگوں کے بارے میں خبر نہ دوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیوں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں کہ جب انہیں دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یاد آ جائے“۔

دین اسلام کے نام پر ساری محبتیں بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچتی ہیں، ہر محبت کے پیچھے محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھپی بیٹھی ہے۔

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان جو بھی دو
جس رخ سے بھی پڑھو گے مجھے جان جاؤ گے

چہرہ میں بڑی برکات رکھی گئی ہیں

چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أخبرنا أبو منصور أحمد بن علي الدامغاني...عن ابن عباس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما من ولد بار ينظر إلى والديه نظرة رحمة إلا كتب الله بكل نظرة حجة مبرورة. قالوا: وإن نظر كل يوم مائة مرة؟ قال: نعم، الله أكبر وأطيب".

(الجامع لشعب الإيمان للبيهقي: ۱۰/۲۴۵)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو صالح اولاد محبت کی نظر سے اپنے والدین کو دیکھے تو اسے ہر نگاہ پر اللہ تعالیٰ ایک مقبول حج کا ثواب بخشتا ہے، لوگوں نے پوچھا: اگر دن میں سو مرتبہ دیکھے تو؟ فرمایا: تب بھی، اللہ بہت بڑا ہے اور بڑا پاکیزہ ہے (یعنی ہر مرتبہ دیکھنے کا ثواب حج مقبول کی صورت میں دے گا۔)

علم حاصل کرنے کے لئے کتابیں پڑھی جاتی ہیں لیکن دنیا کو سمجھنا اور پڑھنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور اس کے لئے انسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ آج کے دور میں باڈی لینگویج روز بروز اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے اس فن کے ذریعے دوسروں کو ایک کھلی کتاب کی مانند پڑھا جاسکتا ہے۔ لوگوں کی جسمانی حرکات وسکنات کے ذریعے شخصیت اور رویوں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ تو گویا عالمی سطح پر بے شمار زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان تمام زبانوں کے باوجود دنیا بھر میں صرف باڈی لینگویج ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں اظہار کے لئے الفاظ و جملوں کی قطعی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ باڈی لینگویج میں انسان کا پورا جسم زبان بن کر جذبات کی غمازی کرتا ہے۔ آدمی کی خاموشی کے باوجود اس کی باڈی لینگویج اس کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انسانی شخصیت کے مطالعے میں باڈی لینگویج اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ کسی کتاب کا پہلا چیپٹر۔ کسی شخص کی باڈی لینگویج اس کی پوری شخصیت اور سوچ کی ڈائریکشن سے آگاہ کر دیتی ہے۔ مولائے رومؒ اس نفسی علم کو بھی بیان فرمارہے ہیں۔

ایرانی

تَرجُمانی ھرچہ مارا در دل است

دست گیری ھرکہ پایش در گِل است

پاکستانی

تَرجُمانِ ہر چہ مارا در دل است

دستگیرِ ہر چہ پایَش در گِل ست

ترجمان: مطلب بیان کرنے والا۔۔۔ دستگیر: سہارا دینے والا۔۔۔ ایش در گل: کیچڑ میں پاؤں یعنی عاجز، بے بس

ترجمہ: تو ہمارے دل کی ہر بات کو بیان کر دینے والا ہے جو شخص (درماندگی کے کیچڑ میں پھنسا ہوا ہو تو اس کا دستگیر ہے۔)

بادشاہ الٰہی طبیب سے کہتا ہے، آپ ہمارے دلوں میں موجود ہر چیز کا ترجمہ کرتے ہیں!

صاف کُن آئینۂ دل از غبار

آتشے زن دل این بیقرار

اپنے دل کے آئینہ کے غبار کو صاف کر دے اور اس بیقرار کے دل میں اللہ تعالیٰ کے عشق کی آگ کو بھڑکا۔

دل صاف ہو تو جلوہ گہہ یار کیوں نہ ہو

آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

کیونکہ اگر دل کا آئینہ صاف ہو، تو اللہ اس پہ عکس بہت سارے اتار تار ہتا ہے۔ بس اس آئینے کو صاف رکھیے!

(بو علی شاہ قلندر پانی پتی)

حافظ صاحبؒ کی کتاب "دیوان حافظ" پڑھ کر آپ اس کا ترجمہ پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ بزرگان دین اس کتاب کو زاد راہ سلوک میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ بڑی عجوبہ کتاب ہے۔ جسب کبھی مشکل پیش آئے یا کوئی راہ لینی ہو تو دل میں ارادہ کر کے اسکو کھولیں۔ بات سامنے میسر ہو گی۔ یعنی حال دل سنانے والی کتاب ہے۔ تو گویا دل میں پنہاں بات کو جان جاتی ہے۔

آپ نے ارادہ کیا اور حافظؒ کو کھولا اور آپ کو لگتا ہے کہ وہ آپ کے دل کا حال جانتا ہے اور آپ کی خواہش کا ترجمہ کر دیتا ہے۔

یعنی یہ تشریح کرتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ آپ کو معلومات فراہم کرتا ہے، جو رازوں کا علم ہے! انسانی زندگی میں بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی آپ کسی سے ملتے ہیں اور آپ کو بغیر پوچھے اس کی باتوں سے اپنا جواب مل جاتا ہے۔

یہ آپ کے لیے ایک قسم کی آگاہی ہو سکتی ہے.

یہاں بادشاہ طبیب سے کہتا ہے: آپ مجھے اس کا جواب دیں جو میں نے نہیں کہا!

جناب مولانا کا مقصد کہانیاں بنانا نہیں ہے۔

یہاں مولانا صاحب نے ہمارے لیے ایک بہت بڑا صوفیانہ کلام کھولا ہے، جو طریقت سے ہیں وہ رہنمائی سمجھیں گے۔

جب بھی اللہ کے ولیوں میں سے کوئی ہمارا ہاتھ پکڑتا ہے، تو ہم "گرفتار" ہوتے ہیں اور اس گرفتاری کا جواز ہماری ساری زندگی کے لیے درست ہے!

مثال کے طور پر، جناب رومیؒ کو بچپن میں شیخ عطارؒ نے گرفتار کیا تھا، جو ایران کے تصوف کے باپ ہیں۔ اس گرفتاری کا اثر اس پر عمر بھر رہا!

"گر نظر پیر بود بر فقیر

مست شود نعرہ کشد ھمچو شیر"

"بوڑھے نے غریب کی طرف دیکھا

جب وہ مدہوش ہو جاتا ہے تو وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہے۔

ایک پرانی رائے ایک غریب کو اس کی زندگی کے آخر تک گرفتار کر سکتی ہے، اور غریب وہ ہے جس کا برتن واقعی علم و آگہی سے خالی ہو۔

چنانچہ، یہاں جناب رومیؒ، اپنی زندگی کی کہانی سناتے ہیں، کہ اس کا پاؤں کیچڑ میں تھا اور وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ کیا یہ گرفتاری جناب عطارؒ اور جناب ملک داد شمس تبریزیؒ تک واپس لا سکتی ہے؟

ایرانی

مَرحَبا یا مُجتَبیٰ یا مُرتَضیٰ

اِنْ تَغِبْ جاءَ الْقَضا ضاقَ الْفَضا

پاکستانی

مرحبایا مُجتبیٰ یامُرتضیٰ

اِنْ تَغِبْ جاءَ القَضا ضاقَ الفُضا

مرحبا: کلمہ استقبالیہ (عرب میں کسی آنے والے مہمان کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی خوش آمدید۔۔۔ مجتبیٰ: چنا ہوا ہے۔۔۔

مرتضیٰ: پسندیدہ۔۔۔ جاء: آئی۔۔۔ قضا: موت۔۔۔ فضا: میدان۔۔۔

یہاں قضا اور فضا میں تجنیس خطی ہے (بظاہر الفاظ ایک شکل کے ہوں مگر ان کے اعراب اور نقطے مختلف ہوں، جیسے حمار اور چمار.)

ترجمہ: آیئے آیئے! اے پسندیدہ و برگذیدہ بزرگ اگر اپ چل دیئے تو ہم مشتاقوں کی موت آجائے گی اور زندگی کا میدان تنگ ہو جائے گا۔ یعنی بیان شوق اور غم جدائی کا بیان ہے۔

یہاں سے جناب مولانا رومؒ عربی زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ جوش و خروش اور محبت سے شاعری کر رہے تھے، اچانک ان میں ایک بڑا جوش و ولولہ پیدا ہوا اور وہ فارسی نہیں بول سکتے تھے اور اپنی زبان بدل لی۔

ماضی میں، ہمارے اکثر مشائخ اور علماء دولسانی تھے۔ یعنی وہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں بولتے تھے، حتیٰ کہ ان کی زیادہ تر تحریریں عربی میں تھیں، اور تقریباً جناب فردوسی کے بعد، جنہوں نے شاہنامہ کتاب لکھی، فارسی زبان کو زیادہ سنجیدگی حاصل ہوئی۔

فردوسی کے بعد فارسی میں لکھی جانے والی سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے امام محمد غزالیؒ کی کیمیائے سعادت، احیاء العلوم اور تب سے وہ اپنی گفتگو میں فارسی کا استعمال کرتے تھے۔

براہِ کرم یہ قاعدہ یاد رکھیں کہ جب بھی رومیؒ فارسی بولنے کے درمیان عربی میں تبدیل ہوتے ہیں۔ تو ان کے اندر ایک طلاطم خیزی ہوتی ہے۔ جس کا اظہار اپنی زبان میں ممکن نہیں ہوتا، عربی چونکہ ایک بلیغ زبان ہے اس لئے وہ پھر اس کا سہارا لیتے ہیں پچھلے شعر میں میں ایک سنہری نکتہ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے وہ عربی میں بات کرنے کے صوفیانہ جوش اور جذبے سے مغلوب ہو گئے!

پچھلے شعر میں، وہ کہتے ہیں، "تم میرے دل کی ہر بات کو سمجھتے ہو، اور مجھے جواب دیتے ہو، اور تم مجھے کیچڑ میں گرفتار کرتے ہو!"

عربی بہت خوبصورت زبان ہے...

مرحبا کا مطلب ہے خوش آمدید۔

مجتبیٰ ایک صفت ہے، اس کا مطلب ہے وہ شخص جسے چنا اور پسند کیا گیا ہو، مجتبیٰ (عربی : اَلْمُجتَبیٰ) نبی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور اس نام کا مطلب چنا ہوا ہے اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا لقب بھی ہے۔ اور مرتضیٰ کا معنی پسندیدہ۔ مقبول۔ حضرت علی علیہ السلام کا لقب اور مرتضیٰ وہ ہے جو مکمل اطمینان کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور خوش ہے اور اسے کوئی چیز پریشان نہیں کر سکتی۔ یہحضرت سیدنا مولا علی علیہ السلام کا لقب ہے۔

قضا کا مطلب تقدیر ہے، لیکن عام زبان میں قضا کا مطلب ہے آفت اور بد قسمتی۔

بادشاہ طبیب سے کہتا ہے کہ اگر آپ غیر حاضر رہے تو قضا میرے پاس آئے گی۔ یعنی اگر آپ نہ ہوئے تو میری زندگی مصائب سے بھری ہوگی اور میں محروم رہوں گا!

ایک کہاوت ہے کہ جہنم میں جگہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے اور لوگ اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کسی کو اپنے پاس رکھیں کیونکہ وہ تنگی محسوس کرتے ہیں، لیکن جنت میں جگہ بہت ہے۔

اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ملاقات جنت ہے یا جہنم، تو دیکھیں کہ لوگ خود جمع ہوتے ہیں تاکہ دوسرے ان کے پاس بیٹھ سکیں یا نہیں! اگر اس مجلس میں جگہ یا رویہ کی تنگی ہو تو سمجھ لیں کہ معاملہ کیا ہے؟ اور اگر کشادگی ہو اور خوش دلی ہو، اور جگہ کشادہ کی جائے تو سمجھ لیں معاملہ جنت ہے۔

بادشاہ طبیب سے کہتا ہے کہ تم نہ ہو تو میری دنیا جہنم ہے۔

شعر میں مولانا رومؒ نے دو لفظ مجتبیٰ اور مرتضیٰ بیان کر کے اس حدت محبت کو واضح کیا ہے جو انہیں خاندان اہل بیت سے ہے۔

اَنْتَ مَوْلَى الْقَوْمِ مَنْ لَا يَشْتَهِي

اَنۡتَ مَوۡلی اَلۡقَوۡمِ مَنۡ لا یَشۡتَہِی
قَدۡ رَدِی کَلّا لَئِنۡ لَمۡ یَنۡتَہِ

مولیٰ: آقا، مالک۔۔۔، من لایشتھی: وہ جو خواہش نہیں رکھتا۔۔۔۔ ردی: ہلاک ہو گیا

ترجمہ: اے بزرگ! تو تو آقائے قوم ہے جو شخص تجھے نہیں چاہتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو گیا۔

ولایت کے معاملے میں، محبت میں ہونا ضروری ہے؛ کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت علیؓ میرے مولا ہیں جو واقعی علی علیہ السلام سے محبت کرتے ہیں اور ان کی ولایت کو دل سے قبول کر سکتے ہیں۔ ولایت اس شخص کی ہے جو خدا کا بندہ ہے اور ہمیں خدا کی یاد دلاتا ہے۔

بادشاہ طبیب سے کہتا ہے کہ جس کے دل میں آپ کی چاہت نہیں ہے اور آپ کی محبت نہیں ہے وہ راہِ سلوک میں رد ہے اور اس کا کام انجام کو نہیں پہنچے گا اور انجام اچھا نہیں ہو گا!

دراصل جناب رومیؒ کو شمسؒ سے محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ کسی ایسے شخص سے محبت کرتے ہیں جو منجانب الٰہی ہے اور وہ ہمیشہ رومیؒ کے تار کو رب سے جوڑتا ہے... خدا کے نور اور محبت کی پناہ میں رہو۔

"مولیٰ" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مفہوم وسیع ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں متعدد معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: آزاد کردہ غلام، دوست، مقتدیٰ، رہنما، مددگار اور سردار وغیرہ، لہٰذا موقع محل کے اعتبار سے ان معنوں کی تعیین کی جائے گی۔ جب "مولیٰ" کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہو گی تو اُس سے مراد مددگار کے معنی ہوں گے، جب اُس کی نسبت اپنے کسی قریبی عزیز کی طرف ہو گی، تو دوست کے معنی میں استعمال ہو گا۔

اور جب کسی رہنما، بڑے بزرگ یا مقتدیٰ کی طرف نسبت ہو گی، تو مولیٰ سے مراد رہنما اور سردار ہوتا ہے، اس لفظ کے آخر میں جو "نا" کا اضافہ کرکے "مولانا" کہا جاتا ہے، اس کا معنی ہے ہمارے بڑے۔

چنانچہ علماء کو جو مولانا کہا جاتا ہے، اُس میں مقتدیٰ کے معنی مدنظر ہوتے ہیں اور اس کا معنی ہوتا ہے "ہمارے مقتدیٰ و پیشوا، لہٰذا اِس معنی کی رو سے کسی عالم یا بزرگ کو مولانا کہنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اِس میں شرک وغیرہ کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، کیونکہ " مولی" جب مخلوق کے لئے استعمال ہو، تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے، جو خالق کے لئے استعمال کرتے وقت سمجھے جاتے ہیں، مزید یہ کہ صدیوں سے علماء کے طبقہ میں اِس لفظ کا استعمال بلا روک ٹوک کے جاری ہے۔

نیز احادیث میں بھی غیر اللہ کے لیے لفظ "مولانا" کا استعمال ہوا ہے۔

سنن الترمذی میں ہے

"عن أبي سريحة، أو زيد بن أرقم -شك شعبة- عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كنت مولاه فعلي مولاه: هذا حديث حسن غريب."

ابی سریحہ، یا زید بن ارقم -شبہ- شعبہ- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، تو علی اس کے مولا ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (سنن الترمذی: ۲/ ۲۱۲، أبواب المناقب / مناقب علی بن أبي طالب)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں قرآن کریم کی اس آیۃ کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۔ لَنَسْفَعًا م بِالنَّاصِيَةِ ۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ - (العلق: 15 تا 18)

(ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بالوں سے۔ جھوٹی گنہگار پیشانی۔ پس وہ بلالے اپنے ہمنشینوں کو۔ ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلائیں گے۔

ان آیات کے شان نزول:

کے حوالے سے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک روز مقام ابراہیم پر نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل کا وہاں سے گزر ہوا اور گستاخانہ لہجے میں کہنے لگا، کیا میں نے تمہیں نماز پڑھنے سے روکا نہیں، تم پھر وہی کام کر رہے ہو۔ آپ

ﷺ نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ اس پر ابو جہل بولا اے محمد ﷺ تم مجھ سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کیسے کر سکتے ہو، کیونکہ اعوان و انصار کی جتنی جمعیت میرے پاس ہے بطحا کی ساری وادی میں کسی رئیس کے پاس نہیں۔ ایک آواز دوں تو ساری وادی میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہے۔ اس وقت حضرت جبرائیل امین (علیہ السلام) یہ آیات لے کر نازل ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی اور سرکشوں کو دھمکی ان آیات میں سب سے پہلے کَلّا کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ اس ناہنجار کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کریں۔ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ اس پر عمل نہیں کر سکے گا اور آپ ﷺ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور ساتھ ہی اسے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ نابکار اپنی گستاخیوں سے باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹیں گے۔ وہ اپنے تئیں کیسی ہی غلط فہمی میں مبتلا کیوں نہ ہو اور لوگ اسے چاہے کچھ بھی سمجھتے ہوں لیکن اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس کی پیشانی ایک خطاکار پیشانی ہے اور جھوٹی پیشانی ہے۔ یعنی وہ ایک خطاکار اور جھوٹا آدمی ہے۔ ایسے شخص کی پیشانی اس قابل ہے کہ اسے مٹی میں رگڑا جائے اور اسے ذلت کی تصویر بنا دیا جائے۔ وہ آپ کو اپنے حمایتیوں اور مددگاروں سے ڈراتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہمنشینوں، ہم مجلسوں، ہم خیالوں اور اعوان و انصار کو بلا لے۔ ہم بھی دوزخ کے سزا دینے والے فرشتوں کو بلاتے ہیں۔ تب معلوم ہو جائے گا کہ جس قوت پر اسے ناز ہے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اس کی حقیقت کیا ہے۔ چناچہ ابو جہل اور دیگر اشرافِ قریش اپنی بہت بڑی جمعیت لے کر نہایت تکبر کے ساتھ قوت کا اظہار کرتے ہوئے میدانِ بدر میں پہنچے۔ اور پیش نظر یہ تھا کہ آج ہم مسلمانوں کو بتا دیں گے کہ ہماری قوت کا عالم کیا ہے۔ اور پورا عرب بھی جو پہلے ہی ہماری عظمت کو تسلیم کرتا ہے ہماری قوت سے مزید مرعوب ہو جائے گا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کے بلائے ہوئے عذاب کے فرشتوں اور سرہنگوں سے واسطہ پڑا تو قریش کی پوری جمعیت ان کے سامنے غبار بن کر اڑ گئی۔

دراصل مولانا رومؒ پر جب غلبہ محبت غالب آیا اور اس مرد درویش کے معاملہ میں جب اس آیہ کی طرف دھیان گیا تو محبت رسول ﷺ غالب آگئی تو حظ باطن کے لئے اس کو بیان کیا اور سطوت پیغمبر ﷺ کو قرآن استدلال سے واضح کر گئے۔ سبحان اللہ!

حضور نبیِّ کریم، رءوفٌ رَّحیم صلَّی اللہ تعالٰی علیہ واٰلہ وسلَّم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَالَ: مَنْ عَادٰى لِي وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهُ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جو میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے میں اس سے جنگ کا اِعلان کرتا ہوں اور میرا بندہ جن چیزوں سے میرا قُرب حاصل کرتا ہے ان میں فرائض سے زیادہ مجھے کوئی شے پسند نہیں اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے حتّٰی کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر جب اس سے مَحبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا

ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑ تا ہے اور اس کے پاؤں ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔(بخاری، ج4، ص248، حدیث:6502) ولیُّ اللہ کون ہے؟ قراٰنِ عظیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا کی صفات ان کلمات سے بیان فرمائی ہیں:(اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ(۶۲) الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ(۶۳)) ترجمۂ کنزالایمان: سن لو بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گاری کرتے ہیں۔(پ11، یونس:62، 63)

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ(۶۲)الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ(۶۳)

سن لو! بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔

{اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ: سن لو! بیشک اللہ کے ولیوں۔} لفظِ "ولی" وِلَاء سے بنا ہے جس کا معنی قرب اور نصرت ہے۔ وَلِیُّ اللہ وہ ہے جو فرائض کی ادائیگی سے اللہ عَزَّوَجَلَّ کا قرب حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول رہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کے نورِ جلال کی معرفت میں مستغرق ہو، جب دیکھے قدرتِ الٰہی کے دلائل کو دیکھے اور جب سنے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی آیتیں ہی سنے اور جب بولے تو اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی ثنا ہی کے ساتھ بولے اور جب حرکت کرے، اطاعتِ الٰہی میں حرکت کرے اور جب کوشش کرے تو اسی کام میں کوشش کرے جو قربِ الٰہی کا ذریعہ ہو، اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ذکر سے نہ تھکے اور چشمِ دل سے خدا کے سوا غیر کو نہ دیکھے۔ یہ صفت اَولیاء کی ہے، بندہ جب اس حال پر پہنچتا ہے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کا ولی و ناصر اور معین و مددگار ہوتا ہے۔

وَلِیُّ اللہ کی علامات

علماء نے "ولی اللہ" کی کثیر علامات بیان فرمائی ہیں، جیسے متکلمین یعنی علمِ کلام کے ماہر علماء کہتے ہیں "ولی وہ ہے جو صحیح اور دلیل پر مبنی اعتقاد رکھتا ہو اور شریعت کے مطابق نیک اعمال بجالاتا ہو۔

بعض عارفین نے فرمایا کہ ولایت قربِ الٰہی اور ہمیشہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ مشغول رہنے کا نام ہے، جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو کسی چیز کا خوف نہیں رہتا اور نہ کسی شے کے فوت ہونے کا غم ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ ولی وہ ہے جس کو دیکھنے سے اللہ تعالٰی یاد آئے، یہی طبری کی حدیث میں بھی ہے۔

ابنِ زید نے کہا کہ ولی وہی ہے جس میں وہ صفت ہو جو اس سے اگلی آیت میں مذکور ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ'' یعنی ایمان و تقویٰ دونوں کا جامع ہو۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ولی وہ ہیں جو خالص اللہ کے لئے محبت کریں۔ اَولیاء کی یہ صفت بکثرت اَحادیث میں ذکر ہوئی ہے۔

بعض بزرگانِ دین نے فرمایا: ولی وہ ہیں جو طاعت یعنی فرمانبرداری سے قربِ الٰہی کی طلب کرتے ہیں اور اللہ تعالٰی کرامت سے ان کی کارسازی فرماتا ہے یا وہ جن کی ہدایت کا دلیل کے ساتھ اللہ تعالٰی کفیل ہو اور وہ اللہ تعالٰی کا حقِ بندگی ادا کرنے اور اس کی مخلوق پر رحم کرنے کے لئے وقف ہو گئے۔ (خازن، یونس، تحت الآیۃ: ۶۲، ۲ / ۳۲۲-۳۲۳)

صدرُ الافاضل مفتی نعیم الدین مراد آبادی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں ''یہ معانی اور عبارات اگرچہ جداگانہ ہیں لیکن ان میں اختلاف کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہر ایک عبارت میں ولی کی ایک ایک صفت بیان کر دی گئی ہے جسے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے یہ تمام صفات اس میں ہوتے ہیں، ولایت کے درجے اور مَراتب میں ہر ایک اپنے درجے کے بقدر فضل و شرف رکھتا ہے۔ (خزائن العرفان، یونس، تحت الآیۃ: ۶۲، ص۴۰۵)

{لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ: اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔} مفسرین نے اس آیت کے بہت سے معنی بیان کئے ہیں، ان میں سے 3 معنی درج ذیل ہیں :-

(1)... مستقبل میں انہیں عذاب کا خوف نہ ہو گا اور نہ موت کے وقت وہ غمگین ہوں گے۔

(2)... مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز میں مبتلا ہونے کا خوف ہو گا اور نہ ماضی اور حال میں کسی پسندیدہ چیز کے چھوٹنے پر غمگین ہوں گے۔ (البحر المحیط، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۳۸، ۱ / ۳۲۳۔ جلالین مع صاوی، یونس، تحت الآیۃ: ۶۲، ۳ / ۸۸۰)

(3)... قیامت کے دن ان پر کوئی خوف ہو گا اور نہ اس دن یہ غمگین ہوں گے کیونکہ اللہ تعالٰی نے اپنے ولیوں کو دنیا میں ان چیزوں سے محفوظ فرما دیا ہے کہ جو آخرت میں خوف اور غم کا باعث بنتی ہیں۔ (4) ان تین کے علاوہ مزید اَقوال بھی تَفاسیر میں مذکور ہیں۔

اولیاءِ کرام کی اَقسام

اولیاءِ کرام کی کثیر اَقسام ہیں جیسا کہ حضرت ابو درداء رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے، بے شک انبیاءِ کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام زمین کے اَوتاد تھے، جب نبوت کا سلسلہ ختم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُمتِ احمد صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ میں سے ایک قوم کو اُن کا نائب بنایا جنہیں اَبدال کہتے ہیں، وہ حضرات (فقط) روزہ و نماز اور تسبیح و تقدیس میں کثرت کی وجہ سے لوگوں سے افضل نہیں ہوئے بلکہ اپنے حسنِ اَخلاق، وَرع و تقویٰ کی سچائی، نیت کی اچھائی، تمام مسلمانوں سے اپنے سینے کی سلامتی، اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا کے لیے حلم، صبر اور دانشمندی، بغیر کمزوری کے عاجزی اور تمام مسلمانوں کی خیر خواہی کی وجہ سے افضل ہوئے ہیں۔ پس وہ انبیاءِ کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے نائب ہیں۔ وہ ایسی قوم ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ذات پاک کے لئے منتخب اور اپنے علم اور رضا کے لئے خاص کر لیا ہے۔ وہ 40 صدیق ہیں، جن میں سے 30 رحمٰن عَزَّوَجَلَّ کے خلیل حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے یقین کی مثل ہیں۔ ان کے ذریعے سے اہلِ زمین سے بلائیں اور لوگوں سے مصیبتیں دور ہوتی ہیں، ان کے ذریعے سے ہی بارش ہوتی اور رزق دیا جاتا ہے، ان میں سے کوئی اُسی وقت فوت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کی جانشینی کیلئے کسی کو پروانہ دے چکا ہوتا ہے۔ وہ کسی پر لعنت نہیں بھیجتے، اپنے ماتحتوں کو اَذیت نہیں دیتے، اُن پر دست درازی نہیں کرتے، اُنہیں حقیر نہیں جانتے، خود پر فَوقیت رکھنے والوں سے حسد نہیں کرتے، دنیا کی حرص نہیں کرتے، دکھاوے کی خاموشی اختیار نہیں کرتے، تکبر نہیں کرتے اور دکھاوے کی عاجزی بھی نہیں کرتے۔ وہ بات کرنے میں تمام لوگوں سے اچھے اور نفس کے اعتبار سے زیادہ پرہیزگار ہیں، سخاوت ان کی فطرت میں شامل ہے، اَسلاف نے جن (نامناسب) چیزوں کو چھوڑا اُن سے محفوظ رہنا ان کی صفت ہے، اُن کی یہ صفت جدا نہیں ہوتی کہ آج خشیت کی حالت میں ہوں اور کل غفلت میں پڑے ہوں بلکہ وہ اپنے حال پر ہمیشگی اختیار کرتے ہیں، وہ اپنے اور اپنے ربّ عَزَّوَجَلَّ کے درمیان ایک خاص تعلق رکھتے ہیں، جہاں تک دوسرے کسی کی رسائی نہیں۔ اُن کے دل اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا اور شوق میں آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں، (پھر یہ آیت تلاوت فرمائی) ” اُولٰٓىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِؕ-اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ “(المجادلۃ:۲۲) ترجمۂ کنزُالعرفان: یہ اللہ کی جماعت ہے، سن لو! اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔ (نوادرُ الاصول، الاصل الحادی والخمسون، ۱ / ۲۰۹، الحدیث: ۳۰۱)

حضرت شریح بن عبید رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں ”حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم کے پاس شام والوں کا ذکر ہوا تو ان سے عرض کی گئی کہ ان پر لعنت کیجئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ”نہیں، میں نے حضورِ اقدس صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو

ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اَبدال شام میں ہوں گے، وہ حضرات چالیس مرد ہیں، جب ان میں ایک وفات پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو بدل دیتا ہے، ان کی برکت سے بارشیں برستی ہیں، ان کے ذریعے دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی ہے اور ان کی برکت سے شام والوں سے عذاب دور ہوتا ہے۔ (مسند امام احمد، ومن مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ۱ / ۲۳۸، الحدیث: ۸۹۶)

اولیاءِ کرام کی اَقسام کے بارے میں اکابر علماء و محدثین نے بڑا تفصیلی کلام فرمایا ہے۔ علامہ سیوطی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے قطب، اَبدال وغیرھما کے وجود پر ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ علامہ نبہانی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی اس موضوع پر مشہور کتاب "جامع کراماتِ اولیاء" ضخیم ترین کتاب ہے۔ علامہ نبہانی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کے کلام کی روشنی میں یہاں چند مشہور اَقسام بیان کی جاتی ہیں

(1)...اَقطاب۔ یہ قُطب کی جمع ہے۔ قطب اسے کہتے ہیں کہ جو خود یا کسی کے نائب کے طور پر حال اور مقام دونوں کا جامع ہو۔

(2)...ائمہ۔ یہ وہ حضرات ہیں کہ جو قطب کے انتقال کے بعد اس کے خلیفہ بنتے ہیں اور وہ قطب کیلئے وزیر کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں ان کی تعداد دو ہوتی ہے۔

(3)...اَوتاد۔ ہر زمانے میں ان کی تعداد چار ہوتی ہے، اس سے کم یا زیادہ نہیں ہوتے۔ ان میں سے ایک کے ذریعے اللہ تعالیٰ مشرق کی حفاظت فرماتا ہے، دوسرے کے ذریعے مغرب کی، تیسرے کے ذریعے شمال کی اور چوتھے کے ذریعے جنوب کی حفاظت فرماتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی اپنے حصے میں ولایت ہوتی ہے۔

(4)...اَبدال۔ ان کی تعداد سات ہوتی ہے، اس سے کم یا زیادہ نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے ساتوں برِّ اَعظم کی حفاظت فرماتا ہے، انہیں ابدال اس لئے کہتے ہیں کہ جب یہ کسی جگہ سے کوچ کرتے ہیں اور کسی مَصلحت اور قربت کی وجہ سے اس جگہ اپنا قائم مقام چھوڑنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں ایسے آدمی کو نامزد کرتے ہیں کہ جو ان کا ہم شکل ہو اور جو کوئی بھی اس ہم شکل کو دیکھے تو وہ اسے اصلی شخص ہی سمجھے حالانکہ وہ ایک روحانی شخصیت ہوتا ہے جسے ابدال میں سے کوئی بدل قصداً وہاں ٹھہراتا ہے۔ جن اَولیاء میں یہ قوت ہوتی ہے، انہیں ابدال کہتے ہیں۔

(5)…رِجال الغیب۔ اَہْلُ اللہ کی اِصطلاح میں یہ وہ لوگ ہیں جو رب کی بارگاہ میں انتہائی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں اور تجلیاتِ رحمٰن کے غلبے کے سبب آہستہ آواز کے سوا کچھ کلام نہیں کرتے، ہمیشہ اسی حال میں رہتے ہیں، چھپے ہوئے ہوتے ہیں پہچانے نہیں جاتے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے مُناجات نہیں کرتے اور اس کے سوا کسی کے مشاہدے میں مشغول نہیں ہوتے۔ بعض اوقات اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہوں اور کبھی اس کا اِطلاق نیک اور مومن جنات پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظاہری حواس سے علم اور رزق وغیرہ نہیں لیتے انہیں غیب سے یہ چیزیں عطا ہوتی ہیں۔ (جامع کرامات اولیائ، القسم الاول فی ذکر مراتب الولایۃ۔۔۔ الخ، ۱ / ۶۹، ۷۴)

{اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: وہ جو ایمان لائے۔} اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ولی کی دو صِفات بیان فرمائی ہیں:

اللہ تعالیٰ نے ولی کی دو صِفات بیان فرمائی ہیں

(1)…ولی وہ ہے جو ایمان کے ساتھ مُتَّصِف ہو۔ ایمان کا معنی ہے وہ صحیح اعتقاد جو قَطعی دلائل پر مبنی ہو۔

(2)… ولی کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ متقی ہو۔ تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ جن کاموں کو کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا انہیں کرنا اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے اِجتناب کرنا۔ (صاوی، یونس، تحت الآیۃ: ۶۳، ۳ / ۸۸۰) اور اس کے ساتھ ساتھ ہر اس کام کیلئے کوشش کرنا جس میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا ہو اور ہر اُس کام سے بچنا جو اللہ عَزَّوَجَلَّ سے دور کرنے والا ہو۔

علّامہ بدرُ الدّین عینی علیہ رحمۃ اللہ القَوی فرماتے ہیں: ولیُّ اللہ وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صِفات کا عالِم ہو، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مخلص ہو۔ (عمدۃ القاری، ج15، ص576، تحت الحدیث: 6502)

حضرت علّامہ علی قاری علیہ رحمۃ اللہ البارِی فرماتے ہیں: ولیُّ اللہ وہ بندہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ والی ہو گیا کہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے نفس کے حوالے نہیں کرتا بلکہ خود اس سے نیک کام لیتا ہے اور وہ بندہ ہے جو خود رب تعالیٰ کی عبادت اور مسلسل اطاعت و فرمانبرداری کا متوَلّی ہو جائے گُناہوں سے محفوظ رہے، پہلی قسم کے ولی کا نام مجذوب یا مُراد ہے اور دوسرے کا نام سالِک یا مُرید ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح، ج5، ص40، تحت الحدیث: 2266) دشمنِ اولیا سے اللہ تعالیٰ کا اعلانِ جنگ اس حدیثِ قُدسی میں اللہ تعالیٰ نے دشمنِ اولیا سے جنگ کا اعلان فرمایا ہے اور قراٰنِ پاک میں سُود خوروں سے بھی جنگ کا اعلان ہے، ارشادِ باری

تعالٰی ہے:(یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ(۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۚ-) ترجمۂ کنزالایمان: اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا۔(پ3، البقرۃ، 278، 279)

صرف انہی دو اعمال پر ایسی سَخْت وعید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں عمل بہت خطرناک ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالٰی کسی بندے سے جنگ فرمائے گا تو اس کا خاتمہ بُرا ہو گا کہ اللہ تعالٰی سے جنگ کرنے والا کبھی فَلاح نہیں پا سکتا۔(مرقاۃ المفاتیح، ج 5، ص 41، تحت الحدیث:2266)

حدیث شریف میں جو اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ "میں اس بندے کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اِلٰی آخِرِہٖ" اس کی شرح میں علّامہ خَطابی فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ میں اپنے اس بندے کیلئے مذکورہ اعضاء سے مُتَعَلِّقہ افعال کو آسان کر دیتا ہوں اور میں اسے ان کاموں کی توفیق دیتا ہوں۔ (مرقاۃ المفاتیح، ج5، ص 41، تحت الحدیث:2266)

حکیمُ الامّت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ رحمۃ اللہ القَوی فرماتے ہیں: اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالٰی ولی میں حلول کر جاتا ہے جیسے کوئلہ میں آگ یا پھول میں رنگ و بو کہ خدا تعالٰی حلول سے پاک ہے اور یہ عقیدہ کُفر ہے بلکہ اس کے چند مطلب ہیں: ایک یہ کہ ولی اللہ کے یہ اعضاء گناہ کے لائق نہیں رہتے ہمیشہ ان سے نیک کام ہی سرزد ہوتے ہیں اس پر عبادات آسان ہوتی ہے گویا ساری عبادتیں اس سے میں کرا رہا ہوں یا یہ کہ پھر وہ بندہ ان اعضاء کو دنیا کے لئے استعمال نہیں کرتا، صرف میرے لئے استعمال کرتا ہے ہر چیز میں مجھے دیکھتا ہے ہر آواز میں میری آواز سنتا ہے، یا یہ کہ وہ بندہ فَانِیْ فِی اللہ ہو جاتا ہے جس سے خُدائی طاقتیں اس کے اعضاء میں کام کرتی ہیں اور وہ ایسے کام کرلیتا ہے جو عقل سے وراء ہیں حضرت یعقوب علیہ السَّلام نے کَنعان میں بیٹھے ہوئے مِصر سے چلی ہوئی قمیصِ یوسفی کی خوشبو سونگھ لی، حضرت سلیمان علیہ السَّلام نے تین میل کے فاصلہ سے چیونٹی کی آواز سن لی حضرت آصف بر خیا نے پلک جھپکنے سے پہلے یمن سے تختِ بلقیس لا کر شام میں حاضِر کر دیا۔ حضرت عمر نے مدینۂ مُنوّرہ سے خطبہ پڑھتے ہوئے نہاوند تک اپنی آواز پہنچادی۔ حضورِ انور صلَّی اللہ تعالٰی علیہ واٰلہٖ وسلَّم نے قِیامت تک کے واقعات بچشم ملاحظہ فرمالئے، یہ سب اسی طاقت کے کرشمے ہیں۔ آج نار (آگ) کی طاقت سے ریڈیو تار، وائرلیس، ٹیلی ویژن عجیب کرشمے دکھارہے ہیں تو نور کی طاقت کا کیا پوچھنا۔ اس حدیث سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو طاقتِ اولیا کے منکر ہیں۔ (مراٰۃ المناجیح، ج3، ص308)

ایرانی

چون گُذشت آن مَجْلِس وخوانِ کَرَم

دستِ او بِگْرفت وبُرد اَنْدَر حَرَم

پاکستانی

چوں گُذشت آں مَجْلِس وخوانِ کَرَم

دستِ او بِگُرفت وبُرد اَنْدُر حَرَم

خوان کرم: مراد مہمان کی تواضع کے لئے کھانا۔۔۔ حرم: خواتین کے رہنے والا حصہ

ترجمہ: جب وہ مجلس برخاست ہوئی اور ضیافت کے لئے خوان وطعام پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اس مہمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے حرم سرا (گھر) لے گیا۔

جب اس مجلس میں طبیب الہی سے بادشاہ کی ملاقات ہوئی اور دستر خوان بچھایا گیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر کی رازداری میں لے گئے۔ مندرجہ بالا شعر میں جناب رومیؒ نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شاگرد کو چاہیے کہ وہ اپنے حقیقی رہنما کو اپنے رازوں کا رازدار سمجھے اور اسے اپنے دل کی رازداری میں لے جائے اور اسے اپنے ضمیر کے راز بتائے تا کہ وہ اس کی رکاوٹوں کو دور کر سکے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اور زیادہ یقینی طور پر راستہ معلوم ہو سکے۔

حرم کا مطلب ایک محفوظ، پر سکون اور آرام دہ جگہ ہے۔ یاد رہے کہ مولانا رومیؒ ایک ماہر اخلاقیات بھی ہیں یہاں وہ ایک اخلاقیات کا بہت عمدہ درس دے رہے ہیں کہ جب لوگ ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے ہیں تو انہیں معلومات کی درجہ بندی کا احترام کرنا چاہیے اور ہر ایک لفظ سب کے سامنے نہیں کہنا چاہیے۔

آپ کے پاس ہر ایک کے ساتھ ایک حلقہ ہونا چاہیے، یا ایک محدود حلقہ ہونا چاہیے جس میں ہر ایک کو داخل نہیں ہونا چاہیے۔
اگر آپ نہیں چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو ہر کسی کو کچھ نہ کہیں اور اپنی پرائیویسی کے لیے حدود مقرر کریں اور کسی کو بھی اپنی پرائیویسی اور ذاتی معلومات میں دخل نہ دیں۔

ایک قول ہے کہ عبادت کے طریقے میں بصیرت سے عاری عبادت گزار اس شخص کی طرح ہے جو کسی دوسرے راستے پر چلتا ہے، تیز رفتاری سے۔ اور وہ جتنا زیادہ چلتا ہے، راستے سے اتنا ہی دور ہوتا جاتا ہے، لہٰذا جو چیز اس پر واجب ہے، اس کا عامل عمل کرنے سے پہلے علم حاصل کرنا ہے، اور علم کا مطالعہ کسی استاد کے بغیر ناممکن ہے، اور ثابت ہوا کہ یہ اس علم کو کسی غیر اہل شخص سے سیکھنا ممکن نہیں، لہٰذا حصول علم کی ضرورت یہ ہے کہ یہ دنیا بنی نوع انسان کے درمیان ہے، جس نے گزشتہ ابواب میں بھی حصول علم کی فرضیت کا ذکر کیا ہے) اور وہ خبریں بھی جو دلالت کرتی ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ نے جاہلوں سے علم حاصل کرنے کا کوئی عہد نہیں لیا سوائے اس کے کہ اس نے علم دینے کا عہد اہل علم سے لیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دنیا تخلیق کے بیچ میں ہونی چاہیے اور وہ آیات جو اس کی ضرورت پر دلالت کرتی ہیں۔ خدا کی طرف وسیلہ تلاش کرنا، اور سچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت، اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حکم کے رہنما کی اطاعت کی ضرورت، اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کی ضرورت، دنیا کی ضرورت پر دلالت کرتی ہے۔ مخلوق کے درمیان، اور آیات قرآن تمام صدیوں میں موجود ہے، لہٰذا ہر صدی میں، ایک شخص جو سچا ہو، جب تک کہ وہ علم الٰہی والا عالم نہ ہو، لوگوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے۔

نتیجے کے طور پر، ایک بوڑھا آدمی ایک عالم ہے جس کو علم الٰہی کا مکمل اور کامل علم ہے، اور بہت سے متلاشی ہیں جو روح کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں، اور راستے میں بہت سے جسمانی اور شیطانی ڈاکو ہیں جن کی منزل نہیں ہے۔ اور وہ راہبر ہے جو ان باتوں سے بچاتا ہے۔

انسان ساری زندگی دُنیوی اور اُخروی ترقی اور درجات کی بلندی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ہر صاحبِ نظر شخص خواہش مند ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت اسے دنیا و آخرت دونوں میں بلندی و کمال عطا فرمائے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ بلندی، کمال اور رفعت کا حصول کیسے ممکن ہے؟ ہم میں سے اکثر لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی کا ذریعہ

'مجالس' کو قرار دیا ہے۔ پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کون سی مجالس اور کن لوگوں کی مجالس؟ آیئے اس سلسلے میں قرآن مجید سے رہنمائی لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○

المجادلۃ، 11:58

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ (اپنی) مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو کشادہ ہو جایا کرو، اللہ تمہیں کشادگی عطا فرمائے گا اور جب کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو تم کھڑے ہو جایا کرو، اللہ اُن لوگوں کے درجات بلند فرما دے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم سے نوازا گیا، اور اللہ اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو خوب آگاہ ہے۔

اس آیت کریمہ سے درج ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

1۔ اس آیت کریمہ کے پہلے حصے میں 'المجالس' جبکہ آخری حصے میں 'العلم' کا ذکر ہے۔ ہمارے اِس تعلیم و تعلم کے تحریری سلسلے کا نام 'مجالس العلم' بھی قرآن مجید کی اسی آیت مبارکہ کے ان دو الفاظ سے ماخوذ ہے۔

2۔ اللہ رب العزت نے اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو مجالس کے نشست و برخاست کے آداب سمجھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر تم یہ آدابِ مجالس بجالاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان اور علم والوں کے درجات بلند فرمائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے درجات کی بلندی اور مجالس کو باہم منسلک (correlate) کیا ہے۔

3۔ اس آیت کریمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مجلس میں بیٹھنے سے درجات کی بلندی تبھی نصیب ہو گی جب بیٹھنے والے کو کوئی روحانی واُخروی نفع حاصل ہو اور اس کی خیر میں اضافہ ہو۔ بالفاظِ دیگر روحانی، اُخروی یا دینی کسی بھی اعتبار سے خیر میں اضافہ درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے۔ یاد رہے کہ 'خیر' میں اضافہ تبھی ہوتا ہے جب بیٹھنے والے کو مجلس سے درج ذیل دو چیزیں حاصل ہوں:

1۔ ایمان

2۔ علم

گویا کسی مجلس میں حاضری سے درجات کی بلندی کا حصول 'خیر' کے میسر آنے سے مشروط ہے اور 'خیر' کا اضافہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب اس مجلس العلم سے انسان 'ایمان' اور 'علم' کے نور سے منور ہو کر نکلے۔

بہترین مجالس اور اچھے ہم نشین کون ہیں؟

اس ضمن میں ہمارے ذہن میں بہت سے سوالات سر اٹھاتے ہیں، مثلاً وہ کون سی مجالس ہیں جو بیٹھنے والوں کے ایمان اور علم میں اضافے کا باعث بنتی ہیں؟ کیسی مجالس اور کن اوصاف کے حامل ہم نشین کا انتخاب کرنا چاہیے؟ مجالس کے عنوان کیا ہوں؟ آیئے! اس سلسلے میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ان فرامین سے رہنمائی لیتے ہیں جن میں حضور نبی اکرم ﷺ نے ایسی مجالس اور ہم نشینوں کی صفات بیان فرمائی ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی الله عنهما، قَالَ: قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، أَيُّ جُلَسَائِنَا خَيْرٌ؟ قَالَ: مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ، وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ وَذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ.

1. أبو يعلى، المسند، 4:326، رقم:2437
2. عبد بن حميد، المسند، 1:213، رقم:631
3. بيهقي، شعب الإيمان، 7:57، رقم:9446
4. حكيم ترمذي، نوادر الأصول، 2:39
5. منذري، الترغيب والترهيب، 1:63، رقم:163
6. هيثمي، مجمع الزوائد، 10:262

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ہمارے بہترین ہم نشین کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلا دے، جس کا بولنا تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے۔

صالح جلیس کی صحبت کے تین ثمرات ذکر فرمائے ہیں

حضور نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث مبارک میں صالح جلیس کی صحبت کے تین ثمرات ذکر فرمائے ہیں:

1۔ **مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ** (جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلا دے)

2۔ **وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ** (جس کا بولنا تمہارے علم میں اضافہ کرے)

3۔ **وَذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ** (جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے)

گویا ہم نشین اگر نیک، عبادت گزار، متقی، اللہ سے محبت کرنے والے، علم و عقیدۂ صحیحہ کے حامل، صدقِ نیت اور اخلاص کے پیکر ہوں تو ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے بھی خیر نصیب ہوتی ہے، ایمان اور علم کا نور حاصل ہوتا ہے، گناہوں کی بخشش ہوتی ہے اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اِن جامع کلمات کے ذریعے مجالسِ علم کی برکات، صحبتِ صلحاء کے اثرات اور مجالس کے انعقاد کے مقاصد واضح فرما دیے ہیں۔

صالح شخص کی محض زیارت کرنا باعثِ خیر و برکت کیسے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی مجلس میں ظاہری طور پر کچھ بھی عمل نہیں کیا؛ محنت، ریاضت و مجاہدہ، نفل، تسبیح، تلاوت، الغرض کوئی خیر کا عمل نہیں کیا تو محض صالح شخص کی زیارت اور اُسے دیکھنا خیر کا عمل کیسے بن گیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی صالح جلیس (نیک ہم نشین) کے دیدار سے خیر اور برکت میسر آنا ایسے ہی ہے جیسے حضور نبی اکرم ﷺ نے متعدد احادیث مبارکہ میں مختلف ہستیوں اور اشیاء کی زیارت پر خیر و برکت کے حصول کی خوش خبری بیان فرمائی ہے۔

1۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ عِبَادَةٌ.

1. ديلمي، مسند الفردوس، 4:293، رقم: 6864
2. فاكهي، أخبار مكة، 1:200، رقم: 328

کعبہ کو دیکھنا عبادت ہے۔

2۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلَى وَجْهِ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ.

1. طبراني، المعجم الكبير، 10:76، رقم: 10006
2. حاكم، المستدرك، 3:152، رقم: 4682، 4683
3. أبو نعيم، حلية الأولياء، 5:58

علی کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

3۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

اَلنَّظَرُ إِلَى وَجْهِ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ.

ديلمي، مسند الفردوس، 294:4، رقم: 6867

عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

4۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ إِلَى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ إِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهُ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً.

(اولاد میں سے) جو صالح بیٹا بھی اپنے والدین کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ ہر نظر کے بدلے میں اس کے لیے مقبول حج کا ثواب لکھ دے گا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ! چاہے وہ دن میں سو بار دیکھے تب بھی اُسے یہ اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

نَعَمْ، اللهُ أَكْبَرُ وَأَطْيَبُ.

1. بیہقی، شعب الإیمان، 186:6، رقم: 7856
2. إسماعیلی، معجم الشیوخ، 320:1، رقم: 7
3. خطیب تبریزی، مشکاۃ المصابیح، 3:1383، رقم: 4944
4. ھندی، کنز العمال، 199:16، رقم: 45535

جی ہاں! کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور وہ سب (عیوب) سے پاک ہے (کہ اُس کے خزانوں میں عنایات کی کوئی کمی نہیں ہے)۔

الغرض حضور نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں جیسے کعبۃ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عالمِ دین اور والدین کو دیکھنا خیر و برکت کا باعث ہے؛ اسی طرح صالح افراد کو دیکھنا، نیک متقی بندے کو سننا اور ان کی ہم نشینی اختیار کرنا بذاتِ خود (itself) عملِ خیر ہے۔

مثنوی مولانا۔دفترِ اوّل۔بخش ۶۔بُردن پادشاہ طبیبِ غیبی را بر سَرِ بیمار تا حال او را ببیند

بادشاہ کا طبیب غیبی کو بیمار کے پاس لے جانا تاکہ اس کا حال خود دیکھ لے

چون گذشت آن مجلس وخوان کرم

دست او بگرفت وبرد اندر حرم

استقبالیہ ختم ہوا تو بادشاہ حکیم کو مزار پر لے گیا تاکہ وہ اس سے آسانی سے بات کر سکے۔

حرم کا مطلب ایک محفوظ، پر سکون اور آرام دہ جگہ ہے۔

جب لوگ ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے ہیں تو انہیں معلومات کی درجہ بندی کا احترام کرنا چاہیے اور ہر ایک لفظ سب کے سامنے نہیں کہنا چاہیے۔

آپ کے پاس ہر ایک کے ساتھ ایک حلقہ ہونا چاہیے، یا ایک محدود حلقہ ہونا چاہیے جس میں ہر ایک کو داخل نہیں ہونا چاہیے۔

اگر آپ نہیں چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو ہر کسی کو کچھ نہ کہیں اور اپنی پرائیویسی کے لیے حدود مقرر کریں اور کسی کو بھی اپنی پرائیویسی اور ذاتی معلومات میں دخل نہ دیں۔

ایرانی

قِصّۂ رَنجور ورَنجوری بِخوانْد

بَعد از آن در پیشِ رَنجورش نِشانْد

پاکستانی

قِصّہ رَنجور ورنجوری بِخوانُد

بَعد از آں در پیشِ رَنجورش نِشانُد

رنجور: مریض۔۔رنجوری: بیماری۔۔۔قصہ بخواند: حال سنایا۔رنجورش: اسے جو بیماری تھی

ترجمہ: بیمار اور اس کی بیماری کا قصہ سنایا۔اس کے بعد اس طیب غیبی کو نبض وغیرہ دیکھ کر تشخیص مرض کرنے کے لئے بیمار کے پاس بٹھادیا۔

یہاں، جناب رومیؒ لفظ بنانے کے لیے حرف "ر" استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ مریض کی خرابی کو بہتر طور پر دکھا سکیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام میں مرض اور مریض پر بڑی توجہ کی ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: اور جو شخص کسی ایک کی جان بچالے، اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا۔(سورۃ المائدہ) قرآن مجید کا ایک وصف یہ بھی ہے: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفاء ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔(سورۂ یونس) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری سے شفاء کو رب العزت کی نعمت قرار دیا: اس حوالے سے ارشاد ہے:

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ

اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے(سورۃ الشعراء) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ' امراض سے شفاء بھی تھا۔

رسول اکرم ﷺ نے امراض و تکالیف کے حوالے سے علاج واسباب کو اختیار کرنے پر زور دیا، تاکہ مسلمان جسمانی' قلبی اور روحانی طور پر صحت مند رہیں۔ حضرت جابرؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں: حضرت سیّدنا ابوہریرہ رضیَ اللہُ تعالٰی عنہ سے روایت ہے کہ نبیِّ کریم صلَّی اللہُ تعالٰی علیہِ واٰلہٖ وسَلَّم نے فرمایا: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ دَآءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَآءً۔ ترجمہ: اللہ تعالٰی نے کوئی ایسی بیماری نازل نہیں فرمائی جس کی شفا نہ اُتاری ہو۔(بخاری، ج4، ص16، حدیث:5678)۔اس حدیث پاک میں "نازل کرنے" سے

مراد مرض اور اس سے شفا کے اسباب کا پیدا کرنا ہے یا ایسے فرشتوں کا نازل کرنا ہے جن کے سپرد مریض اور دوا کو کیا جاتا ہے۔ اس حدیثِ پاک میں بڑھاپے اور موت کا اِستِثْنا نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ حقیقت میں بیماریوں میں شمار ہی نہیں ہوتے۔

(عمدۃ القاری، ج14، ص668۔ حاشیۃ السندی علی البخاری، ج4، ص16، تحت الحدیث:5678)

اللہ ربُّ العالمین بڑا رحیم و کریم ہے اگر وہ اپنے بندوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا فرماتا ہے تو اُن تکالیف پر اُنہیں جزا بھی دیتا ہے یا اُن کے گناہوں کا کفارہ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے اِن تمام بیماریوں سے شفا کے طریقے اور دوائیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ مرض اور علاج: اَطِبَّا کے نزدیک جسمِ انسانی کا اپنی طبعی حالت سے نکل جانا "مرض" کہلاتا ہے، اس کو اپنی اصلی حالت پر لوٹانا "علاج" کہلاتا ہے اور جسم کو اپنی طبعی حالت پر قائم رکھنا "حفظِ صحت" ہے جو غذا اور جسم سے متعلق دوسری چیزوں کی دُرُستی کے بغیر ممکن نہیں اور اگر جسم کی حالت بگڑ جائے تو مرض کو ختم کرنے والی مُوَافِق دوا کے ذریعے ہی اسکو بہتر کیا جاسکتا ہے۔

(شرح النووی علی المسلم، جز14، ج7، ص192)

جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أُصِيبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَأَ بِإِذْنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ یعنی ہر بیماری کی دوا ہے، جب دوا بیماری کے مُوَافِق (مطابق) ہو جاتی ہے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ شفا عطا فرما دیتا ہے۔

(مسلم، ص933، حدیث:5741)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

العلم علمان علم الآبدان و علم الآدیان"

"یعنی علم کی دو قسمیں ہیں: علم ادیان (مذاہب کا علم) اور علم ابدان (طب کا علم)

علم فقہ، تاکہ زندگی گزارنے کا آسان طریقہ معلوم ہو اور علم طب، تاکہ انسانی جسم بیماریوں سے محفوظ اور صحت مند رہے۔

اس بارے میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ امراض سے واقفیت اور ان کے علاج میں مہارت حاصل کرنا' مسلمانوں کے تمام معاشروں کے لیے ضروری ہے۔ البتہ علمانے اسے فرضِ کفایہ قرار دیا ہے کہ اگر بقدرِ ضرورت چند افراد اس فن میں ماہر موجود ہوں تو بقیہ معاشرے پر سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ علاج معالجہ تو زیادہ بڑی بات ہے' اسلام میں فقط مریض سے ملاقات کرنے کا بھی بڑا اجر ہے۔ فرمان رسول ﷺ ہے: عن علی رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم

يقول» :مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُودُ مُسْلِماً غُدْوةً إلاَّ صَلَّى عَلَيْهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ حَتَّى يُمْسِي، وَإِنْ عَادَهُ عَشِيَّةً إلاَّ صَلَّى عَلَيْهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ حَتَّى يُصْبِحَ، وَكَانَ لَهُ خَرِيفٌ في الْجَنَّةِ .«

(صحيح] - [رواه أبو داود والترمذي وابن ماجه وأحمد)

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی مسلمان صبح کے وقت اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرے، تو ستر ہزار فرشتے شام تک اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی شام کے وقت کسی مسلمان کی عیادت کرے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، اور اس کے لیے جنت میں ایک باغ ہو گا۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب اپنے مریض مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ جنت کی کیاری یعنی جنت کے باغ میں ہو گا۔ اللہ کا فضل وسیع ہے۔ یہ حدیث مریض کی عیادت کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ اگر وہ صبح عیادت کرے تو اس کے لیے یہ اجر ہے اور شام کو عیادت کرے تو بھی اس کے لیے یہ اجر ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قَالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم " : إنَّ اللهَ عز وجل يَقُولُ يَوْمَ القِيَامَةِ: يَا ابْنَ آدَمَ، مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ أَعُودُكَ وَأَنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟!. قَالَ: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ عَبْدِي فُلاَناً مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ! أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ! يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأَنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟! قَالَ: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلاَنٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ! أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي! يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ أَسْقِيكَ وَأَنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟! قَالَ: اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلاَنٌ فَلَمْ تَسْقِهِ! أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي ."

(صحيح] - [رواه مسلم])

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پُرسی نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے میرے رب میں کیسے آپ کی بیمار پرسی کرتا آپ تو رب العالمین ہیں؟ ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تُو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی! کیا تو یہ نہیں جانتا کہ اگر تو

اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا! اے آدم کے بیٹے، میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے مجھے نہیں کھلایا! وہ کہے گا : اے میرے رب، میں کیسے آپ کو کھانا کھلاتا آپ تو رب العالمین ہیں ؟ ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا! کیا تُو یہ نہیں جانتا کہ اگر تُو اسے کھانا کھلاتا تو اس کا اجر مجھ سے پاتا! اے آدم کے بیٹے، میں نے تجھ سے پینے کو کچھ مانگا تو نے مجھے نہیں پلایا! وہ کہے گا : اے میرے رب میں کیسے آپ کو پلاتا آپ تو رب العالمین ہیں ؟ ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پینے کو کچھ مانگا اور تُو نے اسے نہیں پلایا! کیا تُو یہ نہیں جانتا کہ اگر تُو اسے پلاتا تو اس کا اجر مجھ سے پاتا!

اس کی شرح میں علمأ نے فرمایا ہے:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے میرے رب میں کیسے آپ کی بیمار پرسی کرتا آپ تو رب العالمین ہیں ؟!، یعنی آپ کو تو ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کی بیمار پرسی کرتا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تُو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی! کیا تو یہ نہیں جانتا کہ اگر تُو اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا! اس حدیث میں کوئی اشکال نہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں بیمار ہوا تو تُو نے میری بیمار پرسی نہیں کی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی بیماری کا لاحق ہونا نا ممکن ہے؛ کیوں کہ بیمار ہونا صفتِ نقص ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیبوں سے پاک ہے، لیکن یہاں بیماری سے مراد اس کے نیک اور صالح بندوں میں سے کسی بندے کا بیمار ہونا ہے جو کہ اس کے خاص لوگ ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : کیا تو یہ نہیں جانتا کہ اگر تُو اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا! اور یہ نہیں فرمایا کہ تُو اس کا اجر میرے پاس پاتا جیسا کہ آگے چل کر کھانے اور پینے کے بارے میں فرمایا، بلکہ یہاں تو یہ فرمایا کہ تُو مجھے اس کے پاس پاتا، اور یہ بات مریض کی اللہ تعالیٰ سے قربت پر دلالت کرتی ہے، اسی لیے علماء کا کہنا ہے کہ مریض کا کسی شخص کے لیے دعاء یا بد دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں سنا جاتا ہے۔ اللہ کا یہ فرمان : اے آدم کے بیٹے، میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تُو نے مجھے نہیں کھلایا!، یعنی میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تُو نے مجھے نہیں کھلایا، یہ تو بات تو طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے تو کھانا طلب نہیں کرتا اس کا فرمان ہے : ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ "وہی ہے جو کھانے کو دیتا ہے، اس کو کوئی کھانے کو نہیں دیتا) "الأنعام:14 (وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اسے نہ کھانے کی ضرورت ہے نہ تو پینے کی حاجت ہے، لیکن دنیا میں اس کے بندوں میں سے کسی بندے کو بھوک لگی تو ایک شخص نے باوجود جاننے کے اسے کھانا نہ کھلایا تو

ارشاد فرمایا: اگر تُو اسے کھانا کھلا تا تو اس کا اجر مجھ سے پاتا" یعنی اس کھلانے کا ثواب میرے پاس میرے خزانوں سے پاتا میرے پاس ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ کا یہ فرمان: اے آدم کے بیٹے، میں نے تجھ سے پینے کو کچھ مانگا تو تُو نے مجھے نہیں پلایا، یعنی میں نے تجھ سے پینے کی کوئی چیز مانگی تو تُو نے مجھے نہیں دی تو بندہ کہے گا: میں کیسے آپ کو پلاتا آپ تو رب العالمین ہیں؟، یعنی آپ کو تو کھانے پینے کی ضرورت ہی نہیں، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: کیا تو یہ نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے کو پیاس لگی یا اس نے تجھ سے پانی مانگا، اور تو نے اسے نہیں پلایا، کیا تُو یہ نہیں جانتا کہ اگر تُو اسے پانی پلاتا تو اس کا اجر مجھ سے پاتا، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی پیاسا آپ سے پانی مانگے تو اسے پانی پلانے پر آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پلانے کا ثواب)خزانوں میں (جمع ہوگا، ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ

ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک

حضرت انسؓ سے مروی آپ ﷺ کا فرمان ہے: جو شخص اچھی طرح وضو کرے اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جائے تو اسے جہنم سے ستر سال کی مسافت کے برابر دور کر دیا جاتا ہے۔

اس لیے ڈاکٹر (بشرط ایمان) ان سب اجر و ثواب کا اس وقت حقدار ہوتا ہے، جب وہ نیک نیتی اور خدمت خلق کے جذبے سے یہ امور انجام دے مریض کو تسلی کے کلمات کہنا ہی عیادت ہے جو کہ عبادت ہے، اس کے بعد اس کا علاج معالجہ کرنا مزید باعث اجر ہے۔ اگر خدانخواستہ ڈاکٹر مریض سے محض پیسے بٹورنے کے لیے کام کر رہا ہے تو وہ دھندا تو کہلایا جا سکتا ہے، خدمت خلق کا نام دینا ناانصافی ہے۔ چونکہ یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اور اسلام انسانیت سے مکمل ہمدردی کا نام ہے، اس لیے شریعت نے اس بارے میں مکمل رہنمائی کی ہے اور ڈاکٹر کی ضرورت، معیار، ذمہ داریاں اور اس کی معاشرتی حیثیت کو اہمیت سے بیان کیا ہے۔

للہ تعالیٰ نے اس کائنات میں زہر کے ساتھ ساتھ اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا ہے اور بیماریوں کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی، رسول للہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حدثنا ابو بكر بن ابي شيبة ,وهشام ابن عمار ,قالا ,حدثنا سفيان بن عيينة ,عن زياد بن علاقة ,
عن اسامة بن شريك ,قال: شهدت الاعراب يسالون النبي صلى الله عليه وسلم اعلينا حرج في كذا؟
اعلينا حرج في كذا؟ فقال لهم: "عباد الله ,وضع الله الحرج إلا من اقترض من عرض اخيه شيئا ,فذاك

الذی حرج"،فقالوا: یارسول الله،هل علینا جناح ان لا نتداوی؟ قال:" تداووا عباد الله،فإن الله سبحانه لم یضع داء إلا وضع معه شفاء،إلا الهرم"،قالوا: یارسول الله،ما خیر ما اعطی العبد؟ قال:" خلق حسن."

اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اعرابیوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے دیکھا کہ کیا فلاں معاملے میں ہم پر گناہ ہے؟ کیا فلاں معاملے میں ہم پر گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :اللہ کے بندو! ان میں سے کسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے گناہ نہیں رکھا سوائے اس کے کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت سے کچھ بھی کھیلے، تو دراصل یہی گناہ ہے"، انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! اگر ہم دوا علاج نہ کریں تو اس میں بھی گناہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :اللہ کے بندو! دوا علاج کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا مرض نہیں بنایا جس کی شفاء اس کے ساتھ نہ بنائی ہو سوائے بڑھاپے کے"، انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! بندے کو جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں ان میں سے سب بہتر چیز کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" :حسن اخلاق"۔

تخریج الحدیث « : تفرد بہ ابن ماجہ، (تحفۃ الأشراف:127، ومصباح الزجاجۃ:127)، وقد أخرجہ: سنن ابی داود/الطب 1 (3855)، سنن الترمذی/الطب 2 (2038)، مسند احمد (4/278) (صحیح) »

اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ للہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور تجربے کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے دواؤں کو دریافت کرے، اس کام کو میڈیکل سائنس اور ڈاکٹر انجام دیتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی خدمات نہایت اہم ہیں، بھوکے کو کھانا کھلانا، محتاج کو کپڑے پہنانا، معذور کے کام میں ہاتھ بٹانا اور ضرورت مند کی حاجت پوری کرنا یہ سب مخلوق کی خدمت ہے، لیکن انسان سب سے زیادہ خدمت کا محتاج اس وقت ہوتا ہے، جب وہ مریض ہو، بیماری انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ کھانا موجود ہونے کے باوجود وہ کھا نہیں سکتا، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، لیکن وہ ایک قدم چل نہیں سکتا اور تیمارداری اور مددگاروں کے رحم و کرم کا محتاج ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول للہ ﷺ نے مریض کی عیادت اور تیمارداری کو بے حد اجر کا باعث قرار دیا ہے،

آپ ﷺ نے فرمایا:

عَنْ ثَوْبَانَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا عَادَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِي خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَأَحْمَدُ. وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَدِيْثُ ثَوْبَانَ حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ.

13: أخرجه مسلم في الصحيح، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عيادة المريض، 4/1989، الرقم: 2568، والترمذي في السنن، كتاب الجنائز، باب ما جاء في عيادة المريض، 3/299، الرقم: 967، وأحمد بن حنبل في المسند، 5/283، الرقم: 22497، وابن أبي شيبة في المصنف، 2/443، الرقم: 10832، والطبراني في المعجم الكبير، 2/101، الرقم: 1446، والقضاعي في مسند الشهاب، 1/242، الرقم: 384، والبيهقي في السنن الكبرى، 3/380، الرقم: 6371، وأيضًا في شعب الإيمان، 6/530، الرقم: 9169.

”حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک ایک مسلمان جب اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہاں سے لوٹنے تک برابر جنت کے باغ میں رہتا ہے۔“

اِس حدیث کو امام مسلم، ترمذی اور احمد نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ حسن صحیح ہے۔

جب تک ایک شخص مریض کی عیادت میں رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغ میں ہے

اس طرح ڈاکٹر گویا اپنی ڈیوٹی کے پورے وقت اس حدیث کا مصداق ہوتا ہے۔

رسول للہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعُهُمْ، وَأَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ سُرُوْرٌ تَدْخُلُهُ عَلٰى مُسْلِمٍ، أَوْ تَكْشِفُ عَنْهُ كُرْبَةً، أَوْ تَقْضِي عَنْهُ دَيْنًا، أَوْ تَطْرُدُ عَنْهُ جُوْعًا، وَلَأَنْ أَمْشِيَ مَعَ أَخِي الْمُسْلِمِ فِيْ حَاجَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَعْتَكِفَ فِي الْمَسْجِدِ شَهْرًا، وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهُ، سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ كَظَمَ غَيْظًا، وَلَوْ شَاءَ أَنْ يُمْضِيَهُ أَمْضَاهُ، مَلَأَ اللهُ قَلْبَهُ رِضًى يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ مَشٰى مَعَ أَخِيْهِ الْمُسْلِمِ فِيْ حَاجَتِهِ حَتّٰى يُثْبِتَهَا لَهُ، أَثْبَتَ اللهُ تَعَالٰى قَدَمَهُ يَوْمَ تَزِلُّ الْأَقْدَامُ، وَإِنَّ سُوْءَ الْخُلُقِ لَيُفْسِدُ الْعَمَلَ، كَمَا يُفْسِدُ الْخَلُّ الْعَسَلَ۔)) (صحیح الجامع الصغیر، رقم: ۱۷۶)

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جو ان سب سے زیادہ نفع

مند ہے اور پسندیدہ اعمال میں سے رب تعالیٰ کے ہاں وہ خوشی ہے جسے تو کسی مسلمان کو مہیا کر دے یا اس کی کوئی تنگی دور کر دے یا اس کی طرف سے قرضہ ادا کر دے یا اس سے بھوک کو بھگائے۔ میں اپنے مسلمان بھائی کے کسی کام کے لیے چلوں، یہ مجھے مسجد میں ایک ماہ تک اعتکاف کرنے سے زیادہ محبوب ہے جس نے اپنے غصہ کو روک لیا، اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا اور جس نے غصہ پیا اس حال میں کہ اسے جاری کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے دل کو رضامندی سے بھر دے گا۔ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کے کام میں چلا، یہاں تک کہ وہ کام اس کے لیے ثابت کر دیا (یعنی کام کروا دیا) تو اللہ تعالیٰ اس دن اس کے قدموں کو ثابت رکھے گا جس دن قدم پھسلتے ہوں گے۔ یقیناً برا اخلاق عمل خراب کر دیتا ہے جیسے سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا: خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاس یعنی لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔" (کنز العمال، ج8، ص54، جزء:16، حدیث:44147)

اور کون ہے جو انسانوں کے لئے ڈاکٹر اور معالج سے بڑھ کر نافع ہو؟ اس طرح گویا حضور ﷺ کی بارگاہ سے ڈاکٹر کو "خیر الناس" (بہترین انسان) کا ایوارڈ ملا ہے، ان سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے۔

تو مولانا رومؒ نے اس شعر میں واضح کیا کہ پہلے بادشاہ نے مریض کی کیفیت اس طبیب کو زبانی بتائی پھر طبیب کو اس مریضہ کے پاس لے گئے تاکہ وہ اس کی تحقیق و تفتیش کر سکے۔

ایرانی

رَنگِ روی و نَبْض و قارورِہ بِدید

ھم عَلاماتَش ھم اَسْبابَش شَنید

پاکستانی

رَنگ رُو و نَبُض و قارُورہ بِدید
ہم عَلاماتَش ہم اَسُبابَش شُنِید

رنگ رو: چہرہ کا رنگ۔۔۔ قارورہ: پیشاب، اطباء شیشی میں مریض کا پیشاب ڈال کر مرض کی تشخیص کے لئے دیکھا کرتے تھے۔۔۔

بدید: دیکھا۔۔۔ علامتش: اسکی علامتیں۔۔۔ اسبابس: اس کے اسباب

ترجمہ: طبیب نے چہرہ کا رنگ، نبض اور پیشاب کا رنگ دیکھا اور اس مرض کی علامتیں اور اسباب بھی سنے۔

آج، ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ روایتی ادویات علاج میں بہتر کام کرتی ہیں لیکن تشخیص میں کمزور ہیں۔ کیونکہ اس میں لیبارٹری نہیں ہے۔ پروفیسر مقدم از ایران فرماتے ہیں کہ: ماضی میں، ڈاکٹر آج کی لیبارٹری کے بجائے اوزار اور علامات کا استعمال کرتے تھے اور انہوں نے اسے بہت سمجھداری سے استعمال کیا، بدقسمتی سے، جدید طب اس سائنس کو استعمال نہیں کرتی ہے حالانکہ یہ سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہر خاندان میں ایک فرد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ طبی علم رکھتا ہو، پودوں کی خصوصیات کو جانتا ہو اور علامات کو جانتا ہو۔ کیونکہ بہت سی ناراضگیوں کو ایک کاڑھے یا آسان کام سے آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے، اور اگر آپ کو قدرتی علامات کا ایک سلسلہ معلوم ہو تو آپ ایک اچھا نتیجہ حاصل کرسکتے ہیں اور بہت سی بیماریوں میں مدد کرسکتے ہیں... (مقدم)

پہلا کام کلر تھیوری سیکھنا ہے۔

عام طور پر جب لوگوں کے چہرے کا رنگ پیلا اور سیاہ ہو جاتا ہے تو یہ جگر کی خراب کارکردگی کو ظاہر کرتا ہے۔

یا نچلی پلک کا رنگ کسی شخص کی خون کی کمی کو ظاہر کرسکتا ہے۔ آنکھوں کا سوجن ان علامات میں سے ایک ہے جس سے بیماری کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ یہ طریقے پرانے ٹیسٹوں میں عام تھے اور بیمار شخص کے چہرے کی جلد کی رنگت کو دیکھ کر اس بیماری کی تشخیص بہت زیادہ امکان کے ساتھ کی جاسکتی تھی۔

آئیر س کی لکیروں سے، کوئی مریض کی ماضی اور حال کی بیماریوں کو سمجھ سکتا ہے اور مستقبل کی بیماری کی پیش گوئی بھی کر سکتا ہے۔

Iridology is the study of the patterns on the iris, the colored part of your eye. The iris is one of the most intricate and fascinating tissue structures in the human body. The claim is that iridology can provide clues about a person's health status, as well as the functioning of various organ systems.) کے پمفلٹ کا مواد بہت آسان ہے اور یہ ان پرچے میں سے ایک ہے جسے آپ انٹرنیٹ پر آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں۔

آنکھ کے ایرس کے اندر جھانک کر آپ یہ جان سکتے ہیں کہ بیماری کا کوئی جینیاتی پہلو ہے یا نہیں!

ہتھیلی کی لکیروں کو دیکھ کر جسے آج کل دواسوجوک کہا جاتا ہے،، بہت سی بیماریوں کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔اس طریقے سے آپ جسم کی تمام مماثلتوں کو جان سکتے ہیں۔ اور اضطراری امراض کو پہچاننے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

یہ بہت آسان علوم ہیں جنہیں آپ ایک یا دو دن میں آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور بیماریوں کو پہچاننے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

میں نے خود اپنے پاؤں کے تلووں پر کافی تحقیق کی ہے اور اس کے ذریعے میں تقریباً تمام بیماریوں کی تشخیص کر سکتا ہوں۔(مقدم)

اگلا طریقہ نبض سے مرض کو پہچاننا ہے۔

نبض دیکھنے والا شخص نباض کہلاتا ہے۔ نبض وہ ہے جو کامل توازن میں ہو۔اس کے ہاتھ کی کانپ نہیں ہے اور اس نے اپنی انگلیوں اور لمس کو بہت مضبوط کیا ہے۔نباض اپنی تین انگلیاں اوپری ہنسلی پر رکھتا ہے اور نبض لیتا ہے۔

انسانی نبض صرف ایک عدد کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کی کئی خصوصیات ہیں۔ نبض کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ہوتی ہے۔ نبض ہمیشہ اپنی سمت میں ایک قوت اور عمودی سمت میں دوسری قوت اور افقی سمت میں بھی ایک قوت متعارف کرواتی ہے۔

نبض کو اس طرح لینے کے بعد، آپ فرق محسوس کریں گے اور آپ نبض کی اریتھمیا یا کو آرڈینیشن کی کمی کو سمجھ سکیں گے۔یعنی آپ دیکھیں گے کہ نبض باقاعدگی سے دھڑکتی ہے یا بے قاعدگی سے۔

کچھ دیر بعد آپ کی ہتھیلی کے سینسرز اور چکر کھل جائیں گے اور چند سیکنڈ میں آپ دوسرے فریق کے تمام مسائل کو اسکین کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے، آپ اپنی خود آگاہی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، یعنی آپ شعوری طور پر پرچہ پڑھتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد، جیسے ہی آپ نبض پر انگلی رکھیں گے، آپ کا لاشعور تمام معلومات کا تجزیہ کرے گا اور بیماری کی صحیح تشخیص کرلے گا۔ ایک اور چیز جس پر آپ کو توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ نبض کہاں دھڑکتی ہے اور یہ مضبوط ہے یا کمزور؟

نبض ایک شخص سے بات کرتی ہے۔ آپ کو صرف توجہ مرکوز کرنے اور ایک اچھے رابطے کی ضرورت ہے...

بدقسمتی سے، یہ کہنا ضروری ہے کہ ادویات اور صحت کے نظام اب تک ہمارے ساتھ بہت ایماندار نہیں رہے، اور ہم اس وقت غیر ارادی طور پر روایتی ادویات کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

چینی نبض میں بہت ماہر ہیں اور اعلیٰ مہارت رکھتے ہیں، اور یہ ان کے پرچوں اور کتابوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ بہت زیادہ مشق کی وجہ سے ہے۔ جو لوگ ایڈوانس مائنڈ کورسز میں حصہ لیتے ہیں وہ دماغ کے ذریعے دریافت کا ہنر سیکھتے ہیں اور نبض سے دوسرے فریق کی بیماریوں کو اسکین کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔

ایک اور طریقہ جو سیکھنے میں بہت آسان ہے اور اس میں دو یا تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگتا ہے زبان پڑھنا ہے۔ آپ زبان سے سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے فریق کی طبیعت کیا ہے اور اس کے جسم کی وجوہات اور بیماریوں کو جان سکتے ہیں۔

بعض اوقات جب آپ ہسپتال نہیں جا سکتے یا آپ کو ڈاکٹر کے دفتر تک رسائی نہیں ہوتی ہے، تو آپ زبان سے جلدی سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرا فریق کیسا ہے۔

ایک اور طریقہ جو بیماری کی تشخیص میں بہت درست ہے وہ ہے فارینگولوجی۔

شیشے کا فلاسک گول نیچے کے ساتھ صاف اور بے رنگ ہے۔

پرانے زمانے میں مریض اپنا پیشاب ایک گلاس میں ڈالتا تھا، اور وہ گلاس ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا تھا، اور ڈاکٹر پیشاب کے رنگ اور بو کی بنیاد پر جگر، گردے اور مثانے کی بہت سی بیماریوں کی تشخیص کر سکتا تھا۔

اس طریقہ کار میں تشخیص بہت آسان ہے۔

مثال کے طور پر، فلورنس رنگ کے ساتھ اور اسے دھوپ میں رکھنے سے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ پیشاب کا رنگ کیسے بدل گیا ہے.

پیشاب پر چربی کی تہہ کا جمع ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کسی شخص میں کولیسٹرول زیادہ ہے۔ قانون کی کتاب میں ابن سینا نے یورولوجی کی بہت اچھی طرح وضاحت کی ہے۔

بیماری کی علامات

مریض کے چہرے اور جسم کو دیکھ کر بیماری کی علامت معلوم کرنا وجہ کہلاتا ہے۔ وجہ مختلف واقعات کے خلاف ایک شخص کی عکاسی ہے.

مثال کے طور پر، ڈاکٹر پوچھتا ہے کہ آپ جو ٹھنڈا پانی پیتے ہیں آپ کے جسم میں کہاں تک درد ہوتا ہے، یا آپ جو مصالحیدار کھانا کھاتے ہیں اس کا کیا ہوتا ہے۔ یہ وجوہات ہیں...

انسان کو سمجھنا اگر آسان ہوتا تو زندگی بھی آسان ہو جاتی۔ زندگی کی تمام تر پیچیدگیاں انسان کی فطرت کے تضاد کا نتیجہ ہیں۔ قدیم فلسفی کہتے ہیں کہ فطرت میں جو بھنور پایا جاتا ہے۔ وہی بھنور انسان کے مزاج میں موجود ہے۔ فطرت کی متحرک قوت دائرے کے روپ میں موجود رہتی ہے۔ پانی، بادل، طوفان یا بارش اس قوت کا اظہار ہیں۔ دو یا اس سے زیادہ توانائی کے دھارے آپس میں ملتے ہیں تو وہ بھنور یا دائرے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے انسان اندر کے بھنور یا ابہام سے لڑتا چلا آیا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی دقیق فلسفوں اور نفسیاتی تشریحات نے سوچ کے نئے زاویے متعارف کرائے۔ ماہرین نفسیات مزاج اور شخصیت کا جائزہ Endocrine Glands کے توسط سے جامع انداز سے کرنے لگے۔ قدیم یونانی ماہرین نفسیات نے شخصیت کو چار اقسام میں بیان کیا ہے۔

Phlegmatic بلغمی: پر سکون اور اعتدال پسند یہ افراد تضاد سے عاری ہوتے ہیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ چلنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ Sanguine صفراوی: جذباتی طور پر متحرک، پر تجسس یہ لوگ زندہ دل ہوتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل یہ افراد پر جوش لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ Choleric دموی: یہ لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ اور یہ خواب انھیں کامیابی کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں قائدانہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ یہ مقصد کا تعین کر کے راستہ بناتے ہیں۔

Melancholic سوداوی: یہ خاموش اور تنہائی پسند لوگ ہیں جو کاملیت پسند کہلاتے ہیں۔ تخلیقی سوچ، گہرائی، منطق اور تجزیے کی صلاحیت، انھیں فنون لطیفہ کی طرف لے جاتی ہے۔ نقاد اور فلسفی بنتے ہیں۔ ان لوگوں کی بیماریاں بھی مزاج کے زیر اثر ہوتی ہیں۔

لیکن بات فقط مزاج اور شخصیت تک محدود نہیں رہی۔ ماہرین نفسیات، فلسفی اور اہل نظر مستقل انسان کو پرکھنے کی کھوج میں رہے۔ ارسطو نے چہرے کے نقوش کے ذریعے انسان کو سمجھنے کی کوشش کی اور انسان کے ظاہری روپ کے ذریعے اس کے اندر کا راز جاننے کے عمل میں مصروف رہے۔ شخصیت کو پرکھنے کی جستجو میں چہرے کا رنگ، بال، آواز، چال اور حرکات و سکنات آجاتے ہیں۔ چہرے کے خدوخال کے وسیلے، انسان کی پرکھ کو قیافہ شناسی کا نام دیا گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آنکھیں، ناک، کان، پیشانی اور ہونٹ وغیرہ انسان کی فطرت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

چینی قیافہ شناسی کا طریقہ بہت دلچسپ ہے۔ (فلیک سولوجی میں ہاتھوں اور پیروں کے پریشر پوائنٹس کے وسیلے علاج کیا جاتا ہے۔ یہ مختلف پوائنٹس انسانی اعضا سے جڑے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے چہرہ شناسی کے چینی طریقے میں، چہرے کے چارٹ کے ذریعے آپ دل، گردوں، جگر و آنتوں کا حال جان سکتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ آنکھیں جگر کا آئینہ ہیں۔ آنکھوں کے رنگ جگر کی بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ناک، دل سے منسلک ہے۔ سرخ ناک اور لکیریں دل کی بیماری کو ظاہر کرتی ہیں۔ پھیپھڑے گالوں کی ساخت سے تعلق رکھتے ہیں۔ گالوں کے گڑھے خوبصورتی کے علاوہ تنفس کی بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جرائم پیشہ لوگوں کو زیر کرنے کے لیے چہرہ شناسی کا علم کارآمد ثابت ہوا۔ مڈل ایجز میں علم نجوم اور چہرہ شناسی کے ذریعے انسانی فطرت کو سمجھا جاتا تھا۔ عرب مصنف الرازی نے بھی چہرہ شناسی کے فن میں کئی دریافتیں کیں۔ بیسویں صدی میں یہ علم عروج پر پہنچا اور ذہن و کردار کو پرکھنے کا پیمانہ قرار پایا۔ طب، آیورویدک اور ٹریڈیشنل چائیز میڈیسن میں مرض کی تشخیص کے لیے قیافہ شناسی سے مدد لی جاتی ہے۔

چہرے کی ساخت شخصیت کو پرکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ گول چہرے کے حامل افراد حساس، جذباتی، خیال رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ رشتے نبھانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

لمبا چہرہ، حقیقت پسندی، محنت اور منطق کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ انا پرست ہوتے ہیں۔ رشتے نبھانے میں مسائل پیدا کرتے ہیں۔ تکونی چہرہ تخلیقی صلاحیت اور غصے کو ظاہر کرتا ہے۔ مستطیل چہرے ذہین، تجزیہ نگار، فیصلہ کن ذہن کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ

غصیلے ہوتے ہیں اور غلبہ قائم رکھتے ہیں۔ ناک چہرے کا اہم حصہ ہے۔ ناک کی بناوٹ دولت، رویہ وجذباتی زندگی کو ظاہر کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح کان کی ساخت سے شخصیت کا اتار چڑھاؤ پرکھا جاسکتا ہے۔ لمبے کان مادیت پرستی اور مغرور ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

چھوٹے کان فطرت میں احترام، توازن اور محبت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ چوڑا ماتھا ادراک، سوجھ بوجھ اور تصوراتی قوت کا مظہر کہلاتا ہے۔ ماتھے کی لکیریں گہری سوچ اور تحقیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح ہونٹ، بھنوؤں کی ساخت اور چہرے کے تل وغیرہ بھی اس ضمن میں شخصیت کے اسرار سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنے اندر کے راز اور اصلیت کو دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی ہے۔ جھوٹ پر سچائی کا نقاب اوڑھ کر وہ ہمیشہ فائدہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جھوٹ، بناوٹ اور دکھاوا دنیاوی کامیابی کی علامت بن چکے ہیں۔ دغابازی، مکاری اور فریب وہ منفی رویے ہیں، جن کے ذریعے انسان دوسروں کا استحصال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا بہتر معیار، جھوٹ وفریب کے ستون پر کھڑا کرتا ہے۔ کیونکہ سیدھا، سچا وشفاف راستہ دنیاوی رنگینیوں و آسائشوں سے مبرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان متضاد راستے کی بھول بھلیوں کا انتخاب کر کے دنیاوی فائدے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چہرہ شناسی کا فن سمجھنے والے، نقاب در نقاب چھپے ہوئے کاغذی پھول سے چہروں کی اصلیت ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رومیؒ نے طب میں مہارت حاصل کی ہے، کیونکہ ایک شعر میں انہوں نے قدیم طب یا سینائی طب کے بیشتر طریقوں کا ذکر کیا ہے۔

ایرانی

گفت ھر داروی کہ ایشان کردہ اند

آن عِمارَت نیست، ویران کردہ اند

گفت ہر دارُو کہ ایشاں کردہ اند

آں عِمارَت نیست، وِیران کردہ اند

گفت: کہا مراد کہنے لگا۔۔ ہر دارو: ہر دوا۔۔ ایشاں: اس کی۔۔ کردہ اند: جو کی گئی۔۔ عمارت: آباد کی۔۔ ویران کردہ: اجاڑ دی گئی

اس شعر میں استعارہ استعمال کیا گیا ہے، عمارت یعنی اصلاح مزاج اور ویران فساد مزاج سے۔

ترجمہ: کہنے لگا ان اطباء نے جو جو علاج کیا ہے اس سے صحت کی عمارت نہیں بنائی بلکہ اس سے انہوں نے اسے ویران کر دیا ہے۔ یعنی مرض کچھ اور تھا اور وہ لوگ علاج کچھ اور کرتے رہے، ایسا علاج کرتے رہے جس سے کوئی فائدہ مقصود نہیں تھا۔

علاج خویش مکن ضایع، ای طبیب، اینجا

کہ بر جراحت عاشق، دوا ندارد سود (امیر خسرو)

اے ڈاکٹر یہاں اپنا علاج ضائع نہ کر کیونکہ عاشق کی چوٹ کی کوئی دوا نہیں۔

حویلی کا مطلب ہے آباد کرنا

حکیم نے کہا کہ پچھلے ڈاکٹروں نے جو دوائی دی تھی اس سے کوئی بہتری نہیں ہوئی بلکہ طبیعت مزید خراب کر دی!

طبیب الٰہی نے سب سے بہترین نفساتی عمل یہ کیا کہ پچھلے ڈاکٹروں کی تشخیص کی نفی کی اس سے جو خوف و وحشت مریضہ کے دل میں بیٹھ گئی تھی وہ ختم ہو گئی اور اس نے ذہنی آسودگی محسوس کی کیونکہ مسئلہ نفسیاتی تھا۔

وہ تمام امراض جو مریض کی فکر، عادت، مزاج، انداز، شخصیت، جذبات اور محسوسات کو متاثر کریں نفسیاتی امراض کہلاتے ہیں۔

نفسیاتی امراض کے ڈاکٹر کو سائیکٹرسٹ (ماہر نفسیات) کہتے ہیں۔ نفسیاتی امراض میں علامات

معمولی علامات میں وہم کا ہونا، بے چینی ہونا، گھبراہٹ، نیند کا کم یا زیادہ ہونا، بھوک کا کم یا زیادہ ہونا، ڈر یا خوف، جنسی خواہش کا کم یا زیادہ ہونا سے لیکر شدید گھبراہٹ، غصہ توڑ پھوڑ، گالم گلوچ اور خود کشی یا تشدد کی کیفیت تک تمام علامات نفسیاتی بیماری کی علامات ہیں۔

زیادہ اہم اور عام نفسیاتی امراض

اہم اور عام نفسیاتی امراض میں اداسی کی بیماری یعنی ڈپریشن(Depression)، گھبراہٹ کی بیماری(Anxiety)، اداسی اور جنون کی بیماری(Mood Dsorder)، شیزوفرینیا(Schizophrenia) کی بیماری، ذہنی پسماندگی، یادداشت کم ہو جانے کی بیماریاں، نشہ کی بیماریاں، مرگی کے دورے کی بیماریاں، جنسی بیماریاں، شخصیت کی خرابی کی بیماریاں، بچوں کے نفسیاتی امراض، جسمانی بیماریوں کے ساتھ ہو جانے والی نفسیاتی بیماریاں وغیرہ شامل ہیں

عام نفسیاتی علامتیں

عام نفسیاتی علامات میں سر درد، اداسی، نیند کی کمی، بھوک کی کمی، یادداشت کی کمزوری، بدن کا درد، بدہضمی کی عمومی شکایت، توجہ کا کم ہونا، دلچسپی کا کم ہو جانا، اعصابی تناؤ، دل کی دھڑکن کا کم یا زیادہ ہو جانا، سینے کا درد، سانس میں گھٹن کی کیفیت، دورہ پڑنا وغیرہ شامل ہیں۔

نفسیاتی امراض کے علاج میں رکاوٹیں

نفسیاتی مریض کا اپنے آپ کو مریض نہ سمجھنا اور علاج معالجے کے سلسلے میں تعاون کرنے سے انکار کرنا۔

نفسیاتی مریض کے لواحقین اور تیمارداروں کا نفسیاتی مرض کا نہ سمجھنا اور مریض کے علاج کے سلسلے میں مزاروں، پیروں، تعویز گنڈوں اور جھاڑ پھونک پر زیادہ زور دینا۔

عام ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کا نفسیاتی امراض کے سلسلے میں تجربہ کم ہونے کے سبب ان امراض کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دینا اور غلط مشورہ دینا۔

معاشرے میں نفسیاتی امراض کے بارے میں معلومات کی کمی۔

نفسیاتی امراض کے تجربہ کار معالجین کی کمی اور نفسیاتی امراض کے علاج کے اداروں کی کمی۔

نفسیاتی امراض کا علاج

نفسیاتی امراض کے علاج کے بہت سے طریقے ہیں جو مرض کی علامات کو جانچنے اور تشخیص کرنے کے بعد تجویز کئے جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کے امراض کے علاج کو تین عنوانات کے تحت الگ الگ بتا سکتے ہیں۔

الف-بغیر ادویات کے علاج (یہ علاج عموماً ادویات کے علاج کے ساتھ کیا جاتا ہے-

سائیکو تھراپی یعنی گفتگو کے ذریعہ نفسیاتی علاج، اس کی بہت سی قسمیں ہیں اور مختلف طریقوں سے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہیپنو تھراپی، عادتوں کی درستگی کا علاج۔ اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔

درست سمت فکر کا علاج۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

آرام بخش ورزشیں، ذہنی ورزشیں اور ہیپنو تھراپی، اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

ب- مشینی علاج۔ یہ علاج شدید نفسیاتی بیماریوں میں کیا جاتا ہے اور ایک کامیاب طریقہ علاج ہے۔

پ-ادویات سے علاج۔ یہ تیر بہدف علاج ہوتا ہے اور جلد بہتر نتائج لیکر آتا ہے۔

جدید تحقیقات کی روشنی میں اس علاج میں روز بہ روز نئی پیش رفت ہو رہی ہے۔

غلط تصورات: اس تصور کو ختم کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ نفسیاتی امراض کے علاج کے لئے استعمال ہونے والی ادویات نشہ آور ہوتی ہیں اور عادت ڈال دیتی ہیں۔

نفسیاتی امراض کے علاج میں جو ادویات استعمال کی جاتی ہیں وہ نشہ آور نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی عادت ڈالتی ہیں۔ دراصل نفسیاتی ادویات کی کئی قسمیں ہیں۔ جو کچھ یوں ہیں۔

گھبراہٹ مخالف ادویات۔Antianxiety

یاسیت مخالف ادویات۔Anti Depressant

جنون مخالف ادویات۔Anti Manic

مزاج کو ہموار رکھنے والی ادویات۔Mood Stablizers

دوروں کو روکنے والی ادویات۔Anti Epileptics

خواب آور ادویات(Hypnotics)۔ان ادویات میں نشہ آور ادویات یعنی ڈائی زی پام(Diazepam) کے گروہ کی ادویات ہوتی ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ سائیکٹرسٹ ان ادویات کو بہت کم استعمال کرتے ہیں اور دیگر ڈاکٹر صاحبان ان دواؤں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

سائیکٹرسٹ انسانی جسم کے سب سے حساس پہلو یعنی ذہن کے معالج ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ کئی اور خدمات بھی انجام دیتے ہیں مثلاً درست تعلیم اور تربیت کی طرف رہنمائی، شخصیت بہتر بنانے کے لئے مشورہ۔

ازدواجی الجھنیں دور کرنے کے لئے مشورہ۔کارکردگی بہتر بنانے کے طریقے۔قوت ارادی کو بڑھانے کے طریقے۔شخصیت کی نشوونما کرنے کے طریقے۔

جنسی لطف اور طاقت کو بڑھانے اور قائم رکھنے کے طریقے۔توجہ اور دلچسپی برقرار رکھنے کے طریقے وغیرہ بھی سائیکٹرسٹ بتاتے ہیں

طبیب الٰہی نے بیماری کے اثرات اور علامات کا جائزہ لیا اور بیماری اور غضب کی وجہ کی تلاش میں لونڈی اور اس کے ساتھیوں کی باتیں سنیں۔

یہاں اس سے مراد صحیح مزاج، صحت اور صحت کی تعمیر ہے اور اس سے مراد مزاج کے بگاڑ کی تباہی ہے۔

طبیب الٰہی نے کہا:ڈاکٹر ملازمہ کی بیماری کی تشخیص نہیں کر سکے،یہی وجہ ہے کہ مریض کی تھکاوٹ بہتر ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے۔طبیب الٰہی نے بیماری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔اور اس کی نفسیاتی تحریک کا علم حاصل ہونے پر مناسب عمل کیا۔

اس شعر میں مولانا رومؒ کے علمی تبحر کا پتا چلتا ہے کہ طب کے انتہائی حساس موضوع کو محرکات نفسانیہ کو بھی زیر بحث لے آئے سبحان اللہ!

ایرانی

بی خَبَر بودند از حالِ درون

پاکستانی

بے خَبَر بودند از حالِ درون

اَسۡتَعِیۡذُ اللّٰہَ مِمَّا یَفۡتَرُون

بے خبر: نہ سمجھ۔۔۔ حال درون: اندر کے حال سے۔۔۔ استعیذ: پناہ مانگنا۔۔۔ ممایفترون: جو کیا

ترجمہ: وہ لوگ اندر کے حال سے بے خبر تھے۔ میں ان کی غلط بیانی سے پناہ مانگتا ہوں۔ مطلب یہ کہ وہ اطباء مرض کی تہہ کو نہیں پہنچ سکے۔

حکیم نے کہا: ڈاکٹر مریض کی حالت سے بے خبر تھے، ان کے پاس صرف طبی معلومات تھی اور وہ اس مریض کے دل کے درد سے آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔

یہاں ہمارے لیے ایک بہت بڑی حقیقت کھلتی ہے کہ بہت سی جسمانی بیماریوں کا علاج صرف جسمانی طور پر نہیں ہو تا بلکہ اس کی وجہ انسان کی اندرونی کیفیت ہوتی ہے! لہٰذا اندرونی کیفیت کے علاج سے ہی مرض سے صحت یابی ہو سکتی ہے۔

کچھ ڈاکٹر نفسیات اور اس کی خصوصیت کے بارے میں علم رکھتے ہیں اور وہ صحیح وقت پر سمجھتے ہیں کہ مریض کو زیادہ آرام دہ دماغ اور اعصاب کی ضرورت ہے اور وہ اسے بغیر کسی وجہ کے منشیات نہیں لگاتے ہیں۔ اس کی نفسی پہلو کے ساتھ نفسیات پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ جس سے مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ مریض کو بتاتے ہیں کہ وہ چلنے پھرنے، مسکرانے یا چائے پینے سے زیادہ خوش حال ہو سکتا ہے۔

جو شخص علاج کروانا چاہتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ طبی اور خصوصی معلومات اور اچھی نفسیات رکھنے والے دونوں خصوصیت کے حامل کے پاس جائے جو کہ اس شخص کے اندر کی باتوں کو جان سکے اور بر وقت اچھا علاج فراہم کر سکے۔

ایک دوسرے پہلو کی طرف مولانا رومؒ نے توجہ دلائی ہے اور وہ سب سے اہم ہے کہ یہ کہنا کہ:

میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں! یہ جملہ بہت قیمتی ہے۔

براہِ کرم، آپ اپنے آپ کو ہر بحران اور حالت میں پاتے ہیں، تو صرف یہ کہو: میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

اندر سے یہ جملہ کہنے سے آپ کو بڑا سکون اور سلامتی حاصل ہو گی۔ آپ بیہودہ خیالات میں نہ پھنسیں گے۔

خدا کی پناہ مانگنے سے آپ کی باطنی حالت بہتر ہو جائے گی اور آپ کے دل میں خدا کے لیے ایک عظیم مقام پیدا ہو جائے گا۔

خدا کی پناہ ایک روحانی طریقہ ہے جس کے دو اہم اسباق ہیں

سب سے پہلے، کوئی ایسی چیز تجویز نہ کریں جس کے بارے میں آپ کو یقین نہ ہو۔

جو لوگ پختہ یقین پر پہنچ گئے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان کا راستہ درست ہے

جس شخص کے پاس بہت زیادہ معلومات ہو وہ فوری طور پر کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔ ایک قطعی رائے دینا بہت ذمہ دارانہ بات ہوتی ہے اور یہ کسی شخص کو خوش یا ناخوش کر سکتا ہے، لہٰذا فوری یقین سے بات نہ کریں، کیونکہ بولنے انسان متاثر ہوتا ہے اور اگر غلط بات پر اعتماد ہو جائے تو وہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب طبیب الٰہی نے دیکھا کہ پچھلے ڈاکٹروں نے غلط تشخیص کی ہے تو صرف اتنا کہا کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں اسے کسی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

پچھلے ڈاکٹرز حقی ڈاکٹر تھے مگر اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے۔ براہ کرم دوسروں کے اعتراضات میں داخل نہ ہوں۔ جب آپ کسی میں کوئی خامی یا ناکامی یا مسئلہ دیکھتے ہیں، اگر آپ اس پر جرات کرتے ہیں اور اس پر توجہ دیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں، تو آپ نے اپنے لئے وہی حشر کیا ہے!

جیسے ہی آپ کسی کی پریشانی دیکھیں تو فوراً کہہ دیں میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ اگر آپ یہ نہیں کہتے ہیں، تو آپ کا دماغ آپ کے لیے وہ حشر پیدا کرنا شروع کر دے گا! جبکہ خدا کی پناہ مانگنا آپ کو غرور میں پھنسنے سے روکے گا۔

جب تکبر تم پر آجائے تو فوراً خدا کی پناہ لے کیونکہ تم فوراً فنا ہو جاؤ گے اور تمہارے تکبر کی آگ بجھ جائے گی اور تم نجات پاؤ گے۔

آپ جن چیزوں میں ناکام رہتے ہیں ان میں سے بہت سی اس وجہ سے ہیں کہ آپ اپنے دماغ میں خود غرضی میں مبتلا ہیں۔

جب بھی آپ کسی کامیابی میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوبارہ خدا کی پناہ مانگیں تاکہ خدائی توانائیاں آپ کی زندگی میں داخل ہو جائیں اور ذہنی کھیل آپ پر حاوی نہ ہوں۔

جن لوگوں نے Havaoponopono پر کام کیا ہے وہ لاشعور کو جانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس طریقہ کار میں بعض اوقات ناقص ڈیٹا مل جاتا ہے اور ہمارا لاشعور کنٹرول کر لیتا ہے اور کام برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے کہ ہمیں اپنے اندر الہی روح کو طاقت دینے کے لیے خدا سے پناہ مانگنی چاہیے اور ہمیں حرکت کرنے کے لیے ایک میدان دینا چاہیے۔ اس وقت، ہمیں یہ کہنا چاہیے، خدا، ہمارے کام کا خیال رکھنا اور ناقص ڈیٹا اور میری ذہنی غلطیوں کو میرے رویے پر قابو نہ ہونے دینا۔

قرآن حکیم جو اللہ رب العزت کا مبارک کلام ہے۔ اس میں ارشاد فرمایا دراصل جس کی طرف مولانا رومؒ نے اشارہ کیا ہے:

اللہ تعالی نے قرآن مجید کی قراءت سے قبل استعاذہ کا حکم دیا ہے

فقال تعالی: فإذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم. النحل ۹۸

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

حدیث میں ہے خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ (تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھلائے) معلوم ہوا کہ مومن کے لئے قرأت قرآن بہترین کام ہے، اور پچھلی آیات میں دو مرتبہ بہتر کاموں پر اجر ملنے کا ذکر تھا اس لئے یہاں قرأت قرآن کے بعض آداب کی تعلیم فرماتے ہیں تاکہ آدمی بے احتیاطی سے اس بہتر کام کا اجر ضائع نہ کر بیٹھے، شیطان کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں سے روکے خصوصاً قرأت قرآن جیسے کام کو جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، کب ٹھنڈے دل سے گوارا کر سکتا ہے، ضرور اس کی کوشش ہوگی کہ مومن کو اس سے باز رکھے، اور اس میں کامیاب نہ ہو تو ایسی آفات میں مبتلا کر دے جو قرأت قرآن کا حقیقی فائدہ حاصل ہونے سے مانع ہوں، ان سب مغویانہ تدبیروں اور پیش آنے والی خرابیوں سے حفاظت کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ جب مومن قرآت قرآن کا ارادہ کرے، پہلے صدق دل سے حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور شیطان مردود کی زد سے بھاگ کر خداوند قدوس کی پناہ میں آجائے، اصلی استعاذہ (پناہ میں آنا) تو دل سے ہے، مگر زبان و دل کو موافق کرنے کے لئے مشروع

ہے کے ابتدائے قرأت میں زبان سے بھی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھے. تفسیر عثمانی

استعاذہ کا معنی

طلب العوذ والعیاذ ہے یعنی پناہ طلب کرنا، یعنی جب آپ: أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. پڑھتے ہیں تو گویا آپ یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اور شیطان کے وساوس و مکائد سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں، کہ وہ مجھے میرے دین یا دنیا میں کوئی نقصان دے یا مجھے اس حکم سے روکے جس کی بجاآوری کا مجھے حکم دیا گیا ہے یا ایسے کام پر ابھارے جس سے میں منع کیا گیا ہوں

استعاذہ کا حکم

قال اللہ تعالی: ﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴾ سورۃ النحل. قراء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قراءت قرآن سے قبل استعاذہ مطلوب ہے اگرچہ قرآن کی ایک آیت ہی کیوں نہ ہو، لیکن استعاذہ کے حکم میں اختلاف ہے ، بعض علماء نے استعاذہ کو مستحب کہا ہے چاہے کسی سورت کے شروع سے تلاوت کرے یا وسط سے، اور ان کا کہنا ہے کہ آیت مبارکہ میں صیغہ امر استحباب کے لیئے استعمال ہوا ہے نہ کہ وجوب کے لیئے. اور بعض علماء نے استعاذہ کو واجب کہا ہے چاہے کسی سورت کے شروع سے تلاوت کرے یا وسط سے، کیونکہ آیت مبارکہ میں صیغہ امر کا استعمال ہوا جو کہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے، لہذا قراءت قرآن سے قبل استعاذہ واجب ہو گا، اور یہی راجح قول ہے.

واللہ اعلم. اور اس قول کی تاکید اس وجہ سے بھی ہے کہ تلاوت سے قبل استعاذہ سے ہم کلام اللہ تعالی اور کلام غیر اللہ میں تمیز کرتے ہیں جو کہ ایک ضروری امر ہے

استعاذہ کا مقام و محل

استعاذہ قرآن مجید کی تلاوت سے قبل پڑھے گا، قال تعالی: فإذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم. یعنی جب آپ قرآن مجید کی قراءت کا ارادہ کریں تو استعاذہ پڑھیں، جیسا کہ قول باری تعالی

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ ...﴾ سورۃ المائدۃ: یعنی جب تم نماز کی قیام کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو دھوؤں الخ یعنی چہرہ دھونا اور باقی ارکان وضوء اور سنتوں کو بجالانا نماز سے قبل ہو گا نہ کہ نماز کے بعد، ایسا ہی استعاذہ قراءت قرآن سے قبل ہو گا نہ کہ بعد میں

استعاذہ کے صیغے

تمام قراء وفقہاء وعلماء کے نزدیک استعاذہ کا مختار وپسندیدہ صیغہ أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ہے. لیکن أئمہ قراء اور أھل الأداء سے کچھ اور صیغے بھی ثابت ہیں جو درج ذیل ہیں

1۔أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم

2۔أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم إنّ اللہ ھو السمیع العلیم

3۔ أعوذ باللہ العظیم من الشیطان الرجیم

4۔أعوذ باللہ العظیم السمیع من الشیطان الرجیم

استعاذہ جہراً یا سراً پڑھنے کا حکم

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ قراءت قرآن سے قبل استعاذہ ضروری ہے، اگر جھراً قراءت کرے تو استعاذہ بھی جھراً پڑھے، اگر سرّاً قراءت کرے تو استعاذہ بھی سرّاً پڑھے، لیکن نماز میں چاہے سری نماز ہو یا جَھری استعاذہ آہستہ پڑھے گا جھراً نہیں پڑھے گا

استعاذہ پڑھنے کے کچھ اور مقامات واحوال

نماز میں سورۃ الفاتحہ سے قبل استعاذہ پڑہنا

غصہ کے وقت استعاذہ یعنی (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) وغیرہ پڑھنا

بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت استعاذہ پڑہنا

کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے ہنہنانے کے وقت استعاذہ یعنی (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) وغیرہ پڑھنا

خوف وہراس اور گھبراہٹ کے وقت استعاذہ پڑہنا

رُقیہ یعنی دَم کرتے وقت استعاذہ پڑہنا

مسجد میں داخل ہوتے وقت استعاذہ پڑہنا

نماز میں وساوس آتے وقت استعاذہ یعنی (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) وغیرہ پڑھنا

رات کے آتے وقت استعاذہ پڑہنا

کسی مقام پر اترتے وقت استعاذہ پڑہنا

شیطانی وساوس آتے وقت استعاذہ یعنی (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) وغیرہ پڑھنا

ایک نئے پہلو کی طرف روشنی بھی ڈالنا ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝

ترجمہ: پس (اے رسول مکرم ﷺ) جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

تفسیر:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس (اے رسول مکرم) جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔ (النحل:۹۸)

قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے کی شیطان کو قدرت دی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

فوسوس الیہ الشیطان قال یاٰدم ھل ادلك علی شجرۃ الخلد وملك لا یبلی۔ (طہ:۱۲۰) پھر شیطان نے آدم کی طرف وسوسہ ڈالا، کہا اے آدم! کیا میں تم کو دوام کے درخت کا پتا بتاؤں اور ایسی بادشاہت کا جو کبھی کمزور نہ ہو۔

اور جب شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جائے تو پھر انسان شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبلسون۔ (الاعراف:۲۰۱) بیشک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آتا ہے تو وہ فوراً (اللہ کو) یاد کرتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ نبیوں کی طرف بھی شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور اللہ کو یاد کرنے کے سبب سے وہ وسوسہ زائل ہو جاتا ہے اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا روشن بیان ہے۔ (النحل:۸۹) اور اس

سے متصل پہلی آیت میں فرمایا تھا اور ہم ان کاموں کی اچھی جزا دیں گے۔(النحل:۹۷)اور یہ دونوں آیتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں، تاکہ آپ قرآن پڑھنا شیطان کی وسوسہ اندازہ سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھیں تو تمام مسلمان اس حکم کے تحت داخل ہیں۔(تبیان)

ایرانی

دید رَنج و کَشف شُد بروِیُ نَہُفت

لیک ُپنھان کرد و با سُلطان نگُفت

پاکستانی

دید رَنج و کَشف شُد بروِے نَہُفت

لیک ُپنہاں کرد و با سُلطان نگُفت

کشف شدن: ظاہر ہو جانا۔۔۔ نہفت: مخفی حال۔۔۔ پنہاں: پوشیدہ۔۔۔ باسلطان بگفت: سلطان سے نہ کہا

ترجمہ: اس نے بیماری ملاحظہ کی اور راز کی بات اس پر ظاہر ہو گئی لیکن اس نے اس بات کو پوشیدہ رکھا اور بادشاہ سے اس کا ذکر نہ کیا۔ یعنی کہ طبیب الٰہی نے عوارض ظاہری سے اس کا مرض باطنی معلوم کر لیا۔

نوک مژگانم بہ سرخی بر بیاض روی زرد

قصہ دل می نویسد حاجت گفتار نیست

میری پلکوں کے سرے پیلے پر سفید و سرخ ہیں۔

دل کہانیاں لکھتا ہے! لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی

حکیم الٰہی وہ شخص ہے جو طب اور نفسیات دونوں کو جانتا ہے اور لوگوں کے اندر کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔

یہاں، طبیب الٰہی نے لونڈی میں ایک مسئلہ دیکھا، لیکن پردہ کیا اور سلطان سے کچھ نہیں کہا!

جب آپ خود کو بہتر بنانے اور روحانی علوم پر کام کرتے ہیں، تو سب سے پہلی چیز جو آپ کے ساتھ ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں، تو آپ کو اس کے اندر کے راز کا جلد احساس ہوتا ہے۔ یعنی، آپ ایک ایسی حالت میں داخل ہوتے ہیں جہاں آپ پہچان سکتے ہیں کہ آپ کا مخالف فریق کیا کر رہا ہے!

اس مرحلے کو کیسے پاس کرنا ہے یہ سیکھنے کے لیے آپ کے لیے یہاں ایک بہت اہم امتحان ہے۔

اس مرحلے پر، آپ کو صرف ایک شخص کے راز دوسرے کو بتانے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں، آپ الٹ جائیں گے اور روحانی مرحلے سے گر جائیں گے جس میں آپ ہیں! کیونکہ تم نے دروازے کا پردہ ڈالنے اور دوسروں کے راز افشا کرنے کا ارتکاب کیا ہے۔ جب آپ کو کسی کی غلطی نظر آتی ہے، چاہے آپ اس کے بارے میں بات نہ کریں اور ایک لفظ بھی نہ بولیں۔ لیکن اپنے اندر اس کا جائزہ لیتے رہیں، اس سے آپ کا باطن ختم ہو جائے گا اور آپ کی روحانی حیثیت گھٹ جائے گی۔

خدا عیوب کا ستار ہے اور دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا پسند کرتا ہے۔

آپ کو خدا کے ستاریت کے ساتھ جانا چاہئے۔ کسی کے عیب نہ دیکھیں، جب بھی آپ کو اپنی یا دوسرے فریق کی غلطی کا علم ہو جائے تو آپ کو فوراً اپنا دماغ بند کر لینا چاہیے تاکہ آپ فیصلے میں نہ پھنس جائیں اور اپنے یا دوسرے فریق کے مثبت نکات پر توجہ دینے کی کوشش کریں!

یہ اور بھی برا ہے اگر آپ دوسروں کو اپنے عیوب کے بارے میں بتائیں اور یہ بہت خطرناک ہے اور آپ شیطان کے جال میں پھنس جائیں گے۔جب بھی آپ کو کسی کی غلطی کا علم ہو جائے تو فوراً منہ پھیر لیں اور گزر جائیں یا کسی اور مسئلے کی طرف توجہ دیں اور دوسروں کی کہانیاں نہ خود کو سنائیں اور نہ ہی دوسروں کو۔اس سے آپ کو اس وقت پر وموشن حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ کو جلدی سے اس چیز سے باہر نکلنا ہو گا جو آپ کو جنسیت کی طرف کھینچتی ہے!دوسروں کی اچھی باتوں پر توجہ دیں اور ان کی برائیوں کو نہ دیکھیں۔

کچھ کے پاس حفاظت اور حفاظت جیسی نوکریاں ہیں۔ان لوگوں کو دوسروں کے عیبوں کو مسلسل دیکھنا پڑتا ہے اور عموماً روحانی راہوں میں بہت مشکل سے بڑھتے ہیں۔کیونکہ وہ دوسروں کے منفی نکات کو دیکھنے پر توجہ دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔

جب تک کہ وہ بہت محتاط نہ ہوں اور جب وہ اپنے کام کے ماحول سے باہر آجائیں تو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اچھے رویے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا آپ کے اندر الٰہی روح کو بیدار کرے گا اور آپ کو رب سے جوڑ دے گا۔

تو یہاں،طبیب کو،اگرچہ اسے اس نوکرانی کی زندگی کی کہانی کا جلدی پتہ چل گیا،اس نے اسے چھپایا اور بادشاہ کو نہیں بتایا...

اصل میں راز چھپی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ہر راز کا ایک رازداں ضرور ہوتا ہے۔قابل اعتماد شخص کے ساتھ ہی انسان اپنا راز ظاہر کر سکتا ہے۔

چنانچہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے،"عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ۙ‏ (۲۶) اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّهٗ يَسۡلُكُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا ۙ‏ (۲۷)

ترجمہ:

غیب کا جاننے والا اپنے غیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے کہ ان کے آگے پیچھے پہرے دار مقرر کر دیتا ہے۔(سورہ جن:۲۶-۲۷)

دوسرے مقام پر خدا جناب یوسف(علیہ السلام) کے اس خواب کو بیان فرمارہا ہے جس کی وجہ سے جناب یوسف (علیہ السلام) کی جان کو خطرہ لاحق تھا،"قَالَ يَابُنَيَّ لاَ تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُواْ لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ"(یوسف:۵)اے بیٹے اپنے خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان مت کرنا،ممکن ہے وہ تمہارے لئے کوئی خطرہ کھڑا کرے یا کوئی جال بچھا دے،بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں:" اولیاء کو بھی اگرچہ غیوب پر اطلاع دی جاتی ہے مگر انبیاء کا علم باعتبارِ کشف واِنجلاء)یعنی غیب کی باتوں کو ظاہر کرنے کے اعتبار سے (اولیاء کے علم سے بہت بلند وبالا واَرفع واعلیٰ ہے اور اولیاء کے علوم انبیاء ہی کے وَساطت اور انہی کے فیض سے ہوتے ہیں، معتزلہ ایک گمراہ فرقہ ہے وہ اولیاء کیلئے علمِ غیب کا قائل نہیں ،اس کا خیال باطل اور احادیثِ کثیرہ کے خلاف ہے اور اس آیت سے ان کا تَمَسُّک)یعنی دلیل پکڑنا (صحیح نہیں ،بیانِ مذکورہ بالا میں اس کا اشارہ کر دیا گیا ہے، سیّدُ الرُّسُل خاتَمُ الانبیاء محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُرتضیٰ رسولوں میں سب سے اعلیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اَشیاء کے علوم عطا فرمائے جیسا کہ صحاح کی معتبر اَحادیث سے ثابت ہے اور یہ آیت حضور)صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ (کے اور تمام مرتضیٰ رسولوں کیلئے غیب کا علم ثابت کرتی ہے۔(**خزائن العرفان، الجن، تحت الآیۃ :۲۷، ص ۱۰۶۲**)

ایک مقام پر امام جعفر الصادقؑ فرماتے یں:"لَا تُطْلِعْ صَدِیقَكَ مِنْ سِرِّكَ إِلَّا عَلَى مَا لَوِ اطَّلَعَ عَلَيْهِ عَدُوُّكَ لَمْ يَضُرَّكَ فَإِنَّ الصَّدِيقَ قَدْ يَكُونُ عُدُّواً يَوْماً مَا " اپنے دوست کو اتنا ہی اپنے راز سے آگاہ کرو کہ اگر وہ کسی کو بتادے تو تمہیں کوئی ضرر نہ ہو، کیونکہ ممکن ہے کبھی دوست دشمن بھی بن جائے، آیات بالا اور حدیث مذکورہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر راز کو کسی کے بھی حتی قریبی دوست کے بھی سامنے نہ بیان کریں خصوصاوہ راز ورموز جو انسان کی جان،مال اور عزت آبرو کے خطرہ کا سبب بنے۔

حقیقت کا راز داں کون ہے؟ اور حقیقت کے راز کس پر عیاں ہوتے ہیں؟ اور حقیقت کے ان رازوں کو کیسے پایا جاسکتا ہے؟ انسان بذات خود حقیقت کا راز داں ہے۔ ان رازوں کے پانے کے لیے انسان کا اہل دل ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے اپنے رازوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ اسے اہل دل کی محبت عطاء کر دیتا ہے۔ ایک اہل دل ہی آپ کو اہل دل بنا سکتا ہے۔ بظاہر تو ہم سب میں دل ہے لیکن ان دل والوں میں بہت کم ہیں جو اہل دل ہیں۔ ایک اہل دل ہی مومن کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ یہاں پر اہل دل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کے نور سے روشن ہو جاتے ہیں۔ ایک اہل دل ہی ان انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اب یہ اللہ کا دوست بن چکا ہوتا ہے۔ اور یہ اپنے دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کے رازوں کو دیکھتا ہے۔ ہر چیز کی حقیقت اس پر عیاں ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ہر چیز میں وہ حقیقت کے نظاروں کو دیکھ کر سرشار ہو جاتا ہے۔ ایک اہل دل ہی خدا کے ان اسرار ورموز کو دیکھ سکتا ہے۔

جب خواجہ میر درد اس مقام پر پہنچے تو ان کو بھی یہ کہنا پڑا:

بقول خواجہ میر درد:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

توہی آیا نظر جدھر دیکھا۔

ہر اہل دل پر اک وہ مقام گزرتا ہے جب اس کو ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا نور دکھائی دیتا ہے جب میر درد نے ہر چیز میں حقیقت کو پوشیدہ پایا تو انھوں نے بھی یہ ہی اقرار کیا کہ وہ ذات ہر چیز میں جلوہ نما ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص رازوں اور انوار و تجلیات کا نزول انسان کے قلب پر ہوتا ہے۔ اصل میں انسان کی ذات ہی حقیقت کی رازداں ہے۔ جب انسان کو اپنی ذات سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ تو وہ ہر چیز میں حقیقت کو کارفرما پاتا ہے لفظ حقیقت سے مراد اللہ کی ذات ہے۔

صوفیا نے بھی اپنی ذات سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے مجاہدے اور ریاضتیں کیں جب وہ اپنی ذات سے آشنا ہوئے تو ان کو معرفت الٰہی نصیب ہو گئی۔ اہل دل جس چیز کا زبان سے اقرار کرتے ہیں دل کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ اہل دل جو بات کرتا ہے دل کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ کر چکا ہوتا ہے یہ بات یاد رہے کہ زبان سے کہنا اور ہے اور دل کی آنکھ سے دیکھنا اور ہے۔ اقبال نے اس کی ترجمانی بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔

بقول اقبال:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی ہیں۔

یعنی لا الہ کا محض زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں جب تک دل کی نگاہ سے اس کا مشاہدہ نہ کر لیا جائے اگر آپ معرفت الٰہی کے متلاشی ہیں تو یہ معرفت آپ کو اہل دل سے ہی مل سکتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو جانتے ہیں کہ انسان کا قلب بھی ذکر الٰہی کرتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ انسان کا دل بھی ذکر الٰہی کرتا ہے۔

جب کسی آدمی کا دل ذکر کرنا شروع شروع کر دیتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ انسان کے دل میں نور پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جب بھی اہل دل ذکر کرتے ہیں تو ان کا دل اللہ کے نور سے روشن ہو جاتا ہے۔ یہ اہل دل ہی راز دان حقیقت ہوتے ہیں۔ جن پر حقیقت کے راز منکشف ہوتے ہیں۔ تو مولانا رومؒ نے فرمایا کہ طبیب الٰہی کو کنیز کے اندر کا حال معلوم ہو گیا لیکن راز کو راز ہی رہنے دیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر شدید آندھی اور سخت سردی کی رات میں سرکار دوعالم نے اپنے ایک جانثار صحابی کو دشمنوں کی جاسوسی کر کے خبر لانے کا حکم فرمایا۔ جب رسول کریم ﷺ نے اس صحابی کو اس مشکل مشن پہ روانہ فرمایا تو بارگاہ رب العزت میں یوں دعا کی:

اے اللہ! تو اس کی سامنے سے بھی حفاظت فرما اور پیچھے سے بھی، دائیں طرف سے بھی اسے اپنے امان میں رکھ اور بائیں طرف سے بھی، اوپر سے بھی اس کی نگہبانی فرما اور نیچے سے بھی۔ وہ جانثار صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دعائے نبوی کی بدولت مجھ سے نہ صرف سردی بالکل جاتی رہی، بلکہ مجھے ہر ہر قدم پر تمازت و حرارت کا احساس ہوتا۔ میری یہ حالت اسی طرح رہی حتی کہ میں دشمنوں کا جائزہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس حاضر ہوا اور تمام حالات ان کے گوش گزار کیے۔ میری اس خدمت پر کریم آقا ﷺ نے مجھے اپنے خصوصی مہربانی سے نوازا، وہ یہ کہ آپ ﷺ نے مجھے اپنے قریب کیا اور اپنے مبارک قدموں کے پاس سونے کے لیے جگہ عطاء فرمائی۔ کرم بالائے کرم یہ کہ اپنی بابرکت چادر کا ایک کنارہ بھی میرے اوپر ڈال دیا۔ کرم نوازی، مہربانی اور شفقت کے اس سلوک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ساری رات اپنا پیٹ اور سینہ سرکار مدینہ ﷺ کے بابرکت قدموں سے بار بار مَس کرتا رہا۔ صبح ہونے تک دشمن اپنا محاصرہ اٹھا کے بھاگ چکا تھا۔ (تاریخ ابن عساکر)

رحمتِ عالم ﷺ کے قدموں سے اپنے پیٹ اور سینے کو مسل مسل کر خوب برکتیں لینے والے یہ وفادار اور جانثار صحابی حضرت سیّدنا حذیفہ بن یمان انصاری رضی اللہ عنہ تھے جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں اپنے دور کے سپر پاور ایران کے پایہ تخت "مدائن" کے گورنر بھی رہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کو ویسے تو اللہ پاک نے متعدد خصوصیات سے نوازا لیکن آپ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو "راز دار رسول" کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ حدیث شریف کے مطابق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار انہیں اپنے قریب بلایا اور ایک ایک منافق کا نام بتایا (معجم کبیر)۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو کسی اور صحابی کے پاس نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ کو تاکید فرمائی کہ منافقین کی حرکات و سکنات پر خوب نظر رکھنا تاکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے کسی منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ مختصر یہ کہ آپ منافقین اور علامات نفاق سے خوب اچھی طرح واقف تھے، بلکہ قیامت تک آنے والے تمام فتنہ پردازوں کے نام، ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ آپ کے مبارک دور میں جب بھی کوئی جنازہ آتا تو آپ رضی اللہ عنہ معلوم کرواتے کہ حضرت حذیفہ جنازے میں شریک ہیں یا نہیں؟۔ اگر وہ شریک ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نمازِ جنازہ پڑھا دیتے ورنہ خود بھی شریک نہ ہوتے۔ (اسد الغابۃ)

ایرانی

رَنجش از صَفرا واز سودا نبود

بوئِ ھر ھیزُم پَدید آید زِ دود

پاکستانی

رَنجَش از صَفُرا واز سَودا نبود
بُوئے ہر ہیزَم پَدید آید زِ دُود

رنجش: ناراضگی معنی مبتلا ہونا۔۔۔ صفرا: زرد مادہ، مزاج، چار اخلطوں میں سے ایک۔۔۔ سودا: ذہنی بیماری۔۔۔ بوئے: بوsmell، ہیزم: جلانے کی لکڑی۔۔۔ پدید آید: ابھرنا۔۔ زدود: ہٹادینا، محسوس ہونا

ترجمہ: اس کی بیماری صفرا اور سودا کے غلبہ کی وجہ سے تھی (جس کو طبیب نے قرائن اور نفسیاتی روشن ضمیری سے جان لیا تھا) ہر لکڑی کی بو اس کے دھوئیں ہی سے محسوس ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ طبیب غیبی نے کشف سے محسوس کر لیا کہ اس کو کیا مرض ہے؟

مولانا رومؒ زبر دست طبیب بھی تھے علم طب کے اساتذہ میں آپکا شمار ہوتا تھا۔ اس دور میں علم طب یونانی طریق سے مسلمانوں میں آیا تھا انہوں نے اس میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے تھے۔ اسلامی مدارس میں اس کی با قاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ عام طور پر تمام علوم کو اشعار میں بیان کیا جاتا تھا۔ نہ صرف ادب اور تصوف، بلکہ ریاضی، سائنس اور گرامر جیسے خشک مضامین کو بھی اشعار میں بیان کیا جاتا تھا، اس وجہ سے رومیؒ کی مثنوی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فارسی ادب میں مثنوی کو بلا مبالغہ مقبول ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔

میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے شعر و شاعری کو اتنی اہمیت کیوں دی کہ حساب اور گرامر جیسے مضامین بھی اس میں بیان کیے۔ اس سوال کا جواب مجھے البیرونی کی مشہور زمانہ "کتاب الہند" سے ملا۔

البیرونی جو کہ ایک بڑے سائنسدان، جغرافیہ دان، مورخ، سیاح اور ادیب ہیں، بیان کرتے ہیں کہ علوم سے ناواقف کاتب حضرات

کتاب کو نقل کرتے ہوئے اس میں بہت سی غلطیاں کرتے ہیں اور بات کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس وجہ سے قدیم دور میں یہ رواج رہا ہے کہ بات کو اشعار میں بیان کیا جائے۔ وزن، قافیے اور ردیف کی پابندیوں کے باعث اشعار کی غلطی فوراً پکڑی جا سکتی ہے۔ انہیں آسانی سے یاد کیا جا سکتا ہے اور صحیح طور پر اگلوں کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔

ذہانت و فطانت کا زبردست امتزاج اشعار کی صورت میں ملتا ہے۔ جناب مولانا رومیؒ کے اس شعر کی رو سے:

ہمارے مزاج چار ہیں

سودا، صفرا، دم، بلغم

کہ یہ فطرت میں چار عناصر کے برابر ہیں۔ اور اگر آپ انہیں اسی طرح حفظ کریں گے جیسا کہ میں کہتا ہوں تو آپ انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہم سب سے نیچے سے شروع کرتے ہیں، یعنی

1۔ ٹھنڈا اور خشکی جو سودا کے برابر ہے۔ اس کا قدرتی عنصر مٹی ہے۔ ہمارے جسم کی ہڈیاں سودا سے بنی ہیں...

2۔ دوسری فطرت، بلغم، ٹھنڈا اور گیلا ہے، جو پانی کے عنصر کے برابر ہے۔ جو شخص موٹا ہو جاتا ہے یا جسم کا درجہ حرارت کم ہوتا ہے اسے بلغم ہوتا ہے۔

3۔ تیسری فطرت، دم گرم اور نم ہے اور خون کے برابر ہے۔ ہوا اور ہوا کے ماحولیاتی نظام میں، یہ گرم اور گیلی ہے۔

4۔ چوتھی فطرت، صفرا، گرم اور خشک کے برابر ہے۔ اس کا عنصر آگ اور دوپہر کی روشنی ہے۔

ان میں سے ہر ایک مضبوط حکمت اور فلسفہ رکھتا ہے۔ سودا اور صفرا بیماری کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ کیونکہ سودا دباؤ کو کم کرنے اور سوکھنے اور جسم کو پتلا اور کمزور بنانے کے مترادف ہے۔ اور صفرا دباؤ بڑھانے اور جسم کو جلانے کے مترادف ہے۔

یہاں طبیب الٰہی فرماتے ہیں کہ مریض کی تکلیف نہ سودا سے ہوتی ہے نہ پت سے!

طب میں، ہمارے پاس پودوں کی خصوصیات کو نکالنے کے مختلف طریقے ہیں۔

مثال کے طور پر، اگر آپ دار چینی کی جوشاندہ بنانا چاہتے ہیں، تو آپ کو اسے پانی میں ابالنا چاہیے جب تک کہ یہ ابل نہ جائے، اور قدرتی طور پر اسے پکنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ تاہم، اس کی نرمی کی وجہ سے، گلاب کی پتیوں کو ابالنے کی ضرورت نہیں ہے اور گرم پانی کافی ہے قدیم زمانے میں پودے کے جوہر کو نکالنے کے لیے ایک اور طریقہ استعمال کیا جاتا تھا کہ پودے کو شراب یا شہد میں ڈالا جاتا تھا اور کچھ عرصے کے بعد شراب یا شہد پودے کی خصوصیات پر قبضہ کر لیتا تھا۔ جیسے آج کل ہومیو پیتھک میڈیسن بنتی ہیں۔

آخری طریقہ تمباکو نوشی ہے۔

یعنی پودے کے ساتھ آخری کام یہ کیا جاسکتا ہے کہ اسے آگ لگا دی جائے یا اسے دھواں دیا جائے، یقیناً اسے بہت کم دہن کے ساتھ آہستہ آہستہ جلنا چاہیے اور پھر دھواں چھوڑنا چاہیے۔ اور اس کے دھوئیں میں کئی شفا بخش خصوصیات ہیں۔

مثال کے طور پر دھوئیں کا ایک گروہ ہے جسے بو کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے خوشبودار۔ انکا بخور لینا عرب علاقوں میں آج بھی جاری ہے۔ جیسے لوبان، پھٹکری، صندل، منڈب اور لیوینڈر۔ یہ دھوئیں دماغ کو گرم کرتے ہیں۔

دھوئیں کی ایک اور قسم ہے؛ ہاتھ سے بنا ہوا بخور استعمال کرنے کی کوشش کریں جس میں ضروری تیل زیادہ نہ ہو۔ اس کی بو کم ہو سکتی ہے لیکن اس کے خواص زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر، دیودار کا دھواں ایک انتہائی مضبوط جراثیم کش قاتل ہے اور انفیکشن کو بہت جلد خشک کر دیتا ہے۔

تمباکو نوشی ایک تھراپی ہے، تفریح نہیں، اور جب یہ تفریح بن جائے تو یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔

یہاں جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ لونڈی کے سودا اور پت میں کوئی خرابی نہیں تھا یا ور ڈاکٹر نے اس کے دل کے دھوئیں سے اس کے اندر کیا چل رہا تھا اس کو سمجھا اور اس کے تمام مسائل کو جان لیا!

ایرانی

دید از زاریش کوزارِ دل است

تَن خوش است و او گرفتارِ دل است

پاکستانی

دید از زاریش کُو زارِ دل است

تَن خوش است و او گرفتارِ دل است

دید: دیکھنا۔۔۔زاری: رونا۔۔۔زار: بیمار۔۔۔کو: کہ او۔۔خوش: تندرست

زارِ دل اور گرفتارِ دل کنایات عشق ہیں۔

ترجمہ: طبیب الٰہی نے اس کی گریہ وزاری (لاغری و کمزوری سے جانچ لیا کہ وہ مریض دل ہے یعنی اسے عشق کا مرض ہے۔ بدن تو ٹھیک اور بھلا چنگا ہے لیکن وہ دراصل اسیر دل ہے۔

وہ کہتا ہے کہ یہ نوحہ اور اضطراب جو اس لونڈی کو ہے اس کے دل کے نوحہ سے ہے۔ زاری دل کا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جو محبت میں، منسلک اور پھنس گیا ہو! ایسے شخص کے لیے جسم کا علاج غلط ہے کیونکہ مسئلہ اس کے دل اور اندر کا ہوتا ہے۔

ماضی میں محبت کا مقام انسانی دل سمجھا جاتا تھا اور آج طبی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بہت سے رومانوی جذبات کی جگہ دل میں ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص شدید غمگین ہوتا ہے تو اس کے دل میں درد ہوتا ہے یا جب وہ خوش ہوتا ہے تو اس کا دل پر جوش ہو جاتا ہے اور یہ مکمل طور پر جسمانی ہے اور انسانی دل روحانی احساسات اور احساسات کو سمجھ سکتا ہے۔

اس کی یاد آئی ہے سانسو ذرا آہستہ چلو

دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے (راحت اندوری)

حقیقت میں محبت کا یہ فطری اثر ہے کہ وہ انسان کو محبوب اور اس کی خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے البتہ کمزور محبتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جن کی شعاع دل سے باہر نہ پر سکے لیکن ایسی محبتیں اس قدر حقیر ہیں کہ انہیں محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک حقیقی محبت یقیناً عملی آثار کی حامل ہوتی ہے اور ایسی محبت محب کا محبوب سے ضرور تعلق قائم کر دیتی ہے، محبوب کی آرزوؤں کی راہ میں ثمر

بخش ہوتی ہے اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے محب کو سعی و کوشش کے لئے ایستادہ کر دیتی ہے۔

کسی جادۂ محبت کے پیکر سے ہی اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے تو مجھے مرید رومیؒ نظر آیا تو خیال آیا اسی قلندر سے کیوں نہ دیکھیں کہ یہ

شورش دل کیا ہے؟

مرید رومیؒ اقبال ہے: اقبالؒ علم اور عشق کا مختصر موازنہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علم کا مقام ذہن یا سوچ بچار ہے لیکن عشق کا مقام قلب ہے، جو ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

"قلب لا نیام" وہ قلب جو کبھی نہ سوئے اس لئے اقبالؒ دل کی بیداری کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ جب عاشق "واذ کروا اللہ کثیراً" پر عمل کرتا ہے تو ذکرِ الٰہی کی برکت بلکہ تاثیر سے اس کا دل جاری ہو جاتا ہے یعنی خواہ وہ کسی حال میں ہو، اس کا دل ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ اس کو صوفیاء اپنی اصطلاح میں "دل کا جاری ہو جانا" کہتے ہیں اور اقبالؒ اس کو دل کے زندہ ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اسی دلِ زندہ کو قلبِ لا نیام بھی کہتے ہیں یعنی عاشق کا دل ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے، سوتے میں بھی، جاگتے میں بھی۔ ذکر سے مراد یاد بھی ہے اور توجہ بھی، لگن، رابطہ اور دھیان بھی۔ ادنیٰ درجہ میں اس کا تجربہ عشقِ مجازی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ شخص خواہ میز کرسی لگائے پڑھ رہا ہو یا لکھ رہا ہو یا دفتر میں فائلوں میں سر کھپا رہا ہو یا دکان پر سودا بیچ رہا ہو یا سڑک پر کنکر کوٹ رہا ہو یا کلاس میں لیکچر دے رہا ہو، غرضیکہ کسی حال میں بھی کیوں نہ ہو، دھیان اس کا اپنے محبوب کی طرف ہوتا ہے۔ بظاہر وہ کسی کام میں مشغول نظر آتا ہے مگر اس کا دل اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بس اسی کو ذکر کہتے ہیں۔

حضور ﷺ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ آپؐ کے غلاموں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ ہر حال میں "دل بیار و دست بکار" کے اصول پر عامل رہتے تھے اور اسی لئے وہ اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال تھے۔

جب تک علم (عقل) عشق سے روشنی اور ہدایت حاصل نہ کرے اس وقت تک اس کی حیثیت "تماشہ خانۂ افکار" سے زائد نہیں ہوتی۔ جب تک علم (عقل) عشق کے تابع نہ ہو اس وقت تک اس میں انسان کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور یہ تماشہ خانہ گویا 'سحر سامری' ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، محض فریب نظر ہوتا ہے، جس سے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ

کلام یہ کہ جب تک علم (عقل) کو روح القدس (عشقِ الٰہی) کی تائید نہ ہو، اس کی حیثیت افسوں گری سے زیادہ نہیں ہے۔

اقبالؒ نے (عقل) کو ہمیشہ 'تماشہ خانۂ افکار' یا 'بتکدۂ تصورات' سے تعبیر کیا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بتکدۂ تصورات

تماشہ خانۂ افکار یا بتکدۂ تصورات سے اقبالؒ کا دراصل مطلب یہ ہے کہ محض عقل، انسان کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کی حالت یہ ہے کہ مثلاً آج وہ ہستئ باری تعالیٰ پر ایک دلیل قائم کرتی ہے تو کل خود ہی اس کے ابطال پر دلیل قائم کر دے گی۔ یعنی جو دلیل آج ہم علم (عقل) کے دربار میں مقبول ہے، کل وہی دلیل مردود ہو جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ عقل، افکار و تصوراتِ مختلفہ، متضادہ اور متعارضہ کا ایک تماشہ خانہ ہے جس میں ہر روز نئے نئے تصورات جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے جھلک دکھا کر اسی طرح خارج ہو جاتے ہیں جس طرح ایکٹر تماشہ دکھا کر اسٹیج سے غائب ہو جاتے ہیں۔ علاوہ بریں عقل انسانی جو تصورات قائم کرتی ہے ان کی صحت پر اسے کبھی بھی یقین نہیں ہوتا (کیونکہ ہو نہیں سکتا) اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کا دار و مدار ان معلومات پر ہے جو بذریعہ حواسِ خمسہ حاصل ہوتی ہیں اور حواس کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہتے ہیں۔ یعنی جو علم، حواس سے حاصل ہوتا ہے وہ یقینی نہیں ہوتا اس لیے تصوراتِ ذہنی اور افکار عقلی بھی لائقِ اعتبار نہیں ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب تک ـ"تجلّی "یعنی عشق رہنمائی نہ کرے، کوئی عقلمند آدمی محض اپنی عقل کے بل بوتے پر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ وہ اپنے خیالاتِ متضادہ کی کشمکش ہی میں مبتلا رہتا ہے اور انجام کار حیرانی اور پریشانی کے صحرا میں ساری عمر بھٹکتا رہتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا

دل کو بھایا نہ کوئی رنگِ محبت کے سوا

کہتے ہیں کہ تجلی کے بغیر یعنی عشقِ صادق کے بغیر انسانی زندگی مستقل عذاب یا مصائب و آلام کا منبع بن جاتی ہے اور انسان بلاشبہ اطمینان، تسکین اور راحتِ قلبی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "رنجوری" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ رنجوری کے معنیٰ ہیں مرض یا بیماری۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہر وہ شخص جو عاشق نہیں ہے، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے مریض (رنجور) ہوتا ہے۔

صرف عشق ہی میں یہ طاقت ہے کہ وہ روح کے تمام امراض کا ازالہ کر سکے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما(رومیؒ)

تجلی کے بغیر زندگی تو سراسر دکھ ہے اور عقل مہجوری ہے یعنی منزلِ مقصود سے دوری ہے۔ یا حریم ناز (درِ جاناں) سے جدائی ہے۔ دیکھا جائے تو ہر عقلمند آدمی مسلکِ جبر کی طرف مائل ہوتا ہے کیونکہ عقل اسے دلیلوں سے قائل کرتی ہے کہ انسان مجبور ہے اور چونکہ مجبور ہے اس لیے اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ عاشق، برعکس ایں، اختیار کی طرف راغب ہوتا ہے یعنی وہ مسلک اختیار پر عامل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ کا نائب ہوں اس لیے اگر مجھ میں اختیار نہ ہو تو نیابت کیسے کروں۔ عشق کا تقاضا ہے کہ وہ عاشق کو معشوق کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اس کو جذب و انجذاب کہتے ہیں یعنی عاشق، معشوق کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں اس کے خواص پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح لوہا اگر کچھ عرصہ آگ میں پڑا رہے (یعنی وہ اپنے کو آگ میں فنا کر دے) تو لوہے میں آگ کی صفات جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ دراصل

عشق عربی زبان کا لفظ ہے

محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے اور یہی محبت کسی درجے پر جا کر جنوں کہلاتی ہے۔ اس پر اقبال سے بہتر کون بیان کر سکتا ہے عشق کا محرک مجازی یا حقیقی ہو سکتا ہے۔ یہ عشق ناممکن کو ممکن بنا ڈالتا ہے۔ کہیں فرہاد سے نہر کھدواتا ہے تو کہیں سوہنی کو کچے گھڑے پر تیرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت کوئی صدیق اکبر کہلاتا ہے تو کوئی سیدنا بلال بنتا ہے۔ غرض ہر عشق کے مدارج مختلف ہیں۔ کوئی عشق مجازی میں ہی گھر کر رہ جاتا ہے۔ تو کوئی عشقِ مجازی سے حقیقی تک رسائی حاصل کر کے حقیقی اعزاز و شرف حاصل کرتا ہے۔

اقبال کے یہاں عشق اور ان کے مترادفات و لوازمات یعنی وجدان، خود آگہی، باطنی شعور، جذب، جنون، دل، محبت، شوق، آرزو مندی، درد، سوز، جستجو، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، تواتر، انہماک سے ملتا ہے۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے تصورات میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔ انسانوں میں پیغمبروں کا مرتبہ دوسروں سے اس لیے بلند تر ہے کہ ان کا سینہ محبت کی روشنی سے یکسر معمور اور ان کا دل بادہ عشق سے یکسر سرشار ہے۔ محبت جسے بعض نے فطرتِ انسانی کے لطیف ترین حسی پہلو کا نام دیا ہے۔ اور بعض نے روحِ انسانی پر الہام و وجدان کی بارش یا نورِ معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے متعلق اقبال کیا کہتے ہیں اقبال ہی کی زبان سے سنتے چلیے، یہ ان کی نظم ”محبت“ سے ماخوذ ہے۔

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی

حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی

ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزاء کو گھولا چشمہ حیوان کے پانی میں

مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

یہ ہے وہ محبت کا جذبہ عشق جو اقبال کے دائرہ فکر و فن کا مرکزی نقطہ ہے۔یہی تخلیق کائنات سے لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت کا آشنا اور کارزارِ حیات میں انسان کا رہنما و کار کُشا ہے۔بقول اقبال کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ورنہ اس سے پہلے،اس کی فضا بے جان اور بے کیف تھی۔

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد!

ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

تو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ کنیز کی بیماری اس کے دل کی شوریدگی کی بنا پر تھی۔اور سوائے طبیب الٰہی کے کوئی اور طبیب اس راز کو نہ پا سکا اصل میں زار دکو صاحب راز ہی جان سکتا ہے اور وہ صرف طبیب الٰہی ہی تھا۔

ایرانی

عاشقی پیدا است از زاریِّ دل

نیست بیماری چو بیماریِّ دل

پاکستانی

عاشقی پیدا است از زاریِّ دل

نیست بیماری چو بیماریِّ دل

پیدا است: پیدا ہوئی۔۔۔زاری دل: دل کا رونا۔۔۔بیماری دل: دل کی بیماری

اس شعر میں بیماری دل میں مشاکلہ ہے۔

ترجمہ: دل کی زاری سے عاشقی ظاہر ہے۔ دل کی بیماری کے برابر کوئی بیماری نہیں۔

یعنی کنیز کے دل کی خراب حالت بتا رہی تھی کہ اس کو مرض عشق ہے جو دل کا مرض ہے اور دل کا مرض بدن کے مرض سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ محبت کی بیماری سب سے بری قسم کی بیماری ہے۔ جب کسی کو محبت کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء ٹوٹ جاتے ہیں۔ محبت کرنے والے کھاتے نہیں، بولتے نہیں، جاگتے نہیں رہ سکتے اور ہر وقت سونا چاہتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں جہاں زلیخا نے اپنی پوری زندگی یوسف کی محبت کے لیے دی تھی وہ بالکل سچ ہے۔ کیونکہ محبت کرنے والے واقعی ایسا ہی کرتے ہیں...

اس دنیا میں ہمیں جو سب سے سبق لینا ہے وہ محبت کا سبق ہے اور یہ سبق ناگزیر ہے اور ہر کوئی اس سبق سے گزرے گا۔

محبت دنیا کی حل نہ ہونے والی گرہوں میں سے ایک ہے، اس کے اندر جاؤ گے تو آگ لگ جائے گی، اور اگر اس سے نکلو گے تو پچھتاؤ گے، اور دونوں صورتیں پریشان کن ہیں! لیکن محبت بہت پروان چڑھتی ہے۔ کیونکہ اس سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوتا ہے جہاں لوگ خود کو سنوار سکتے ہیں۔ محبت کے وقوع پذیر ہونے سے دل میں سینسر متحرک ہو جاتے ہیں جو بالآخر خدا کی معرفت کی طرف لے جاتے ہیں۔

ایرانی

عِلَّتِ عاشق زِ عِلَّت ھا جُدا است

عشق اُصطُرلابِ اَسرارِ خدا است

پاکستانی

عِلَّتِ عاشق زِ عِلَّت ہا جُدا است

عِشقُ اُصطُرلابِ اَسرارِ خدا است

علت: مرض۔۔۔عاشق: محبت کرنے والا۔۔۔جدا است: نرالا، الگ تھلگ۔۔۔اصطرلاب: ایک آلہ ہے جس سے ستاروں، سورج، چاند وغیرہ کا فاصلہ اور پیمائش و گردش کو معلوم کیا جاتا ہے۔بڑی عجیب بات ہے کہ مولانا رومؒ علم فلکیات جسے آسٹرونومی کہا جاتا ہے کے ماہر ہیں۔اس آلہ کی ایک جدید شکل جسے sextant کہتے ہیں۔ ہمیں بی۔ایس۔سی میں دیکھنے کو ملا۔اور اس کے پریکٹیکل کئے اور ہمارے پروفیسرؒ صاحب نے اصطرلاب کے بارے بتایا۔تو گویا ہمیں ایک بات کا علم بی۔ایس۔سی میں ہوا تو جناب رومیؒ علم میں کتنے اپڈیٹڈ تھے۔اللہ اللہ! اس شعر میں انہوں نے اس لفظ کو ایسے سمویا ہے کہ وجد آفرین ہے اس کے لئے جو اس چیز کی حقیقت سے آشنا ہو۔سبحان اللہ!

عشق کو اصطرلاب سے تشبیہہ دی ہے۔

ترجمہ: عاشقی خواہ ادھر کی یعنی مجازی ہو یا ادھر کی یعنی حقیقی ہو۔بالآخر ہم کو شاہ محبوباں کی طرف لے جاتی ہے۔

یونی عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی بہر حال وہ محبوب حقیقی یعنی ذات حق جل شانہ کی طرف لے جاتا ہے۔

میں نے محبت کے بارے میں اس سے زیادہ نرم نظم کبھی نہیں دیکھی۔

محبت کی پوری کہانی اس شعر میں بیان کی گئی ہے۔

وجہ بیماری ہے۔اس کا مطلب ہے کہ ہماری بہت سی ذہنی چوٹوں اور روحانی غربت کا علاج محبت کی بیماری سے کیا جاسکتا ہے!

محبت کا علاج دوسرے علاج سے الگ ہے اور یہ جو عام طریقوں سے علاج نہیں کیا جاسکتا!محبت سے اس کا حل ممکن ہے۔

جناب رومیؒ فرماتے ہیں کہ تم محبت کا علاج کیسے کرنا چاہتے ہو جب یہ راستہ خدا کا راستہ دکھاتا ہے۔اور خدا کا راستہ دل کا راستہ ہے۔

بعض اوقات غصہ،ناراضگی اور غم کی وجہ سے دل پر ایک مضبوط پردہ پڑ جاتا ہے جسے محبت کے ذریعے آہستہ آہستہ ہٹانا چاہیے۔

بعض اوقات جب انسان اپنے آپ کو درست نہیں کر پاتا تو خدایا حضرت عشق جلدی سے اس دل کو چن کر صفائی کرتے ہیں!

محبت کرنے والوں میں غصہ،ناراضگی اور نفرت بہت زیادہ اور تیز ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر محبت کرنے والا شخص انتہائی غیرت مند ہوتا ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اپنے عاشق کی طرف دیکھے۔

محبت کا عمل اتنا پاکیزہ ہے کہ یہ راتوں رات انسان کے تمام غصے، غم،خوف اور کمزوری کو دور کر سکتا ہے۔اور یہاں، محبت میں ایک شخص کا رشتہ بہت اہم ہے؛

جب آپ محبت میں پڑ جاتے ہیں اور برا محسوس کرتے ہیں،تو محبت دراصل آپ کے غلط ڈیٹا کو ظاہر کر رہی ہے!اور یہ کتنا اچھا ہے کہ آپ اس وقت باخبر رہیں اور اپنی زندگی کے راستے کو خراب نہ کریں اور محبت سے صفائی شروع کریں۔اور تھوڑی دیر کے بعد، آپ کو احساس ہوتا ہے کہ وہ محبت ایک انتہائی نرم محبت میں بدل گئی ہے اور آپ اس خطرناک جوش سے بچ گئے ہیں۔

حالانکہ جناب مولاناؒ خود محبت کو دل کی بیماری قرار دیتے ہیں۔لیکن مریض خدا کی طرف رہنمائی کرنے والا نور ہے اور بہت نرم مزاج ہے۔

محبت اور عقل انسان کی بقا اور ترقی،کائنات کی حقیقتوں سے آگاہی اور ادراک کے لیے سب سے اہم ضرورتوں میں سے ایک ہے، اپنی فکری طاقت کو استعمال کریں،کیونکہ عقل کا استعمال وراثت میں نہیں ملتا،یہ اس کی مرضی ہے،اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر قوت پیدا کرے تاکہ عقل کو استعمال کرنے کے لیے خدائے مطلق اسے قوت ارادی عطا کرے اور وہ قوت محبت،کام سے لگن،ذوق و شوق اور عزم مصمم ہے جو سیکھنے اور استدلال کی سمت میں آگے بڑھنے کے لیے انسان میں پیدا ہونی چاہیے۔

شعور اور علم حاصل کرنے کی خواہش انسان کی اندرونی محبت ہے۔ہمیں اپنی عقل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے ہمیشہ علم سیکھنے اور حاصل کرنے کا شوق رکھنا چاہیے اور محبت بھرے انداز میں علم و معرفت کے حصول کی طرف بڑھنا چاہیے۔محبت کا سبب تمام اسباب سے الگ ہے۔محبت کا سبب وجہ اور اثر نہیں ہے،بلکہ یہ سبب اور اثر دونوں ہے،کیونکہ محبت انسان کی اندرونی خواہش ہے،یہ انسان کے اندر ایک قوت ہے جو خواہش کے تناؤ سے پیدا ہوتی ہے۔

Astrolabe??? محبت خدا کا راز ہے... یہ محبت ہمیں خدا کے رازوں کو جاننے کی خواہش کے معیار اور طاقت سکھاتی ہے (دنیا کی تخلیق کے قوانین اور حقائق کو جاننا)۔ Astrolabe کا مطلب ہے ستاروں کو جاننے کا ذریعہ۔ شاعری میں (Astrolabe) یہ سائنس کو جاننے کا ذریعہ ہے، جس سے ہم تاریکی اور جہالت سے آزاد ہو کر روشنی کے ستاروں کی طرف بڑھتے ہیں تا کہ تاریکی، جہالت اور جہالت کی رات سے آزاد ہو کر روشنی کی صبح تک پہنچ سکیں۔ دنیا، معاشرے اور انسان کو اپنے آپ کو چلانے والے قوانین کو جانیں۔ آیئے اس عالمی معاشرے کو جانیں جس میں ہم رہتے ہیں اور جہالت، تعصبات اور توہمات کے اندھیروں سے نکل کر روشنی اور فہم کی طرف بڑھتے ہیں

محبت میں پڑنے کی وجہ الگ ہے۔ محبت خدا کے رازوں کا علم نجوم ہے۔

محبت کے لغوی معنیٰ

کشف المحجوب میں لفظ محبت کے متعدد معانی بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے یہ بیان کیا گیا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ محبت لفظ "ہیب" سے ماخوذ ہے اور یہ وہ انڈے تھے جو صحرا میں زمین پر گرتے تھے۔

محبت کی آج تک کوئی ایسی جامع تعریف نہیں ہو سکی جو کہ ہر طبقہ فکر کے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ میرے خیال میں آج تک محبت کے متعلق جتنی بھی تعریف ہو چکی ہے اس کو قابل قبول اور درست تسلیم کر لیا جائے۔ محبت تو ایک جذبہ ہے ایک کیفیت ہے اور جس نے بھی اس کیفیت یا جذبے کو جس طرح محسوس کیا اس کے نزدیک وہی محبت ہے۔

میرے نزدیک محبت بقا سے فنا تک کا سفر ہے۔ اس سفر میں مسافر کو کہیں تو تند و تیز دریا کی لہروں میں گھڑے سمیت غرق ہونا پڑتا ہے تو کسی کو تپتے ریگستان کی ریت میں دفن ہونا پڑتا ہے۔ یا پھر کہیں پر انا الحق کا نعرہ لگا کر تختہ دار پہ جھولنا پڑتا ہے۔ یہ سارے امتحانات ہیں اور محبت میں بقا سے فنا تک کے سفر میں ہر مسافر کو ان امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مدارج کو طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ رتبے ہوتے ہیں اور اس سفر میں ایک کے بعد دوسرا رتبہ ملتا جاتا ہے۔

اور اس طرح ہر مرتبے کے بعد ایک امتحان ہوتا ہے بعد ہر امتحان کے ایک رتبہ ہوتا ہے یہ امتحان ڈالنے والی اور رتبے عطا کرنے والی ذات بھی محبت سے ناآشنا نہیں ہے محبت وجہ تخلیق کائنات ہے اور اس ساری کائنات میں وہی سب سے پہلا محب ہے جس نے اپنے محبوب کی خاطر چند دنوں میں یہ کائنات تخلیق کی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ محبت ایک لاثانی اور آفاقی جذبے کا نام ہے۔

محبت آسمان سے اترے ہوئے صحیفوں کی مانند مقدس، پاکیزہ اور معتبر ہے۔ محبت جیسے معتبر جذبے میں شک نہیں ہو سکتا۔ شک

ایمان کے کمزور ہونے کی دلیل ہے اور جن کے ایمان کمزور ہوتے ہیں ان کو رتبے عطا نہیں کیے جاتے۔ جن دلوں میں شک کے بیج گر جائیں وہاں نفرتوں کی خاردار جھاڑیاں اگا کرتی ہیں یقین کے پھول نہیں۔

اللہ کی محبت کیا ہے؟

اللہ کی محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے انسان دنیاومافیہا کی ہر پریشانی اور دکھ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اللہ کی محبت کے سرور میں انسان دنیا اور اس کی لذتوں سے بے نیاز جاتا ہے۔ اللہ کی محبت انسان کو دنیاوالوں اور ان کی تلخ باتوں سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ یعنی انسان کو پرواہ نہیں رہتی کہ لوگ کیا کہیں گے بلکہ وہ صرف اللہ کے احکام کو پورا کر کے، اللہ کی محبت حاصل کرنے کی پرواہ کرتا ہے۔ جس کو اللہ سے محبت ہوتی ہے اس کا دل و دماغ ہمیشہ اللہ کی باتوں اور اللہ کے ذکر میں لگا رہتا ہے۔ وہ اللہ سے ملاقات کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ پھر ایسے شخص کے لئے نماز بوجھ کیوں کر ہوگی (نماز بھی تو اللہ سے ملاقات ہی ہوتی ہے ناں)۔ پھر اللہ سے محبت کرنے والے شخص کو اللہ سے منسلک ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے چاہے وہ کعبہ ہو یا اللہ کا کلام قرآن ہو یا اللہ کے رسول ﷺ ہوں۔

اللہ سے محبت کیسی ہونی چاہیے؟

اللہ سے محبت ہر چیز اور ہر ہستی کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔" (سورہ البقرہ: 165) یعنی ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ کی محبت ہر دوسرے کی محبت پر مقدم ہو۔ اور کسی بھی چیز کی محبت انسان کے دل میں یہ مقام و مرتبہ نہ حاصل کر لے کہ وہ اللہ کی محبت پر اسے قربان نہ کر سکتا ہو۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسُولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔" (سورۃ التوبہ: 24) اس آیت میں "اللہ اپنا فیصلہ ہمارے سامنے لے آئے" سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہمیں ہٹا کر دین داری کی نعمت اور پیشوائی کا منصب کسی اور گروہ کو عطا کر دے۔ اگر دنیاوی چیزوں کی محبت ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت سے زیادہ ہو جائے، تو ہمیں اللہ کے اِس فیصلے سے ڈرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے اتنی زیادہ محبت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی ہی نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کے تمام لوازمات بھی عطا کئے ہیں۔ ایمان، صحت اور تندرستی، علم اور حکمت، توانائی اور عقل، رزق اور رہائش، غرض یہ کہ اس کی عنایات کا شمار کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: "اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گِن نہیں سکتے۔" (سورہ النحل: 18) یہ کیسے ہو

سکتا ہے کہ ہم اس اس ان گنت نعمتوں کے عطا کرنے والے سے ہی محبت نہ کریں؟ کہیں ہم ان نعمتوں کو اپنا حق تو نہیں سمجھ بیٹھے؟ اگر ہم ان نعمتوں کو اللہ ہی کی طرف سے سمجھتے ہیں، تو ہمارے دل میں ضرور جذبہ محبت و احسان مندی کثرت سے پیدا ہو گا۔ یعنی ہم سب سے زیادہ محبت اللہ تعالی سے کرنے لگیں گے۔

تو اس وقت محبت بقول مولانا رومؒ اصطرلاب بنے گی اور وہ سامنے اس حقیقت کا مظہر بن کر بقول علامہ اقبالؒ

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو

وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن

نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ایرانی

عاشقی گر زین سَر و گر زان سَر است

عاقِبت ماراِبداں سَر رَھبَر است

پاکستانی

عاشقی گر زیں سَر و گر زاں سَر ست
عاقِبت ماراِبداں شہ رَہبَر ست

گزریں: ادھر کی مراد مجازی۔۔۔ گزراں: ادھر کی معنی حقیقی۔۔۔ عاقبت: انجام کار۔۔۔ رہبر ست: محبوب کی طرف

ترجمہ: عازقی خواہ ادھر کی ہو یعنی مجازی ہو یا اُدھر کی یعنی حقیقی ہو بالاخر ہم کو اس شاہ محبوباں کی طرف لے جاتی ہے۔

مطلب یہ ہیے کہ عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی ہو بہر کیف وہ محبوب حقیقی یعنی ذات حق کی طرف لے جاتا ہے۔

کچھ محبتیں ہمیں توڑ کر اللہ سے جوڑتی ہیں۔ ان محبتوں کو پانے کے لئے ہم کتنی ہی کوششیں کرتے ہیں، کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں، کتنے ہی رشتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں لیکن جب ہم اس انسان کے ہاتھوں ٹوٹ جاتے ہیں ناں! جس سے ہم عشق کرتے ہیں تو پھر سب سے پہلے خدا یاد آتا ہے اور بس پھر وہی یاد رہ جاتا ہے۔

ہم اپنا روتا، بلکتا وجود لے کر اپنے رب کے حضور جھکتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتا ہے، وہ ہمارے ٹوٹے بکھرے وجود کو سمیٹ لیتا ہے، وہ بن کہے ہمیں سنتا ہے اور اکتاتا بھی نہیں۔ وہ ہمیں سہارا دیتا ہے اور دھتکارتا بھی نہیں۔ ہاں! وہ انسانوں کی طرح یہ نہیں کہتا کہ
بس کرو! میں تنگ آ گیا۔ ہاں! یہ اللہ ہی کی وفا ہوتی ہے جو ہمیں تھام لیتی ہے۔

یہ اللہ تو اس وقت بھی موجود تھا ناں؟ جب ہم سرابوں میں تھے، اس وقت تو ہم نے اسے محسوس نہیں کیا تھا۔ بہر حال یہ ٹوٹنا اور ٹوٹ کے بکھرنا کسی کام تو آیا۔

مجازی کو نہ پاکر انسان حقیقی تک پہنچتا ہے۔ ہاں! ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر مجازی محبت حقیقی تک نہیں لے جا سکتی، جو دل بار بار اپنا قبلہ بدلے، در در کی خاک چھانے، وہ کبھی حقیقی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

وہی لوگ عشق حقیقی کے اہل ہوتے ہیں جنھیں ایک در کا ہو کر رہنا آتا ہو، جو اپنی انا اپنے محبوب پہ وار دیتے ہوں، جو عشق کی خاطر اپنے نفس سے منہ موڑلینا جانتے ہوں، جو دھتکارے جانے کے باوجود اپنے معشوق کی چوکھٹ سے سر نہ اٹھائیں۔

یہ جو مجازی محبت ہوتی ہے ناں، یہ ایک آزمائش ہوتی ہے، انسان کی مستقل مزاجی کی آزمائش، اس کے دل کی آزمائش، اللہ انسان کو انسان کے ذریعے آزماتا ہے اور جو اس میں کامیاب ہو جاتا ہے، اللہ اس کے دل کو اپنی محبت کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

خاموشی سے ہمارے رگ وپے میں سرایت کر جانے والا یہ مجازی عشق ہی حقیقی عشق تک کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

عشق مجازی، عشق حقیقی کی منزل آسان کر دیتا ہے اور عشق مجازی کے دریا میں اترنے والا کبھی نہ کبھی عشق حقیقی کے سمندر میں اتر جاتا ہے۔

لا حاصل عشق ہی انسان کو نمازی بناتا ہے، اللہ کی محبت عطا کرتا ہے اور پھر یہ محبت ہر دنیاوی محبت پہ غالب آجاتی ہے اور جس طرح بارش کا پہلا قطرہ مٹی میں نا جانے کہاں جذب ہو جاتا ہے، اسی طرح ہمارا عشق مجازی بھی عشق حقیقی میں جذب ہو جاتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا اور بس پھر باقی رہ جاتی ہے تو اللہ کی لافانی محبت۔

کھولا ہے مجھ پہ سر حقیقت مجاز نے

یہ پختگی صلہ ہے خیالات خام کا

(اسماعیل میرٹھی)

اگر آپ کو یاد ہو تو آپ کی مثنوی کی تفصیل کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ اشعار کا ایک سلسلہ ہے جو حفظ کے لائق ہے، یہ چند اشعار جو پڑھے گئے اور اس کے بعد کے چند اشعار بہت خوبصورت اور حفظ کے لائق ہیں، برائے مہربانی انہیں حفظ کر لیں۔۔۔

یہاں رومیؒ فرماتے ہیں کہ محبت چاہے وہ زمینی ہو یا آسمانی، چاہے وہ متفق ہو یا با اختلاف، محبت کا نمونہ جو بھی ہو، کوئی فرق نہیں ہے۔ محبت ایک پاگل پن ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ آپ کو بچا سکتا ہے اور آپ کو اپنے اندر کے رب سے جوڑ سکتا ہے!

آج، ہمارے پاس نفسیاتی تجزیہ کے مختلف طریقے ہیں،

مثال کے طور پر، ای ایف ٹی کے طریقے یا جذباتی کو ڈیا ٹیپ کرنے کے طریقے اور وہ طریقے جو آج لاشعور پر کام کرتے جو آپ کے لاشعور کا خراب ڈیٹا دکھاتے ہیں اور پھر مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے ہیں...

ان میں سے ہر ایک طریقہ ہے اور محبت بھی ایک طریقہ ہے۔

پہلے دیکھتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟ جذباتی آزادی کی تکنیک (EFT)، جسے عام طور پر "ٹیپنگ" بھی کہا جاتا ہے، 1990 کی دہائی میں گیری کریگ نے متعارف کرایا تھا لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ مسلمان یہ صدیوں پہلے سے یہ عمل کرتے رہے ہیں۔ شاید انہیں سے گیری نے اخذ کیا ہو جسم کے بارہ اہم میریڈیئن پوائنٹس میں سے ہر ایک پر کئی بار ٹیپ کرنے کے لیے انگلیوں کا استعمال شامل ہے یا دباؤ سے تکلیف کی کمی یا آرام دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر انہی پوائینٹس کو استعمال کر کے روحانی تصور و تفکر سے جلا دی جائے تو وجود بقعہ نور بن جاتا ہے۔

کیونکہ محبت آگ ہے!

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آپ کی تمام برائیاں دکھاتا ہے اور آپ کے اندر موجود منفی خصلتوں کو دور کرنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ آپ شعوری طور پر اور جلدی سے ان کو صاف کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

محبت آپ کو ہمیشہ کے لیے دکھ دینے کے لیے نہیں آئی بلکہ یہ آپ کو سبق سکھانے آئی ہے تاکہ آپ بہتر زندگی گزار سکیں۔

اور یہ اہم نکتہ یاد رکھیں کہ بعض اوقات لوگ محبت میں پڑتے ہی اپنے سابقہ رشتے کو چھوڑ کر نئے رشتے میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ ارشاد فرماتے ہیں:

لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں،

ہِک کھولاں ہِک کجّاں ہُو

ایتناں ڈِٹھیاں صبر نہ آوے

ہور کِتے ول بھجّاں ہُو

یہ وہ راز ہے جو سیدنا سلطان باہوؒ نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ تو پھر مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ عشق سلامت مجاز سے حقیقت کی طرف سفر ہے۔ یہ سفر عشقی ہے۔

خدا کی محبت اور نور کی پناہ میں رہو۔

مولانا بحر العلومؒ فرماتے ہیں کہ الوہیت و محبوبیت خاص خداوند تعالیٰ کی صفات ہیں جن میں غیر کی شرکت محال ہے۔ مگر عشق مجازی کا تعلق جو بظاہر ماسویٰ سے ہے تو اس کی اصلیت یہ ہے کہ اس جمیل مطلق جل شانہ کا پر تو جمال مختلف مظہروں میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ہر مظہر کے الگ الگ عاشق پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا مجازی معشوق تو وہی خاص خاص مظہر ہے۔ لیکن معشوق حقیقی سب کا ایک ہی ہے کیونکہ ایک ہی شمع ہے جس کی شعاعیں متعدد چیزوں پر پڑ کر ان کو روشن کر رہی ہیں اور یہ نکتہ عارف ہی سمجھ سکتا ہے جو ترقی کرتا کرتا عشق مظہر کے ذریعے سے اس پر جا پہنچتا ہے جدھر سے یہ پر تو اس مظہر پر پڑا ہے وہو المراد۔ پس عشق مجازی عارف کے لیے ہادی ہے اور جاہل کے لیے وبال عظیم ہے جو مظہر کے عشق پر ہی مرمٹتا ہے اور اسی کو معشوق و منتہیٰ جانتا ہے۔ یہاں ای واقعہ شئیر کیا جا رہا ہے:

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر مگر کیسے؟

دن کے گیارہ بج چکے تھے لیکن موسم ابھی تک سرد تھا۔ یہ 2014 کی دوسری صبح تھی اور میں بابا جی کی خانقاہ پر بیٹھا ان کی نصیحتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ باتوں باتوں میں ہمارا موضوع عشق کی طرف مڑ گیا اور اس کے بعد بابا جی نے میرے سامنے عشق کی گتھیاں سلجھانا شروع کر دیں۔ میں مذہب عشق کا سخت کافر تھا لیکن اس دن کے بعد مجھے احساس ہوا عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے اور جس شخص نے ابھی تک عشق کی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوئے اس کی شخصیت ابھی تک نامکمل اور ادھوری ہے۔ بابا جی سے ملاقات سے پہلے عشق کے بارے میں میرا نقطہ نظر وہی تھا جو ہم میں سے اسی فیصد لوگوں کا ہے لیکن اس دن کے بعد مجھے پتا چلا شاید اسی فیصد

لوگ عشق کو غلط رنگ میں دیکھتے ہیں اور بلاوجہ عشق سے نفرت کرتے ہیں۔ہم نے عشق کو صرف عورت ذات تک محدود کر دیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں عشق صرف جنس مخالف کے لیے رونے دھونے اور جان کی بازی لگانے کا نام ہے۔اور اگر کوئی جنس مخالف کو پانے کے لیے مجنون، پاگل یا دیوانہ بن جائے یا خودکشی کر لے ہم اسے عشق کی معراج سمجھتے ہیں جبکہ یہ عشق کی کھلی توہین ہے۔میں نے پوچھا"باباجی عشق کیا ہے"باباجی نے ماہر فلسفی کی طرح نظریں گھمائیں اور میری طرف دیکھ کر بولے "عشق کمال انسانیت، حاصل مذہب، ایک بلند ترین تجزیہ اور انسانی تلاش کا نام ہے۔انسان کا دل اگر عشق سے خالی ہو تو وہ انسان نہیں پتھر کا بت ہے، عشق انسان سے خدا نہیں چھڑواتا بلکہ انسان کو خدا کے قریب کر دیتا ہے اور عشق ایک تاریک جنگل کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ اس جنگل میں چلا جائے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ عشق بے لوث ہوتا ہے اور طبیعت میں شائستگی پیدا کرتا ہے، عشق صندل کی لکڑی کی طرح سلگتے رہنے کا نام ہے اور عشق کسی کو پانے اور کھونے سے بہت ماوراء ہوتا ہے۔ عشق ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور عشق ہر کسی کی آہ اور دکھ میں اپنا دکھ اور اپنی آہ محسوس کرتا ہے، جو خود غرض ہو وہ عشق نہیں ہوتا اور عشق انسان کو خلق عظیم کا پیکر بنا دیتا ہے

"میں نے پوچھا"باباجی عشق حقیقی اور عشق مجازی کی حقیقت کیا ہے"باباجی نے گہری سانس لی اور سرد آہ بھر کر بولے "عشق, عشق ہوتا ہے خواہ حقیقی ہو یا مجازی، یہ خوش نصیبوں کو ہوتا ہے اور اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو عشق اللہ کی بہت بڑی توفیق ہوتی ہے گناہ نہیں۔ عشق بندے کو رب کے قریب کر دیتا ہے اور دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھی بندے کو رب کے قریب کرنے آئے تھے اب اس سے تم عشق کے مقام اور مرتبے کا اندازہ کر سکتے ہو"باباجی کے اس جواب نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا میں رکے بغیر بولا"بابا جی عشق حقیقی تو بجا مگر عشق مجازی کو ہم کیسے اللہ کی توفیق کہہ سکتے ہیں کیا یہ کھلا گناہ نہیں"باباجی نے ناصحانہ انداز میں بولنا شروع کیا "عشق مجازی عشق حقیقی کی منزل آسان کر دیتا ہے اور عشق مجازی کے دریا میں بہنے والا نافرمان کبھی نہ کبھی عشق حقیقی کے سمندر میں اتر جاتا ہے اور پھر اس کے اور رب کے درمیان صرف ایک باریک سا پردہ حائل ہوتا ہے، وہ پہلی ہی جست میں عشق حقیقی کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں صوفیاء بیسیوں سالوں کی محنت، ریاضت اور مشقت کے بعد پہنچتے ہیں"

مجھے بات پوری طرح سمجھ نہیں آئی تھی میں نے باباجی سے وضاحت چاہی انہوں نے اپنے دو مریدوں کی طرف اشارہ کیا اور بولے "یہ پہلا مرید دس سال سے میری خدمت میں ہے لیکن یہ ابھی تک تصوف کی دوسری سیڑھی پر کھڑا ہے لیکن جو دوسرا مرید ہے اس کو اس خانقاہ میں آئے ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں لیکن اسے میں نے اپنی خلافت عطا کر دی ہے"دس سال اور چھ ماہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا، میرے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر باباجی خود ہی گویا ہوئے"اس دوسرے مرید کی کہانی بڑی عجیب ہے۔یہ

آج سے دس سال پہلے لاہور گیا اور وہاں لیکچرار کی نوکری شروع کر دی۔ نوکری کے دوران ہی اسے عشق ہو گیا اور دونوں نے اکھٹے جینے مرنے کی قسمیں کھالیں، کچھ وقت تک سب ٹھیک چلتا رہا لیکن دو سال بعد کہانی ایک سو اسی زاویے الٹ چلنا شروع ہو گئی ۔ محبوب نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا لیکن اس کے لیے یہ بات نا قابل برداشت تھی، اس نے لاکھ منانے کی کوشش کی مگر نتیجہ خاک نکلا۔ یہ کئی کئی دن بھوکا پیاسا رہتا لیکن محبوب کو ترس نہ آیا۔ ایک دن سخت سردی کی رات تھی یہ گھر سے نکلا اور محبوب کی تلاش میں آہیں بھرنے لگا، اس کا محبوب لاہور کے ایک نامور ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ رات کا وقت، دسمبر کی سردی اور یہ سوائے تن کے کپڑوں کے ہر چیز سے خالی۔ پوچھ گچھ کرتا ہسپتال پہنچ گیا، محبوب پر نظر پڑتے ہی بچوں کی طرح رونے لگا کہ مجھے بس یہی چاہئے، پورے وارڈ میں کھلبلی مچ گئی، ارد گرد سے لوگ اکھٹے ہو گئے لیکن محبوب کو پھر بھی ترس نہ آیا اور اس نے سنی ان سنی کر دی۔ یہ غش کھا کر گر پڑا، صبح ہوش آیا تو اسی ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل تھا۔ اس کے ساتھ والے بیڈ پر میرے کسی مرید کا کوئی رشتہ دار تھا اس نے اسے میرا ایڈریس دے دیا، یہ ہسپتال سے سیدھا میرے پاس چلا آیا، میں نے اسے خانقاہ میں رہنے کی اجازت دے دی، پہلے یہ ایک ہفتہ پریشان رہا لیکن پھر اس پر خانقاہ کا رنگ جمنا شروع ہو گیا۔ دو ہفتے بعد یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے یہاں عجیب سی خوشی محسوس ہونے لگی ہے، جب میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اللہ سے باتیں کر رہا ہوں اور جب ذکر کی محفل ہوتی ہے تو جو حال اس پر طاری ہوتا ہے وہ اب تک بڑوں بڑوں کو حاصل نہیں ہوا"لیکن باباجی آپ نے ایک عورت کے عاشق کو اتنی جلدی خلافت کیسے دے دی" باباجی ہنستے ہوئے بولے "یہی وہ نکتہ ہے جو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے دو ماہ میں اس کے ذہن سے اس عورت کو نکال کر اللہ کو بٹھا دیا، میں نے اس کی ساری توجہ اس عورت سے ہٹا کر اللہ کی طرف موڑ دی اور پھر اس دن کے بعد اس کی قسمت بدلنا شروع ہو گئی۔ عشق مجازی نے اسے رونا دھونا، محبوب سے باتیں کرنا، محبوب کو منانا اور کبھی محبوب کو مناتے ہوئے خود روٹھ جانا یہ سب سکھا دیا تھا۔ یہ عشق کے اسرار و رموز کو جانتا تھا اور یہ جانتا تھا کہ عشق میں معشوق کی رضا کے لیے سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے اس دن سے اس نے گناہوں سے توبہ کی، اللہ سے لو لگائی اور خانقاہ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گیا۔ یہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے سامنے روتا اور اسے مناتا، اور اب یہ اس طرح محبوب سے راز و نیاز کرتا ہے کہ مجھے بھی اس پر رشک آنے لگتا ہے۔ دو ہفتے پہلے میں تہجد کے لیے اٹھا، دیکھا یہ جائے نماز پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا، میں نے غور سے سنا تو کہہ رہا تھا" یا اللہ تجھے موسیٰ اور چرواہے کا قصہ تو یاد ہے نا؟ موسیٰ کے دور کا وہ چرواہا جو تجھ سے بہت پیار کرتا تھا اور ایک دفعہ وہ آپ سے دعا مانگتے ہوئے کہہ رہا تھا اے اللہ کاش تو میرے پاس ہوتا، میں تیرے بالوں میں تیل لگاتا، تجھے کنگھی کرتا، تیرے پاؤں دھوتا لیکن موسیٰ نے پیچھے سے زور سے تھپڑ مارا کہ نادان تو کیا کہہ رہا ہے۔ تو یا اللہ تو نے فوراً جبرائیل کو بھیج دیا تھا کہ موسیٰ تم نے اسے کیوں مارا، یہ مجھ سے پیار کی باتیں کر رہا تھا، یہ مجھ

سے لاڈ کر رہا تھا، مجھ سے مانگ رہا تھا تم نے اسے کیوں مارا، اے اللہ میں بھی اس چرواہے کی طرح آپ سے پیار کرتا ہوں اور آپ کا ہونا چاہتا ہوں، اس کے بعد مجھ میں مزید سننے کی سکت نہ تھی اور میں نم آنکھوں کے ساتھ اپنے حجرے میں چلا گیا" بابا جی کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، میں نے دوسرے مرید کے متعلق پوچھا جو پچھلے دس سالوں سے تصوف کے دوسرے زینے پر کھڑا تھا۔ بابا جی نے مختصر جواب دیا "یہ بیچارہ عشق کے اسرار و رموز سے ناواقف ہے، اس کا دل عشق جیسے لطیف جذبات سے خالی ہے، اسے محبوب کے لیے رونا اور اسے منانا بھی نہیں آتا، اس کی دعائیں بے اثر ہیں، اسے مانگنا بھی نہیں آتا، یہ محبوب کے لیے بے چین ہونا بھی نہیں جانتا اور یہ محبوب کو پانے اور منانے کے لیئے کوئی حیلے بہانے بھی نہیں کرتا۔ یہ عبادت تو کرتا ہے، نمازیں تو پڑھتا ہے، روزے تو رکھتا ہے، نفل تو پڑھتا ہے، تسبیحات تو کرتا ہے لیکن اس کی یہ ساری عبادت خشک ہوتی ہے، اس میں عشق کا تڑکا نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے یہ ابھی تک تصوف کی دوسری سیڑھی پر کھڑا ہے" نماز کا وقت ہو چکا تھا، میں نے مزید گفتگو مناسب نہ سمجھی، بابا جی اٹھے، سلام کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، چپکے سے اپنے حجرے کی جانب چل دیئے اور میں جنوری کی میٹھی دھوپ میں بیٹھا عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

عشق حقیقی اور مجازی

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے، عشق اِن سب جذبات سے الگ ایک اعلیٰ ترین جذبہ ہے۔ اس اعلیٰ ترین جذبے میں نہ توقعات ہوتی ہیں اور نہ کوئی احساسِ ملکیت۔ یہ جذبہ اپنے اظہار کے لیے کسی جسمانی حسن یا کشش کا ضرورت مند نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کے لیے کوئی وقت یا ماحول مخصوص ہوتا ہے۔ عشق کیا نہیں جاتا عشق ہو جاتا ہے۔ پسند، کشش، انسیت، محبت میں عقل انسان کو مسلسل گائیڈ کرتی رہتی ہے۔ عشق میں عقل وجدان کے تابع ہو جاتی ہے۔ محبت میں دو ہستیاں ہوتی ہیں۔ ایک محب اور دوسرا محبوب۔ عشق میں صرف ایک ہی ہستی ہوتی ہے۔ اسی ہستی کا جلال عشق کو سوز عطا کرتا ہے۔ اس ہستی کا جمال عشق کو آسودگی بخشتا ہے اور وہ ہستی ہے معشوق۔

محبت میں دوئی ہوتی ہے۔ میں اور تو ہوتے ہیں۔ عشق میں وحدت ہوتی ہے۔ عشق میں، میں نہیں ہوتا۔ صرف تو ہوتا ہے۔ ہر طرف تو ہی تو۔ عاشق کو اس دنیا میں ہر طرف، ہر نظارے میں اپنا معشوق ہی نظر آتا ہے۔

ایک دوسرے کے ساتھ انسیت یا محبت کی ڈور میں بندھے ہوئے دو افراد میں سے کوئی کسی کے لیے تھوڑا سا بھی ایثار کرتا ہے، ذرا سی تکلیف بھی اٹھاتا ہے تو کہتا ہے یا کہتی ہے کہ دیکھ....! میں نے.... تیرے لیے یہ کیا وہ کیا۔ راہ عشق کا مسافر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا کر، گہرے سے گہرا زخم کھا کر بھی کہتا ہے یہ تو میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ راہِ عشق میں جان تک دے ڈالنے کے باوجود وہ سوچتا ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

عشق کی یہ تعریف (Definition) اور عشق کے یہ انداز کوئی خیالی اور تصوراتی باتیں نہیں ہیں۔ یہ اس مادی دنیا کے کسی فلسفی کا پیش کردہ کوئی مہمل نظریہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ وہ تعریف ہے اور عشق کے یہ وہ انداز ہیں جو حقیقت کے متلاشی لوگوں نے تاریخ کے صفحات سے اخذ کئے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال اللہ کے دوست، ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور آپ کے عظیم المرتبت صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات مبارکہ عشق کے ایک نہیں کئی منفرد انداز سے مزین ہے۔ اللہ کی وحدانیت کی دعوت دینے کی پاداش میں بادشاہ وقت کے حکم پر حضرت ابراہیم کو تیز و تند بھڑکتی ہوئی آگ میں پھنکوادیا گیا لیکن حضرت ابراہیم نے اف تک نہ کی۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

بڑھاپے میں ملنے والی اولاد اسمٰعیل کو ان کی نوجوانی کے دور میں اللہ کے اشارے پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے اور اس کام کے لیے خود اپنے بیٹے اسمٰعیل کی مرضی معلوم کی۔ اسمٰعیل نے اپنے والد سے عرض کیا....

"جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔" اللہ کے عشق میں سرشار باپ بیٹے کا یہ حیرت انگیز قصہ عشق کا ایک اور زریں باب ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

عشق کا ایک انداز دنیا کو حضرت سمیہؓ نے سکھایا کہ کس طرح مشرکین مکہ کے مظالم سہتے سہتے ابو جہل کی برچھیوں کو اپنے نازک بدن پر جھیل کر اسلام کی پہلی شہید ہونے کی سعادت پائی.... حضرت بلال حبشیؓ نے تپتے انگاروں پر لیٹ کر احد احد کا لاہوتی صدا بلند کی.... عشق ہی کی بدولت کوئی صدیق اکبر کہلایا تو کوئی باب العلم۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی تقویم میں، عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اسی عشق کی خاطر حضرت امام حسین نے دشتِ کربلا میں شہادت پائی۔

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدہ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق

معرکہِ وجود میں بدر و حنین بھیٔ ہے عشق

عشق امتحانات سے خالی نہیں ہے۔ عشق کا میدان یا عشق کا راستہ آزمائشوں اور امتحانات سے بھرا پڑا ہے۔ اس راہ میں جگہ جگہ عقل اور عشق کی باہمی کش مکش بھی ہوتی رہتی ہے لیکن راہ عشق کے سچے مسافر عقل کو وجدان کے اور وحی کے تابع رکھنا جان جاتے ہیں

۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشہ لب بام ابھی

عشق جہد مسلسل کا تقاضہ کرتا ہے۔ عشق کے زیر اثر ہونے والی ہر جستجو فطرت کے کسی نئے رنگ کو آشکارا کرتی ہے، کسی نئی دنیا، کسی نئے عالم کو منکشف کرتی ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہے

اویس قرنی، حسن بصری، رابعہ بصری، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، معروف کرخی، ذوالنون، شبلی، منصور حلاج، ابوالخیر کشفی، امام غزالی، ابو حسن خرقانی، عبد القادر جیلانی، گنج بخش، خواجہ معین الدین، بختیار کاکی، گنج شکر، نظام الدین اولیاء، صابر کلیاری، امیر خسرو، شہاب الدین سہروردی، بہاء الدین زکریا، لعل شہباز، ابن عربی، شمس تبریزی، رومی، شیخ سعدی، عطار، رازی، بو علی سینا، جامی، بھٹائی، سچل سرمست، غلام فرید، بلھے شاہ، وارث شاہ۔ شاہ حسین، سبھی راہِ عشق کے مسافر ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

فی زمانہ، جس چیز کو انسان عشق کے نام سے جانتا ہے وہ مجازی اور محدود عشق ہے جو عشقِ حقیقی کی ایک محدود جھلک ہے۔ حقیقی عشق ایک وجودی اصل ہے جو بنیادی اور مستحکم ہے اور تبدیلیوں اور تغیّرات پر مشتمل نہیں۔ محبّت کی عام سطح روز مرّہ زندگی، جنسیت، دوستی اور دوسری کششوں میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ بعض دانشور عشق کو جذباتیت، حساسیت اور رجائیت کا نام دیتے ہیں، یہ جو بعض جگہ کچھ عامیانہ اور گھسے پٹے سے شعر لکھے نظر آتے ہیں۔ کسی ویب سائٹ پر، کسی بلاگ پر، کسی رکشے پر، اور انہیں عشق سے منسوب کیا جاتا ہے یہ حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ بعض جگہ لکھے گئے کچھ اشعار شغل کے طور محبت میں گرفتار ہونے کی کیفیت کا اظہار تو کرتے ہیں مگر ان سے عشق کی حقیقت کو سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بنجر زمین پر زعفران کی فصل کاشت کرنا۔ اکثر لوگ غلطی سے جنسی جذبے اور حسّیاتی جنسیّت کو محبّت کی اعلٰی ترین شکل سمجھ لیتے ہیں، جب کہ یہ حقیقت میں محبت کی بھی کم ترین شکل ہوتی ہے۔

عشق، اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی ہوس کا نام نہیں ہے۔ عشق کی کیفیت کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہے، یہ تو ایک ایسا جذبہ ہے جس کا پتہ تجربے سے ہی چلتا ہے۔

عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔ اسے بعض نے فطرتِ انسانی کے لطیف ترین حسی پہلو کا نام دیا ہے۔ اور بعض نے روحِ انسانی پر الہام و وجدان کی بارش یا نورِ معرفت سے تعبیر کیا ہے۔

ایرانی

هرچه گویم عشق را شَرح و بَیان

چون به عشق آیَم خَجِل باشم از آن

ہر چہ گویم عشق راشَرح وبَیاں
چون بِعشق آیَم خَجِل باشم از آں

گرچہ: اگرچہ۔۔۔ گویم: میں بیان کروں شرح: کھول کر بیان کرنا۔۔۔ خَجِل: شرمندہ

ترجمہ: اگرچہ عشق کی تفصیل وبیان خواہ کتنا ہی کیوں نہ کروں۔ جب عشق کی کیفیت میں آتا ہوں تو اس بیان سے شرمندہ ہوتا ہوں۔

جب پرسشِ حال وہ فرماتے ہیں جانیے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے (فانی)

جناب رومیؒ کہتے ہیں کہ میں تم سے محبت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، لیکن میں خود محبت سے شرمندہ ہوں! کیونکہ میں اس کی مکمل تفصیل نہیں دے سکتا۔

صوفیانہ ادب میں محبت کو ایک آزاد شناخت دی جاتی ہے اور وہ اسے ایک آزاد انسان کے طور پر جانتے ہیں۔

جناب رومیؒ کا کہنا ہے کہ میں لفظوں کا آدمی ہوں اور میں کسی بھی موضوع کا اظہار اور تشریح کر سکتا ہوں، لیکن مجھ سے محبت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، اور جب بھی میں محبت کرتا ہوں، بے زبان محبت خود ایک بہتر مقرر ہو سکتی ہے!

اس لیے محبت ایک ایسا موضوع ہے جس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، خاص طور پر شمس جیسی محبت کا تجربہ کرنے والا کبھی بھی کسی کے ساتھ کیا ہوا بیان نہیں کر سکتا۔

محبت وہ چیز ہے جو دل میں آتی ہے اور۔۔۔ یہ محبت ہے!۔۔۔ رومی بے زبان محبت کا اظہار کرتے ہیں،۔۔۔ وہ محبت کی ناانصافی کو بتانا چاہتا ہے اور یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ اس واقعہ کو بالکل بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب اسی محبت کی انتہا ہو تو وہ عشق کا مقام ہے اور عشق حقیقی کی وہ لذت آشنائی ہے۔

یعنی عشقِ حقیقی انوارِ الٰہی میں سے ایک نور ہے، ایک ایسا عظیم نور کہ اس سے بڑھ کر کوئی نور نہیں، کیونکہ جسم سے روح کا مرتبہ اونچا ہے، روح سے عقل کا درجہ بلند تر ہے اور عقل سے عشق ارفع و اعلیٰ ہے۔

ہم نے یہ دعویٰ تو کر ہی لیا کہ عشقِ حقیقی سب سے عظیم نور ہے، مگر ایمانداری تب ہو سکتی ہے، جبکہ یہ بھی سوال کیا جائے کہ ایسے نور کی روشنی کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اور یہ روشنی کس قسم کی تاریکی کو دور کر دیتی ہے؟

چنانچہ میں اس کا بیان رب العزت کی توفیق سے کروں گا، مگر مجھے احساس ہے کہ یہ بہت بڑی بات ہے اور بہت اونچی بات ہے، اس لئے نہ صرف مجھے اِس رازِ حقیقت کو انتہائی ادب اور حرمت کے ساتھ بیان میں لانا چاہیئے، بلکہ آپ کو بھی نہایت ہی قدر دانی کے ساتھ ایسی باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے، تا کہ حقائق و معارف کی قدر و قیمت قائم رہ سکے، اے میرے عزیزو! یہ جان رکھو کہ نور یعنی روشنی کسی چیز کے جل جانے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے بغیر کوئی نور ہے ہی نہیں، کہ جلنے جلانے کے سوا نور ہو، سو نورِ عشق عاشق کے جل جانے سے پیدا ہوتا ہے، اس میں جسم، روح اور عقل تینوں چیزیں مسلسل جلتی رہتی ہیں، یعنی ان کی تحلیل ہوتی چلی جاتی ہے، ہاں درست ہے یہ کام ترتیب سے اور اصول کے

مطابق ہوتا ہے، کہ جسم جل کر ایکدم سے نورِ عشق نہیں بن سکتا، بلکہ جسم کی تحلیل سے روح کا احاطہ بڑھ جاتا ہے اور اس مطلب کو عام الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ جسم کے حقیقی معنوں جلنے سے روح کا شعلہ بن جاتا ہے، روح کے جلنے سے عقل کا وجود بنتا ہے اور عقل کو اُس بے مثال محبوب کے حسن و جمال اور اوصافِ کمال کی محبت و حیرت کی آگ میں جلانے سے نورِ عشق پیدا ہو جاتا ہے۔

نورِ عشق کی کیفیت و حقیقت کماحقہ بیان نہیں ہو سکتی ہے،

اس لئے کہ عشق عاشق کے اُس بھرپور جذبے کو کہا جاتا ہے، جس میں سچا عاشق ماسوائے معشوق کے ہر چیز کو اور سب سے پہلے خود کو ہیچ سمجھتا ہے، یعنی وہ ہر چیز کو اور اپنی خودی کو ارادے کی انتہائی شدت سے اپنے معشوق پر قربان کر دیتا ہے، اس کیفیت کی مثال کسی چیز کو جلا کر روشنی پیدا کرنے کی طرح ہے، ایسی حالت میں یقیناً ایک حقیقی مؤمن میں نورِ عشق کی روشنی پیدا ہوتی ہے، جس کی

قرآنِ حکیم میں دینی قسم کی محبت و دوستی اور ولایت فرض کی گئی ہے، جس کا ہم یہاں عشق کے عنوان سے ذکر کر رہے ہیں، اگرچہ لفظِ عشق قرآن میں بظاہر موجود نہیں، لیکن مترادفات میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور حروفِ مقطعات میں بھی، اور اگر دقتِ نظر سے کام لے کر دیکھا جائے، تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئیگی، کہ دنیائے قرآن کی تمام چیزیں عشقِ خدائی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، جس کا اشارہ ۱۳۸:۲ میں ہے، اور اس قول میں کیا شک ہو سکتا ہے، جبکہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ:
ولکن حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم (۷:۴۹) لیکن خدا نے تمہیں ایمان حبیب و عزیز قرار دیا اور اس کی خوبصورتی وعمدگی تمہارے دلوں میں ظاہر کردی، یعنی ایمان نہ صرف محبت و جاذبیت و دلکشی کی تاثیر ہے بلکہ اس میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جب ایک حقیقی مؤمن کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے تو اس وقت ایمان اس کے روحانی مشاہدے میں تجلیاتِ نورانیت کی جنت بن کر سامنے آتا ہے، اس کا مختصر مطلب یہ ہوا کہ ایمان پیارا ہے، وہ پیار چاہتا ہے، ایمان ہر چیز سے حسین اور خوبصورت ہے، کیونکہ حکمت میں ایمان ہی بہشت ہے، اور اسی میں تمام لذتیں پوشیدہ و پنہاں ہیں، اس میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

عشق کے سات مقام۔

دل لگی، انس، محبت، عقیدت، عبادت، جنون اور فنا۔

بات کرتے ہیں پہلے درجے کی۔

سب سے پہلے آپ کو کسی سے ہوتی ہے دل لگی (اس کے لئے لازمی نہیں کہ کسی خوب صورت یا دل کش چیز / انسان سے ہی ہو) .

اس کے بات آپ اس سے انسیت پیدا کرتے ہیں. جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کون ہے کیا ہے؟ اس کی پسند، ناپسند وغیرہ وغیرہ،

پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے جذبات میں بھی خالص پن آتا ہے اور جذبات بدلنے لگتے ہیں، یہاں آپ محبت کے مقام تک پہنچتے ہیں۔

پھر اگر محبت خالص، پاکیزہ اور خود غرضی سے پاک ہو تو انسان (عاشق) کو اپنے محبوب سے عقیدت ہو جاتی ہے، جیسے ایک مرید کو اپنے مرشد سے۔

جو محبوب (مرشد) نے کہہ دیا وہی حکم ہو گیا۔

اگلا درجہ عبادت ہے۔ عبادت سے یہاں ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس کو سجدے کرے۔

بلکہ بندگی کرنا۔ اس کا حکم ماننا۔

یہاں پہنچتے ہوئے بندے کی میں ختم ہو جاتی ہے۔ جنون بن جاتا ہے اس کا عشق دنیا سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

اور پھر۔ فنا

اس کے بارے میں مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ اقبالؒ اس کی کیفیت کچھ یوں بیان فرماتے ہیں

عشق اَست کہ دَر جانِت ہر کیفیت اَنگیزَد

اَز تاب و تبِ رومی تا حیرتِ فارابی

{یہ} عشق ہی ہے جو تیری روح میں ہر کیفیت پیدا کرتا ہے

رومی کے جوش و تڑپ سے لیکر فارابی کی حیرت تک

{رومیؒ مسلک عشق کے علمبردار ہیں اور عشق کا ثمرہ تب و تاب ہے، فارابی مذہب عقل کا نماہندہ ہے اور عقل کا نتیجہ حیرت و استعجاب ہے}

اِیں حَرفِ نشاط آور می گویَم و می رَقصَم

اَز عشق دِل آسایَد با اِیں ہَمہ بیتابی

میں اس نشاط آور {خوشی لانے والا} حرف کا ورد کرتا ہوں اور ناچتا ہوں

اس تمام بے تابی کے باوجود دل عشق ہی سے چین {سکون} پاتا ہے

ہَر معنیِ پیچیدہ دَر حَرف نُمی گَنجَد
یَک لحظہ بدِل دَر شَو شاید کہ تُو دَریابی

حرف میں ہر پیچیدہ معانی نہیں سماتا
ایک پل کے لیئے اپنے دل کے اندر نظر ڈال شاید تو اسے پا جائے {اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی}

"پیامِ مشرق" علامہ محمد اقبال رح

ایرانی

گرچہ تَفسیرِ زبانُ روشن گر است
لیک عُشقِ بی زبانُ روشن تَر است

پاکستانی

گرچہ تَفسیرِ زبانُ روشن گرست
لیک عُشقِ بیزبانُ روشن ترست

گرچہ: اگرچہ۔۔۔ تفسیر: ظاہر کرنا۔۔۔ روشن گر: روشنی ڈالنے والا۔۔۔ لیک: لیکن۔۔۔ عشق بیزبان: عشق بغیر زبان کے

ترجمہ: اگرچہ زبان کی تشریح روشنی ڈالنے والی ہے۔ لیکن عشق تو زبان کے بغیر خود ہی خوب روشن ہے۔ یعنی کہ زبان اگرچہ ہر قسم کی باتوں کے اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہے لیکن عشق ایسی چیز ہے کہ اس کی کیفیت خود بخود عاشق پر منکشف ہو جاتی ہے۔

چاہے محبت حقیقی ہو یا مجازی، یہ بالآخر ہمیں انسانوں کو الہی دنیا کی طرف لے جاتی ہے۔

یہاں پچھلے شعر کی توثیق ہوتی ہے اور شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ زبان میں چیزوں کی حقیقت کا اظہار بہتر اور معنی کی اقسام میں معلوم ہوتا ہے لیکن مقام کی لفظی معنی اور کامل معانی کے استعمال میں، محبت کا زبانی اظہار بہتر اور واضح لگتا ہے لیکن حقیقت میں زبان کے بغیر محبت زیادہ واضح ہے کیونکہ محبت ذائقہ کا معاملہ ہے۔ لہٰذا خاموشی کی زبان سے محبت کا اظہار رومانوی حالات کسی کی مدد کے بغیر اور بغیر کسی سوال، جواب یا وضاحت کے انسان کے دل پر حاوی ہونے کا سبب بنتا ہے اور یہ انسانی وجود کا احاطہ کرتا ہے اور انسان حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ خود سے محبت کی.

یہ کہنا تھا ان سے محبت ہے مجھ کو

یہ کہنے میں مجھ کو زمانے لگے ہیں

خمارؔ بارہ بنکوی

عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے

پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

اکبر الہ آبادی

میں ساز حقیقت ہوں دم ساز حقیقت ہوں

خاموشی ہے گویائی گویائی ہے خاموشی

اسرار محبت کا اظہار ہے ناممکن

ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا قفل در خاموشی

ہر دل میں تجلی ہے ان کے رخ روشن کی

خورشید سے حاصل ہے ذروں کو ہم آغوشی

جو سنتا ہوں سنتا ہوں میں اپنی خموشی سے

جو کہتی ہے کہتی ہے مجھ سے مری خاموشی (بیدم)

اظہار محبت اللہ کریم جل شانہ کی سنت بھی ہے جیسے ارشاد فرمایا

اس خوبصورت سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیئے ہم اللہ سبحانہ وتعالی ہی کی کتاب یعنی قرآن مجید سے مدد لیں گے۔ قرآن مجید کی پانچویں سورت، سورۃ المائدہ کی آیت میں اس اہم راز کا انکشاف موجود ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ۖ يُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَاۤئِمٍ‌ ؕ ذٰ لِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۵۴ [۵:۵۴]

اے ایمان والو اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے نہ ڈریں یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے

حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيل، حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ هِلَالٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الصَّامِتِ، عَنْ أَبِي ذَرٍّ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، " الرَّجُلُ يُحِبُّ الْقَوْمَ وَلَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَعْمَلَ كَعَمَلِهِمْ ,قال: أَنْتَ يَا أَبَا ذَرٍّ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ ,قال: فَإِنِّي أُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ,قال: فَإِنَّكَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ ,قال: فَأَعَادَهَا أَبُو ذَرٍّ، فَأَعَادَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ."

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے پوچھا: اللہ کے رسول! ایک شخص ایک قوم سے محبت کرتا ہے لیکن ان جیسا عمل نہیں کر پاتا؟ آپ نے فرمایا” :اے ابوذر !تو اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو “تو انہوں نے کہا: میں تو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں، تو آپ نے فرمایا” :تم اسی کے ساتھ ہوگے، جس سے تم محبت رکھتے ہو “ابوذر نے پھر یہی کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی دہرایا۔]سنن ابي داود / أَبْوَابُ النَّوْمِ / حدیث: 5126[

تخریج الحدیث: «تفرد بہ أبو داود، (تحفة الأشراف: 11943)، وقد أخرجہ: مسند احمد (5/156، 166، 174، 175)، دی/الرقاق 71 (2829) (صحیح الإسناد)

حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، حَدَّثَنَا الْمُبَارَكُ بْنُ فَضَالَةَ، حَدَّثَنَا ثَابِتٌ الْبُنَانِيُّ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، "أَنَّ رَجُلًا كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَرَّ بِهِ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي لَأُحِبُّ هَذَا ,فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَعْلَمْتَهُ؟ قَالَ: لَا ,قَالَ: أَعْلِمْهُ ,قال: فَلَحِقَهُ، فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّكَ فِي اللَّهِ ,فَقَالَ: أَحَبَّكَ الَّذِي أَحْبَبْتَنِي لَهُ."

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، اتنے میں ایک شخص اس کے سامنے سے گزرا تو اس شخص نے کہا: اللہ کے رسول! میں اس سے محبت رکھتا ہوں، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا” :تم نے اسے یہ بات بتا دی ہے؟ “اس نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا” :اسے بتا دو “یہ سن کر وہ شخص اٹھا اور اس شخص سے جا کر ملا اور اسے بتایا کہ میں تم سے اللہ واسطے کی محبت رکھتا ہوں، اس نے کہا: تم سے وہ ذات محبت کرے، جس کی خاطر تم نے مجھ سے محبت کی ہے۔ (سنن ابي داود / أَبْوَابُ النَّوْمِ / حدیث: 5125)

تخریج الحدیث: «تفرد بہ أبو داود، (تحفة الأشراف: 464)، وقد أخرجہ: مسند احمد (3/141) (حسن)

کتنا خوبصورت ہوتا ہے نہ یہ محبت کا رشتہ جو ہمارا اپنوں کے ساتھ ہوتا ہے جس میں ہر وقت ایک دوسرے کی فکر رہتی ہے۔ ہر لمحہ اپنوں کے لئے عافیت کی دعائیں کی جاتی ہیں۔ والدین ہوں، بہن بھائی ہوں یا دوست ہمیں سب سے بہت محبت ہوتی ہے اور اس کا اظہار کرنے کے لئے موقع ملتے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اظہار ضروری بھی ہوتا ہے کیونکہ جب آپ کسی کو بتائیں گے نھیں تو آپ کا یقین نھیں کرے گا کہ آپ کو ان سے کتنی محبت ہے یہاں تک کہ آپ کے دوست بھی نھیں۔ اسی لیے تو دوستوں سے بات چیت کی جاتی ہے ان کو تحفے تحائف دیے جاتے ہیں ے تاکہ ان کو محسوس کروایا جاسکے ان کا ہماری زندگی میں کیا مقام ہے۔ یہ سب

اپنی جگہ درست ہے لیکن ایک اہم چیز، ایک اہم محبت، ایک اہم اظہار جس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا پتہ ہے کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کا اظہار۔ کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے محبت ہے لیکن جب اظہار کی باری آتی ہے تو تب ساری محبت کہاں چلی جاتی ہے؟ دوستوں کی خوشی کے لئے ان کے سامنے خود کو مخلص ثابت کرنے کے لئے تو میلوں کا سفر کر کے ان کی ایک پکار پر ان تک پہنچ جاتے ہیں تو جب اللہ تعالیٰ دن میں پانچ دفعہ پکارتے ہیں تب کیوں نہیں ہوتا اظہارِ محبت؟ تب کیوں اپنے بستر سے یا اپنے کام کو چھوڑ کر جائے نماز تک کا سفر طے نہیں ہوتا؟ تب محبت کے سارے جذبے ماند کیوں پڑ جاتے ہیں؟ انسانوں کے لئے رات بھر جاگ سکتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میری محبت میں رات کے پچھلے پہر اٹھ کر مجھ سے باتیں کروں تو تب کیوں نہیں آنکھ کھلتی؟ ہر روز فضولیات میں کس قدر رقم خرچ کرتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کہتے ہیں مجھے قرضِ حسنہ دو تو کیوں جیبوں کو ٹٹولنے لگ جاتے ہیں کہ چند سکے مل جائیں تو وہ دے دیں؟ کیا یہی محبت ہے؟ اسے کہتے ہیں محبت کرنا اور اس کا اظہار کرنا؟ جو انسان اپنے بنانے والے سے وفا نہ کر سکے وہ دوسروں کے ساتھ کیسے مخلص ہو سکتا ہے۔ پہلے محبت کا حق، وفا کا حق خالقِ کائنات کا ہے۔ اس کی محبت کو اولین ترجیح دیں باقی ساری محبتیں اور چاہتیں وہ خود دے دے گا۔ وہ ذات اتنی عظیم ہے کہ انسان کی محبت کو کبھی رائیگاں نہیں جانے دیتی۔ تو پھر محبت کرنی ہے تو خدا سے کریں اظہار کرنا ہے تو الہ سے کریں وفا کرنی ہے تو اس بادشاہ سے کریں جہاں کبھی خسارہ نہیں ہو گا نہ منہ پہ مارا جائے گا۔ آج ترجیحات بدل لیں زندگی خود بخود بدلنا شروع ہو جائے گی۔ زندگی میں ایسا سکون اور اطمینان آئے گا. اِن شاء اللہ کہ آپ خود بھی حیران رہ جائیں گے۔ کیوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ خالق سے محبت کرے اور وہ اس کو محبت سے جواب نہ دے؟ دیر تو انسان ہی کرتا ہے رحمان تو دوڑ کر تھامتا ہے۔ آجاؤ اپنے رب کی طرف۔ لوٹ آؤ ورنہ ایک دن اس کی طرف لوٹنا تو ہے ہی، چاہے خوشی یا ناخوشی سے۔

ایرانی

چون قَلَم اَندَر نوشتن می شِتافت

چون بہ عشق آمد قَلَم بر خود شِکافت

پاکستانی

چون قَلَم اَنْدَر نوشتن میشِتافت
چون بعِشق آمد قَلَم بَر خود شگِافت

نوشتن: لکھنا۔۔۔ می شافت: جلدی کر رہا تھا۔۔۔ بعشق آمد: عشق پر آیا۔۔۔ شگافت: شق ہو گیا

ترجمہ: جب قلم مختلف مضامین کے لکھنے میں تیزی سے مصروف تھا تو جونہی عشق پر آیا تو وہ قلم درمیان سے شق ہو گیا۔ یونی کہ جس طرح محبت زبان سے اپنی اصلیت کو ظاہر نہیں کر سکتی اسی طرح قلم بھی حالت عشق کو لکھنے سے قاصر ہے۔ بقی سب کچھ لکھ سکتی ہے پر ذوق عشق کو بیان کرنے سے عاجز ہے۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ قلم نے دوسرے موضوعات بھی خوب لکھے لیکن جب محبت کا ذکر آیا اور چونکہ محبت ضمیر اور باطن کا معاملہ ہے اور گفتگو اور تحریر کا اس میں کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے سچ لکھنے سے گریز کیا۔ محبت کو بیان نہیں کر سکتا۔

اس شعر میں بھی وہی موضوع بیان کیا گیا ہے جیسا کہ گزشتہ شعر کا ہے اور اس کیفیت کا مفہوم محبت کی کیفیت ہے، اور قلم توڑنا اور کاغذ پھاڑنا بھی ان کی محبت کو بیان کرنے سے قاصر ہونے کی ستم ظریفی ہے۔ کیونکہ اگر قلم ٹوٹ جائے اور کاغذ پھٹ جائے تو لکھنا ضرور رک جائے گا۔

مختصر یہ کہ جب محبت کی بات کرنے کا وقت آیا تو قلم نے لکھنا چھوڑ دیا، اور اس کی وجہ محبت کی باطنی اور باطنی فطرت تھی، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات میں زیر بحث آیا ہے۔

جب ہم قرآن حکیم کو دیکھتے ہیں تو پروردگار عالم، اقراء سے آغاز فرماتے ہیں اور مالم یعلم پر اختتام فرماتے ہیں تو محبت کی پہلی وحی کیا انداز و گہرائی و گیرائی ہے۔

دیکھیں:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝۲ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝۳ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝" (العلق)

اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔)بخاری، کتاب بدء الوحی، ۳-باب، ۱ /۷، الحدیث :۳، مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، ص۹۴، الحدیث :۲۵۲(۱۶۰

شانِ نزول: حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا فرماتی ہیں " رسولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر وحی کی ابتداء اچھے خوابوں سے ہوئی، آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ جو خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا، پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ خَلْوَت پسند ہو گئے اور غارِ حرا میں جانے لگے اور کاشانۂ اَقدس کی طرف لوٹنے سے پہلے وہاں کئی کئی راتیں ٹھہر کر عبادت کرتے اور)اتنا عرصہ وہاں رہنے کے لئے (کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے جاتے، پھر حضرت خدیجہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا کی طرف لوٹتے اور وہ اسی طرح کھانے کا بندوبست کر دیا کرتیں یہاں تک کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے پاس حق آ گیا جب کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ غارِ حرا میں تھے یعنی فرشتے نے آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر کہا: پڑھئے۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں "میں نے کہا: میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ اس نے مجھے پکڑ کر بڑے زور سے دبایا، پھر چھوڑتے ہوئے کہا: پڑھئے۔ میں نے کہا" میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ اس نے مجھے پکڑ کر دوبارہ بڑے زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا اور کہا: پڑھئے۔ میں نے کہا" میں پڑھنے والا نہیں ہوں اس نے مجھے پکڑا اور تیسری بار دبایا، پھر مجھے چھوڑ کر کہا

:اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝۲ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝۳ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝" (العلق)

یہ وحی محبت بھی ہے۔

۱۔ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ (1)

اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا۔

تشریح: عام طور پر اس آیت کے پہلے لفظ پر بہت زیادہ فوکس کیا جاتا ہے جس کی بنا پر اس آیت کا پورا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ یہاں اقرا کا لفظ ایک حکم اور ہدایت ہے۔ جیسے قرآن میں کئی مقامات پر نبی کریم کو کہا گیا کہ "قل" یعنی کہہ دو۔ تو اسی طرح یہاں اللہ تعالی فرشتے کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں کہ "پڑھو" یعنی جو کچھ وحی تمہیں دی جا رہی ہے اسے پڑھو۔ اسی لیے جب جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے غار حرا میں ملے اور وحی کا یہ ابتدائی حکم دیا کہ "پڑھو" تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ "ما انا بقاری" یعنی میں تو پڑھا ہوا نہیں تو کیسے پڑھوں یا کیا پڑھوں۔

تو اگر ہم اقرا کے لفظ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جانے والی ایک کمانڈ یا ہدایت مان لیں باقی آیت کا مفہوم کم و بیش وہی ہے جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ہے۔ یعنی "باسم ربک الذی خلق"۔ یعنی ابتدا ہے تمہارے رب کے نام سے جس نے تخلیق بھی کیا۔ یہ ابتدا ہے قرآن کی اور انسانیت کو دی جانے والی آخری وحی کی۔ اور اس کی ابتدا ہوتی ہے پالنے والے یعنی رب کے نام سے جو خالق بھی ہے۔ یہاں رب اور خالق کی دو صفات کا مطلب اس وقت دیگر مذاہب میں پائی جانے والے تصورات کی نفی کرنا تھا جس میں پالنے والا خدا الگ اور پیدا کرنے والا الگ ہوتا ہے۔ مشرکین مکہ کے مختلف بتوں کے فنکشنز مختلف تھے۔ کوئی پیدا کرنے والا، کوئی پالنے والا، کوئی حفاظت کرنے والا تو کوئی کوئی اور کام کرنے والا تھا۔ اس پہلی آیت نے اس پورے فلسفے کو منہدم کر دیا۔ یہ بتا دیا کہ رب یعنی پالنے والا وہی ہے جس نے پیدا کیا اور یہ کوئی اور نہیں ہے۔

اس آیت کو دیکھیں تو یہ دراصل وحی کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ابتدا ہے البتہ یہاں الفاظ مختلف ہیں۔

۲۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ(2)

انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

پچھلی آیت وحی کی ابتدا تھی تو یہ آیت انسان کے مادی وجود کی ابتدا کو بیان کرتی ہے۔ قرآن نے اس زمانے میں یہ بات کہہ دی کہ انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ یہ رحم مادر میں نر اور مادہ کے ملاپ کے بعد زائگوٹ کی جانب اشارہ ہے جو ایک خون کے لوتھڑے یا جمے ہوئے خون کی مانند ہی ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی کی ابتدا ہی میں اس دوسری آیت میں تخلیق کا یہ عمل بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں دراصل وحی بھیجنے والی ہستی کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ کہ وہ رب ہے، وہ خالق ہے تو اب اگر وہ خالق ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ وہی خالق ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے تخلیق کا وہ مرحلہ بیان کر دیا جو اس وقت انسان کے علم میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے یہ مرحلہ ایک خالق ہی جان سکتا ہے۔

یہ مرحلہ اولین مخاطبین یعنی مشرکین مکہ کے لیے اہم نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ سائنسی علم کے ارتقا کے بغیر اس سچائی کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خون کے لوتھڑے کو ایک دوسری فارم میں جانتے تھے۔ البتہ انہیں اس بات کا شعور ضرور تھا کہ انسان ایک حقیر سے نطفے سے پیدا ہوتا ہے۔

یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ وحی جس ہستی کی جانب سے بھیجی جارہی ہے وہ کتنی عظیم اور قدرت رکھتی ہے کہ ایک جمے ہوئے خون سے زندگی پیدا کرتی ہے۔ یہ اس کی عظمت کی وہ دلیل ہے انسان کی نظروں کے سامنے ہے۔ تو اسی وحی میں جب آگے یہ بتایا جائے گا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا تو اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس وحی اور اس پیغام کا بھیجنے والا کوئی معمولی نہیں بلکہ ہر شے پر قادر ہے۔

۳۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ (3)

پڑھیے اور آپ کا رب سب سے بڑھ کر کرم والا ہے۔

یہاں دوبارہ وہی لفظ "اقرا" یعنی پڑھو استعمال ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تصور کیجیے کہ وہ ایک غار میں موجود ہیں اور خدا کا فرشتہ ان سے ہم کلام ہے۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار اس تجربے سے براہ راست گذر رہے ہیں، ایک عجیب مقام حیرت ہے، ذہن میں کئی سوالات پوشیدہ ہیں۔ اس کیفیت میں فرشتہ ان سے مخاطب ہے تو وہ دوبارہ ہدایت کرتا ہے کہ اس مقام حیرت اور ان سوالات کو فی الحال پس پشت ڈالیے اور پھر پڑھیے۔ اور گھبرائیے نہیں، یہ کلام جس ہستی کی جانب سے آرہا ہے وہ کوئی جابر، قاہر، ظالم اور متشدد قسم کی ہستی نہیں۔ بلکہ وہ تو انتہائی کریم، شفیق، مہربان اور خیال رکھنے والی ذات ہے۔ وہ آپ کے تمام سوالات کے جواب دے گی، آپ کی اس حیرت کو دور کردے گی، وہ آپ کے اضطراب کو سکون میں دل دے گی۔ یہ وہ پیغام ہے جو اس آیت میں خدا نے اپنے نبی کو دیا۔

دوسری جانب یہ آیت اپنے دوسرے مخاطبین کو وحی بھی والی ہستی کی چوتھی صفت سے آشنا کرتی ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا کہ اس کلام کا بھیجنے والا رب بھی ہے، خالق بھی ہے اور قادر مطلق بھی ہے۔ اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ وہ بہت ہی کرم، لطف، مہربانی والا خدا ہے۔ وہ بے شک سب سے بلند و بالا ہے لیکن دنیاوی حکمرانوں کی طرح وہ کوئی سخت مزاج یا تشدد کرنے والا نہیں ہے۔ وہ اپنی بات جو بھیج رہا ہے وہ کوئی عذاب کا پیغام نہیں بلکہ انسانیت کے رحمت ہے۔ وہ اپنی بات اس وقت ماننے کا مکلف انسان کو ٹھہراتا ہے جب وہ اچھی طرح سمجھادے اور مخاطب یہ بات اچھی طرح سمجھ لے۔ وہ اپنی مرضی اگر تھوپنا چاہتا تو اس پیغام کے بغیر ہی یہ کام کردیتا۔ لیکن وہ تو کریم النفس ہستی ہے۔

۴۔ اَلَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (4)

جس نے قلم سے سکھایا۔

یہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو سکھایا۔ یہاں قلم ایک ٹول کے طور پر بیان ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو قلم یہاں مجازی معنوں میں ہے حقیقی معنوں میں نہیں۔ اگر ہم دیکھیں تو پین یا قلم انسانی تاریخ میں بالکل ابتدا سے موجود نہیں تھا۔ پہلے انسان اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کلام، تصاویر، بت اور دیگر طریقوں سے کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد انسان کی تاریخ میں قلم اگر آیا بھی تو وہ عوام کی بجائے مخصوص طبقات کے استعمال میں تھا۔ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بہت کم لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے اور خود نبی کریم بھی لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

تو اگر یہاں قلم سے مراد پین یا پر لیا جائے تو یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ انسان کو ابتدا ہی سے قلم سے سکھایا گیا اور نہ ہی ہر انسان نے قلم سے سیکھا۔ بلکہ ہم دیکھیں تو آج بھی ایک بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں جو کچھ سیکھتا ہے وہ قلم کے بغیر ہی ہوتا ہے۔ اگر یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جانے والی وحی مراد لی جائے تو یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ حضرت جبریل نے اس وقت قلم استعمال نہیں کیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں قلم سے کیا مراد ہے۔ قلم درحقیقت ایک ٹول یا آلے طور پر استعمال ہوا ہے۔ قلم کا کام انسانی کی سوچ ، علم اور خیالات کو منتقل کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز یا طریقہ کار جو علم کو آگے پہنچانے کا سبب بنے وہ قلم کی ذیل میں آجائے گا۔ چنانچہ یہاں قلم سے مراد ہر وہ کمیونکیشن یا ابلاغ کا ذریعہ ہے جس سے علم ایک شخص سے دوسرے شخص، ایک گروہ سے دوسرے گروہ اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منتقل ہوتا ہے۔ اس میں قلم، کمپیوٹر، زبانی تقریر، تصویر، ہر طرح کی کمیونکیشن کا ذریعہ شامل ہے۔

اس آیت کا اصل پہلو قلم نہیں بلکہ سکھانے کا عمل ہے۔

قلم کا ذکر تو یہاں ضمناً آگیا ہے۔ اصل فوکس اس بات پر ہے کہ انسان کو سکھایا اور اسے علم دیا۔ اس سے پچھلی آیت میں بات یہ ہوئی تھی کہ انسان کے حیوانی وجود کی ابتدا کس طرح جمے ہوئے خون سے ہوئی۔ اب یہاں انسان کے روحانی وجود کی ابتدا کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ کس طرح انسان کو سکھا کر اور اسے علم دے کر دیگر مخلوقات سے ممتاز کیا گیا۔ یہاں اسی خالق کی صفت خلاق کی جانب اشارہ ہے کہ اس نے انسان کے حیوانی وجود کو تخلیق کرنے کے بعد تنہا نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کو وہ سب کچھ سکھایا جس کی اسے

ضرورت تھی۔

یہاں پس منظر واضح رہے کہ خدا انسانیت سے اپنے آخری آفیشل پیغام میں پہلی بار مخاطب ہو رہا ہے۔ تو یہ بات بتائی جارہی ہے کہ یہ وحی بھی اسی سکھانے کا عمل ہے۔ یہ وہ پیغام ہے جس کی انسانیت کو ضرورت ہے اور اس کا سیکھنا اور اس کا جاننا بھی دیگر چیزوں کی طرح ضروری ہے۔ سیکھنے کا عمل انسانی عقل سے متعلق ہے۔ اس لیے یہ آیت علم اور عقل کی اہمیت کو بھی بیان کرتی ہے۔ عقل نہ ہو تو انسان پر نہ تو کوئی دنیاوی قانون لاگو ہوتا ہے اور نہ کوئی دینی حکم۔ اسی لیے عقل کا ہونا، اس کا استعمال کرنا اور اس کا درست استعمال کرنا ہی اصل مقصد ہے۔

یہ آیت اللہ کی صفت علیم و حکیم کی جانب اشارہ کررہی ہے۔ قلم بھی درست ہے۔ کیونکہ بالآخر اس کا استعمال بھی علم میں ہے۔ قلم میں سب کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن ذوق محبت نہیں۔

۵۔عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (5)

انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔

اس آیت میں یہ بتادیا کہ انسان کو جو کچھ بھی علم ملا ہے وہ خدا کی جانب سے ملا ہے۔ انسان کو اللہ تعالی نے جو علم دیا ہے وہ اس کی فطرت وجبلت اور وجدان کے ساتھ ساتھ وحی کے ذریعے بھی دیا ہے۔ اسی طرح انسان اپنے تجربات سے بھی بہت کچھ سیکھتا اور اپنا علم اگلی نسل کو منتقل کرتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے علم کو دیکھیں تو کھیتی باڑی کرنا، کھانا پکانا، شکار کرنا، جنسی تعلق قائم کرنا، رہائش تعمیر کرنا ،لباس پہننا، اسلحہ بنانا وغیرہ وہ علوم ہیں جو انسان کو جبلت، فطرت، وجدان اور وحی کے ذریعے ملے ہیں۔ اگر انسان ان سب علوم کو مائنس کردے تو اس کی زندگی غاروں کے دور میں چلی جائے گی۔ یہی حال تمام سائنسی ایجادات کا ہے۔ ان کو بنانے میں خدا کی جانب سے راہنمائی ہر لمحہ پیش پیش رہی ہے۔

تو علم عطا کرنا خدا کی دین ہے اور یہ وہ سارا کا سارا علم ہے جو انسان نہیں جانتا تھا بلکہ اسے مختلف طریقوں سے سکھایا گیا۔ اس آیت میں ایک جانب تو اللہ کی ربوبیت اور خلاقی کی جھلک ہے تو دوسری جانب یہ پیغام بھی دیا جارہا ہے یہ وحی بھی اسی نوعیت کا علم ہے جو ماضی میں خدا انسانوں کی ہدایت کے لیے نشر کرتا رہا ہے۔ دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی اللہ کی جانب سے ہے اس لیے اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ اس علم میں اور دیگر علوم میں کچھ قدر مشترک اور کچھ بات مختلف ہے۔

اس وحی کے علم کی خاص بات یہ ہے کہ یہ براہ راست عالم کے پروردگار نے اپنے الفاظ میں نازل کیا ہے جبکہ دیگر علوم بالواسطہ طور پر انسان کو وجدانی طور پر عطا کیے جاتے ہیں۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ دیگر علوم کے منتقل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نسل اپنے سے

اگلی نسل کو یہ منتقل کرتی ہے جبکہ یہ علم ایک ہی شخص کو عطا کیا جارہا ہے اور یہاں سے اس کا انتقال ہو گا۔ تیسری چیز یہ ہے اس علم کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ باقی علوم کی طرح نہیں ہو گا۔ اگر کسی نے یہ سمجھ لیا کہ یہ خدا کی جانب سے ہے اور اس کے باوجود نہیں مانا تو اس کا انکار خدا کی توہین کے مترادف ہو گا۔ جس کا نقصان بھگتنا پڑے گا۔

یہ آیت خدا کے رحمان ور حیم ہونے کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ اس کی کرم نوازی کہ اس نے انسان کو وہ سب سکھادیا جس کی اسے ضرورت تھی۔

بزرگوں نے قلم اور تحریر کی حرمت اور تعظیم کے بارے میں کہا ہے: قلم اور تحریر میں تین خصوصیات ہیں جو اظہار میں نہیں ہیں۔

سب سے پہلے، الفاظ کی مستقلیت؛ کہا جاتا ہے کہ آقا علی علیہ السلام نے فرمایا: علم کو لکھ کر بند کرو تا کہ وہ باقی رہے اور کفتان (تھیلی) سے باہر نہ جائے۔

دوسری خصوصیت عین مطابق ہونا ہے۔ اگر پچھلی صدیوں میں لکھی جانے والی کتابیں نہ لکھی جاتیں تو وہ اتنی تفصیل سے ہم تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ زبان پر جو الفاظ بہتے ہیں وہ بعض اوقات غور و فکر کی وجہ سے نہیں ہوتے لیکن جو الفاظ لکھے جاتے ہیں وہ لکھنے والے کے گھنٹوں، دنوں اور شاید برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کلام کی مستقل مزاجی، درستگی اور گہرائی میں جو قلم کی کرامت اور کمال سے ظاہر ہو تا ہے،

اگرچہ آج کے دن کو قلم کا دن قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ بات ذہن سے بہت دور معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بھی اس انسانی تخلیق اور نوادرات کی تمام جہات اور تمام صفات کی تشریح کر سکتا ہے، جو منصوبہ بندی اور استدلال کی روح کے معجزے سے۔ اب بہت سے تحریری نمونوں کا بنانے والا اور تخلیق کار بن گیا ہے۔ قلم سے بولنا مشکل ہے اور قلم سے بولنا زیادہ مشکل ہے۔

لکھنا صرف قلم کے مالک کے خیالات کو کاغذ پر قلمبند کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ دراصل ایک ایسا فن ہے جو میٹھے الفاظ کو ابدی زندگی سے ڈھانپتا ہے جو سننے کے خواہشمند اور مستقبل میں سمجھنے اور جاننا چاہتے ہیں۔

تحریک کا عنوان اور ترتیب قلم کا لفظ ہے۔ گو کہ لفظوں کی تار ختم ہو جاتی ہے لیکن قلم اپنے کنٹرول کو معروضی طور پر اسی رکاوٹ کے مقام پر لوٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ معجزہ صرف قلم ہی کر سکتا ہے۔

قلم کی قسم تیرے وجود کا موڑ اس کے وجود سے متاثر ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے برگزیدہ حضرات کے دل و جان پر قلم کے نام سے پڑھنے کا شرف درج کر دیا اور یہ قصہ تا قیامت باقی ہے۔ کیونکہ نہ آپ قلم کے راز جانتے ہیں، نہ میں۔

ایرانی

عقلُ در شَرحَش چو خَر در گِل بِخُفت
شَرحِ عشق و عاشقی هم عشق گفت

پاکستانی

عقلُ در شَرحَش چو خَر در گِل بخُفت
شَرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

شرحش: اس کی شرح۔۔۔ خر: گدھا۔۔۔ در گل بخفت: کیچڑ میں پھنسا۔۔۔۔ شرح عشق: عشق کی شرح

ترجمہ: عشق کی شرح کرتے وقت عقل کا یہ حال ہوا گویا گدھا کیچڑ میں دھنس گیا۔ عشق اور عاشقی کی شرح بھی عشق ہی نے کی۔

یعنی زبان و قلم کے بعد اب عقل کو ہی دیکھ لیں جو بڑی بری عنوی اشکال کو منٹوں میں حل کرنے والی ہے۔ لیکن عشق کی شرح کرنے سے یہ بھی عاجز و درماں ہے۔

کیچڑ میں سونا گدھا" تھکاوٹ کا اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر گدھا چلتے ہوئے کیچڑ میں پھنس جائے تو گدھے کا چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عقل محبت کو سمجھانے سے قاصر ہے اور صرف محبت ہی اپنے بارے میں وضاحت کر سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت داخلی ہے اس لیے جب کسی کے لیے رومانوی حالات پیدا ہوں گے تو وہ حقیقت کو دریافت کرے گا۔ در حقیقت عشق اور معشوق میں فرق

صرف ایک معنی میں ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محبت ایک صفت ہے اور سچی محبت محبت کی صفت کو کریڈٹ دیتی ہے، اس لیے عشق حقیقی وصف ہے اور محبت ایک اضافی صفت ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں کے معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں اور دونوں کا ذکر زیادہ تاکید کے لیے کیا گیا ہے۔ آخری لفظ یہ ہے کہ محبت سے مراد ایک موروثی خوبی ہے اور محبت سے مراد محبت کے اثرات ہیں، لہٰذا محبت کی صفات اور اثرات کو سمجھ کر حاصل کیا جاتا ہے۔

جناب مولانا رومؒ جو مرشد ہیں ان کو سمجھنے کے لئے مرید خاص علامہ اقبالؒ کے بغیر سمجھنا دشوار ہے اس لئے یہاں اقبالؒ کے تصور عقل و عشق سے سمجھتے ہیں۔

اقبال کا تصور عقل و عشق

اقبال کے یہاں عشق اور ان کے مترادفات ولوازمات یعنی وجدان، خود آگہی، باطنی شعور، جذب، جنون، دل، محبت، شوق، آرزو مندی، درد، سوز، جستجو، مستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، تواتر، انہماک سے ملتا ہے۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے تصورات میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے۔ انسانوں میں پیغمبروں کا مرتبہ دوسروں سے اس لیے بلند تر ہے کہ ان کا سینہ محبت کی روشنی سے یکسر معمور اور ان کا دل بادہ عشق سے یکسر سرشار ہے۔ محبت جسے بعض نے فطرتِ انسانی کے لطیف ترین حسی پہلو کا نام دیا ہے۔ اور بعض نے روحِ انسانی پر الہام و وجدان کی بارش یا نورِ معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے متعلق اقبال کیا کہتے ہیں اقبال ہی کی زبان سے سنتے چلیے، یہ ان کی نظم "محبت" سے ماخوذ ہے۔

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی

حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی

ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزاء کو گھولا چشمہ حیوان کے پانی میں

مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

یہ ہے وہ محبت کا جذبہ عشق جو اقبال کے دائرہ فکر و فن کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہی تخلیق کائنات سے لے کر ارتقائے کائنات تک رموزِ فطرت کا آشنا اور کارزارِ حیات میں انسان کا رہنما و کار کُشا ہے۔ بقول اقبال کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔ ورنہ اس سے پہلے، اس کی فضا بے جان اور بے کیف تھی۔

عقل اور عشق

ڈاکٹر عابد حسین اپنے مضمون "عقل و عشق۔۔۔ اقبال کی شاعری میں" میں لکھتے ہیں کہ

"عقل اور عشق کی کشمکش اردو اور فارسی شاعری کا پرانا مضمون ہے عشقیہ شاعری میں عقل، مصلحت اندیشی اور احتیاط کے معانی میں آتا ہے۔ اور عشق اس والہانہ محبت کے معانی میں جو آدابِ مصلحت سے ناآشنا اور وضع احتیاط سے بیگانہ ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

متصوفانہ شاعری میں عقل سے مراد منطقی استدلال ہے جس کے ذریعے ظن ظاہر کا دھندلا تصور قائم ہوتا ہے۔ جبکہ عشق سے مراد جذبِ باطن جس کی بدولت طالبِ تعینات کے پردوں کو ہٹا کر حقیقت کی بلاواسطہ معرفت حاصل کرنا ہے۔ اقبال نے عقل اور عشق کے تصورات صوفی شاعروں سے لے کر ان پر جدید فلسفہ وجدانیت کا رنگ چڑھایا۔ صوفی شعراء "ہمہ اوست" کے قائل ہیں ان کے نزدیک کائنات کا وجود ہمارے حواس ظاہری کا فریب ہے۔ جبکہ جدید فلسفہ وجدانیت کے سب سے ممتاز فلسفی برگساں کے خیال میں انسان کے ذہن کا کام یہ ہے کہ حسی وظیفہ کو حرکتی وظیفہ میں منتقل کر دے اقبال بھی برگساں سے متاثر تھے۔

بقول اقبال

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہر شان کبریا ہوں میں

جواب میں دل کہتا ہے کہ،

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے

تو خدا جو خدا نما ہوں میں

عقل راز کو سمجھ کر اس کا ادراک کرتی ہے۔ جبکہ عشق اسے آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یعنی حقیقت ہستی کا بلاِواسطہ مشاہدہ کرتا ہے۔

عقل زمان و مکان کی پابند جبکہ عشق زمان و مکاں کی حدود سے نکل کر اُس عالم نامحدود میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں حقیقت بے حجاب ہوتی ہے۔ اور یہ معرفت کا مقام ہے۔ عقل کی منزل مقصود ہستی مطلق کی معرفت وہ خدا جو ہے لیکن اس کی جستجو ناتمام ہے عشق خدا نما ہے جو راہ طلب میں عقل کی رہبری کرتا ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک عقل اور عشق میں بنیادی تضاد اتنا زیادہ نہیں بلکہ ابتدائی مراحل پر تو عقل کی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر

تسخیر مقامِ رنگ و بو کر؟

عقل میں بہت سی صفات موجود ہیں البتہ اس میں وہ جوش و خروش، تڑپ، حرکت اور وہ جرات نہیں جو عشق کا شیوہ ہے۔ عقل اگرچہ آستانِ حقیقت سے دور نہیں لیکن اکیلی اس تک پہنچ نہیں سکتی

عقل گو آستاں سے دور نہیں

اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن

یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اقبال کے ہاں عشق سے مراد

اقبال کے ہاں عشق سے مراد ایمان ہے ایمان کا پہلا جُز حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے اور اس پر شدت سے یقین، اس شدت کو صوفیاء کرام نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ عقل ہمیں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا حل سمجھاتی ہے لیکن جو شے عمل پر آمادہ کرتی ہے وہ ہے عشق۔ عشق و ایمان سے زیادہ قوی کوئی جذبہ نہیں، اس کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بقول مولانا روم،

"عقل جُزئی قبر سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔۔۔۔ قبر سے آگے عشق کا قدم اُٹھتا ہے اور عشق ایک جست میں زمان و مکان والی کائنات سے آگے نکل جاتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقبال کے نزدیک عقل و علم کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ اس کی بنیاد شک پر قائم ہے۔ اس وجہ سے عقل و علم میں وہ خواص موجود نہیں جو تربیت خودی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے مقابلے میں عشق بے خوفی، جرات اور یقین و ایمان پیدا کرتی ہے۔ اس لیے وہ خدا سے صاحبِ جنوں ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں

مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عقل پر اقبال کا اعتراض

ڈاکٹر سید عبداللہ "عقل و خودی" کے عنوان سے "طیف اقبال" میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

"اقبال کے خیال میں عقل ایک ناتمام چیز ہے یعنی عقل حقیقت کی کلیت کا ادراک نہیں کر سکتی۔۔۔۔ عقل جو حواس پر مبنی ہے حقیقت تک پہنچنے کے لئے یقینی راستہ نہیں ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کے خلاف اقبال کا اعتراض ہے کہ عقل میں گرمی، جذب، سرور و جنوں نہیں۔ خودی کی تقویت کے لیے جس سرگرمی جذب و سرور کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقل اس سے محروم ہے۔ خودی کی تسخیر کے لیے آگے بڑھنے کی جدوجہد کے لیے یقین کی ضرورت ہے مگر وہ یقین عقل کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ عقل کی باتیں یقینی نہیں ہوتیں۔ عقل کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ شک میں گرفتار رہتی ہے اس لیے خودی میں وہ حرکت اس سے پیدا نہیں ہوتی جو عشق یعنی یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ بحر کیف عقل ایسی چیز نہیں جس سے نفرت ہو، اقبال نے عملی اور جزوی امور میں اس کی مخالفت نہیں کی انہوں نے عقل سے اختلاف اس لیے کیا ہے کہ کلی امور میں یہ فوراًا نکار کر دیتی ہے۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

عشق اور خودی

اقبال کے تصورِ خودی کو ان کے تصورِ عشق سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تربیت خودی کے لیے سب سے بڑا وسیلہ اقبال کے نزدیک عشق ہے جس کے بغیر خودی نہ ترقی کر سکتی ہے اور نہ پختہ ہو سکتی ہے۔ صوفیوں کے نزدیک نصب العین تک پہنچنے کے لیے خودی کو مٹانا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک عشق کے کمال کی علامت یہ ہے کہ مادی وجود کو خود مٹایا جائے اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت ضروری ہے نہ کہ مٹا دینا۔ اقبال نے بار بار کہا ہے کہ خودی عشق سے استوار ہوتی ہے۔ اور یہ عشق نہ تو وہ صوفیانہ عشق ہے جو خود کو فنا کر کے کمال حاصل کرتا ہے اور نہ وہ مجازی عشق جو معمولی آرزوں کے لیے تڑپتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

مرد خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ

عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفی

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی تقویم میں، عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

ڈاکٹر سید عبد اللہ "طیف اقبال" میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے نزدیک عشق اور خودی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ عشق پالینے مسخر کرنے کی صلاحیت اور آرزو رکھتا ہے اور خودی کا خاصہ بھی یہی ہے کہ وہ غیر خودی کو مسخر کرنے یا پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عشق کا خاصہ ہے۔۔۔۔ کہ اس کا یقین اٹل اور محکم ہوتا ہے اور خودی بھی یقین محکم کے پہیوں پر چلتی ہے۔ عشق پریشانیوں، رنگارنگیوں اور بد نظمی میں ترتیبِ حیات کرتا ہے۔ خودی کا بھی یہ وصف ہے کہ تنظیم حیات کرتی ہے۔

"

الغرض اقبال کے نزدیک خودی نہ صرف عشق سے استوار ہوئی ہے بلکہ عشق خودی کا دوسرا نام ہے مولانا عبد السلام ندوی "اقبالِ کامل" میں لکھتے ہیں کہ

،

"ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عقل و عشق دونوں خودی کا جزو ترکیبی ہیں۔"

عشق کو عقل پر ترجیح دینے کے اسباب

اقبال اگرچہ عقل کے مقابلے میں عشق کی برتری کے قائل ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عقل کے مخالف ہیں بلکہ وہ ایک حد تک اس کی اہمیت کے قائل ہیں تاہم یہ درست ہے کہ اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک عشق سے ہی حقائق اشیا کا مکمل علم بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں زندگی کی ساری رونق عشق سے ہے علم و عقل انسان

کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن عشق کی مدد کے بغیر منزل کو طے نہیں کر سکتے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اگر چہ عام طور پر عقل سے رہنمائی کا کام لیا جاتا ہے لیکن عشق عقل سے زیادہ صاحبِ ادراک ہے

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

اقبال کو اپنے ہم مشربوں سے شکایت ہے کہ وہ اس جنوں سے محروم ہیں، جو عقل کو کارسازی کی راہ ورسم سکھا سکے۔

ترے دشت ودر میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو راہ ورسم کارسازی

بغیر نورِ عشق کے علم وعقل کی مدد سے دین وتمدن کی جو توجیہ کی جائے گی۔ وہ حقیقت پر کبھی بھی حاوی نہیں ہو سکتی۔ عقل تصورات کا بت کدہ بنا سکتی ہے۔ لیکن زندگی کی صحیح رہبری نہیں کر سکتی۔

عقل ودل ونگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع ودیں بُت کدہ تصورات

اقبال کے نزدیک عقل کی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرات رندانہ کی کمی ہے۔ جب تک عشق اس کی پشت پناہ نہ ہو آگے نہیں بڑھتی ۔ عقل اسباب کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اصل حقیقت سے دور رہتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اقبال سراسر عقل کا مخالف نہیں۔ چنانچہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہ تمام امور جن سے قوموں کی زندگی بدل گئ کسی نہ کسی جذبہ کے تحت انجام پاتے ہیں اسی خیال کو اقبال اس طرح ادا کرتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی اس کو عشق اپنی کرامات سے بے سوزن اور بغیر تارِ رفو سی سکتا ہے۔

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں

عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

عقل کی عیاری اور عشق کی سادگی اور اخلاص کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

عشق بے چارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

روحانی ترقی، جسے اقبال حیاتِ انسانی کا اصل مقصود گردانتے ہیں۔ عشق کی رہبری کی محتاج ہے اور اس میں اقبال عقل و علم کو بے دست و پا خیال کرتے ہیں، خود انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

کبھی کبھی پاسبانِ عقل کی موجودگی انسان کو تنگ کرنے لگتی ہے خاص طور پر جب وہ تنقید ہی کو مطمع نظر بنالے ایسے موقعوں پر اقبال اعمال کی بنیاد عقل کے بجائے عشق پر رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں

عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

کبھی کبھی اقبال کے ضمیر میں معرکہ ہونے لگتا ہے۔ اور انہیں احساس ہوتا ہے کہ عشق ہی حق ہے اور عقل اس کے مقابلے میں وہی درجہ رکھتی ہے جو رسولِ پاک کے مقابلے میں ابو لہب کا تھا۔

تازہ میرے ضمیر پر معرکہ کہن ہوا

عشق تمام مصطفی، عقل تمام بولہب

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عقل سے کسی قسم کی رہنمائی کی توقع رکھنا بے جا ہی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال عشق کو عقل سے برتر وبلند قرار دیتے ہیں۔ اگر اقبال کے تصور عشق کے بارے میں ایک فقرے میں بات کی جائے تو حضرت علامہ کے شعر کے صرف ایک مصرعے میں ہی بات مکمل کی جاسکتی ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

یہی وجہ ہے کہ اقبال عقل کے بجائے عشق سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں جس کی ایک جست سے سارا قصہ تمام ہو جاتا ہے جس فاصلے کو انسان بیکراں سمجھتا ہے، عشق ایک چھلانگ میں اُسے عبور کرا دیتی ہے۔

ان تفصیلات سے اقبال کے تصور عشق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اگرچہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں، تاہم عقل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ درج بالا تفصیلات سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کا تصور عشق اردو فارسی کے دوسرے شعراسے کتنا مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق، محض اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی ہوس باختہ ازخود رفتگی، فنا آمادگی، یا محدود کو لامحدود میں گم کر دینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوتِ حیات کا، جذبہ عمل سے سرشاری کا۔

ایرانی

آفتاب آمد دَلیلِ آفتاب

گر دَلیلَت باید ازوِیُ رومَتاب

پاکستانی

آفتاب آمد دَلیلِ آفتاب

گر دَلیلَت باید از وِیُ رو مَتاب

آفتاب: سورج۔۔۔ آمد: آنا۔۔۔ دلیل آفتاب: سورج کی دلیل ہے۔۔۔ گر دلیلت: اگر اس کی دلیل چاہیے۔۔۔ رو متاب: اپنا رخ اسے سے مت ہٹا۔

اس میں آفتاب استعارہ ہے ذات حق کا

ترجمہ: آفتاب کی دلیل خود سورج ہی ہے۔ اگر تجھ کو اس کی دلیل چاہیئے تو س کی طرف سے رخ نہ پھیر یعنی عشق کے بیان سے زبان و قلم اور عقل تینوں عاجز ہیں مگر جو شخص مبتلائے عشق ہو جات ہے خود عشق کے ذریعے سے اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دیگر واسطے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یہ شعر پچھلے موضوع کے لیے ایک مثال ہے اور کسی نہ کسی طرح اسی موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی جس طرح سورج کو دیکھنے کا ذریعہ خود سورج ہے اور اس کے لیے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح محبت اپنی سچائی کا اظہار کرتی ہے اور اسے الفاظ یا تحریر سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تمثیل کا نتیجہ وہی ہے جو کہا گیا تھا؛ لیکن اس تمثیل کی وجہ کی وضاحت یہ ہے کہ ایک فکری قاعدہ اور اصول کے مطابق اگر کسی چیز کو کسی اور چیز کے جاننے کے لیے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اصول کو ماتحتی سے زیادہ واضح ہونا چاہیے، اور بلاشبہ ایک فکری تصور کبھی نہیں ہوتا۔ حسی تصور سے زیادہ واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا محبت (کیونکہ یہ ضمیر کا معاملہ ہے اور ضمیر باطنی احساس کی اقسام میں سے ایک قسم ہے) حسیات میں سے ہے، لیکن جب محبت کی تعریف اور وضاحت کی جائے تو یہ ایک عقلی موضوع ہے، اس لیے، یہ وضاحت اسے سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے اس کا ادراک غیر ثالث ہونا چاہیے، اس بنیاد پر کہ محبت کو خود اپنے ادراک کا ثالث ہونا چاہیے، جس طرح سورج کی گرمی کے احساس کے لیے ایک خارجی احساس اور عقلی تعریف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تفصیل اس کے مکمل علم اور سمجھ کے لیے کافی نہیں ہے، اور جب ہم اسے براہ راست محسوس کرتے ہیں تو یہ پوری طرح سمجھ میں آتا ہے۔

جناب رومیؒ اس معاملے کو خود سورج سے تعبیر کرتے ہیں جو اس کے جوہر کو سمجھنے کے لیے بہترین اشارہ ہے اور اگر آپ سورج کو جاننے کے ذرائع جاننا چاہتے ہیں تو صرف سورج کو دیکھیں اور اس وجہ سے منہ نہ پھیریں اور نہ دیکھیں۔ کسی اور ثالث کے لیے۔

جِس کے لئے زمین دلیل، آسماں دلیل

جس کے لئے ہوئے ہیں یہ کون و مکاں دلیل

جس کے لئے ہیں بحر کی گہرائیاں دلیل

جس کے لئے پہاڑوں کی اونچائیاں دلیل

صحرا میں جس کے فیض کی زرخیزیاں دلیل

گل پوش پیڑ اور حسیں وادیاں دلیل

جس کی گواہ بحر کی سب بے کرانیاں

چشموں سے پھوٹتا ہوُا آبِ رواں دلیل

کافی نہیں ہے تب بھی نسیمِ سحرؔ، اگر

دُہرائے لاکھوں مرتبہ میری زباں دلیل

لیکن تلاش کیوں کروں کوئی دلیل مَیں؟

اُس ذاتِ پاک کو ہے ضرورت کہاں دلیل

مشاہدۂ نور

خدا تعالیٰ نور کی مانند ہے، اور اس نے ظاہری شکل اور تمام مخلوقات کو وجود بخشا، انسان اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک تخلیق ہے اور اس خالق کا ظہور دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا ظہور کہاں اور کب اور کیسے ممکن ہے؟ جب وہ ظہور کے بارے میں بھول جاتا ہے، تو اسے کرن سے جڑنا چاہیے اور روشنی کے منبع کی طرف لوٹنا چاہیے۔ سورج کی طرف واپس جائیں، اور سورج کے جوہر میں جائیں۔ وہاں مزید کوئی رداس نہیں ہے۔ سورج سورج ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سورج کے جوہر کو سورج کے علاوہ کوئی اور نہیں جان سکتا۔

ہم سورج کی کتنی ہی تعریف وتوصیف کریں، اس کی سچائی بتانے کے قابل کہاں ہیں؟ ہم سورج کو کہاں دیکھیں گے؟ ہم سورج کی حرارت کو کہاں سے محسوس کرتے ہیں؟ ہم سورج کی عظمت اور سورج کی سانس اور اس کے معیار اور مقدار کے بارے میں معلومات کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں؟ ہم سورج سے لاکھوں، کروڑوں میل دور ہیں جو عام طور پر گرمی ہم تک پہنچتی ہے۔ جب ہم سورج کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک سیاہ شیشے سے اس کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے تاکہ ہم اس کی ڈسک کو سیاہ اور سیاہ پردے کے پیچھے سے ہی دیکھ سکیں۔

سورج کے بارے میں ہمارا علم اتنا ہے۔ کون ہے جو سورج کو ڈھونڈے اور صوفی بن کر اسے پہچانے؟ جو یہاں سے اٹھ کر سورج کے اندر پگھل کر غائب ہو جاتا ہے اور اس کے وجود کے ذرے ذرے میں سے کوئی غبار باقی نہیں رہتا، اس نے سورج کو پہچان لیا ہے۔ افسوس کہ وہاں "وہ" نہیں ملتا اور سورج کی فطرت میں لفظ "وہ" کی کوئی جگہ نہیں۔

چنانچہ اس کا اشعارہ اس قول کی طرف ہے:

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عرفت ربی بربی ولولا فضل ربی ما عرفت ربی، وفی قولہ تعالی: ووجدك ضالا فهدی، اشارة الی هذا المعنی ای کنت ضالا عنی فی تیه وجودك، وطلبتك لوجودی، ووجدتك بفضلی، وهدیتك بجذبات عنایتی، ونور هدایتی الی، وجعلتك نورا، وانزلت الیك نورا، فاهدی لك من نشآء من عبادی، ممن تبعك، وطلب رضاك، نورت فیهم من ظلمات وجوده البشری الی نور الروحانی ویهدیهم الی صراط مستقیم "*

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعہ پہچانا اگر مجھ پر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہ پہچان پاتا، اللہ تعالی کے فرمان: ووجدک ضالا فھدی، میں اسی معنی کی جانب اشارہ ہے، یعنی پیارے محبوب! آپ اپنے وجود کے میدان میں میرے لئے وارفتہ وبے خود تھے، میں نے آپ کو میرے وجود کی طلب میں بے خود پایا، اپنے فضل تلاش میں پایا تو میں نے آپ کو اپنی عنایت کے جذبات اور اپنی ھدایت کے نور کی رہنمائی فرمائی اور آپ کو نور بنادیا، آپ کی طرف نور اتارا، تو آپ کی وجہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہونگا ھدایت دونگا ان کو جو آپ کی پیروی کرے اور آپ کی خوشنودی چاہے انہیں وجود بشری کی تاریکیوں سے نکال کر نور روحانی سے منور کرونگا اور انہیں صراط مستقیم پر چلاؤنگا"

تفسیر فاتحۃ الکتاب واسرار بسم اللہ الرحمن الرحیم لشیخ ابن العربی، ص ۱۵۱، ۱۵۲ مطبوعۃ دار الکتب العلمیۃ

مزید ارشاد فرمایا

انعم اللہ علیھم من النبین انعم اللہ علی اسرھم بأنوار العنایۃ،وعلی ارواحھم بأسرار الھدایۃ،وعلی قلوبھم بآثار الولایۃ،وعلی نفوسھم فی قمع الھوی،وفھم الطبع،وحفظ الشرع بالتوفیق والرعایۃ*"

ایضاص ۱۵۳

اللہ تعالی نے انبیائے کرام پر انعام فرمایا ان کے باطن پر عنایت کے انوار سے، ان کی ارواح پر ھدایت کے اسرار سے، ان کے قلوب پر ولایت کے آثار سے، ان کے نفوس پر خواہشات کے قلع قمع میں فہم طبع و حفظ شرع میں توفیق ورعایت کے ذریعہ "

تو سورج کو سورج سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ تو مولانا رومؒ نے معرفت کے سمندر کی غوطہ زنی کی ہے۔ سبحان اللہ!

ایرانی

از وِیُ اَرُ سایہ نشانی می دَھَد

شَمسُ ھر دَمُ نورِ جانی می دَھَد

پاکستانی

از وَے اَرُ سایہ نشانے میدہَد

شَمسُ ہر دَمُ نورِ جانے میدہَد

ارسایہ: اگر سایہ۔۔۔ نشانے میدہد: نشان دیتا ہے۔۔۔ شمس: سورج۔۔۔ ہر دم: ہر وقت۔۔۔ نور جانے: جان کا نور

اس شعر میں شمس استعارہ ہے باری تعالیٰ کا

ترجمہ: اس آسمان کے سورج سے اگر سایہ نشان دیتا ہے تو آفتاب حق ہر وقت جان کا نور عطا فرماتا ہے۔ یعنی جس طرح یہ سورج کے ظاہری ادراک سے نشان منزل ملتی ہے تو جو آفتاب حقیقی کے ظہور کامل کا کیا حال ہو گا؟

شمس کا لفظی اور استعاراتی معنی "ذات حق" ہے جیسا کہ مذکورہ شعر میں بیان ہوا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (نور: ۳۵)

"خدا آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے والا ہے (وہ وہ ہے جس نے دنیا کو چمکتے ہوئے ستاروں کی جسمانی روشنی سے، اور وحی، ہدایت، اور شاندار علم کی روحانی روشنی سے، اور ثبوتوں اور کاموں کے ساتھ روشن کیا ہے۔ مخلوق میں پایا جاتا ہے)۔ خدا کا نور اس چراغ کی مانند ہے جس میں ایک چراغ ہے اور وہ چراغ ایک فانوس میں رکھا گیا ہے، فانوس ایک جلتے ہوئے ستارے کی طرح ہے اور یہ چراغ (تیل سے) روشن ہے (جو) زیتون کے مبارک درخت سے حاصل کیا گیا ہے۔، نہ یہ مشرقی ہے اور نہ مغربی (بلکہ یہ ایک کھلی اور اونچی زمین میں ایک درخت ہے جہاں ہر طرف سے سورج اس پر چمکتا ہے)۔ "تیل کی طرح صاف اور پاکیزہ ہے"

نور اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں: ''آیت کے اس حصے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا ہادی ہے تو زمین و آسمان والے اس کے نور سے حق کی راہ پاتے ہیں اور اس کی ہدایت سے گمراہی کی حیرت سے نجات حاصل کرتے ہیں۔'' بعض مفسرین نے فرمایا: ''اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو منور فرمانے والا ہے اور اُس نے آسمانوں کو فرشتوں سے اور زمین کو انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے منور کیا۔'' (خازن، النور، تحت الآیۃ: ۳۵، ۳/ ۳۵۳)

{مَثَلُ نُوْرِهٖ: اس کے نور کی مثال۔} بعض مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے نور سے مؤمن کے دل کی وہ نورانیت مراد ہے جس سے وہ ہدایت پاتا اور راہ یاب ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس نور

کی مثال ہے جو اس نے مؤمن کو عطا فرمایا۔ بعض مفسرین نے اس نور سے قرآن مراد لیا اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس نور سے مراد سیّدِ کائنات، افضلِ موجودات، رحمتِ عالَم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہیں۔

نور کی مثال کے مختلف معانی

اہلِ علم نے اس آیت میں بیان کی گئی مثال کے کئی معنی بیان فرمائے ہیں، ان میں سے دو معنی درج ذیل ہیں،

(1)...نور سے مراد ہدایت ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالٰی کی ہدایت انتہائی ظہور میں ہے کہ عالَمِ محسوسات میں اس کی تشبیہ ایسے روشن دان سے ہو سکتی ہے جس میں صاف شفاف فانوس ہو، اس فانوس میں ایسا چراغ ہو جو نہایت ہی بہتر اور پاک صاف زیتون سے روشن ہو تاکہ اس کی روشنی نہایت اعلٰی اور صاف ہو۔

(2)...یہ سید المرسلین، محمدِ مصطفٰی صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے نور کی مثال ہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے حضرت کعب احبار رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ سے فرمایا کہ اس آیت کے معنی بیان کرو۔ انہوں نے فرمایا: ’’ اللہ تعالٰی نے اپنے نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی مثال بیان فرمائی۔ روشندان (یعنی طاق) تو حضورِ اقدس صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا سینہ شریف ہے اور فانوس، قلبِ مبارک اور چراغ، نبوت ہے جو کہ شجرِ نبوت سے روشن ہے اور اس نورِ محمدی کی روشنی کمالِ ظہور میں اس مرتبہ پر ہے کہ اگر آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اپنے نبی ہونے کا بیان بھی نہ فرمائیں جب بھی خَلْق پر ظاہر ہو جائے۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے کہ روشندان تو دو عالَم کے سردار صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا سینہ مبارک ہے اور فانوس قلبِ اَطہر اور چراغ وہ نور جو اللہ تعالٰی نے اس میں رکھا کہ شرقی ہے نہ غربی نہ یہودی، نہ نصرانی، ایک شجرۂ مبارکہ سے روشن ہے، وہ شجرہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ہیں۔ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے دل کے نور پر نورِ محمدی، نور پر نور ہے۔

حضرت محمد بن کعب قرظی رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ روشن دان اور فانوس تو حضرت اسمٰعیل عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ہیں اور چراغ حضورِ اقدس صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور شجرۂ مبارکہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کہ

اکثر انبیاء عَلَیۡہِمُ الصَّلٰوۃُوَالسَّلَام آپ کی نسل سے ہیں اور شرقی وغربی نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ابراہیم عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نہ یہودی تھے نہ عیسائی، کیونکہ یہودی مغرب کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور عیسائی مشرق کی طرف۔ قریب ہے کہ محمدِ مصطفٰی صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے محاسن وکمالات نزولِ وحی سے پہلے ہی مخلوق پر ظاہر ہو جائیں۔ نور پر نور یہ کہ نبی کی نسل سے نبی ہیں اور نورِ محمدی نورِ ابراہیمی پر ہے۔(خازن، النور، تحت الآیۃ: ۳۵، ۳/۳۵۴) اس مثال کی تشریح میں ان کے علاوہ اور بھی بہت اَقوال ہیں۔

اعلٰی حضرت امام احمد رضا خاں عَلَیۡہِ رَحۡمَۃُالرَّحۡمٰن نے اس آیت کا خلاصہ ایک شعر میں سمو دیا، چنانچہ فرماتے ہیں،

شمع دل مشکوٰۃ تن سینہ زجاجہ نور کا

تیری صورت کے لئے آیا ہے سورہ نور کا

{مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيۡتُوۡنَةٍ: برکت والے درخت زیتون سے۔} زیتون کا درخت انتہائی برکت والا ہے کیونکہ اس میں بہت سارے فوائد ہیں، جیسے اس کا روغن جس کو زَیت کہتے ہیں انتہائی صاف اور پاکیزہ روشنی دیتا ہے۔ سر میں بھی لگایا جاتا ہے اور سالن کی جگہ روٹی سے بھی کھایا جاتا ہے۔ دنیا کے اور کسی تیل میں یہ وصف نہیں۔ زیتون کے درخت کے پتے نہیں گرتے۔ یہ درخت نہ سرد ملک میں واقع ہے نہ گرم ملک میں بلکہ ان کے درمیان ملک شام ہے کہ نہ اُسے گرمی سے نقصان پہنچے نہ سردی سے اور وہ نہایت عمدہ واعلٰی ہے اور اس کے پھل انتہائی مُعتَدِل ہیں۔(خازن، النور، تحت الآیۃ: ۳۵، ۳/ ۳۵۳-۳۵۴، ملخصاً)

زیتون سے متعلق حضرت ابو اسید رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنۡہُ سے روایت ہے، رسولِ کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ’’زیتون کھاؤ اور اس کا تیل استعمال کرو یہ مبارک درخت ہے۔‘‘(ترمذی، کتاب الاطعمۃ، باب ماجاء فی اکل الزیت، ۳/۳۳۷، الحدیث: ۱۸۵۹)

تو گویا یہ آگ کے بغیر جل رہا ہے۔ ایک روشنی کے اوپر ایک روشنی ہے!(لالٹین کی روشنی، بلبل کی روشنی اور زیتون کی روشنی نے ہر جگہ روشن کر دیا ہے، اسی طرح وحی کی قانون سازی، ہدایت کی تشکیلاتی روشنی اور علم کی عقلی روشنی نے اندھیرا دور کر دیا ہے۔ آنکھوں کے سامنے سے شکوک وشبہات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور خدائے بزرگ وبرتر کا حسن دروازے اور دیوار پر ظاہر ہوتا ہے، بے شک دیکھنے والی آنکھ اور باشعور دل دیکھ اور جان سکتے ہیں)۔ خدا جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے (اور

حکمت کے نور کی شمع کو خدا کے نور کے چراغ کی طرف لاتا ہے اور اسے پوری طرح جلا دیتا ہے)۔ خدا لوگوں کو تمثیلات سے روشنی دیتا ہے (جس چیز کو معقول شکل میں ظاہر کرنے کے لئے اور اسے حکمت کے دائرے سے دور لے جانے کے لئے - جہاں تک ممکن ہو وحی کی مدد سے اور علم کی روشنی میں) اور خدا اس سے باخبر ہے۔ سب کچھ (اور جانتا ہے کہ مخلوق کو خدا سے کیسے متعارف کرایا)"۔

پچھلے فقروں میں بتایا گیا تھا کہ محبت سورج کی مانند ہے جسے براہِ راست سمجھا جا سکتا ہے لیکن قاری کا ذہن حقیقی سورج (ذات حق) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

یہاں جناب رومیؒ نے ظاہر اور حقیقی سورج کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ یہ ظاہر سورج چمک اور دمک کے معیار سے متصف ہے اور اسے سمجھنے کے لیے کسی پہچان کی ضرورت نہیں ہے اور وہ براہ راست نظر آتا ہے، لیکن اس روشن سورج اور ظاہر سورج کا موازنہ کیا گیا ہے۔ حقیقی سورج اور سورج کی طرف۔ الشموس کو ایک باطل اور نامکمل حق سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ سورج کی ظاہری شکل ایک چھوٹی سی خامی سے ڈھکی ہوئی ہے جسے سایہ کہتے ہیں، جو اس کی روشنی کو چھپاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ اس طرح کہ ایک ضد دوسرے مخالف کے علم کا سبب بن جائے جیسا کہ معلوم ہے: "مخالف کی تعریف" کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں کو ان کے مخالف سے جانا جاتا ہے۔

عربی میں ایک کہاوت ہے کے چیزیں اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اضداد ضد کی جمع ہے۔ ضد یعنی الٹ کسی چیز کی پہچان اس کے الٹ سے کی جاتی ہے۔ جیسے اندھیرا روشنی کے نا ہونے کا نام ہے، گرمی سردی کی غیر موجودگی کا نام ہے ایک کو جانے بغیر دوسرے کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

آپ وہ ہیں جو دوسرے نہیں ہیں

آپ وہ ہیں جو آپ کی نیچر ہے آپ کی اچھی عادتیں آپ کی بری عادتیں آپ کی کمزوریاں آپ کی طاقت یا آپ کے خوف آپ کا اعتماد آپ کا برتاؤ آپ کا اخلاق آپ کا طرز زندگی حتیٰ کہ آپ کا ماضی بھی یہ سب آپ کی شخصیت کو بناتے ہیں یا بگاڑتے ہیں خود کو سمجھنے کے لئے آپ کو ان سب کو سمجھنا ہو گا۔

ظاہر ہے کہ اگر گرمی نہ ہوتی تو سردی کا معیار متعین نہ ہوتا، اور اس کے برعکس سورج کے ساتھ سائے کا معیار سمجھا جاتا ہے، اور سائے کی مدد سے سورج کا معیار معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے سورج کے بارے میں میرے علم میں مجموعی طور پر سایہ شامل ہے، اور سایہ کے بغیر ظاہری سورج کو سمجھنا مشکل ہے، بالکل صحیح سورج کے برعکس ہے، جو اس خوبی میں کامل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے۔ حقیقی سورج ہمیشہ زندگی کو روشنی دیتا ہے اور صوفیاء کی روحوں میں مسلسل روشنی ڈالتا ہے۔

مختصر یہ کہ چونکہ ظاہر سورج کبھی غائب ہوتا ہے اور اس سے سایہ پیدا ہوتا ہے اور سورج اور سایہ ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں اس لیے اس میں صفت "ثبوت فطرت" نامکمل ہے، لیکن حقیقی سورج کبھی غائب نہیں ہوتا۔ اور مسلسل چمک رہا ہے، اس کے لیے کوئی ایسی ضد نہیں ہے جو اسے مزید جاننے کا باعث بنتی ہے، اسی لیے وہ "فطرت سے ثبوت" کی صفت میں کامل ہے۔

واضح رہے کہ اگرچہ حقیقی سورج (ذات حق) کا ظہور مکمل اور دائمی ہے لیکن ہر شخص کے لیے اس کا ادراک ممکن نہیں ہے اور علم کا واحد امکان صوفیائے حق کے لیے ہے جس کی تشریح جناب رومیؒ نے کی ہے۔ روح کی روشنی.

یقیناً صوفیاء اپنے صوفیانہ ذوق اور صوفیانہ ادراک کے ساتھ حقیقت کے جوہر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انہیں کسی ممکنہ ثالث کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں: "**عرفت ربی بربی ولولا فضل ربی ما عرفت ربی**" ان پر لاگو ہوتا ہے۔ اس باطنی اور روحانی ادراک کو "مشاہدہ" کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا تصریحات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وقار کا اعلیٰ حق کبھی غائب یا پوشیدہ نہیں ہوتا کیونکہ کوئی چیز اس کے ظاہر ہونے کا سبب نہیں بن سکتی۔ دوسرے لفظوں میں، سچائی کا جوہر ظہور اور چمک کی انتہا ہے، اور اس کا کوئی مخالف نہیں کہ خدا کی سمجھ کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

ایرانی

سایہ خواب آرَد تورا هَمچون سَمَر
چون بَر آید شَمسُ اِنشَقَّ القَمَر

پاکستانی

سایہ خواب آرَد تورا ہَمچوں سَمَر
چون بَر آید شَمسُ اِنشَقَّ القُمَر

خواب آرد: نیند لاتا ہے۔۔۔ سمر: افسانہ گوئی۔۔۔ چوں: جیسے کہ۔۔۔ انشق القمر: چاند شق ہو گیا۔

ظاہری سورج کا سایہ تو نیند یعنی غفلت لاتا ہے۔ جیسے کہانی سنتے سنتے نیند آجاتی ہے اور وہ آفتاب حق جب نکلتا ہے تو ممکنات کا چاند ماند پڑ جاتا ہے۔

یہاں بھی آفتاب ظاہری کے نقص اور آفتاب حقیقی کے کمال کا بیان مقصود ہے۔ آفتاب ظاہری تو غروب ہونے کے بعد ایک عالمگیر تاریکی چھوڑ جاتا ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ نیند آنے لگتی ہے مگر آفتاب حق کبھی غروب نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت نور افشانی کرتا رہتا ہے۔ اس کے چکا چوند سے ممکنات ماند ہیں۔

اس شعر جناب میں رومیؒ نے ظاہر سورج کے اثرات اور حقیقی سورج کے اثرات کے درمیان فرق بیان کیا ہے اور پچھلے سائے کی تاکید اور تصدیق سے بھی مراد وہی سایہ ہے جو سورج کے مقابل رکھا گیا ہے اور حقیقت میں اس کے مخالف ہے۔ سورج، اور اس کے ذکر کی وجہ ظاہر سورج کے درمیان فرق کو بیان کرنا ہے، شمس کے نزدیک یہ حقیقی ہے۔

سورج کی حقیقی روشنی بھی سچائی کا جوہر ہے جو صوفیاء کے دلوں میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ وجود کے "چاند" سے کیا مراد ہے وجود کا امکان۔ چاند اور ممکنہ وجود کے درمیان مطابقت کا پہلو یہ ہے کہ چاند کی روشنی سورج سے ہوتی ہے جیسا کہ مشہور ہے: "چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے مستفید ہے" (چاند سورج سے اپنی روشنی لیتا ہے))۔

بالکل اسی طرح ممکنہ وجود جس کا سہرا سچے سورج سے ملتا ہے۔ توحیدی عقائد کے مطابق، اگر خدا ممکنہ وجود کو وجود عطا نہ کرے، تو اس کا دونوں حالتوں میں وجود اور باقی رہنا ممکن ہے۔

مختصر یہ کہ اصلی سورج اور ظاہری سورج ایک دوسرے کے مقابلے اور برابر نہیں ہیں۔ ظاہر سورج غائب ہو تو پھر زمین پر سایہ پڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے نیند اور غفلت کا سایہ نظر آتا ہے، جیسے رات کا قصہ آنکھوں میں نیند لاتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج کی غیر موجودگی میں اندھیرا نمودار ہوتا ہے اور قدرتی طور پر عام لوگوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے جب ظاہر

سورج غائب ہو جاتا ہے تو نیند اور غفلت اس کے پیچھے چلی جاتی ہے، جبکہ حقیقی سورج کبھی غائب نہیں ہوا اور ہمیشہ چمکتا ہے اور اس کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی ممکنہ وجود کے زوال اور استعمال کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا، ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب تک حقیقی سورج کا ظہور نہیں ہو گا، اس وقت تک ممکنہ وجود کا زوال واقع نہیں ہو گا، اور جب حقیقی سورج کی تفہیم اور نشو و نما تصوف کی روشنی سے ہو جائے گی، یہی ہے وہ وقت جب ممکنہ وجود (چاند) فنا ہو جائے گا، ارشاد فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ‌ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا‌ ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَيۡهِ دَلِيۡلًا (45) ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَيۡنَا قَبۡضًا يَّسِيۡرًا (46) (الفرقان)

اے حبیب! کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ اس نے سائے کو کیسا دراز کیا؟ اور اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا بنا دیتا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف سمیٹ لیا۔

اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، کیا آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو نہ دیکھا کہ اس کی صَنعت و قدرت کیسی عجیب ہے، اس نے سائے کو صبح صادق طلوع ہونے کے بعد سے لے کر سورج طلوع ہونے تک کیسا دراز کیا کہ اس وقت ساری روئے زمین میں سایہ ہی سایہ ہوتا ہے نہ دھوپ ہے، نہ اندھیرا ہے، اور اگر اللہ تعالٰی چاہتا تو سائے کو ایک ہی حالت پر ٹھہرا ہوا بنا دیتا کہ سورج طلوع ہونے سے بھی سایہ زائل نہ ہوتا۔ پھر ہم نے سورج کو سائے پر دلیل بنایا کیونکہ اگر سورج نہ ہو تو سائے کا پتہ ہی نہ چلے۔ پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف سمیٹ لیا کہ طلوع کے بعد سورج جتنا اُونچا ہوتا گیا اتنا ہی سایہ سمٹتا گیا۔ (مدارک، الفرقان، تحت الآیۃ: ۴۵-۴۶، ص ۸۰۴-۸۰۵)

اَشیاء کی طبعی تاثیریں بھی اللہ تعالٰی کی مَشِیَّت کے تابع ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء کی طبعی تاثیریں بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں، آگ کا جلانا، پانی کا پیاس بجھانا، ثقیل بدن کا سایہ بننا، سورج کا سایہ اٹھادینا سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، اگر اللہ عَزَّوَجَلَّ چاہے تو یہ تاثیریں ختم ہو جائیں۔ یہ سب مادی سورج کے اثرات ہیں لیکن حقیقی سورج سدا بہار ہے۔

اس شعر میں اپنے شیخ جناب شمس تبریزیؒ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ان کی کرم نوازی اتنی ہے کہ قائم رہتی ہے۔

شمس تبریزی یا شمس الدین محمد (1185ء–1248ء) ایران کے مشہور صوفی اور مولانا رومؒ کے روحانی استاد تھے۔ روایت ہے کہ شمس تبریزی نے مولانا روم کو قونیہ میں چالیس دن خلوت میں تعلیم دی اور دمشق روانہ ہوگئے۔ ابھی حال ہی میں ان کے مقبرے کو یونیسکو نے عالمی ثقافتی ورثہ کے لیے نامزد کیا ہے۔

حضرت شاہ شمس تبریزؒ کون

وقت کے بہتے دریا میں تین شمس الدین ابھرتے ہیں جو تبریزی کہلاتے ہیں پہلے شمس الدین تبریزیؒ مولانا رومؒ کے استاد گرامی ہیں جنکا مزار قونیہ میں ہے دوسرے شخص تبریزی اصل میں شمس عراقیؒ ہیں جنکا روضہ کشمیر میں ہے اور انکی وفات 924 ہجری میں ہوئی جبکہ تیسرے شمس تبریزی شمس الدین سبز واریؒ ہیں جنکا مزار ملتان میں ہے چوتھے شمس الدین سبز واری جو کہ شاہ شمس سبز واری ملتان کی اولاد سے ہیں انکا مزار آلہ آباد (انڈیا) میں ہے عوامی حلقہ میں اس حوالہ سے حیرانگی اور پریشان پائی جاتی ہے کہ قونیہ والے شاہ شمس تبریزؒ کون ہیں اور شاہ شمس تبریزؒ ملتان والے کون ہیں اہل علم جانتے ہیں کہ شاہ شمس تبریزؒ جنکا مزار قونیہ میں ہے وہ مولانا رومؒ کے استاد گرامی تھے جن کے بارے میں مولانا روم فرماتے ہیں

معنوی ہر گز نہ شد مولائے روم تا غلامے شمس تبریزی نہ شد

حضرت شاہ شمس تبریز وہ عارف ہیں جنہوں نے مولانا روم کو معرفت کے اسرار رموز سے آگاہ کیا حضرت مولانا جلال الدین رومی کو شاہ شمس تبریزی سے بڑی عقیدت مندی تھی اور زیادہ تر وہ شاہ شمس کے ساتھ ہی رہتے تھے ایک مرتبہ مولانا روم اپنی کتب لیے ہوئے اپنے استاد کے پاس تشریف لائے وہ حوض پر بیٹھے ہوئے تھے حضرت شاہ شمس تبریز نے علامہ سے پوچھا یہ کیا ہے مولانا نے کہا یہ یہ قیل و قال ہے یہ وہ چیز ہے جسکا آپکو علم نہیں اس پر شاہ شمس نے تمام کتابیں تالاب میں پھینک دیں مولانا روم گھبرائے کہ اس میں میرے والد بزرگوار کے اقوال تھے جنکا ملنا اب مشکل ہے حضرت شاہ شمس تبریز نے تالاب میں ہاتھ ڈالا اور کتابیں پانی سے باہر

نکال دیں مولاناروم نے دیکھا کتابیں بھیگی نہیں بلکہ ان سے گرد اڑ رہی تھی مولاناروم نے شاہ شمس سے پوچھا یہ کیاراز ہے شاہ شمس نے جواب دیاتم کو اسی خبر نہیں مولاناروم یہ کشف کرامات کو دیکھ کر شاہ شمس تبریز کے مرید ہو گئے مولاناروم کو شاہ شمس تبریز نے باطنی علوم سے روشناس کرایا کچھ عرصہ بعد شاہ شمس مولاناروم کو چھوڑ کر دمشق چلے آئے مولاناروم نے انکی جدائی میں کھانا پینا چھوڑ دیا لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا پھر اپنے بیٹے سلمان کو دمشق بھیجا جو شاہ شمس تبریز کو واپس قونیہ لے آئے جب شاہ شمس تبریز کی کرامات کے چرچے ہوئے تو مولاناروم کے بیٹے علاؤالدین محمد نے چند لوگوں کو ساتھ ملا کر شاہ شمس تبریز کو 645 ہجری میں قتل کر دیا آپکا مزار قونیہ میں ہے حضرت شاہ شمس تبریز کا کلام کتب خانوں میں موجود نہیں ہے کلیات شاہ شمس تبریزی میں سارا کلام مولانا روم کا ہے جس میں مولاناروم نے شاہ شمس کے عشق میں غزلیات کہی ہیں چونکہ مولاناروم کو ولایت مطلقہ کا حقیقی عرفان شاہ شمس تبریز کی صحبت سے حاصل ہوا دوسرے سید شمس الدین سبزواری جنکا مزار ملتان میں ہے آپکا شجرہ نسب چند پشتوں کے بعد مولا امام جعفر صادق ع سے جا کر ملتا ہے آپ صوبہ خراسان کی بستی سبزوار میں 560 ہجری میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید صلاح الدین گرم کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے سید صلاح الدین عالم فاضل اور دیندار مبلغ تھے فاطمیوں کے نقیب خاموشی کے ساتھ عالم اسلام میں پھیلائے گئے سید صلاح الدین کا خاندان کس داعی کے ساتھ سبزوار آیا پتہ نہیں چلتا سید صلاح الدین نے فرزند گرامی کا نام شمس الدین رکھا آپکا شجرہ کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے مولا امام جعفر صادق ع_ امام زادہ اسماعیل_ سید محمد عریضی_ سید زید (اسماعیل ثانی) _ سید معصوم شاہ_ سید غالب الدین_ سید عبدالمجید_ مستنصر باللہ_ سید محمد ہادی_ محمد ہاشم (مدفون یمن) سید محمود سبزواری (مدفون لاہور)_ سید محب مشتاق_ سید خالد الدین_ سید صلاح الدین_ شمس الدین سبزواری (مدفون ملتان) مناسب وقت پر شمس الدین کی تعلیم وتربیت کی فارسی و عربی میں سمجھ بوجھ کے بعد قرآن حدیث تفسیر فقہ کی طرف لائے یوں ایمانیات عبادات معاملات کی بنیادیں مضبوط کر کے شیعیت کے ساتھ طریقت کو شامل کیا تذکرۃ الاولیاء فرید الدین عطار میں ہے کہ سید صلاح الدین ایرانی صوفیائے کرام کی پیدا کردہ روحانی ہوا و فضا میں سانس لے رہے تھے اندازہ ہے کہ سید صلاح الدین نے فرزند گرامی کو تعلیمات چہاردہ معصومین ع سے روشناس کرایا کیونکہ آخری فاطمی خلفاء اثناعشری مسلک رکھتے تھے بعض مورخین شاہ شمس سبزواری کو شاہ شمس اسماعیلی کہتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت اسماعیل بن امام جعفر صادق ع کی اولاد سے ہیں نہ کہ اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں آپ کی درگاہ عالیہ میں امام بارگاہ موجود ہے جہاں قدیم عرصہ سے مجالس امام حسین ع کا اہتمام ہوتا ہے ہر جمعرات کو ہفتہ وار مجالس عزا برپا ہوتی ہیں بارہ اماموں کے حوالے سے دیگر تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے یہ ہی دستور درگاہ بی بی پاک دامناں درگاہ امام بری درگاہ شہباز لعل قلندر پر نافذ العمل ہے بعض مورخین نے شاہ شمس تبریزی کو کو ملتان کی سرزمین پر عزاداری کا آغاز کرنے والا

درج کیا ہے سید صلاح الدین کا انتقال 665 ہجری میں ہوا اس دور میں عالم اسلام مغلوں کے تابڑ توڑ حملوں کی وجہ سے زلزلہ میں آگیا تھا سید شمس الدین سبزوار سے نکلے 666 ہجری میں ملتان میں وارد ہوئے متاخرین تذکرہ نگاروں نے حکایت اولیا سنائی کہتے ہیں کہ بہاؤالدین زکریا نے آپ کی خبر پائی تو دودھ کا پیالہ لباب بھیجا مطلب یہ تھا یہاں اہل اللہ کی بھیڑ بھاڑ ہے تمہاری گنجائش نہیں ہے حضرت شاہ شمس الدین نے پیالہ دودھ پر گلاب کا پھول تیر ادیا اور اپنی گنجائش کا جواز دکھلایا حضرت بہاؤالدین زکریا کے پوتے سے شاہ شمس کے گہرے روابط تھے خطاب رکن الدین والعالم شاہ شمس کا عطا کردہ ہے جو بعد ازاں شاہ رکن عالم بن گیا تذکرہ نگاروں نے حکایات اولیاء میں ایک اور اضافہ کیا ہے سید شمس الدین نے جلادوں کو اپنی کھال اتار کردے دی اب کوئی انہیں اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا تھا بھوک نے ستایا تو لب دریا آئے مچھلیاں ابھرنے لگئیں ایک مچھلی پکڑی مگر ملتانیوں نے اسے بھوننے سے انکار کر دیا آپ نے سورج کو حکم دیا تمش بکن سورج سوانیزے پر اتر آیا اور مچھلی بھون دی جسے آپ نے تناول فرمایا اسی وجہ سے ملتانی آپ کو تپ ریز (گرمی دینے والا) کہنے لگے بعد میں تپ ریز تت ریز تب ریز اور تبریز ہوا یوں شمس الدین سبزواری شمس تبریزی ہوئے ملتان کی شدید گرمی اسی وجہ سے ہے ورنہ ملتان کی آب وہوا خوشگوار معتدل تھی نو تعمیر سہ دری کی پیشانی پر آئمہ اہل بیت اطہار ع کے اسم گرامی لکھے ہوئے ہیں بورڈ پر لکھا ہے "کربلا دربار شاہ شمس تبریز" مزار شریف کے چبوترے پر ایک چھوٹا سے دروازہ ہے بورڈ پر لکھا ہے حضرت شمس الدین ولی سبزواری جبکہ مزار شریف کے اندر لکھا ہوا ہے حضرت شاہ شمس تبریز یہ تضاد عوام کے لیے پریشانی کا باعث بنتا ہے بعض مورخین نے اسی وجہ سے شمس الدین سبزواری کو ہی شمس الدین تبریزی مانا ہے جیسا کہ تاریخ انوار السادات المعروف گلستان فاطمہ میں لکھا ہے کہ مخدوم سید شمس الدین تبریزی کی ولادت ماہ شعبان بقول ماہ رجب بروز جمعہ 560 ہجری میں شہر سبزوار میں ہوئی علم فضل و تقوی اور طہارت میں بے عدیل صاحب کرامت ہوئے جب آپ اپنے والد صلاح الدین کے ہمراہ کشمیر و تبت بغرض دعوت اسلام تشریف لے گئے تو وہاں شمس الدین عراقی کہلائے اور جب عرصہ تک تبریز میں مقیم رہے تو تبریزی کہلائے 675 ہجری میں وفات پائی مزار ملتان میں ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس بات کا تاریخی شواہد کے لحاظ سے حقیت کے ساتھ دور دور تک کوئی واسطہ نہیں کیونکہ شمس الدین سبزواری کا کسی طور پر بھی تبریز سے کوئی واسطہ نہیں ہے تبریز کہلانے کی وجہ وہ صرف تپ ریز ہے جو بعد میں تبریز ہو گیا جبکہ شمس تبریزی مولانا روم کے استاد تھے جنکا مزار قونیہ میں آج بھی موجود ہے اسی طرح شمس الدین عراقی اور ہیں جنکا مزار کشمیر میں ہے انکا انتقال 924 ہجری میں ہوا سید شمس الدین نے گیارہ سال ملتان میں تبلیغ کی اور 677 ہجری کو ملتان میں وفات پائی حجرہ کے قریب سپرد خاک کیا گیا قبر پر مقبرہ آپ کے پوتے سید صدر الدین نے تعمیر کرایا سیٹھ مہر دین نے عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا رنجیت سنگھ کے دور میں سکھ گورنر ساون مل نے مسجد مقبرہ مسلمانوں سے چھین کر گردوارہ

بنادیا مسجد گر نتھی کی جائے رہائش تھی رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد مقبرہ بد دستور گردوارہ رہاان سارے سکھاشاہی دور میں ملتان میں اذان سنائی نہیں دی نماز پنجگانہ نماز عیدبقر فطر پر مکمل طور پر پابندی تھی انگریزوں کے ملتان پر قبضے کے بعد 1850ء میں مقبرہ و مسجد مسلمانوں کو دے دی گئ آپ کے صرف ایک ہی فرزند صاحب اولاد ہوئے جنکا نام نصر الدین ہے جو لاہور میں دفن ہیں انکی اولاد میں کبیر الدین کا مدفن اوچ شریف میں ہے اور صدر الدین ملتان میں انکی اولاد سے سید عالم پیدا ہوئے جنکو پیار سے جتو شاہ کہتے ہیں اور انکی قبر شاہ شمس کے برابر ہی ہے

کتاب. حقائق بیاں طلب صفحہ. ۱۱۹